
نومبر 2015
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا
خواتین ڈائجسٹ

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— سادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالد جیلانی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700	روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000	روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000	روپے

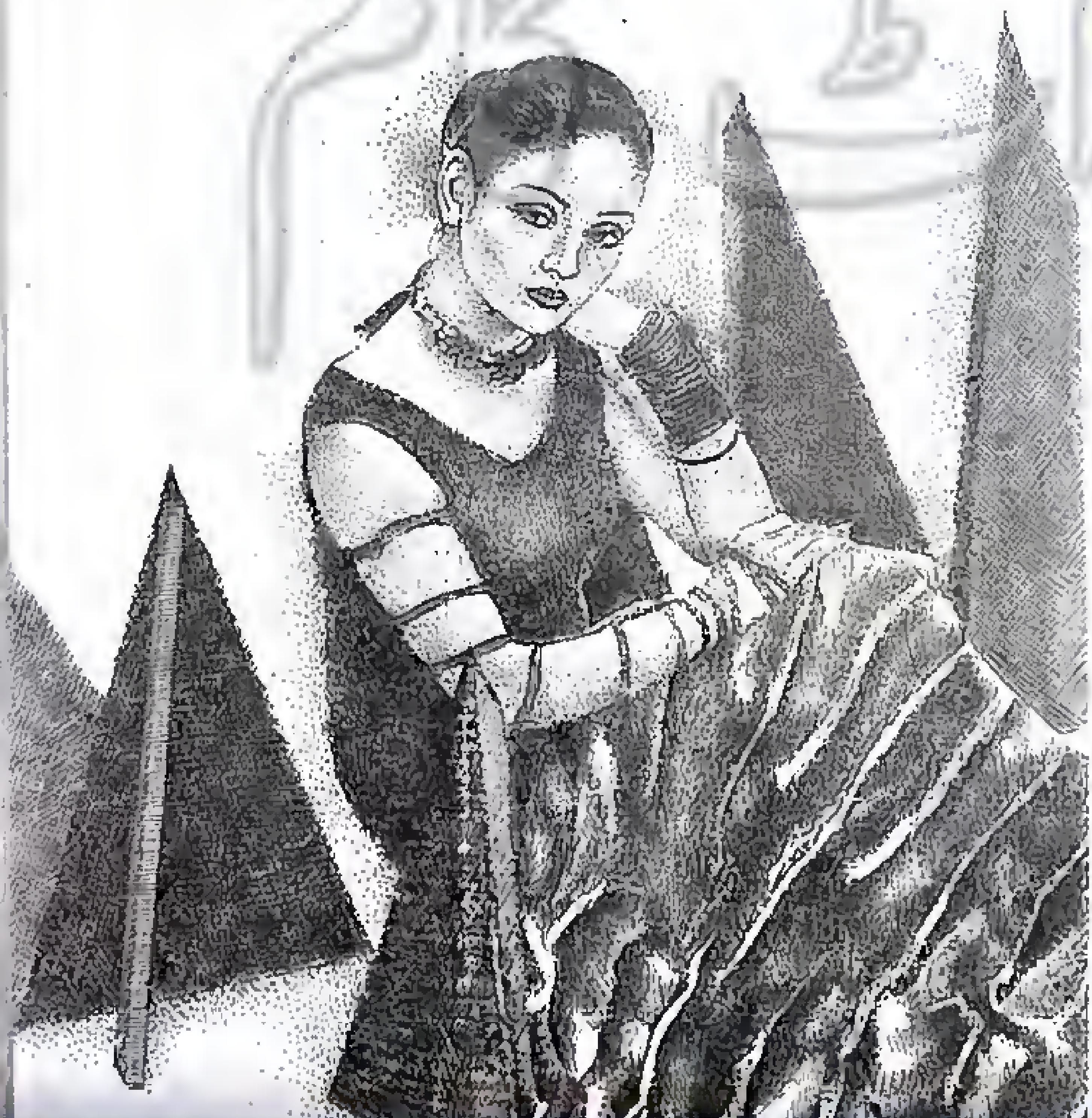
خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

نومبر 2015
جلد 43 شمارہ 7
قیمت 60 روپے





خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مُدیرہ

کہی اَن کہی

نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

دس سال پہلے اکتوبر میں پاکستان نے ہولناک زلزلے کا سامنا کیا تھا آج دس سال بعد زمین ایک بار پھر لرز اٹھی۔ در و دیوار ہل گئے۔ ہزاروں مکانات تباہ ہوگئے۔ سینکڑوں انسان اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ زلزلے کی تباہ کاریوں سے پاکستان کا بڑا حصہ متاثر ہوا ہے۔

ستاروں پر کمند ڈالنے والا انسان آج بھی قدرتی آفات کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ قدرت اپنی طاقت منوا ہی لیتی ہے۔ ایک نظام کے تحت چلنے والی کائنات میں انسان کی مداخلت کرۂ ارض کو تہہ و بالا کر رہی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی اور زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے اور اس کا نتیجہ ہے آندھیاں، طوفان، سیلاب اور زلزلے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو آنے والا وقت کیسا ہو سکتا ہے، اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہ انسان کو قدرت کی طرف سے تنبیہ ہے۔

آج وطنِ عزیز مشکل صورت حال سے دوچار ہے۔ زلزلے سے ہزاروں افراد زخمی اور بے گھر ہوگئے ہیں۔ ان لوگوں کو دوائیں، خوراک کے ساتھ ساتھ گرم کپڑوں کی بھی ضرورت ہے کہ موسم شدید سرد ہے۔ بچوں کے لیے دودھ اور دیگر اشیا درکار ہیں۔

اس کٹھن گھڑی میں ان کا ساتھ دیں۔ جس قدر بھی جو بھی ممکن ہو سکے۔ یہ سب ہمارے اپنے ہیں۔ ہماری تھوڑی سی مدد ان کے لیے زندگی بن سکتی ہے۔

پچھلے دنوں بھارت میں ایک مسلمان کو گائے کا گوشت کھانے کے شبہ کی وجہ سے مار دیا گیا۔ اس کا بیس سالہ بیٹا اسپتال میں موت اور زندگی کی کشمکش میں سانس لے رہا ہے۔ یہ حقیقت ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ جو نظریہ پاکستان کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ ایک بار پھر ثابت ہوگیا ہے کہ ہماری بقا کے لیے پاکستان ناگزیر تھا۔

علامہ اقبال وہ عظیم مفکر، فلسفی اور شاعر جن کی بصیرت نے اس حقیقت کو بھانپا اور پاکستان کا تصور پیش کیا۔ قوم کو خودی کا پیغام دیا۔ سر اٹھا کر جینے کا درس دیا جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی۔

9 نومبر علامہ اقبال کا یوم پیدائش ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

نیا ناول،

اس ماہ بھی عفت سحر طاہر کا ناول اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ آغاز سے اختتام تک ناول میں قارئین کی دلچسپی برقرار رہی ہماری قارئین کی اکثریت نے اسے پسند کیا۔

آئندہ ناول کس مصنف کا ہوگا۔ اس بار یہ فیصلہ ہماری قارئین کریں گی۔ آپ کس مصنف کا ناول پڑھنا چاہتی ہیں۔ ہمیں خط لکھیں یا فون کر کے بتائیں۔ اکثریت کی رائے کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے گا۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول ۔ آبِ حیات، ٭ عفت سحر طاہر کے ناول کی آخری قسط،
- نمل ۔ نمرہ احمد کا مکمل ناول، ٭ شہر آشوب ۔ امت العزیز شہزاد کا مکمل ناول،
- صدف ریحان گیلانی اور ملیحہ صدیقی کے ناولٹ، ٭
- حنا یاسمین، ہاجرہ ریحان، علیقہ محمد بیگ، عمارہ خان، نور فاطمہ اور صدف آصف کے افسانے،
- افسانہ نگار، ناول نگار اقبال بانو سے ملاقات، ٭ حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ ۔ مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، ٭ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو پسند آیا؟ یہ جاننے کے لیے منتظر ہیں۔ خط ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قرآن مجید پڑھنے کا ثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قرآن کریم (صحت کے ساتھ) پڑھنے میں ماہر (قیامت کے دن) معزز نیکوکار فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص اسے اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اسے پڑھنے میں مشقت ہوتی ہے' اس کے لیے دگنا اجر ہے۔"

فوائد و مسائل : 1۔ قرآن کے ماہر سے مراد حافظ اور تجوید کے ساتھ پڑھنے والا قاری یا عالم باعمل ہے۔

2۔ جو شخص تجوید کے ساتھ روانی سے نہیں پڑھ سکتا' اس کے باوجود شوق سے پڑھتا ہے اور پڑھنے میں جو مشقت ہوتی ہے اسے برداشت کرتا ہے' اس کے لیے دگنا ثواب ہے۔ اس میں ان معمر حضرات کے لیے بڑی خوش خبری ہے جن کی زبان موٹی ہو جاتی ہے تو وہ کوشش کے باوجود صحت مخارج اور صفات حروف کا لحاظ رکھ کر الفاظ ادا نہیں کرسکتے' لہٰذا وہ تلاوت ترک نہ کریں بلکہ یہ عمل صالح جاری رکھیں۔

3۔ خلوص نیت کے ساتھ ادا کیا ہوا ناقص عمل بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پیارا ہے' جب وہ عمل نقص کے بغیر ادا کرنا ممکن نہ ہو۔

حافظ و قاری کا درجہ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قرآن والے (حافظ یا قاری) سے (قیامت کے دن) جنت میں داخل ہوتے وقت کہا جائے گا "قرآن پڑھتا جا اور (جنت کے درجات میں) چڑھتا جا"۔ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت کے ساتھ ایک ایک درجہ بلند ہوتا چلا جائے گا حتیٰ کہ اسے جو آخری آیت یاد ہے' وہ بھی پڑھ لے۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔اس سے قرآن مجید کے حافظ اور کثرت سے اس کی تلاوت کرنے والے کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔

2 اگر پورا قرآن مجید یاد نہ ہو تو بھی جتنا یاد ہے اس کے مطابق درجات بلند ہوں گے۔

3 ۔اس حدیث میں تلاوت اور حفظ قرآن کی ترغیب ہے۔

قرآن کی گواہی

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا "قیامت کے دن قرآن مجید ایسے مرد کی شکل میں آئے گا جس کا رنگ اڑا ہوا ہو اور کہے گا میں وہی ہوں جس نے تجھے رات کو بیدار رکھا اور دن کو پیاسا رکھا۔

فوائد و مسائل : 1 ۔شاحب سے مراد وہ انسان ہے جس کا رنگ بیماری کی وجہ سے یا سخت محنت اور تھکاوٹ کی وجہ سے تبدیل ہو گیا ہو۔

2 ۔اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح قرآن پڑھنے والا تہجد میں تلاوت کی محنت اور تھکاوٹ برداشت کرتا تھا' قرآن کو بھی اسی شکل میں ظاہر کیا جائے گا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح قرآن کی تلاوت اور قیام کی وجہ سے آدمی کا رنگ بدل جاتا تھا' اسی طرح قرآن بھی انتہائی بھاگ دوڑ کرے گا کہ مومن کو زیادہ سے زیادہ بلند درجہ مل سکے اور اس بھاگ دوڑ کا اثر اس کی ظاہری صورت میں نظر آئے گا۔ واللہ اعلم۔

تلاوت کا اجر و ثواب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ جب وہ گھر جائے تو اسے گھر میں تین بڑی بڑی موٹی تازی حاملہ اونٹنیاں ملیں؟"

ہم نے کہا جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر کوئی نماز میں تین آیتیں پڑھ لے تو وہ اس کے لیے تین بڑی بڑی موٹی تازی حاملہ اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔قرآن مجید کی تلاوت کا فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

2 ۔حاملہ اونٹنیوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس دور میں عربوں کے نزدیک یہ سب سے عمدہ اور قیمتی مال تھا۔

3 ۔نماز میں تلاوت کا ثواب نماز کے علاوہ تلاوت سے زیادہ ہے۔

قرآن کی مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قرآن کی مثال گھٹنا بندھے ہوئے اونٹوں کی سی ہے۔ اگر مالک ان کے بندھنوں کے ذریعے سے ان کی حفاظت کرے گا تو انہیں اپنے قابو میں رکھے گا اور اگر ان کے بندھن کھول دے گا تو وہ بھاگ جائیں گے۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔اونٹ کو بٹھا کر رسی سے اس کا گھٹنا باندھ دیا جاتا ہے۔ اس رسی کو عقال کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اونٹ بھاگ نہیں سکتا۔ قرآن مجید یاد کرنے کے بعد اسے پڑھتے رہنا چاہیے تاکہ یاد رہے۔ اگر پابندی سے تلاوت نہ کی جائے تو حفظ کیا ہوا قرآن بھول جاتا ہے۔

2 ۔اگر تلاوت فرض اور نفل نمازوں میں' خصوصاً" نماز تہجد میں ہو تو برکات کا حصول زیادہ ہوتا ہے۔

سورۂ فاتحہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے "اللہ عزوجل فرماتا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لیا ہے۔ وہ آدھی میرے لیے ہے اور آدھی میرے بندے کے

لیے۔ اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگتا ہے۔"
انہوں نے کہا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"پڑھو! بندہ کہتا ہے۔ "الحمد للہ رب العالمین" سب تعریفیں جہانوں کے مالک اور پالنے والے کے لیے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری تعریف کی اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے۔ بندہ کہتا ہے۔
"الرحمٰن الرحیم" "بہت مہربان' نہایت رحم کرنے والا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے۔ بندہ کہتا ہے "مالک یوم الدین" جزا کے دن کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری عظمت بیان کی۔ یہ (سب تعریف) میرے لیے ہے اور یہ آیت میرے درمیان اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔ (یعنی جب) بندہ کہتا ہے "ایاک نعبدو ایاک نستعین" "ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو یہ میرے اور بندے کے درمیان نصف نصف ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا۔ اور سورہ کی (باقی) آخری آیات میرے بندے کے لیے ہیں۔ (پھر) بندہ کہتا ہے۔" ہمیں سیدھا راستہ دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا' جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔" (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) یہ میرے بندے کا حصہ ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔ سورۂ فاتحہ سب سے عظیم سورت ہے۔
اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو "نماز" فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تلاوت نماز کا رکن ہے۔

2 ۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث میں اس بات کی قطعی طور پر صراحت اور وضاحت موجود ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی ایک مستقل آیت ہے۔
امیر المومنین فی الحدیث سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یعنی جب تم سورۂ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا کرو کیونکہ یہ (سورت فاتحہ) ام القرآن' ام الکتاب اور السبع المثانی ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس (سورہ فاتحہ) کی ایک آیت ہے۔
3 ۔ دوسری سورتوں کے شروع میں جو بسم اللہ ہے وہ سورتوں کا جزو نہیں' تاہم یہ بھی اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی آیت ہے اور سورہ توبہ کے سوا ہر سورت کے ساتھ نازل ہوئی ہے' اس لیے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔
4 ۔ جہری نماز میں سورت کے ساتھ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے' تاہم آہستہ پڑھنا راجح ہے۔
5 ۔ اللہ کی حمد و ثنا بھی ایک لحاظ سے دعا ہے کیونکہ اللہ کی تعریف سے مقصود اس کی رضا اور قرب کا حصول ہوتا ہے اور حمد و ثنا کرنے والے کو یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔
نمازی کو اگرچہ اسلام کے ذریعے ہدایت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود انسان کو زندگی میں ہر قدم پر اللہ کی رہنمائی اور توفیق کی ضرورت ہوتی ہے' اس لیے ضروری ہے کہ بندہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ذریعے اللہ سے ہدایت کی درخواست کرتا رہے۔ واللہ اعلم۔

سب سے بڑی سورت

حضرت ابو سعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ "کیا میں مسجد سے نکلنے سے پہلے تجھ کو قرآن مجید کی سب سے بڑی سورت نہ سکھاؤں؟" (اس کے بعد جب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر تشریف

لے جانے لگے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دہانی کرائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"الحمد للہ رب العالمین۔ یہی سبع مثانی (سات بار بار دہرائی جانے والی آیت) ہیں اور یہی قرآن عظیم ہے' جو مجھے دیا گیا ہے۔"

فوائد و مسائل : 1۔ اس حدیث میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ "یقیناً" ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیات اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے۔"

2۔ "سورۂ فاتحہ کو "سبع مثانی" اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

3۔ سورۂ فاتحہ کو "قرآن عظیم" کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے' یعنی اس میں عقیدہ توحید' عملی توحید' یعنی صرف اللہ کی عبادت اور صرف اس سے مدد مانگنا' اس کی صفات' عقیدہ آخرت' وعدہ وعید' گزشتہ انبیاء اور ان کی امتوں کے نیک اور نافرمان افراد کے واقعات سے عبرت اور اس سے ہدایت کی درخواست جیسے اہم مضامین موجود ہیں۔

شفاعت

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قرآن مجید میں ایک سورت ہے جس کی تیس آیتیں ہیں۔ اس نے اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کی۔" حتیٰ کہ اس کی مغفرت ہو گئی۔ (وہ سورت ہے) تبارک الذی بیدہ الملک۔

فوائد و مسائل :

1۔ "شفاعت کی" یعنی قیامت کے دن شفاعت کرے گی۔

2۔ قیامت کے دن اعمال محسوس صورت میں سامنے آئیں گے۔

3۔ قیامت کو نیک اعمال بھی شفاعت کریں گے۔

4۔ قرآن مجید کی تلاوت ایمان کے ساتھ اور خلوص نیت سے ہو تو مغفرت کا باعث ہے۔

تہائی قرآن

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قل ھو اللہ احد" (سورہ اخلاص) تہائی قرآن کے (تیسرے حصے کے) برابر ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ سورہ اخلاص کا ثواب ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔

2۔ اس کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں توحید کا بیان ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کو توحید سے محبت اور شرک سے انتہائی نفرت ہے۔

اللہ کے ذکر کی فضیلت

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر' تمہارے بادشاہ (اللہ تعالیٰ) کو سب سے زیادہ پسند' تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور تمہارے لیے سونا اور چاندی (اللہ کی راہ میں) دینے سے بہتر اور اس بات سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن کا مقابلہ کرو اور ان کی گردنیں کاٹو اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں؟"

صحابہ نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کا ذکر۔"

اللہ کی رحمت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے بیٹھتے ہیں' انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان (فرشتوں) میں فرماتا ہے' جو اس کے پاس ہوتے ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ذکر کے لیے بیٹھنے والوں سے مراد مسنون انداز سے ذکر کرنے والے ہیں' مثلاً "نماز سے فارغ ہو کر مسنون اذکار میں مشغول افراد یا وعظ و درس قرآن و حدیث کی مجلس یا آپس میں اللہ کی نعمتوں کا ذکر تاکہ دل میں شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

2۔ خود ساختہ الفاظ کے ساتھ' خود ساختہ طریقوں سے ذکر کرنا خلاف سنت ہے۔ جیسے روشنیاں بجھا کر اجتماعی طور پر ذکر کرنا' بالخصوص الفاظ کی ضربیں لگانا' یا ایسی دعاؤں کو اہمیت دینا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں' مثلاً "درود تاج' درود ماہی' ہفت ہیکل' شش قفل وغیرہ۔ ایسی چیزوں سے ثواب کے بجائے گناہ کا اندیشہ ہے۔

3۔ فرشتے نیکی کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔

4۔ سکینت سے مراد دل میں اطمینان و سکون اور خوشی کی خاص کیفیت ہے' جو ذکر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔

5۔ فرشتوں میں ذکر فرمانے کا مقصد اس عمل پر خوشنودی کا اظہار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قربت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں' جب وہ میرا ذکر کرتا ہے اور اس کے ہونٹ میرے ذکر کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ تعالیٰ کی عام معیت تو ہر مخلوق کے ساتھ ہے کیونکہ وہ اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے ہر ایک کے ساتھ ہے۔ ایک معیت مدد اور نصرت کی ہوتی ہے' جو اس کی راہ میں جدوجہد یا جنگ کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی معیت ہے جو ذکر کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے' اس کا مقصد خوشنودی کا اظہار ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر ہر جگہ موجود نہیں بلکہ آسمانوں پر عرش عظیم کے اوپر ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کی صریح نصوص سے ثابت ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے۔ الرحمٰن علی العرش استویٰ (طہٰ۔20)

3۔ اللہ کا ذکر بہت بڑی نیکی ہے۔

بخل سے اللہ کی پناہ مانگنا

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کرتے تھے کہ "اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بخل سے' میں تیری پناہ مانگتا ہوں بزدلی سے' میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ ناکارہ عمر میں پہنچا دیا جاؤں' میں تیری پناہ مانگتا ہوں دنیا کی آزمائش سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے۔"

دعا سے وبا اور پریشانی دور ہو جاتی ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! ہمارے دل میں مدینہ کی ایسی ہی محبت پیدا کر دے جیسی تو نے مکہ کی محبت ہمارے دل میں پیدا کی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔ اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مد اور صاع میں برکت عطا فرما۔"

دو والے حوالات ہمیں پڑھوا دو بانگِ درا

انشاء جی

جنگ میں گزشتہ ہفتے ہمارے عزیز دوست جمیل الدین عالی (دوہوں والے ' تماشا مرے آگے والے) نے اپنے ناطقہ کو سربہ گریباں کرتے ہوئے ایسا رقت انگیز کالم لکھا ہے کہ جدھر جائیے خلقت زارو قطار رو رہی ہے۔ سارا شہر دیوار گریہ بنا ہوا ہے۔ لیاری کی جھگیاں بہہ گئی ہیں اور محرم کی مجلسیں ماند پڑ گئی ہیں۔ ہم دوسروں کو کیا کہیں' ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ یہ مضمون ہم لکھ نہیں رہے۔ ایک کرم فرما کو لکھوا رہے ہیں کیونکہ ہمارے ہاتھ خالی نہیں۔ ایک تولیہ اس ہاتھ میں ہے' ایک اس میں۔ بولتے جاتے ہیں اور اپنی اشک شوئی کرتے جاتے ہیں۔ ہم دو آبے کے رہنے والے ہیں 'لیکن ایسا دو آبہ نہ دیکھا تھا۔

اس میں کچھ تاثیر موضوع کی بھی ہے۔ ان کا یہ کالم علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں ہے اور خود علامہ مرحوم کے متعلق سب ہی وقائع نگار متفق ہیں کہ بات بات پر رو دیا کرتے تھے۔ جہاں قوم کا نام آیا' ان کی آنکھوں سے اشکوں کا چشمہ رواں ہوا۔ عالی صاحب کا کالم 'جواب' کے ذرا دھندلا دھندلا چھپا ہے' اس کی وجہ بھی مشین کی خرابی نہیں' لکھنے والا کاتب بھی صاحب دل تھا۔ اس کے آنسو لکھتے میں کاغذ پر ٹپکتے گئے اور سیاہی پھیلتی گئی۔ مشین مین نے اسے درست کرنے کی کوشش کی 'لیکن وہ بھی پڑھا لکھا تھا۔ قوم کا درد دل میں رکھتا تھا۔ سیاہی کو مزید پھیکا کرنے میں کچھ حصہ اس کا بھی سمجھیے۔

"عالی صاحب پہلے سیدھا سیدھا کالم لکھا کرتے تھے۔ مطلب اخذ کرنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیتے تھے 'لیکن پڑھنے والوں نے کہا کہ جناب آج کل اتنی فرصت کسے کہ پڑھے بھی اور اس کا مطلب بھی سوچے۔ آج کل تو کالجوں' یونیورسٹیوں تک میں تعلیم خلاصوں کے ذریعے اور امتحان گیس پیپروں کی مدد سے دیے جاتے ہیں۔ آپ بھی اپنی بات کا خلاصہ آخر میں ایک دو تین نمبر ڈال کر لکھ دیا کیجیے۔ آخر حکایات لقمان والے لقمان اور گلستان سعدی والے سعدی بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ آج تک کسی نے اعتراض نہ کیا۔ قارئین پر کند ذہنی کا گمان کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کے عالی صاحب نے اپنے کالم کے آخر میں ضروری نکات مفید مشوروں کی صورت میں رقم کر دیے اور یہ کام ایسا ہے کہ اس میں ان کا حریف کوئی نہیں۔ ان کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے' مفت مشوروں سے خالی نہیں ہوتی۔ گھوڑے پر سوار مولوی صاحب کی طرح مشورہ دیا اور آگے چل دیے۔ ہم نے کئی بار عرض بھی کیا کہ رک کر دیکھ لیا کیجیے۔ آپ کے مشورے کا نتیجہ کیا ہوا' کیا گل کھلا 'لیکن

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

☼ ☼ ☼

کراچی کے یوم اقبال کی عدیم المثال کامیابی سے خوش ہو کر انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ جس طرح آج کل بینکوں والے آئے دن قصبوں اور قریوں میں ایک دوسرے کی ضد میں شاخیں کھول رہے ہیں۔ خواہ وہاں کوئی اکاؤنٹ کھولنے والا ہو یا نہ ہو' اسی طرح آئندہ یوم اقبال کی بھی شاخیں قائم کی جائیں۔ یعنی آئندہ یوم اقبال ہر ڈویژن' ہر ضلع' ہر تحصیل' ہر تھانے اور ہر گاؤں میں منایا جائے۔ اس سے قطع نظر کہ وہاں اقبال کو جاننے اور سمجھنے والا کوئی ہے کہ



نہیں۔ یوم وغیرہ رضا کارانہ طور پر منانے کی عملی دقتوں سے واقف ہونے کی وجہ سے انہوں نے فرمایا ہے کہ یوم اقبال منانا ہر مقامی حاکم کا ایک غیر سرکاری فرض قرار دے دیا جائے۔ بس اتنا سا سرکاری مراسلہ جاری کر دیا جائے کہ مقامی حکام تقریبات اقبال کی ہمت افزائی کریں پھر دیکھیے خدا کیا کرتا ہے۔

☼ ☼ ☼

یہ بات ہمارے بھی تجربے میں آئی ہے' جہاں کوئی کمشنر یا ڈپٹی کمشنر ادب سے دلچسپی رکھنے والا آیا' سارا ضلع اشعار اور استعاروں میں باتیں کرنے لگا' بنیادی جمہوریتوں والے بھی غزلیں کہنا اور رسالے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی کا یوم ہے۔ چونکہ سال میں صرف تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں' لہٰذا بعض شاعروں اور ادیبوں کے نام قلم زد بھی کرنے پڑتے ہیں کیونکہ ایک دن میں ایک سے زیادہ آدمیوں کا یوم منانا کچھ بھلا نہیں لگتا۔ ایک ضلع میں ہم ایک کام سے گئے۔ دیکھا کہ ایک گاؤں میں جھنڈیاں لگی ہیں اور لوگ دیگیں پکا رہے ہیں۔

ہم نے کہا کہ ''کسی کی شادی یا عرس ہے' کیا ہے؟''
معلوم ہوا۔ ''نہیں' حضرت ملنگ گڑگانوی کا یوم ہے۔''

ایک صاحب کو جو پیش پیش تھے' ہم نے روک کر پوچھا کہ ''یہ کون صاحب تھے۔ کیونکہ ہم گڑگاؤں میں رہے ہیں' ان کا نام نہیں سنا۔''

کہنے لگے۔ ''سنا تو ہم نے بھی نہیں' لیکن اوپر سے حکم آیا ہے۔ سنا ہے ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیگم کے ماموں تھے۔ کلام ان کا چھپا نہیں۔ رسالوں والے متعصب تھے۔ چھاپتے ہی نہ تھے۔ ورنہ شاعر سنا ہے اچھے تھے۔ آج ہم ان کی یاد تازہ کریں گے۔ قوالوں سے ان کی غزلیں گوائی جائیں گی اور جو چندہ گاؤں والوں نے تھانیدار صاحب کو ''رضا کارانہ'' طور پر دیا ہے' اس سے ملنگ مرحوم کا دیوان چھپایا جائے گا۔''

☼ ☼ ☼

اندریں حالات ہماری سفارش یہ ہے کہ اگر ادب کی ترقی مطلوب ہے تو آئندہ کسی کو حاکم ضلع مقرر کرتے ہوئے دیکھ لیا جائے کہ آیا شاعر ہے۔ کہیں نرا سی ایس پی تو نہیں۔ یہ ہو جائے تو دیکھیے 'ادب میں کیسی بہار آتی ہے۔ سب لوگ کھیتی باڑی' آب پاشی وغیرہ چھوڑ کر یوم منانے میں لگ جائیں گے۔

آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر یہ ہے کہ ضلع مرادپور میں نیا ڈی سی چارج لیتا ہے۔ فوراً" اہل معاملہ سراغ لگائیں گے کہ آئندہ لائحہ عمل کیا ہو۔

اگر موصوف گھوڑوں کے شوقین ہیں تو گھوڑوں اور مویشیوں کا میلہ کیا جائے اور میونسپلٹی سے ریس کورس قائم کرنے کے لیے جگہ الاٹ کرائی جائے۔

اگر مزاج میں تصوف ہے تو عرس کیے جائیں اور داڑھیاں رکھی جائیں۔

اگر شاعر ہیں تو فوراً" مشاعرہ ہونا چاہیے۔ اگر نمازی ہیں تو نماز سیکھی جائے۔ کیا عجب کبھی پڑھنی پڑ جائے' آخر پتا چلتا ہے کہ حضرت آفتاب اکبر آبادی کا شاگرد ہے۔ سب ہی اپنا قبلہ راست کر لیتے ہیں' لیکن جونہی حضرت کا تبادلہ ہوا' ہم نے یہ دیکھا کہ دوسرے ہی روز بزم ادب کے دفتر میں کھلی بنولوں کی دکان کھل گئی۔

☼ ☼ ☼

ہفت روزہ آفتاب عالمتاب کے دفتر میں کورے لٹھے کا ڈپو قائم کیا گیا کیونکہ تحقیق کرنے والوں نے تحقیق کر لیا کہ نیا ڈی سی شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ تھانے میں شعر کہنے والوں کی فائل کھلوا دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

خیر اقبال تو قومی شاعر ہے۔ تصور پاکستان کا خالق ہے' تاہم یہ بعید از امکان نہیں کہ گاؤں کی یونین کونسل میں سرکلر پہنچے کہ اب کے یوم اقبال منایا جائے تو اس قسم کی گفتگو ہو۔

"اے یہ کیہڑا اقبال بھئی؟"

"ڈاکٹر اقبال"

"کون ڈاکٹر اقبال؟"

" ڈاکٹر اقبال نہیں جانتے۔ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال۔"

"یہ ڈی سی صاحب ہیں یا سول سرجن جو ڈاکٹروں' حکیموں کے دن منائے جانے لگے۔ یہ کیا لگتے ہیں ڈی سی صاحب کے؟"

"کچھ بھی نہیں لگتے۔ شاعر تھے۔ بہت بڑے' 1938ء میں مر گئے۔"

"مر گئے تو پھر یوم منانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں اتنا خرچا کیا جائے۔ جب کہ وہ ڈی سی صاحب کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ کہاں کے رہنے والے تھے؟"

"سیالکوٹ کے۔"

"سیالکوٹ کے....؟ پھر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہماری بیگم سیالکوٹ ہی کی ہیں۔ یہ بھی ضرور کوئی تگڑے آدمی ہوں گے۔"

☼ ☼ ☼

بعد ازاں رپورٹیں طلب کی جائیں گی۔ کس کس گاؤں میں یوم اقبال منایا گیا' کہاں نہیں۔ کوئی ہزار عذر کرے کہ جناب کوئی قوال ہی خالی نہیں ملا۔ ہم یوم اقبال کیسے مناتے۔ کوئی عذر مسموع نہ ہو گا۔ تھانے والا باندھ کے لے جائے گا کہ بدمعاش! یوم اقبال نہیں مناتے۔ ڈی سی صاحب کے حکم کی سرتابی کرتے ہو۔ دو جی اسے حوالات میں' پڑھوا دو اسے بانگ درا۔ صبح خود ہی بانگ دیتا ملے گا کہ حضور غلطی ہوئی' بال بچوں والا ہوں' آج ہی جا کے مناتا ہوں یوم اقبال۔



معروف افسانہ نگار/ناول نگار

اقبال بانو سے ملاقات

شاہین رشید

صلاحیتیں تو خداداد ہی ہوتی ہیں مگر کچھ صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو پالش کیا جاتا ہے تو وہ مزید نکھر کر سامنے آتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جنہیں پالش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ جیسے شاعری کی صلاحیت اور لکھنے کی صلاحیت۔ تخلیقی صلاحیت اللہ کسی کسی کو ہی عطا کرتا ہے۔ ڈرامے' افسانے' ناولز لکھنا اور شاعری کرنا واقعی کمال کی بات ہے۔

اقبال بانو کا نام قاری بہنوں کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں' ایک عرصے سے لکھ رہی ہیں اور بہت خوب لکھ رہی ہیں۔ ڈائجسٹ کی رائٹرز کو کبھی ٹی وی والوں نے لفٹ نہیں کرائی' کبھی ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ مگر جب ایک ڈائریکٹر نے ہمت کی تو سب نے ہی ڈائجسٹ کی رائٹرز سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اور آج ڈراموں کی دنیا میں ڈائجسٹ رائٹرز کا ہی راج ہے "سسرال میری بہن کا" وہ کامیاب سوپ جو ابھی حال ہی میں ختم ہوا ہے "اقبال بانو" کی ہی کاوش تھی تو' بہ حیثیت ایک افسانہ نگار' ناول نگار اور اب ڈرامہ نگار' کے ہماری جو گفتگو ہوئی آپ کی نذر ہے۔

"جی اقبال بانو.... کیسی ہیں آپ؟"

"شکر ہے اللہ کا۔"

"کہاں تھیں؟ میں کافی دیر سے فون کر رہی تھی؟"

"میں کچن میں تھی اور اب کچن میں میں فون لے کر نہیں جاتی کیوں کہ پہلے ایک بار میری لاپروائی سے میرا موبائل گھی کے ڈبے میں گر گیا تھا۔ موبائل گھی کے ڈبے کے ڈھکن پر رکھا تھا جیسے ہی ڈھکن ہٹایا موبائل اندر جا گرا۔"

"واہ.... واہ.... کیا بات ہے مشہور رائٹر کی۔ مجھے یاد ہے کہ شروع کی تحریروں میں تم کبھی کچن کا ذکر نہیں

کرتی تھیں۔ کیوں؟؟"

"ہاں.... مجھے اور بھی کافی لوگوں نے کہا تھا تو میں نے انہیں بتایا کہ میں چونکہ کچن میں جاتی ہی نہیں تو مجھے نہیں پتا ہوتا کہ چائے کی پتی کہاں پڑی ہے' چینی کہاں پڑی ہے کچن کا سارا کام تو میری بہنیں کرتی تھیں' تو مجھے نہیں پتا کہ کچن میں کیا ہوتا تھا۔ مگر اب

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں بتا سکتی ہوں کہ کچن میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے میری بہنیں میرا سب کام کر دیتی تھیں۔ حد تو یہ کہ کبھی مجھے رومال بھی نہیں دھونے دیا اور اگر میں کبھی دھو لیتی تھی تو وہ ناراض ہو جاتی تھیں اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں گھر کی بڑی تھی تو سب مجھ سے پیار اور میرا احترام کرتی تھیں۔"

"فیلڈ سے متعلق باتیں تو ہوں گی ہی مگر پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟؟"

"جی ہمارا تعلق ملتان سے ہے ابا امی دونوں ملتان کے ہیں اور ہم سرائیکی ہیں۔ میں جب دو سوا دو سال کی تھی تو میری خالہ نے مجھے گود لے لیا تھا اور وہ مجھے لے کر کراچی آگئیں۔ تو جب میں اپنے گاؤں آتی تھی تو اپنی امی کو خالہ کہتی تھی۔ اور جب میں پانچویں کلاس میں تھی تب مجھے پتا چلا کہ جن کو میں خالہ کہتی ہوں وہ میری سگی ماں ہیں اور جن کو ماں کہتی ہوں وہ میری خالہ ہیں اور ہاں! میں 15 جولائی کو پیدا ہوئی۔"

"اچھا یہ راز افشا کس نے کیا اور آپ کی کیا کیفیت تھی؟"

"یہ راز میری خالہ کی دیورانی نے افشا کیا' میری بڑی خالہ کی دیورانی نے۔ تو ایک دفعہ جھٹکا تو لگا اور پھر میرے لیے دونوں ماؤں میں توازن رکھنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ میرا دل دونوں طرف کھنچتا تھا۔ ایک مجھے پال رہی تھیں اور ایک نے مجھے جنم دیا تھا۔ لیکن ایک بات تھی کہ مجھے میری اماں شروع دن سے ہی بہت اچھی لگتی تھیں۔ خالہ کہہ کر میں ان سے لپٹ جایا کرتی تھی۔ شاید قدرتی طور پر ماں والی کشش تھی اور

یہ بات مجھ میں بچپن سے تھی کہ میں لوگوں کی فیلنگز کو بھانپ لیتی تھی تو جب میں اپنی اماں سے خالہ سمجھ کر لپٹ جاتی تھی تو اپنی اماں (جنھوں نے گود لیا تھا) کی آنکھوں میں بڑی حسرت دیکھتی تھی کہ جیسے وہ سوچ رہی ہوں کہ اگر میری سگی بیٹی ہوتی تو خالہ سے اتنے لاڈ نہ کرتی کیونکہ میں اپنی دوسری خالاؤں سے اتنے لاڈ نہیں کرتی تھی جتنا میں اپنی اماں (سگی ماں) سے کرتی

تھی۔ تو جب میں نے محسوس کیا کہ میری پالنے والی ماں محسوس کرتی ہیں تو پھر ان کے سامنے میں اپنی سگی ماں کو زیادہ نہیں بلاتی تھی۔ لپٹتی بھی نہیں تھی۔ گود میں سر بھی نہیں رکھتی تھی بلکہ اپنی دوسری ماں (خالہ) سے زیادہ لاڈ کرنے لگ گئی تھی۔"

"آپ گھر کی بڑی بیٹی تھیں اور پہلی ہی بیٹی کو گود دے دینا' کچھ بات سمجھ میں نہیں آئی؟"

"ہوا یہ کہ ایک تو میری خالہ کے یہاں اولاد نہیں ہوئی تھی' پھر جب میں پیدا ہوئی تو میرے سوا سال کے بعد میری دوسری بہن پیدا ہو گئی اور وہ اکثر بیمار رہتی تھی تو میری خالہ نے بھی مجھے گود لے لیا اور میری نانی نے بھی کہا کہ ہاں دو دو لڑکیوں کی پرورش کرنا تمہارے لیے مشکل ہو رہا ہے تو بڑی کو خالہ کے حوالے کر دو.... تو اس طرح میری خالہ نے مجھے گود لے لیا۔ ویسے ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔"

"سب لکھاری ہیں؟ یا تم ہی ہو؟"

"کوئی بھی لکھاری نہیں ہے صرف میں ہی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سب میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور سب تعریف بھی کرتے ہیں اور پہلے بہنوں کو فخر ہوتا تھا اب ان کی اولادوں کو بھی فخر ہوتا ہے اور سب کو بتاتی ہیں کہ ہماری خالہ لکھتی ہیں۔"

"تمہارا نام اقبال ہے جبکہ یہ لڑکوں کا نام ہوتا ہے۔ کیا علامہ اقبال سے متاثر ہو کر رکھا؟"

"میرے دادا کا نام ملک بہاول تھا تو شاید انہی کی مناسبت سے میرا نام اقبال رکھ دیا ہو گا۔ میرے ابا گھر کے بڑے تھے اور ان کی بڑی بیٹی میں تھی تو بس دادا کے

نام سے ملتا جلتا میرا نام رکھا گیا' ہمارے خاندان میں بہت کم لوگ پڑھے لکھے تھے بلکہ معمولی پڑھے لکھے تھے تو میں اپنے خاندان کی واحد لڑکی تھی جس نے سب سے زیادہ پڑھا۔ ایم اے کیا' ایل ایل بی کیا اور سرائیکی ادب میں ایم اے کیا۔ اب تو ہمارے خاندان میں لڑکیاں پی ایچ ڈی بھی کر رہی ہیں۔ صرف میری خالہ نے میٹرک کیا تھا۔ اور ایسا نہیں کہ میں ڈگریاں لے کر گھر بیٹھ گئی تھی بلکہ میں نے بینک میں جاب کی بہ حیثیت منیجر کے۔ 1993ء میں جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو مجھے جاب چھوڑنی پڑی کیونکہ گھر کی ساری ذمہ داری مجھ پر آگئی تھی۔"

"لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے اور کب احساس ہوا کہ میں لکھ سکتی ہوں؟"

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ گزرے زمانے میں اخبار ہر گھر میں آتا تھا تو ہمارے گھر میں بھی آتا تھا۔ اس میں بچوں کا صفحہ بھی ہوتا تھا تو جب میں میٹرک میں تھی اور بچوں کی کہانیاں پڑھا کرتی تھی جو کہ میں بچپن سے ہی پڑھ رہی تھی تو مجھے احساس ہوا کہ ایسی کہانیاں تو میں بھی لکھ سکتی ہوں۔ تو میں نے لکھ کر بھیجی روزنامہ امن میں۔ اس زمانے میں بچوں کا صفحہ انور شعور صاحب نکالا کرتے تھے۔ انہوں نے میری کہانی کو بہت پسند کیا اور باقاعدہ لکھنے کو کہا یوں ہر ہفتے میری کہانی روزنامہ امن میں لگ جایا کرتی تھی۔ اور انور شعور مجھے اکثر کہتے تھے کہ تم ایک دن بہت بڑی رائٹر بنو گی۔ اسی اخبار میں طلبہ کا صفحہ بھی آتا تھا اس میں بھی مضامین' کہانیاں اور سروے کیے۔ ان دنوں ایک میگزین نکلتا تھا "گھرانہ" کے نام سے اس میں میں نے ایک کہانی لکھی۔ فروری 79ء میں اس وقت میں میٹرک میں تھی۔"

"معاوضہ ملتا تھا؟"

"معاوضہ کیا ہوتا ہے' مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ سب سے پہلا معاوضہ مجھے ایک میگزین والوں نے دیا تھا دسمبر 99ء میں سو روپے اور پرچوں میں بھی افسانے لکھے مگر کوئی معاوضہ نہیں ملا اور تمہیں بتاؤں کہ افسانوں میں زندگی کا ہر رنگ دکھایا جاتا ہے تو جب میرے افسانے چھپتے تھے اور میری دوسری امی جب پڑھنے لگتی تھیں تو میں کمرے سے نکل جاتی تھی' کیونکہ مجھے شرم آتی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ کہیں کہ اس کو ان باتوں کا بھی پتا ہے؟ تو یہ لکھنے کی صلاحیت تو خداداد ہوتی ہے تو جملے خود بخود اترتے چلے جاتے ہیں ہر ماحول کے۔"

"لکھاری لوگ رومانٹک بھی بہت ہوتے ہیں۔ کیا خیال ہے اور پہلی تعریف کس کی طرف سے آئی؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو اور میں تو ابھی تک رومانٹک ہوں۔ پہلی تعریف مجھے ریاض صاحب (بانی خواتین ڈائجسٹ) کی طرف سے ملی۔ انہوں نے جب کہا کہ "ہیں! یہ تم نے لکھا ہے" اور پھر امتل کے والد صاحب نے کہا کہ "امتل یہ وہی اقبال بانو ہے جو افسانے لکھتی ہے" (ان دنوں یونیورسٹی کے حوالے سے میرا امتل کے یہاں کافی آنا جانا تھا) تو امتل کہتی کہ "جی بابو" تو کہتے کہ "لگتا تو نہیں کہ یہ ایسے افسانے لکھتی ہو گی۔" امتل کہتی کہ "میرے ابا تو تمہارے زبردست فین ہیں۔"

"ناول لکھنے کا خیال کیسے آیا؟"

"میں نے دوشیزہ میں کچھ افسانے لکھے تھے جس پر مجھے رعنا فاروقی نے کہا کہ تم ہمیں ناول لکھ کر دو۔ تو میں نے کہا کہ میں نے تو ابھی اتنے افسانے بھی نہیں لکھے تو ناول کیسے لکھ سکتی ہوں۔ حالانکہ ایک سال میں میں نے اچھے خاصے افسانے لکھ لیے تھے جو کہ سب کے سب شائع بھی ہوئے تھے۔ تو اس وقت عظمت عزمی بھی وہاں تھیں انہوں نے کہا کہ بانو اگر تمہیں چانس مل رہا ہے تو ضرور لکھو۔ ان دنوں عظمت عزمی بھی امن میں لکھا کرتی تھیں۔ خیر اس وقت میرے ذہن میں کوئی پلاٹ نہیں تھا چنانچہ میں نے دیہاتی ماحول پہ لکھنے کا ارادہ کیا' کچی سڑک سے

شروع کیا تو میرے ذہن میں میرے گاؤں کا پورا سین' پورا ماحول آ گیا۔ میں نے چند صفحات لکھے اور رعنا کے پاس لے گئی وہ پڑھتی رہیں۔ میں منتظر تھی کہ ابھی کہیں گی کہ یہ ٹھیک نہیں ہے مگر انہوں نے کچھ نہیں کہا البتہ جب پندرہ دن کے بعد پرچہ آیا تو اس میں میرا ناول تھا۔ بہت اچھا لگا' لکھنے کا سگنل تو مجھے مل ہی گیا تھا اور ناول جیسے جیسے چھپتا گیا۔ پسندیدگی بڑھتی گئی اور " دوشیزہ" میں آنے والا ہر خط میری تعریف میں ہوتا تھا۔ یہ ناول 20 ماہ چلا۔ اس کا نام "شیشہ گر" تھا پھر یابر صاحب نے فرمائش کی تو "دروازہ کھلا رکھنا" کے نام سے ان کے لیے ناول لکھا۔ اسی ناول "دروازہ کھلا رکھنا" کی ڈرامائی تشکیل ہوئی اور کچھ عرصہ پہلے "جینا دشوار سہی" کے نام سے سیریل چلا۔ پھر لکھا "تجھے ہر جگہ پکارا۔"

"موضوعات کس طرح ذہن میں آتے تھے؟"

"سچ بتاؤں مجھے آج تک یہ نہیں پتا کہ کہاں سے اور کس طرح موضوعات میرے ذہن میں آجاتے ہیں۔ میں سوچتی بھی نہیں ہوں اور موضوع میرے اندر کروٹیں لینے لگتا ہے۔ میرے اللہ کا مجھ پر بہت کرم رہا۔ والدہ کے انتقال کے بعد میرے لکھنے کی روٹین بالکل ختم ہو گئی اور تقریباً" آٹھ دس سال کا وقفہ آ گیا تب میں قلم کاغذ اپنے سامنے رکھ کر رویا کرتی تھی کہ لکھا ہی نہیں جاتا تھا تو میں روتی تھی کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت مجھ سے چھین تو نہیں لی۔ مجھے امتل اور دوسرے پرچوں کی مدیرہ فون کرکے کہتیں کہ لکھو اور میں اگلے ماہ کا کہہ کر ٹال جاتی تھی۔ خیر ذمہ داریاں کم ہوئیں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ خاندان میں خوشی غمی میں آنا جانا تو رہتا ہی تھا مگر بڑی ذمہ داریوں سے فراغت ہوئی تو پھر میں نے لکھنا شروع کیا اور قلم جو روٹھ گیا تھا اسے دوبارہ میں نے منایا۔"

"افسانوں' ناولوں میں فینٹسی بہت ہوتی ہے۔ لڑکیوں کو ایک آئیڈیل شوہر دکھایا جاتا ہے اور وہ اسی کا تصور کر بیٹھتی ہیں۔ جبکہ عام لائف میں شہزادے نہیں ملتے؟"

"میں اس بات کو تسلیم کروں گی کہ ہم بعض اوقات غلط بھی دکھا دیتے ہیں ہر لڑکی کو حقیقی دنیا میں شہزادہ نہیں ملتا اور میں نے بہت سی لڑکیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم نے خواتین کرن اور شعاع سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے تو افسانوں میں تو ہر بات دکھائی اور بتائی جاتی ہے۔ برائی کا انجام بھی دکھایا جاتا ہے۔"

"کہتے ہیں کہ ڈائجسٹ کی رائٹرز نے ڈرامے کو خراب کر دیا ہے۔ تمہاری رسائی کیسے ہوئی ڈرامے کے لیے اور اب تک کتنے ناولز لکھ چکی ہو؟"

"ڈائجسٹ کی رائٹرز نے تو ڈرامے کو زندہ کر دیا ہے اور کتابی شکل میں میرے اب تک چار ناولز آ چکے ہیں۔ جبکہ گیارہ کتابیں افسانوں کی آ چکی ہیں۔ ایک سرائیکی ناول پہ ابھی کام کر رہی ہوں' سب کا اچھا رسپانس ملا۔"

"لکھنے کے کیا اوقات ہوتے ہیں؟ ایسا ہوتا ہے کہ دماغ میں اسٹوری آئی۔ چلو جی سب کام چھوڑ کر پہلے اسٹوری کی تین لائن ۔ لکھ لوں؟"

"نہیں' ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ گھر کے کاموں سے فراغت مل جائے۔ تو صبح فجر کے بعد جب میرا بیٹا اسکول چلا جاتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کچھ لکھنے کا یا پھر رات کے وقت سارے کام نبٹا کے لکھنے بیٹھتی ہوں۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ اسٹوری دماغ میں آئی اور ہجوم میں بیٹھ کر بھی لکھ لیا؟"

"اب تو ایسا نہیں ہوتا البتہ جب میں یونیورسٹی میں تھی اور کوئی پلاٹ میرے ذہن میں آتا تھا تو کتنا ہی شور کیوں نہ ہوتا ہو' میں لکھ لیتی تھی اور میری دوستیں بھی کہتی تھیں کہ تم لکھو ہم تمہیں نوٹس دے دیں گے اور یقین کرو کہ جب امتل کو افسانہ دینا ہوتا تھا تو میں پوائنٹ کی بس میں بیٹھ کر بھی لکھ لیا کرتی تھی یعنی مکمل کر لیتی تھی افسانہ اور پھر آفس آکر دے بھی جاتی تھی اور اللہ کا بڑا شکر ہے کہ میری تحریریں کبھی

ریجیکٹ نہیں ہوئیں۔ البتہ تبدیلی ضرور کروائی گئی۔"

"اور ٹی وی ڈراموں کے لیے سنا ہے کہ ڈائریکٹر اپنی مرضی سے اسکرپٹ چینج کر دیتے ہیں تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوا؟"

"سچ پوچھو تو میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا' میرے تین ہی پروجیکٹ ہوئے ہیں "مرجائیں ہم تو کیا' جینا دشوار سہی" اور "سسرال میری بہن کا" تو جو میں نے لکھ کر دیا وہ ہی ڈرامہ بنا اور ڈرامہ شوٹ ہونے سے پہلے ہر چیز ڈسکس ہو جاتی ہے۔ میرے تین پروجیکٹ تین چینلز سے ہوئے اور کسی نے کوئی چیز خود سے نہیں بدلی۔ عامرہ شاہد کے ساتھ میں نے دو پروجیکٹ کیے اور ایک انڈر پروڈکشن ہے اور وہ اتنی اچھی خاتون ہیں کہ مجھے ان سے سیکھنے کا بہت موقع ملا۔"

"سوپ لکھنا آسان ہے یا سیریل لکھنا اور معاوضہ پرکشش ہوتا ہے اور کیا وقت پر ملتا ہے؟"

"مجھے تو دونوں ہی آسان لگتے ہیں اور معاوضہ پرکشش ہوتا ہے اور ہاں ملنے میں دیر ہو جاتی ہے اور ایک ادارے نے تو مجھے معاوضہ کے لیے بہت تنگ کیا' ڈرامہ ختم ہونے کے کافی ٹائم بعد میرا معاوضہ clear کیا۔ باقی جن دو اداروں کے ساتھ کام کیا انہوں نے فوراً "پے منٹ" دے دی۔"

"ارے وہ سوال تو رہ ہی گیا کہ ٹی وی تک رسائی کیسے ہوئی۔ کیا تم نے خود رابطہ کیا؟"

"نہیں نہیں... میں نے خود نہیں کہا' کیونکہ خود سے کہنے والے کی کوئی عزت نہیں ہوتی خواہ وہ کتنا ہی اچھا لکھاری کیوں نہ ہو' مجھ سے عامرہ شاہد نے ہی رابطہ کیا۔ انہوں نے میرا ناول "گونگے دکھ" پڑھا تھا تو انہیں پسند آیا اور پھر کہیں سے میرا نمبر لے کر انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ اس کے رائٹس ہمیں بھیج دیں تو میں نے کہا کہ آپ بتائیں میں لکھ لوں گی۔ بس آپ مجھے کوئی اسکرپٹ بھیج دیں تاکہ مجھے پتا چل جائے کہ اسکرپٹ کیسے لکھا جاتا ہے۔ تو بس اس طرح



ٹی وی تک میری رسائی ہوئی "گونگے دکھ" یہ سوپ "مرجائیں بھی ہم تو کیا" بنا تھا۔"

"چلو جی... فیلڈ کے بارے میں بہت باتیں ہو گئیں۔ یہ بتاؤ کہ شادی کب ہوئی۔ تمہاری پسند کو کتنا عمل دخل تھا؟"

"میری شادی 1998ء میں ہوئی ملک فیض رسول لنگڑیال صاحب سے۔ سب بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ صرف میں اور بھائی رہ گئے تھے اور میرا ارادہ بالکل بھی نہیں تھا شادی کرنے کا' میرا خیال تھا کہ میں اب بڑی ہو گئی ہوں تو اب کیا شادی کرنی۔ والد صاحب اصرار کرتے تھے کہ شادی کر لو کہ اگر میں نہ رہا تو پھر تم اکیلی رہ جاؤ گی تو پھر والد کی بات مان کر میں نے شادی کر لی اور جہاں تک پسند کی بات ہے تو یہ بھی زمین دار تھے اور بینک میں جاب کرتے تھے تو ہیلو ہائے تھی ان کے ساتھ اور میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا بندہ ہو جو ہر مہینے اپنی تنخواہ میرے ہاتھ میں لا کر دے۔ زمین داروں کا کیا ہے۔ گندم کی فصل آئے گی گندم کٹے گی یا کپاس کی فصل ہوگی تو پیسہ آئے گا... تو اس وقت دو

تین رشتے تھے تو فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ 1998ء میں شادی ہوئی اور 2004ء میں میرے میاں صاحب نے گولڈن ہینڈ شیک لے کر جاب چھوڑ دی۔ کیونکہ ان کا ٹرانسفر لاہور ہو رہا تھا اور یہ لاہور جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ تو اس وقت سے یہ زمین داری کر رہے ہیں اور ہماری بہت اچھی زمین داری ہے۔"

"فیشن سے تمہیں لگاؤ نہیں' اس کا اندازہ تو مجھے ہے؟"

ہنستے ہوئے "ہاں فیشن سے مجھے لگاؤ نہیں' کچھ دن پہلے میں اپنے میاں صاحب سے کہہ رہی تھی کہ مجھے ایک لپ اسٹک لادیں کہ میں تین سال سے ایک ہی لپ اسٹک استعمال کر رہی ہوں تو ہنستے ہوئے بولے تم نے مجھے کبھی کہا ہی نہیں' ویسے انہیں میرے لیے کپڑے لانے کا بہت شوق ہے۔ اچھے اچھے کپڑے لے کر آتے ہیں کہ انہیں پہنو۔ انہیں میرے لیے جوتیاں لانے کا بھی شوق ہے۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں' مجھے خود سے کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ میں ان کے ساتھ جاؤں بھی تو کتابوں کی دکان میں گھس جاتی ہوں۔ مجھے اچھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"

"کبھی میاں صاحب نے ہاتھ سے قلم کاغذ لے کر پھاڑا کہ بس کرو' بچے کو پالو؟"

"نہیں ایسا کبھی نہیں کیا۔ اور جن دنوں ڈرامہ "سسرال میری بہن کا" لکھ رہی تھی تو چار چار بجے تک جاگ کے لکھتی تھی تو یہ ضرور کہتے تھے کہ بس کر دو تمہاری آنکھیں دکھ جائیں گی۔"

"تمہارا ماشاء اللہ سے ایک ہی بیٹا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچے دو ہی اچھے؟"

"بس اللہ کا حکم۔ اللہ نے تین بچے دے کر واپس لے لیے۔ اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کی زندگی لمبی کرے اور صحت کے ساتھ جیتا رہے۔ میرا بیٹا تیرہ سال کا ہے اور 9th کلاس میں ہے اور اس کو نعتیں پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہے اور تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق ہے اور ٹیم کا شوق ہے۔ میرے بیٹے کا نام محمد اسماعیل ٹیپو ہے.... میرے میاں میرے ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اور Repeat میں بھی دیکھتے ہیں۔ جہاں میرا ڈرامہ آرہا ہوتا ہے آواز دے کر کہتے ہیں۔ "موٹو! تمہارا ڈرامہ آرہا ہے۔"

"کہتے ہیں کہ عورتیں جب کمانے لگتی ہیں تو مردوں پر رعب ڈالتی ہیں تو تم بھی ایسی ہی ہو؟"

"میرا میاں تو مجھے 1998ء سے کھلا رہا ہے جبکہ میری کمائی تو 2011ء سے شروع ہوئی ہے۔ ہمارا جوائنٹ اکاؤنٹ ہے' میں جتنا خرچ کروں۔ مجھے منع نہیں کرتے۔"

"مزاج کی کیسی رہیں۔ نرم یا گرم؟"

"مزاج ہمیشہ میرا نرم ہی رہا۔ مجھ سے کوئی لڑ بھی پڑے تو میں خاموش رہتی ہوں۔ میری بڑی خواہش ہوتی ہے کہ مجھ سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو کسی کو دکھ نہ پہنچے۔"

"کھانے پینے میں کیسی ہو مہمان نواز بھی ہو؟"

"مہمان نواز ہوں۔ تم آؤ تمہیں پتا چلے کہ میں کیسی مہمان نواز ہوں اور کھانے مجھے سب پکانے آتے ہیں کیونکہ میرے میاں کھانے کے بہت شوقین ہیں۔ کبھی اچھا نہ پکے تو ضرور کہتے ہیں کہ تم نے آج اچھا نہیں پکایا۔"

"باہر کا کھانا پسند ہے؟.... جاتے ہیں آپ لوگ؟"

"انہیں ایسا کوئی شوق نہیں ہے البتہ میرے بیٹے کو شوق ہے تو مہینے دو مہینے میں ایک بار ضرور باہر جاتے ہیں تو وہاڑی اور بورے والا کا کوئی ہوٹل کوئی ریسٹورنٹ نہیں چھوڑا ہم نے جہاں کھانا نہ کھایا ہو گا۔"

باتیں بہت تھیں مگر صفحات کی کمی ہے' تو ان شاء اللہ ان کا نیا سیریل آنے پر پھر بات کریں گے.... شکریہ اقبال بانو کہ آپ نے مصروفیات سے ٹائم دیا۔

☆

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا ' کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔
43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا 'اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔
گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے 'کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا ' وہ شوق 'وہ جستجو 'وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔
اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کربناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی ' دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی 'ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے 'یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔
فطری بات ہے 'ہم جن کو پسند کرتے ہیں 'جن سے لگاؤ رکھتے ہیں 'ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں 'ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔
سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے 'سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن 'بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟
2 آپ کے گھر والے ' خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریوں کے بارے میں کیا رائے ہے۔
3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے 'اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟
4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟
5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں 'مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

شازیہ جمال طارق

"لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں ملا ہے؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی؟ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟"

سب سے پہلے تو ادارے کو سالگرہ کی ڈھیر ساری مبارکباد اور امتل کا بے حد شکریہ 'انہوں نے مجھے بھی مصنفین کی فہرست میں یاد رکھا۔
(شازیہ! ہم نے آپ کو مصنفین کی فہرست میں

نہیں رکھا' آپ بہت اچھی مصنفہ ہیں آپ کو یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے؟)

کسی بھی سوالنامے میں میری یہ پہلی شمولیت ہے۔ پہلی بار اپنے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے متضاد کیفیت میں ہوں۔ خیر! زندگی میں بہت سارے کام ہم پہلی بار کرتے ہیں۔" یہ ڈائیلاگ کئی بار میری زبان سے ادا ہوا البتہ لکھا صرف ایک ہی بار تھا۔

ہمارے خاندان میں ادب سے شغف رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے' میرے نانا جان مطالعے کے از حد شائق ہیں۔ تمام ادبی رسائل' میگزین' اخبارات باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ اللہ ان کو صحت و سلامتی عطا کرے۔ آمین۔

دادا مرحوم کے نزدیک مطالعہ غذا جتنی اہمیت رکھتا۔ ان کے پاس کھردری جلد اور زرد صفحات والی قدیم کتابوں کا خزانہ جمع تھا۔ جسے ایک دن ان کی نصف بہتر نے تیلی دکھا کر بالن کی نذر کر دیا۔ اپنے اس عظیم نقصان پر دادا جتنا کف افسوس ملتے کم تھا۔ دادی کو پڑھی ہوئی کتابیں دوسرے معنوں میں ان کے نزدیک فارغ کتابوں کے جلائے جانے پر ان کے اس قدر جلال میں آنے کی توقع نہیں تھی اور دادا اپنی بے ادب زوجہ کو یہ سمجھانے سے قاصر رہے تھے کہ پڑھی ہوئی کتابوں کو دوبارہ پڑھنے جیسا لطف اور کسی چیز میں کہاں۔

زندگی کے آخری ایام میں بوجہ ضعیف العمری ان کا زیادہ تر وقت اپنے گھر کے باغیچے میں کتابوں کے مطالعہ میں گزر جاتا۔ تب ان کا حال "کتابیں دو' دعائیں لو" والا ہوتا تھا۔ وفات سے پہلے وہ اپنا "بچا کھچا دلی سرمایہ" اپنے گھر کی پہلی پوتی آپی نازیہ کے حوالے کر گئے تھے۔

اور نازیہ آپی.....

اپنا معصوم لڑکپن یاد کر کے دانت کچکچاؤں یا پاؤں پٹخوں۔ کسی جابر حکمران کی مانند ہم تینوں بہنوں کو اپنی کڑی نگرانی میں رکھا۔

"خبردار! جب تک میٹرک اچھے نمبروں سے پاس نہیں کرلو گی تب تک ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

ایک تو میٹرک پاس اور وہ بھی اچھے نمبروں سے؟ آہم۔

ونکہ مسکراتی کرنوں اور انٹرویوز وغیرہ کی آڑ میں چوری چھپے "اندرونی صفحات" پڑھنے کا چسکہ تو لگ ہی چکا تھا سو آپی کی مطلوبہ شرط پر پورا اترنے کے لیے میٹرک اچھے کیا بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔

البتہ آج تک دل سے یہ قلق نہیں گیا اگر آپی اپنی شرط میں تھوڑی سی نرمی برتتیں تو ہم بھی اس زمانے میں تہلکہ مچاتے ناولز "پیر کامل' رقص جنوں" سے لطف اندوز ہو جاتے۔

خیر! بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ آج جب اپنی آپی کے ساتھ اپنی کہانیوں کے آئیڈیاز ڈسکس کرتی ہوں تو گزرا وقت یاد کر کے بہت مزہ آتا ہے۔

"مجھ سے پہلے اس کار ہنر میں میری کزن باجی بے بی (فرحانہ ناز ملک) اور آپی (نازیہ جمال) اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔ میں نے ان دونوں سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا۔

میری وہ بے حد پیاری کزن جن کے حسن سیرت کی مثالیں دی جاتیں' جن کی خوبیوں کا شمار نا ممکن۔ ہمیں دائمی جدائی کے دکھ سے ہمکنار کر کے خود منوں مٹی اوڑھے سکون سے سو گئیں۔ ادب کا وہ روشن ستارہ ہماری یادوں کے فلک پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

خدا تعالیٰ اس اندوہناک حادثے میں شہید ہونے والی میری پیاری خالہ کو' شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والے خاور بھائی' ہمارے خاندان کی پہلی ڈاکٹر' ہمارا فخر' کرن اور باجی بے بی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

س "آپ کے گھر والے' خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

ج گھر والوں میں میری امی میری ہر تحریر بہت شوق سے پڑھتی ہیں اور ان کو ہر تحریر کا "ہیپی اینڈ" درکار ہوتا ہے۔ بھلے سے کہانی جتنی بھی "ٹریجک" ہو۔ "میرے اچھے چاند" ایک ہی نشست میں ختم کرنے کے بعد میری چھوٹی بہن سعدیہ نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔

س "اگر میں اوپر تمہارا نام نہ پڑھ چکی ہوتی تو یقیناً یہی سمجھتی کہ یہ ناول کسی بڑی رائٹر نے لکھا ہے۔"

("تحریلی میڈم! کیا میں اسے اپنی تعریف سمجھوں؟")

ج آپی نازیہ کی تعریف و تنقید میرے لیے اصلاح کا درجہ رکھتی ہے۔

س اور ہمارے گھر کی خاموش ریڈر ہماری بیوٹی کوئن (باجی آسیہ) سے جب بھی پوچھو یہی جواب ملتا ہے "ہاں وہ تو میں نے پڑھ لی تھی۔ اچھی تھی۔" اور بس!

س "زین العابدین کی ممانی لیں۔ تبصرے کے لیے اتنی کنجوسی چہ معنی دارد؟"

میری بہترین دوست انیس فاطمہ میری ہر تحریر پر بہت تسلی سے تبصرہ کرتی ہے اور مجھے اس کے تبصرے کا دل سے انتظار رہتا ہے۔

میرے شوہر حاجی طارق جدہ میں جاب کرتے ہیں۔ اپنی ٹف روٹین کی وجہ سے پڑھنے جیسے مشاغل کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔ یہ بات ان کے علم میں ہے کہ میں لکھتی ہوں۔ کیا لکھتی ہوں' اس بات سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ البتہ شادی کے مختصر عرصے بعد ان کا یہ کہنا "تمہیں لکھنے کے لیے صفحے وغیرہ لادوں؟" میرے لیے کسی حوصلہ افزائی سے کم نہیں۔

ہم دونوں بہنوں کے لکھنے میں ہمارے والد صاحب کی حوصلہ افزائی نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کے بارہا یاد دلانے کے باوجود میں نے انہیں آج تک اپنی کوئی تحریر پڑھنے کے لیے نہیں دی۔ "ابوجی! آپ کی خواہش سر آنکھوں پر! لیکن مجھے لگتا ہے میں ابھی اس معیار تک نہیں پہنچی کہ اپنا لکھا ہوا آپ کو پڑھنے کے لیے دوں۔"

کار جہاں دراز ہے۔ اسی تگ و دو میں ہوں کچھ ایسا لکھوں جسے فخریہ والد صاحب کو پڑھوا کر ان کی داد سمیٹوں۔

س "آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو؟ اب تک جو لکھا ہے۔ اس میں سے اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟"

ج "میرا تخلیقی سفر زیادہ طویل نہیں ہے۔ البتہ اپنی ہر تحریر کو مکمل کرنے کے بعد مجھے سکون ہی ملا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ لکھتے لکھتے خیالات کا تانا بانا تھوڑا سا الجھا اور میں سب کچھ سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میری فائل میں بے شمار ادھوری کہانیاں اپنے مکمل کیے جانے کی منتظر ہیں۔ ان گنت کردار مجسم ہو کر نگاہوں کے سامنے پھرتے ہیں۔ خیالات تصور کے پردے سے جھانکتے ہیں اور بے چین کر ڈالتے ہیں۔

"سرخ جوڑا" لکھ کر بہت اطمینان ملا تھا۔ "بارش کے ہاتھ میں پھول" عنوان سوچ کر کہانی لکھنا شروع کی تھی اور عنوان کے مطابق ہی اینڈ کیا۔

س "ہوئے تم مہربان؟" بہت انجوائے کرکے لکھا تھا۔ مجھے اپنی ہر وہ تحریر لکھتے ہوئے مزہ آتا ہے۔ جس میں بے ساختگی ہو۔

سسرال ماشاء اللہ بہت اچھا ملا ہے۔ بالکل بھی روایتی ماحول نہیں ہے۔ میری بڑی نند نوشین باجی اور خالہ (ساس) ہر ماہ باقاعدگی سے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ شاید ہی کسی نے ان کی طرح پڑھے ہوئے تمام ڈائجسٹ ترتیب اور احتیاط سے رکھے ہوں۔ پہلے امی اور اب خالہ لکھنے کے لیے بہت تعاون کرتی ہیں گو کہ پہلے بھی بہت جم کر نہیں لکھا لیکن شادی کے بعد تسلسل سے نہیں لکھ پا رہی تو اس کے پیچھے سراسر میری سستی اور تساہل پسندی کارفرما ہے (نجانے میں لکھنے کے معاملے میں اتنی کاہل کیوں ہو گئی ہوں؟)"

س "اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟"

ج "میں تقریباً" سب ہی مصنفین کو شوق سے پڑھتی ہوں۔

خامشی کو بیاں ملے

امت الصبور

مسرت الطاف احمد... کراچی

(1) ۔ میرا نام مسرت الطاف احمد ہے گھر میں مجھے عموماً "موسی (Musi) کہہ کر پکارا جاتا ہے اور اگر کچھ زیادہ ہی پیار آرہا ہو تو میں موسی سے موسو ہو جاتی ہوں۔ میری تاریخ پیدائش 4 مئی اور اسٹار ثور ہے۔ میں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے کی شدید خواہش ہونے کے باوجود ایم اے نہیں کر سکی کیونکہ یہ میرے اختیار میں ہی نہیں تھا۔ ہم پانچ بہنیں ہیں۔ بہنوں میں میرا پلس صائمہ کا نمبر دوسرا ہے۔ جی ہاں قارئین! سب سے مزے کی بات تو یہی ہے کہ ہم جڑواں ہیں۔ اس خوبی کی وجہ سے ہم کہیں بھی جاتے ہیں تو پسندیدگی اور حیرت و تجسس کی ملی جلی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں تو ہم اس سچویشن کو بہت انجوائے کرتے ہیں لیکن ہم دونوں کے عادات و اطوار ایک دوسرے سے ٹوٹلی ڈفرنٹ ہیں۔ میں مطالعے کی پاگل پن کی حد تک شوقین ہوں اچھی اچھی کتابیں پڑھنا اور لکھنا میرا واحد مشغلہ ہے جس سے اپنے آپ کو بہت فریش فیل کرتی ہوں۔ جب کہ صائمہ کتابیں اور دیگر رسائل دیکھ کر رفوچکر ہو جاتی ہے۔ ہم ساری بہنیں سارا وقت ہنسی مذاق اور مستی کرتے گزارتے ہیں۔ ایک دوسرے سے نوک جھونک بھی لگی رہتی ہے۔ خوب اودھم مچاتے ہیں اور ہمارے سوئیٹ سے بھانجے محمد راحیل اپنی شرارتوں اور بلیک میلنگ میں ہم سے بھی آگے پائے جاتے ہیں۔

گھر ہو یا خاندان اسکول ہو یا کالج ہر محفل کی جان ہوں۔ ہر محفل میں اپنے اسٹائل اعلیٰ ذوق اور اپنی شخصیت کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہوں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں ہر جگہ پیار ملا عزت و محبت ملی ہر وقت اپنے آپ کو بڑوں کی دعاؤں کے حصار میں

محسوس کرتی ہوں۔ پودوں کے ساتھ باتیں کرنا ان کی کیئر کرنا ان کے ساتھ وقت گزارنا بہت اچھا لگتا ہے۔ سردیوں میں آئس کریم کھانے کی دیوانی ہوں۔ شاعری سے بھی لگاؤ ہے کمپیوٹر پر بیٹھنا میوزک سننا لیکن سوفٹ سانگز بہت پسند ہیں ڈریس ڈیزائننگ بھی کرتی ہوں۔ فارغ اوقات میں میرے پاس کرنے کو

بہت کچھ ہوتا ہے میں کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ فارغ رہ ہی نہیں سکتی کیونکہ کہ اس سے پہلے کہ غم اور مایوسی ہمیں فنا کر دیں ہمیں اپنے آپ کو کام میں غرق کر دینا چاہیے۔ بقول شاعر

چراغ شب کو جیسے آندھیاں اچھی نہیں لگتیں
کچھ ایسے ہی ہمیں خوش فہمیاں اچھی نہیں لگتیں
آسماں کی بلندی تک پہنچائے گا میرا ہنر مجھ کو
مجھے قدموں کے نیچے سیڑھیاں اچھی نہیں لگتیں

(2) ۔ ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں تک میری خوبیوں اور خامیوں کا تعلق ہے تو بقول امی کے خامیوں میں ضدی طبیعت کی مالک ہوں۔ اگر کسی بات پر اڑ جاؤں تو خدا خیر کرے۔ بہت ہی حساس ہوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی ہوں اور خوبیوں میں کھانے پینے میں کوئی نخرہ نہیں کرتی کچھ بھی ہو کھا لیتی ہوں۔ پہننے اوڑھنے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ امی عموماً "بہنوں کے ساتھ مل کر میرے لیے بھی شاپنگ کر لیتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے میرے کپڑوں کی ڈیزائننگ بہت اسٹائلش ہوتی ہے سمیعہ کا کہنا ہے میری ایک عادت بہت بری ہے۔ میں جب بھی کسی سے ناراض ہوتی ہوں تو کبھی پہل نہیں کرتی اور خوبیوں میں سمیعہ کے نزدیک میں

ہمدرد ہوں' بہادر ہوں' پریشانیوں سے نہیں گھبراتی۔ بہت ہمت والی ہوں کیونکہ میرا اللہ سے رشتہ بہت گہرا اور مضبوط ہے' آزمائشوں سے کبھی مایوس نہیں ہوتی۔ میرا اللہ پر پختہ بھروسہ ہے۔

شکوہ کرتے نہیں تقدیر کا ہمت والے
خود بدل دیتے ہیں تقدیر مگر روتے نہیں

ندا کے نزدیک خامیوں میں اپنی فلینگز کسی سے شیئر نہیں کرتی بہت جلد بدگمان ہو جاتی ہوں اور خولی کیئرفل ہوں' ہر کسی کی ہیلپ کرتی ہوں۔ ام رباب کو میرا پنکچوئل ہونا بھی خامی لگتا ہے کیونکہ میں ہر کام ٹائم پر کرتی ہوں۔ اٹھنے کے ساتھ ہی اپنا شیڈول بناتی ہوں' کب کیا کرنا ہے۔ مجھے سست الوجود لوگ بالکل نہیں پسند۔ جب میں نے صائمہ سے اپنی خامی پوچھی تو اس کا چہرہ خوشی سے لال ٹماٹر جیسا ہو گیا۔ وہ تو جیسے پھٹ پڑی کانشس ہو' اگنور بہت کرتی ہو' موڈی ہو' کسی کو ایڈوائز نہیں دیتی (یہ صرف صائمہ کا نظریہ ہے)' میں جب بھی رسالہ پڑھنے میں مشغول ہوتی ہوں وہ جان بوجھ کر اسی وقت مشورہ لیتی ہے تاکہ میں ڈسٹرب ہو جاؤں اور خوبی میں بس اتنا کہا کچھ زیادہ ہی نفاست پسند ہوں' وہ بھی منہ بگاڑ کر۔ میرے نزدیک خامیوں میں' میں کافی حد تک شدت پسند ہوں۔ جن لوگوں کی باتیں چھید کر جائیں باوجود کوشش کے بھلا نہیں پائی اور خوبیوں میں کچھ کر دکھانے کی لگن ہے' مستقل مزاج ہوں' فرینڈلی ہوں' کوآپریٹو ہوں' ہر وقت ایکٹو رہتی ہوں اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا ضرور کرتی ہوں۔ اپنے رب سے باتیں کرنا مجھے اچھا لگتا ہے' مجھے مطلب پرست خود غرض لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ اپنے مزاج میں تبدیلی کی خواہاں ہوں کیونکہ مجھے بہتر سے بہترین بننا ہے' جب تک ہم خود اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لائیں گے ہماری محدود سوچ' رویہ اور ہمارا عمل تبدیل نہیں ہوگا۔ مثبت سوچ اور بلند خیالات غموں اور مایوسیوں کو ہم سے دور کر کے ہمارے لیے فتح اور کامیابی کے دروازے کھول دیتے ہیں' مثبت سوچ ہی ہماری زندگی کو خوب صورت بنا سکتی ہے۔ بقول شاعر:

شمع بجھ جائے تو جل سکتی ہے
کشتی ہر طوفاں سے نکل سکتی ہے
مایوس نہ ہو اپنے ارادے نہ بدل
کہ تقدیر کسی وقت بھی بدل سکتی ہے

(3) خواتین سے وابستگی کو پانچ سال ہو گئے اور یہ رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اس حسین سفر کی ابتداء کو یاد کرنے بیٹھی تو دل و دماغ مکمل طور پر ان پرانی اور خوشگوار یادوں میں ڈوب سے گئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل ہی اس محبت کے سفر کی پہلی سیڑھی پر میں نے قدم رکھا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور آج جب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ اس سفر کے دوران کئی قابل فخر لمحات آئے جس سے میری خود اعتمادی میں مزید اضافہ ہوا۔ خواتین ڈائجسٹ نے میری زندگی میں جو

مثبت تبدیلی پیدا کی ہے وہ قابل تعریف ہے بقول شاعر:

نہیں دیکھا تمہارے بعد کوئی دوسرا ہم نے
کہ آپ ہی اپنا جواب ہو تم
جیسے بھلا نہ سکے گا یہ سارا جہاں
وہی انمول شاہکار ہو تم

اس سے رشتہ اتنا خاص ہے کہ میرے ابو نہ صرف میری تحریریں خود پوسٹ کرتے ہیں بلکہ ایک ساتھ درجن بھر لفافے بھی لاتے ہیں۔ آج اگر میں اس محفل میں شرکت کر رہی ہوں تو میں اس کا کریڈٹ بھی اپنے پاپا کو دینا چاہوں گی۔

ایسی بہت سی تحریریں ہیں جو آج بھی خوب صورت یاد بن کر دل میں نقش ہیں اور برسوں ہمارے ذہنوں پہ حاوی رہیں گی فرحت اشتیاق کا ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بہت ہی متاثر کن اور دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ اب تک سکندر شہریار کے کردار کو بھلا نہیں پائی۔ سائرہ رضا کا ناول "یقین کامل ہی زندگی ہے" اس ناول نے بہت زیادہ انسپائر کیا 'موضوع بہت ہی اسٹرونگ تھا۔ میمونہ صدف کا ناول "نزبل" دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ حقیقت کے بہت ہی قریب تر محسوس ہوئی' اس ناول کے ہر جملے نے آنکھیں نم ہونے پر مجبور کریں تھیں۔ نمرہ احمد کا ناول "قراقرم کا تاج محل" اور "جنت کے پتے" بھی اپنی مثال آپ ہیں سحر ساجد کا ناول "پہلا اور آخری داؤ" دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا 'عنایا کا کردار بہت ہی زبردست تھا۔ سمیرا حمید کا ناول "خیال یار" فنٹاسٹک تحریر تھی' طرز تحریر بہت ہی اثر انگیز تھا اور لاسٹ میں عمیرہ احمد کا ناول "آب حیات" بہت ہی آؤٹ اسٹینڈنگ تحریر ہے۔ پر تجسس اور اٹریکٹو اور ایسی بہت سے تحریریں ہیں جو ہماری زندگی کی بھرپور اصلاح کرتی ہیں اور میں دل سے قدر دان ہوں ان رائٹرز کی جو اپنی خوب صورت کاوشوں سے اس کو سجاتی ہیں اور ہمارے لیے اتنی محنت اور دل جمعی سے لکھتی ہیں۔

بقول شاعر:

تو میری سانس کی ہر ڈور سے وابستہ ہے
اب مجھے چاہتے رہنے کے سوا کیا کرنا

(4) مجھے برتھ ڈے سلیبریٹ کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ بہت بار کالج میں فرینڈز کے ساتھ دھوم دھام سے برتھ ڈے سلیبریٹ کیا۔ سب فرینڈز کے گفٹس آج بھی میں نے بہت ہی سنبھال کے رکھے ہیں۔ ایک بار گھر والوں نے میرے اور صائمہ کے لیے سرپرائز برتھ ڈے ارینج کیا' ہم نے بہت انجوائے کیا۔ اس دن امی اسپیشل ڈش بناتی ہیں۔ ابو آئس کریم کیک ضرور لے کر آتے ہیں' وہ دن میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہوتا ہے۔

(5) شاعری سے کافی حد تک گہرا لگاؤ ہے۔ کیوں کہ یہ ہماری احساسات کی ترجمانی کرتی ہے' جب جذبوں کو لفظوں کا روپ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پسندیدہ شعر:

عزم انساں ہے کہ بن جائے فرشتہ لیکن
ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

(6) پسندیدہ اقتباس: ناول "یقین کامل ہی زندگی ہے" اس جملے نے مجھے بہت زیادہ انسپائر کیا:

"اللہ کی انصاف پسند نگاہ تمہارے اوزان پر تھی' تمہارا ایک پلڑا دعاؤں سے لدا پڑا تھا مگر جب تولا گیا تو دوسرے پلڑے میں موجود خدشات بھاری نکلے۔ جو دعا کرتا ہے وہ خدشہ نہیں پالتا۔ ہم دعا نہ بھی کریں مگر یقین کرلیں تو کامیابی قدم چومتی ہے۔" امامہ خان کے ناول "بت شکن" کا یہ جملہ بہت ہی متاثر کن لگا:

"دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں' ایک خود پرستی میں مبتلا' ایک خود ترسی میں' دونوں کیفیات انسان کو صرف "میں" تک محدود رکھتی ہیں۔ وہ صرف اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں' ایک ظالم تو دوسرا مظلوم بن کر تمام عمر اسی رنج میں گرفتار رہتا ہے کہ اسے اس کا حق نہیں ملا' یہ دونوں انسان کبھی خوش نہیں رہ پاتے۔ بے یقین' بے اعتبار ہی رہتے ہیں کسی نعمت کا شکر ادا بھی نہیں کر پاتے۔"

آخر میں بس یہ کہوں گی ہمیشہ خوش رہیں' اپنے لیے نہ سہی' دوسروں کے لیے' کیوں کہ شاید کسی کی زندگی کی امید تم سے وابستہ ہو۔



عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں ' جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص ـــ سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔



J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

تیرہویں قسط

وہ ٹی وی آن نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بے چینی کے باعث ٹی وی بند کر کے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں کروڑوں لوگوں کی طرح امامہ نے بھی ہوٹل کے کمرے میں سالار سکندر کو اس اسٹیج پر لاکھوں کے مجمع کے سامنے تقریر کا آغاز کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ وہ سرد اور تقریباً" بے حس و حرکت وجود کے ساتھ کسی بت کی طرح اس شخص کو ٹی وی پر دیکھ رہی تھی۔ گو اس کے وجود میں کہیں حرکت تھی تو اس کے دل کے دھڑکنے کی۔ جو اتنی بلند تھی کہ اس وقت اس کے پاس بیٹھا کوئی شخص بھی سن سکتا تھا یا پھر اس زبان پر اس شخص کی زندگی کے لیے کی جانے والی دعاؤں کی جنہیں اللہ سن رہا تھا۔

سالار سکندر نے زندگی میں بہت ساری تقریریں کی تھیں لیکن ان میں سے کوئی تقریر بھی لاکھوں کے ایک ایسے مجمع کے سامنے نہیں تھی جس سے وہ انسانی ہمدردی کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔

وہ Lingala (مقامی زبان) میں ان سے بات کر رہا تھا اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ ترجمہ ہو کر ٹی وی کی اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔ پوری دنیا میں کی جانے والی ٹی وی کوریج میں سواحلی اور لنگالا میں کی جانے والی 'وہاں کے مقامی لیڈرز کی ہر تقریر کو انگلش اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔ نہ امامہ کو اندازہ تھا اور نہ ہی سالار سکندر کو کہ وہ آج افریقہ کے اس سیاہ فام مجمع کے سامنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبہ کو دہرائے گا۔ وہ الفاظ جن کی باز گشت سے وہ ہمیشہ چھپتا رہا تھا وہ اس کے لاشعور سے تصور کا سفر طے کر کے زبان پر آ کر نہیں رکے تھے 'وہ لاکھوں کے اس مجمع کے سامنے ادا ہو کر کروڑوں لوگوں تک پہنچے تھے۔

اس نے بسم اللہ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا ہمیشہ کی طرح۔ اس نے مجمع کو قرآنی آیات سنائی تھیں۔ کہ عزت اور ذلت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے بعد اس نے سر اٹھا کر مجمع کو دیکھا تھا اور پھر جیسے اس کا ذہن خالی ہو گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ بھول گیا تھا کہ اسے وہاں کیا کہنا تھا۔ اس نے سر جھکا کر دوبارہ روسٹرم پر رکھے اس کاغذ پر نظر دوڑائی تھی جس پر اس نے اس تقریر کے نکات لکھے تھے۔ وہ ساری عمر صرف نکات نوٹ کر کے ہی تقریریں کرتا رہا تھا۔ اپنی یادداشت اور اپنے علم پر ایسا ہی اندھا یقین رکھتا تھا وہ اور اب وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ ہونقوں کی طرح اس مجمع کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اگلے الفاظ کے منتظر تھے۔ اس کے پچھلے الفاظ ان کے سر سے گزرے تھے۔ افریقہ کے وہ قبائل جو اس وقت وہاں اکٹھے تھے وہ آج بھی اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے، نہ ہی اللہ کے وجود کو پہچانتے اور مانتے تھے۔ وہ بہت سی دوسری چیزوں کو اعلاً 'برتر' مانتے تھے۔ ان کے لیے وہ رب (جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے) بھی اتنا ہی نا آشنا تھا جتنا وہ "رب جو عزت اور ذلت عطا کرنے پر قادر تھا۔" سالار سکندر کو اب ایسا اور کیا کہنا تھا جو سمجھ میں آتا اور بہت آسانی سے آتا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے آخری خطبہ یاد آیا تھا۔

"میں ایک ایسی آرگنائزیشن کا حصہ ہوں جس نے ماضی میں اس خطے اور آپ لوگوں کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ آپ لوگوں کو کمتر سمجھا گیا۔ آپ لوگوں کے حقوق چھینے گئے۔ آپ لوگوں کے وسائل اور اثاثوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔ میں اس سب کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں کیوں کہ میں ایک ایسے مذہب کو ماننے والا ہوں جو یہ سب "گناہ" قرار دیتا ہے۔ میں ایک ایسے مذہب کا ماننے والا ہوں جس کے پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) امانتوں میں خیانت سے منع کرتے تھے۔ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرنے کی تلقین کرتے تھے جو اپنے لیے۔ جنہوں نے بتایا "کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر برتری حاصل نہیں ہے۔" وہ انسانی مساوات کی بات کرتے تھے۔ ذات پات' رنگ و نسل' چھوت چھات کو نہیں مانتے تھے۔

سالار سکندر حافظ تھا' مبلغ نہیں تھا۔ مقرر تھا' مفسر نہیں تھا۔ زندگی میں اس نے کبھی اپنے پروفیشن میں مذہب کو لانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ آج بھی اس نیت سے وہاں نہیں آیا تھا پر اس وقت جو بھی اس کی زبان سے نکل رہا تھا وہ دل کی آواز تھی اور دلوں تک جا رہی تھی۔

افریقہ میں غیر انسانی حالات میں رہنے والا وہ سیاہ فام مجمع اس کی باتیں سن رہا تھا اور اب پہلی بار ساکت و صامت' خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور اس خاموشی کو ایک بے اختیار داد و تحسین نے توڑا تھا۔ یہ داد سالار سکندر کے جملے پر نہیں ملی تھی۔ یہ داد نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخر الزماں کے آخری خطبے کے ایک بنیادی فلسفے کو ملی تھی۔ وہ اللہ کا پیغام تھا جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے چودہ سو سال پہلے آیا تھا اور آج چودہ سو سال بعد بھی وہ پیغام دلوں کو تسخیر بھی کر رہا تھا' ان پر مرہم بھی رکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ پیغام انسانیت کے لیے تھا۔ قیامت تک کے لیے تھا۔ ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے لوگ اب بھی گنگ تھے۔ لاکھوں کا وہ مجمع اس آدمی کو اپنے رعب میں نہیں لے پایا تھا لیکن اس آدمی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اس لاکھوں کے مجمع کو جیسے اس کی مٹھی میں لے آئے تھے۔ سالار سکندر نے وہ اسم اعظم پڑھتے ہوئے افریقہ کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا جو چودہ سو سال پہلے بھیج دیا گیا تھا۔

امامہ بھی دم بخود تھی۔ وہ شخص کس جگہ کھڑا کیا دہرا رہا تھا اور اگر اسے اس آخری خطبہ کا یہ حصہ یاد تھا تو یہ کیسے ممکن تھا باقی حصہ یاد نہ ہوتا۔ اور یاد تھا تو اس لیے کہ وہ کہیں گزر گیا تھا۔

"یہ لوگ بابا کے لیے تالیاں کیوں بجا رہے ہیں؟"

وہ جبریل کے سوال پر جیسے چونک پڑی تھی' وہ اس کے پاس بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ امامہ صرف اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

تالیوں کی گونج اب تھم رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک بجتی رہی تھیں۔ اتنی دیر تک کہ سالار سکندر کو یاد آگیا تھا کہ اسے آج وہاں کیا کہنا تھا لیکن اب اپنے بھولے ہوئے الفاظ یاد آنے پر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ تاثیر اس میں تھی جو بھول کر یاد آیا تھا۔

"میں افریقہ میں اپنے مذہب کے ان ہی اصولوں اور اسی سوچ کے ساتھ کام کرنے آیا ہوں اور کام کروں گا اور میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ان اصولوں پر آپ لوگوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کر سکتا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن میں ان طاقتوں کے ہاتھ مضبوط نہیں کروں گا۔ جن کے خلاف پیٹرس ایباکا نے جنگ کی اور جن سے لڑتے ہوئے اس نے جان دی۔"

سالار سکندر کہہ رہا تھا۔

"لیکن ایباکا نے اپنی جان اس لیے قربان نہیں کی کہ وہ اپنے لوگوں کو بدترین حالات میں جیتا دیکھے۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے خواب دیکھتا تھا ایک اچھی زندگی کے خواب۔"

سالار سکندر اب انہیں ایباکا کی آخری ای میل سنا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں جب تم سے پہلی بار ملا تھا تو میں اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ ناامیدی اور مایوسی کے علاوہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا اور میں بہت کمزور تھا۔

میں ان دیوؤں کے سامنے واقعی ایک **مکھی** تھا جو میرے ملک کو لوٹنے آئے تھے اور میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا' اپنے لوگوں کے لیے اور پھر میں تم سے ملا اور مجھے لگا' مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔ ابھی امید زندہ ہے۔ تمہاری صورت میں۔ اور میں ٹھیک تھا میں نے امید نہیں چھوڑی۔ جنگ جاری رکھی اور میری امید مجھے یہاں

لے آئی کہ اب چند دنوں میں پوری دنیا کانگو کے بارے میں بات کرے گی۔ ہم چھوٹے کالے کالے بدصورت معمولی انسانوں کے بارے میں۔ جو دنیا میں مفتوح اور غلام بننے نہیں آئے۔ مجھے یقین ہے اب کانگو کی تاریخ بدلنے والی ہے۔ میرے لوگ اب ایک اچھی زندگی جئیں گے۔ انسانوں جیسی زندگی' جانوروں جیسی نہیں۔"

مجمع سالار سکندر کے ہر جملے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ ایباکا کی آخری ای میل نہیں جیسے آخری وصیت تھی جو صرف سالار سکندر کے پاس تھی۔

"اور ایباکا جو خواب کانگو کے لیے دیکھتا تھا وہ بھوک' جنگ اور بیماری کا خواب نہیں تھا وہ امن اور انسانیت پر یقین رکھتا تھا اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ امن ہی کی بات کرتا رہا اور یہ امن وہ اپنے لیے نہیں آپ لوگوں کے لیے چاہتا تھا' اپنے لوگوں کے لیے۔ ایباکا کو اس سے بڑا خراج تحسین آپ تب تک پیش نہیں کر سکیں گے جب تک اس کانگو کو ایک جدید' ترقی یافتہ قوم اور ملک نہ بنا دیں اور کانگو یہ کر سکتا ہے۔ ہم یہ کر سکتے ہیں اور میں اور میرا ادارہ' پیٹرس ایباکا کا یہ خواب پورا کرنے میں آپ لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ ہم جانے والے کل کو نہیں بدل سکتے۔ آنے والا کل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اکیسویں صدی کا کانگو' ایباکا جیسے اور بہت سے لیڈرز پیدا کرے۔ جو ترقی' امن اور کانگو کے بہتر مستقبل کا تصور لے کر آگے چلیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو جائیں۔ یہ میرا پیغام نہیں ہے یہ ایباکا کا پیغام ہے۔ جو کسی مذہب پر کاربند نہیں تھا لیکن اللہ کے وجود کو مانتا تھا اور یہ زمین اللہ کی ہے' اللہ کے بندوں کے لیے ہے۔ کسی غاصب کے لیے نہیں ہے۔ سامراج کے لیے نہیں ہے۔ آپ کے لیے ہے۔ کانگو کے لوگوں کے لیے ہے۔"

لاکھوں کا وہ مجمع جو چند لمحے پہلے تک ایک ناقابل تسخیر پہاڑ لگ رہا تھا اب تسخیر ہو چکا تھا۔ وہ سالار سکندر کے الفاظ پر رو رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر نعرے لگا رہا تھا۔

سالار سکندر اپنی تقریر ختم کر کے روسٹرم سے ہٹ چکا تھا۔ اس کے روسٹرم سے واپس اپنی نشست کی طرف جاتے ہوئے لاکھوں کا وہ مجمع سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ افریقہ' سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ وہ روسٹرم پر آیا بھی آوازوں کی گونج میں تھا' وہ وہاں سے واپس بھی آوازوں کی گونج میں ہی ہوا تھا لیکن اب ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ دس منٹ کی تقریر کے لیے گیا تھا اور آدھے گھنٹے کے بعد وہاں سے ہٹ سکا تھا۔ اور وہ اس کی زندگی کا طویل ترین آدھا گھنٹہ تھا' صرف اس ہی کی نہیں' امامہ کی زندگی کا بھی۔ آنسو صرف اس مجمع کی آنکھوں سے ہی رواں نہیں ہوئے تھے۔ امامہ کی آنکھوں سے بھی برسنے لگے تھے۔ وہ مجمع سالار سکندر کو اپنا نجات دہندہ کے طور پر دیکھتے ہوئے رو رہا تھا اور امامہ ہاشم اس "نجات دہندہ" کی جان ایک بار پھر بچ جانے پر۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں مما؟" جبریل نے کچھ پریشان ہو کر ماں کو دیکھا تھا جو پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ بھی بولے بغیر گم صم ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی' اس کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر اور اب ایک دم رونے لگی تھی۔ امامہ نے کچھ بھی کہے بغیر اسے لپٹا لیا۔ انسان روتا کیوں ہے؟ یہ آسان سوال کبھی کبھار الجبرا کا سوال بن جاتا ہے۔

وہ دس منٹ سالار کو جیسے شرم ساری کے سمندر میں ایک بار پھر غرق کر گئے تھے۔ وہ آج جس آخری خطبے کے الفاظ یاد آ جانے اور دہرا دینے پر اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ آخری خطبہ اس کے اپنے ضابطۂ حیات کی عکاسی کیوں نہیں کر پایا تھا۔ اس پر عمل اس کی زندگی کی ترجیحات میں کیوں شامل نہیں تھا۔ یاددہانی تھی جو اسے بار بار کرائی جا رہی تھی۔ تنبیہہ تھی جو اسے دی جا رہی تھی جو "ارادہ' نیت" تھا اسے "مشن" بنا دینے کے لیے یہ ضروری تھا۔ سالار سکندر ان دس منٹوں کے بعد اسٹیج پر گم صم بیٹھا رہا تھا۔ اس کی زبان پر اب بھی آیات تھیں' شکر کے الفاظ تھے۔ اس رب نے آج بھی ہمیشہ کی طرح اس کی عزت رکھی تھی۔ اس ذات نے اس حافظ قرآن کو دنیا کے سامنے رسوا نہیں کیا تھا اور اس احساس نے صرف تشکر ہی نہیں شرم ساری بھی بڑھائی تھی۔

"تمہیں پتا ہے تمہارے اندر خودکشی کرنے کی خواہش آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ جس طرح سترہ سال پہلے تھی۔"

سالار سکندر نے لیپ ٹاپ پر آخری ای میل کا جواب دیتے ہوئے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے امامہ کی آخری پھٹکار سنی۔ بچے سوچکے تھے اور وہ ہوٹل کی وارڈروب کھولے پتا نہیں کتنی بار اپنے اور اس کے کپڑوں کو تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ کبھی وارڈروب کے ایک خانے میں۔ پھر دوسرے خانے میں۔ پھر سے پہلے خانے میں۔ اور سالار یہ سب نوٹس کرنے کے باوجود لیپ ٹاپ پر ای میلز چیک کرنے اور اپنے اگلے دن کے شیڈول کو حتمی شکل دینے میں مصروف رہا تھا اور اب جب وہ اپنا کام نبٹا چکا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی اسے اندازہ تھا۔ جو کچھ آج ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کے ذہنی تناؤ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" سالار نے لیپ ٹاپ بند کر کے اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ دو گھنٹے پہلے ہوٹل واپس آیا تھا اور دو گھنٹے سے اپنا کام لیے بیٹھا تھا اور اب جب کام ختم ہو گیا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کی خاموشی اور بے اعتنائی کے مظاہرے پر اب تقریباً" روہانسی ہو چکی تھی۔

"تمہیں پتا ہے مجھے تمہاری کیوں ضرورت ہے اور میں کیوں فکرمند رہتی ہوں تمہارے بارے میں؟"

وہ اس کے اعتراف پر برہم ہوئی تھی اور بے حد خفگی سے ہاتھ میں پکڑی اس کی شرٹ تیسری بار تہہ کر کے رکھنے کے بجائے اسی طرح وارڈروب کے خانے میں ٹھونس کر اسے بند کرتے ہوئے سالار کے بیڈ سائیڈ کی طرف آئی تھی۔ "کیوں کہ بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ تم کوئی سپرمین نہیں ہو کہ وہ تمہارے کمالات دیکھ کر تالیاں بجائیں گے۔ لطف اندوز ہوں گے۔ تمہیں کچھ ہو گا تو۔"

وہ بات کرتے کرتے پھر روہانسی ہو گئی۔ بات مکمل نہیں کر سکی۔ وہ گہری خاموشی کے ساتھ اس کی بات سنتا رہا سر جھکا کر۔ پھر اس کے خاموش ہو جانے پر اس نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا۔ وہ اس کے بالمقابل کھڑی تھی اور وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں لگی ہوئی لائٹس کی زرد روشنی میں اس کی سرخ آنکھیں اور سرخ ناک اس کے روتے رہنے کو جیسے اور نمایاں کر رہی تھی۔ وہ ان ہی آنکھوں سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہ چہرہ اور آنکھیں تھیں جو اسے کھوجنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ بے بس کرنے کی اضافی خصوصیت کے ساتھ۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" جواب پہلے سے مدھم آواز میں آیا تھا اور وہی آیا تھا۔ وہ اور برہم ہوئی۔

"میں مذاق نہیں کر رہی۔" اسے لگا تھا جیسے وہ اسے ہمیشہ کی طرح زچ کر رہا تھا۔

"اب اگر تم نے ایک بار پھر یہ جملہ دہرایا تو میں اس کمرے سے چلی جاؤں گی۔ تمہیں میری ہر بات احمقانہ لگ رہی ہے۔"

"یو آر رائٹ۔" وہ اس بار زچ ہو کر جھلاتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔ پھر اس کے پاس بستر پر بیٹھ گئی۔

"آخری خطبہ سنا رہے تھے آج تو سارا سناتے۔ ادھوری بات کیوں کی۔" وہ اب اس پر طنز کر رہی تھی۔

"ہمت نہیں پڑی۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں تم جو بھی کہتی رہی ہو۔ ٹھیک کہتی رہی ہو۔ پہلے بھی۔ آج بھی۔"

وہ زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے ایسا اعتراف کر رہا تھا' امامہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ غصہ پہلے بھی نہیں تھا پر جو گلہ تھا وہ بھی یک دم غائب ہوا تھا۔

"پیٹرس ایباکا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک امن کے لیے لڑا۔ وہ نیویارک کی ایک سڑک پر اپنی جان بچانے کے لیے لڑتا رہا ان ہی طاقتوں کے 'ہرکاروں کے ساتھ جن کے ساتھ تم کھڑے ہو اور جن کے ساتھ تم مل کر افریقہ

کی تقدیر بدلنا چاہتے ہو۔"

اس نے سالار سکندر کو وہ آئینہ دکھایا تھا جو اسے صرف امامہ ہاشم ہی دکھا سکتی تھی۔ "تم سمجھتے ہو وہ تمہیں یہ سب کرنے دیں گے؟"

"تم سمجھتی ہو میں یہ سب کرنا چاہتا ہوں؟" اس نے جواباً "اس سے پوچھا تھا اسی انداز میں۔ وہ بول نہیں سکی۔ سوال عجیب تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر امامہ نے پوچھا۔

"پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے لیے ایک باعزت راستہ چاہتا ہوں۔ اپنے لیے' تمہارے لیے' اپنے بچوں کے لیے۔ جس جنجال میں میں اپنے آپ کو اور تم لوگوں کو پھنسا چکا ہوں اس سے نکلنا چاہتا ہوں لیکن میں ایک کنویں سے نکلنے کی کوشش میں کسی دوسرے کنویں میں کودنا نہیں چاہتا۔ جو اس سے زیادہ گہرا اور تاریک ہو۔"

وہ اس کا چہرہ حیرانی سے دیکھتی رہی۔ جس ایشو پر وہ بحث کرنا چاہتی تھی' وہ اس پر پہلے ہی گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اور وہ سمجھنا چاہتی تھی۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو سالار؟" وہ ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"میں پہلا اسلامی مالیاتی نظام بنانا چاہتا ہوں۔ جو سود سے پاک ہو لیکن جو پوری دنیا کے لیے ہو باضابطہ' قابل عمل اور جو اس کی جگہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔" جواب اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حیرانی سے سالار سکندر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ بول ہی نہیں سکی۔ وہ ہمیشہ عجیب باتیں کرتا تھا۔ وہ اب اس کی عادی ہو چکی تھی لیکن جو وہ اب کہہ رہا تھا وہ عجیب ترین تھا۔ وہ اس کی بہت ساری باتوں پر دم بخود ہوتی تھی۔ ہکا بکا بھی۔ لیکن آج اپنی خاموشی کو وہ کس کیفیت کا نام دیتی امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"تمہیں لگتا ہے میں نہیں کر پاؤں گا؟"

بہت دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہنے کے بعد اس خاموشی کو سالار نے توڑا تھا۔ اس نے جیسے امامہ کی کیفیت کو ہی الفاظ میں نہیں ڈھالا تھا بلکہ اس نے اپنے ہر خدشے کو بھی جیسے سوال میں بدل کر امامہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ سوال لاشعور سے آیا تھا۔ یقین سے نہیں اندیشے سے ابھرا تھا۔ جواب نہیں تسلی مانگ رہا تھا۔

"یہ کام دنیا میں اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف تم کر سکتے ہو سالار سکندر۔"

اس بار گنگ ہونے کی باری سالار کی تھی۔ یہ جواب نہیں تھا' وہ اعتماد تھا جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس کا خون بڑھا تھا اور سیروں کے حساب سے بڑھا تھا۔ اس نے امامہ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ اس کے جواب نے اسے تسلی اور دلاسے کی وہ تھپکی دی تھی جو اس کا بوجھ ہٹا گیا تھا۔

"تھینک یو۔" امامہ کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے سالار نے اپنا تشکر اس تک پہنچایا تھا۔ وہ غیر متوقع جواب تھا۔ شکریہ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی تھی امامہ کو۔ لیکن وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی یوں جیسے منتظر تھی کہ وہ کچھ اور کہے گا۔

"تمہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" بالآخر سالار نے کہا تھا' وہ ہنس پڑی یوں جیسے اس نے کوئی عجیب بات کہی تھی۔

"تم مشکلات کی بات مجھ سے کر رہے ہو سالار؟" سالار نے اسے دیکھا۔ انداز استہزائیہ تھا پر سوال نہیں تھا وہ۔

"زندگی میں بڑے برے دن گزارے ہیں میں نے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"لیکن وہ برے دن میری وجہ سے نہیں آئے تھے۔ اب شاید میری وجہ سے بھی آئیں۔ سب سے مشکل چیز

یہی ہے میرے لیے کہ جو کام میں کرنے جارہا ہوں۔ اس کے اثرات تم تک اور بچوں تک آئیں گے۔ واحد کمزور کرنے والی شے یہی ہے مجھے۔ اپنے آپ پر آنے والی مصیبتیں تو برداشت کرلیتا ہے انسان لیکن بیوی بچوں کو پہنچنے والی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔"

سالار کو یہ بات کرتے ہوئے وہ لمحات یاد آئے تھے جو اس نے واشنگٹن میں امامہ اور بچوں کی زندگی اور سلامتی کے لیے امید اور ناامیدی کے عالم میں گزارے تھے۔

"تم یہ مت سوچو۔ جو کرنا چاہتے ہو' وہ کرو۔ باقی دیکھا جائے گا۔ زندگی اس سے بدتر تو بہرحال نہیں ہوگی جیسی میں گزار آئی ہوں۔ باقی سب کچھ تو سہا جاسکتا ہے۔"

امامہ کو اس وقت یہ بات کرتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ جن مشکلات سے سالار خوف زدہ تھا یہ وہ مشکلات نہیں تھیں جن کا وہ سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی' وہ صرف مالی مسائل کے حوالے سے اسے متنبہ کررہا تھا۔

"میں سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ بچپن سے دنیا کی ہر نعمت ملی۔ روپیہ پیسہ کے بارے میں کبھی سوچنا نہیں پڑا۔ وہ وقت گزر گیا پھر ایک وقت آیا جب اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کرسکتی تھی۔ دوسروں کے سر پر محتاجی کی زندگی گزارنی پڑی۔ نوکری کرنا پڑی۔ ضروریات پوری ہوتی تھیں لیکن اپنی خواہشات اور آسائشات والی زندگی نہیں رہی تھی۔ وہ وقت بھی گزر گیا۔ پھر تمہارے ساتھ گزرے پچھلے سات سال میں دنیا کی ہر نعمت' ہر آسائش ملی۔ پہلے سے بڑھ کر' پہلے سے بہتر۔ میری توقعات اور سوچ سے بھی زیادہ۔ لیکن میں یہ کبھی نہیں بھولی کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ چیزوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی نہ کبھی مل جاتی ہیں صرف انسان ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ وہ نہیں ملتے۔" وہ بات کرتے ہوئے رنجیدہ ہوئی تھی۔ "تو جب تک بچے اور تم میرے پاس ہو باقی کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے مجھے۔ کم زیادہ۔ میں سب میں گزارہ کرسکتی ہوں۔"

اس نے سالار کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ اسے بولانا نہیں چاہتا تھا یہ کہ وہ اور بچے بھی کبھی اس سے چھن سکتے تھے۔ جیسے اس سے چھین لیے گئے تھے۔ اور ہر آزمائش مال سے شروع ہو کر مال پر ختم نہیں ہوجاتی۔ لیکن وہ امامہ سے ابھی کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم آج کا تناؤ بھرا دن اسے دینے کے بعد وہ اسے مزید کسی خدشے اور اندیشے میں مبتلا کرکے اس کو رات بھی سولی پر لٹکتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"تم یہ سب کیسے کروگے؟۔ کسی کے ساتھ مل کر؟" امامہ نے بالآخر ذہن میں ابھرنے والا وہ سوال اس سے پوچھا جو اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" جواب عجیب مسکراہٹ کے ساتھ آیا تھا اور بے چارگی والی ایک کیفیت کے ساتھ بھی۔ اور وہ ایک بار پھر اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی لیکن اسے یقین تھا۔ سالار سکندر اپنے لائحہ عمل کے بارے میں اتنا لاعلم نہیں تھا جتنا اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا تھا۔

"یہ کہونا کہ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"

"بتانے کا فائدہ نہیں۔ کم از کم اس اسٹیج پر جب ہر نکتہ صرف ایک خیال اور سوچ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

سالار نے کہا اور بات کرتے ہوئے پہلی بار اس کی نظر امامہ کے ہاتھ میں پہنی اس انگوٹھی پر پڑی تھی جو اس نے اسے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ وہ بے حد حیرانی کے عالم میں اس انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کچھ بولنا بھی بھول گیا تھا۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد اور ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد آج اتنے ہفتوں بعد وہ پہلی بار اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی دیکھ رہا تھا بلکہ اس کے جسم پر کوئی زیور دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ انگوٹھی بھی اس گھر میں موجود لاکر میں پڑے دوسرے زیورات کے ساتھ جل گئی تھی اس آتشزدگی میں اور اب اس جگمگاتی بیش قیمت

انگوٹھی کو اس کی مخروطی انگلی میں سجا دیکھ کر سالار سکندر کو ایک عجیب خوشی ہوئی تھی۔ ناقابل بیان خوشی۔ اس نے امامہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ کہاں سے آئی؟" گفتگو کا موضوع عجیب انداز میں بدلا تھا۔

امامہ ہنسی اور اس نے اس کی ہتھیلی پر ہی اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ بڑے جتانے والے انداز میں۔ اسے سالار کی خوشی اور کیفیت کا اندازہ تو نہیں ہوا تھا لیکن خود وہ اس انگوٹھی کو دیکھ کر کھل سی گئی تھی۔ اس گھر میں ضائع ہو جانے والے تمام زیورات میں اگر اسے کسی زیور کا غم تھا تو وہ یہ انگوٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ دیر سے ملا تھا لیکن منہ دکھائی کا تحفہ تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں جب جب وہ پہنی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ دیکھنے والے کو اپنی خوب صورتی سے مبہوت کر دیتی تھی۔ امامہ اس کی قدر تو جانتی تھی لیکن اس کی قیمت کا اندازہ آج بھی نہیں تھا۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ وہ بیش قیمت تھی کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی فنکشن میں اسے پہن کر گئی ہو اور کسی نہ کسی نے اسے سراہا نہ ہو۔ اسے داد نہ دی ہو اور اس انگوٹھی کی قیمت کا اندازہ نہ لگانے کی کوشش کی ہو۔ اس کا کھو جانا امامہ کے لیے عجیب کسک کا باعث بنا تھا۔ وہ اسے ہر وقت ہاتھ میں نہیں پہنے رکھتی تھی، کبھی پہنے رکھتی تھی۔ کبھی اتار دیتی تھی لیکن وہ جب بھی گھر میں زیور اتارتی تھی تو اسے لاکر میں ہی رکھتی تھی۔ یہ سالار کی ہدایت تھی۔ یہ کانگو تھا۔ ان کے ملازمین قابل اعتماد اور ایمان دار تھے اور چھان پھٹک کر رکھے گئے تھے لیکن وہ بے حد غریب تھے اور وہ زیورات کی شکل میں ان کے سامنے ترغیبات چھوڑ کر، ان کو آزما کر نقصان اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

حمین کی پیدائش کے بعد سالار کے واپس کانگو آنے پر امامہ کو پہلی بار اس انگوٹھی کا خیال آیا تھا، جب اسے بالآخر یہ پتا چل گیا تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں بچا سب کچھ جل گیا ہے یا لوٹ لیا گیا ہے۔ امریکن ایمبیسی کے اسپتال میں قیام کے دوران امامہ کو یہ یاد نہیں آیا تھا۔ اس نے آخری بار وہ انگوٹھی کب اتاری تھی۔ اس نے آخری بار اپنے گلے میں پہنی ہوئی چین کب اتاری تھی۔ اپنے بندے کب اتارے تھے۔ اس کا خیال تھا۔ یہ کام اس نے اسپتال چیک اپ کے لیے جانے سے پہلے کیا تھا۔ لیکن صرف خیال تھا، اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور وہ اس کی وجہ اینستھیزیا کو سمجھتی تھی جو اسے سرجری کے لیے دیا گیا تھا لیکن جو اس کی یادداشت کو گڑبڑانے کا باعث بن رہا تھا۔

لیکن آج سالار سکندر کے آنے سے دو گھنٹے پہلے پاکستان کے لیے پیکنگ کرتے ہوئے اس نے اپنا ہینڈ بیگ تبدیل کرنے کے لیے اس میں سے چیزیں نکال کر ایک نئے ہینڈ بیگ میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ وہ ہینڈ بیگ تھا جو اسپتال جانے سے لے کر اب تک اس کے زیر استعمال تھا اور اب کچھ دن پہلے بازار سے ایک ہینڈ بیگ خرید کردہ پرانے ہینڈ بیگ کے اندر موجود چھوٹی بڑی بہت ساری جیبوں کو کھنگال رہی تھی اور ان ہی چھوٹی بڑی جیبوں میں سے ایک جیب کے اندر وہ چھوٹا سا پاؤچ نکلا تھا اور اسے ہاتھ میں لیتے ہی چند لمحوں کے لیے امامہ کی سانس ہی رک گئی تھی۔ ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا تھا کہ اس نے اپنے جسم پر موجود زیور سرجری کے لیے تیار ہوتے ہوئے اتار کر اس بیگ میں رکھا تھا اور پھر یہ بیگ ہیڈی کو دے دیا تھا اور ان تمام ہفتوں میں اس بیگ کو اس نے کئی بار ضرورتاً "کھولا تھا لیکن کبھی بھی اس نے اسے کھنگالا نہیں تھا۔ شاید کھنگال لیتی اگر اس کی زندگی نارمل حالات سے گزر رہی ہوتی۔

ہاتھ سے پاؤچ کو ٹٹولتے ہوئے اس کے دل کی ـــــ دھڑکن خوشی سے بڑھی تھی اس کے اندر زیور تھا اور انگوٹھی بھی۔۔ وہ اس پورے دن کی ذہنی اذیت کو منٹوں میں غائب کر دینے والی خوشی تھی جو اس لمحے اس پاؤچ کو کھول کر اپنے ہاتھ میں اس انگوٹھی کو لے کر اس نے جو چیز محسوس کی تھی۔۔ اور وہ ہیڈی کی ایمان داری بھی تھی

جس نے کئی دن اس بیگ کو اپنے پاس رکھنے کے باوجود اسے ایک امانت کی طرح کسی خیانت کے بغیر امامہ کو لوٹایا تھا۔

وہ شکر کا ایک اور لمحہ تھا امامہ کے لیے، اس نے بھیگتی آنکھوں کے ساتھ اس انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں دوبارہ پہنا تھا، پھر سونے کی چین کو اور پھر ان کانوں کے بندوں کو اور وہ یہ سرپرائز سالار کو دینے سے پہلے ہی بھول گئی تھی اور اب سالار نے اس کے ایئر رنگز، اس کی چین کو نوٹس نہیں کیا تھا اور وہ اس انگوٹھی پر اٹک گیا تھا۔

"تم نے میرے ایئر رنگز اور چین نہیں دیکھی۔" وہ اب اسے وہ دونوں چیزیں بھی ہاتھ سے چھوتے ہوئے دکھا رہی تھی۔ کسی بچے کی طرح خوشی اور جوش سے 'اپنا کھویا ہوا کھلونا واپس اور غیر متوقع طور پر مل جانے پر۔

سالار نے مسکراتے ہوئے ان چیزوں کو دیکھا اور پھر امامہ کے یک دم سب کچھ بھول بھال کر جگمگا اٹھنے والے چہرے پر نظر ڈالی 'تینوں چیزوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ چین ڈاکٹر سبط علی کی دی ہوئی تھی' وہ ایئر رنگز امامہ کو شادی کے تحائف میں اس کے ساس سسر نے دیے تھے اور وہ انگوٹھی جو اس نے اسے دی تھی وہ؟ سکندر عثمان کی طرف سے جائیداد میں ملنے والے ایک پلاٹ کو بیچ کر خریدی گئی تھی۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی چیز سود اور حرام کے پیسے سے نہیں خریدی گئی تھی اور وہ سالار کی طرف سے ملنے والا واحد زیور تھا جو اس کی اپنی آمدنی سے نہیں خریدا گیا تھا۔ اور وہ زیور واپس آگیا تھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" امامہ نے اسے مخاطب کیا' وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس انگوٹھی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے چھوتے ہوئے جیسے چونکا تھا اپنی گہری سوچ سے۔۔۔ کچھ حقائق اور ان کا ادراک ایسا شرمسار اور نادم کرنے والا ہوتا ہے کہ انسان چاہتے ہوئے بھی انہیں کسی کے سامنے دہرا نہیں سکتا' وہ بھی اس وقت ایک بار پھر اسی لمحے سے گزرا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی کچھ خیال آیا تھا۔" سالار گہرا سانس لے کر بات ٹال گیا تھا۔

"اس انگوٹھی کی قیمت کیا ہے؟" پتا نہیں امامہ کو یک دم اس کی قیمت پوچھنے کا خیال کیوں آیا تھا۔

"یہ انمول ہے کیونکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" سالار نے اس کا ہاتھ چوما تھا اور وہی جواب دیا تھا جو پہلی بار اس انگوٹھی کو پہناتے ہوئے دیا تھا' وہ ہمیشہ کی طرح سرشار ہوئی تھی۔ یہ بہت دفعہ پیش کیا جانے والا "خراج تحسین" تھا لیکن ہمیشہ نیا لگتا تھا کیونکہ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔۔۔ یہ وہ سالار سکندر نہیں رہا تھا جو امامہ ہاشم کو سمجھ نہیں پاتا تھا اور اسے امامہ کی دل جوئی کرنے نہیں آتی تھی۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد وہ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے۔

"پیکنگ مکمل ہو گئی۔" سالار نے داد دینے کے ساتھ ہی اگلے کسی جملے سے بچنے کے لیے بات کا موضوع ہی بدل دیا تھا۔

"ہاں مکمل ہو گئی۔" امامہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تین دن کے بعد وہ پاکستان جا رہے تھے۔

"پیکنگ تھی ہی کیا اس بار۔۔۔ سب کچھ تو گھر میں ہی جل گیا۔۔۔ بس بچوں کی ضروری چیزیں ہیں جو خرید کر لائی ہوں یا اپنے کچھ کپڑے۔"

"تم کتنے دنوں کے لیے ٹھہرو گے وہاں؟" امامہ نے بات کرتے کرتے اس سے پوچھا۔

"ایک ہفتہ۔" سالار نے بستر پر لیٹتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"کیوں؟ تم ہمارے ساتھ وہاں زیادہ دن کیوں نہیں ٹھہرو گے؟" امامہ کو اعتراض ہوا۔

"ایک ہفتہ بھی بہت زیادہ ہے میرے لیے۔۔۔ کام کا ڈھیر ہے یہاں اور مجھے تمہارے واپس آنے سے پہلے گھر کا بھی بندوبست کرنا ہے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ایک ہفتہ کے بعد ہی واپس آجاؤں گی۔" امامہ نے کہا۔
"نہیں تم اب ایک ماہ کے بعد ہی واپس آؤ' تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ وہاں گھر کا ماحول تبدیل ہو گا تو تم بہتر محسوس کرو گی۔ یہاں بچوں کے ساتھ بہت پریشانی ہوتی ہے تمہیں۔" سالار نے اسے کہا تھا۔
"مجھے بچوں سے زیادہ تمہاری پریشانی ہوتی ہے۔" وہ ایک بار پھر وارڈ روب کے سامنے کھڑی تھی۔ سالار نے بستر پر لیٹے لیٹے اسے دیکھا۔ وہ وارڈ روب سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے انداز میں کچھ تھا جس نے سالار کو چونکایا تھا۔
"میری کیا پریشانی؟" اس نے پوچھا تھا۔
"پتا نہیں' بس مجھے ڈر لگتا ہے۔" اس نے آدھی بات کر کے وارڈ روب دوبارہ کھول لی اور ایک بار پھر الجھے انداز میں کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔
"کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟" سالار نے اسی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا' امامہ نے ویسے ہی کھڑے گردن موڑ کر اسے دیکھا "کس چیز سے ڈر لگتا ہو گا مجھے؟" وہ جیسے کسی سائیکاٹرسٹ سے اپنے مسئلے کا حل پوچھ رہی تھی۔
"میری موت سے۔" اور وہ سائیکاٹرسٹ بے حد بے رحم تھا۔
امامہ ہل نہیں سکی' اس نے جیسے نشتر اس کے جسم میں موجود ناسور کے اوپر سیدھا ہی مار دیا تھا۔ اس نے کتنے آرام سے جیسے پہیلی بوجھ لی تھی۔ وہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی یوں جیسے اب اس کے پاس کہنے کے لیے' بوجھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔
"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" سالار اس کی نظروں سے جیسے الجھا تھا۔
"تم بہت بے رحم ہو اور ہمیشہ سے ہو۔"
"تم نے سوال کیا تھا مجھ سے... میں نے تو صرف اندازہ لگایا... صحیح اندازہ لگایا ہے کیا؟" وہ جیسے داد چاہتا تھا۔
"اب تمہیں پتا چلا میں تم سے کیوں کہتی ہوں کہ تمہارے اندر آج بھی موت کشش رکھتی ہے۔" وہ جو کہنا چاہ رہی تھی وہ نہیں کہہ سکی اور جو کہہ رہی تھی اس کے غلط ہونے کا اسے اندازہ ہو گیا تھا۔
"موت سے کون فیسی نیٹ ہوتا ہے امامہ؟ کوئی پاگل ہی ہو گا جو ایسا سوچے گا اور ایک وقت میں' میں پاگل تھا... اب نہیں ہوں۔" وہ عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔
"اب بھی ہو۔" امامہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ہنسا تھا یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو...
"You are always right"۔ (تم ہمیشہ ٹھیک کہتی ہو)
اس کی ہنسی نے امامہ کو کم تپایا تھا اس کے جملے نے زیادہ... وہ وارڈ روب کو پوری قوت سے بند کرتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ اب اسے زچ کرے گا اور کرتا ہی جائے گا' یہ اس کا ذہنی تھکن اتارنے کا ایک طریقہ تھا... اسے زچ کرنا... اور وہ اس وقت اپنا دماغ خراب کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

کانگو کا بحران اور اس سے پہلے ہونے والے واقعات سی آئی اے کے لیے سالار سکندر کو اس لسٹ میں ڈالنے کا باعث بنا تھا جن پر باقاعدہ نظر رکھی جاتی تھی' وہ افریقہ میں اب ان کا (Key figure) سب سے اہم کارندہ تھا ان کے لیے کام کر رہا تھا لیکن ان کا ساتھی نہیں تھا۔ ان کے پے رول پر بھی نہیں تھا۔ وہ پہلی بار ایک عجیب و غریب کام میں حصہ دار بنے تھے shadow work partner دونوں ایک دوسرے سے بھی واقف تھے'

ایک دوسرے کے نام سے بھی اور ایک دوسرے کے کام سے بھی.... اس بات سے بھی کہ دوسرا اس بات سے واقف تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے' وہ مانیٹر کیا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ورلڈ بنک کی طرف سے دی جانے والی ٹاپ پروفیشنلز کی ٹیم بھی سی آئی اے کے انڈر کور ایجنٹس کی ہے اور ——— دونوں پارٹنرز اپنے سایئے کی موجودگی سے باخبر ہونے کے باوجود اپنا کام کررہے تھے.... اور کوئی کسی کو دھوکا دیے بغیر ایک دوسرے کا ساتھی بنا ہوا تھا۔ سی آئی اے سالار سکندر کی سیکیورٹی اور افریقہ میں ورلڈ بینک کے پروجیکٹس کو کامیاب بنانے کی ذمہ دار تھی اور وہ اس رول کو بخوبی انجام دے رہے تھے۔ سالار سکندر' ورلڈ بینک امریکی حکومت اور سی آئی اے کے لیے نعمت مترقبہ ثابت ہوا تھا.... اس نے کانگو اور افریقہ میں ایک بہت نازک صورت حال میں ان سب کو ایک بے حد شرم ناک اور خطرناک صورت حال سے نکالا تھا اور بے حد خوبی اور مہارت سے.... اس کی تقریر میں اپنے ہی ادارے کی اور سامراجی قوتوں پر کی جانے والی تنقید کسی کو بری نہیں لگی تھی۔ اگر صورت حال کنٹرول میں آجاتی تو وہ اس سے زیادہ گالیاں کھانے پر تیار تھے۔ لیکن اگر کوئی چیز سالار سکندر کی تقریر میں انہیں قابل اعتراض لگی تھی تو وہ اپنے مذہب اور پیغمبر کا حوالہ تھا۔ اس نے دین کو آدمیت اور انسانیت کے سیکولر لبادے میں ملفوف کر کے پیش نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے دین اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ذکر کیا تھا اور سالار سکندر ہمیشہ ایک لبرل سوچ رکھنے والا مسلمان سمجھا جاتا تھا.... بیٹھے بٹھائے اس کی ایک پبلک اسپیچ میں جھلکنے والی مذہبی "انتہا پرستی" ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے کو بھی قابل اعتراض لگی تھی۔

وہ افریقہ میں بے شک ان کے لیے سب سے اہم تھا لیکن کوئی اہم ترین شخص بھی "اسلامی سوچ" کے پرچار کے لیے ورلڈ بینک کا عہدہ استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ نارمل حالات ہوتے تو وہ تقریر سالار سکندر سے استعفے کے لیے بے حد مضبوط وجہ تھی لیکن یہ نارمل حالات نہیں تھے.... ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے نے بھی سالار سکندر کی اس تقریر سے نظریں چرا کر بظاہر اس کی پردہ پوشی کی تھی لیکن درپردہ میڈیا میں اپنے صحافیوں کے ذریعے سالار سکندر کو اس تقریر میں مذہبی حوالہ دینے کے لیے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ سلسلہ براہ راست کوریج کے فوراً" بعد ہی شروع کردیا گیا تھا۔ امریکہ اور سی آئی اے کو کانگو اور افریقہ میں ہرکارہ چاہیے تھا۔ مسیحا اور ریڈر نہیں.... وہ ہر شخص کو اس کی اوقات میں رکھنا جانتے تھے اور اب اس پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ چینلز پر سالار سکندر کی اس تقریر کو موضوع بحث لانے والوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے بہت سے دوسرے پوائنٹس کو بھی زیر بحث لانا شروع کردیا تھا۔ ایک نئی چیخ و پکار سالار سکندر کی مذہبی شناخت مذہبی اعتقادات اور اعمال کے حوالے سے شروع کردی گئی تھی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ایک بنیادی حصہ سود کے خلاف ان کے احکامات بھی تھے جنہیں مغربی میڈیا نے بہت نمایاں انداز میں پیش کیا تھا کیونکہ وہ انہیں مغربی نظام معیشت کی بنیادوں کو چیلنج کرنے والی سوچ اور فلاسفی لگی تھی' وہ یہ بات علی الاعلان نہیں کہہ پارہے تھے کہ وہ مغربی نہیں' سودی نظام معیشت کو چیلنج کرنے والی فلاسفی تھی۔

سالار سکندر کے خلاف مغربی میڈیا میں اٹھنے والا یہ طوفان اسے افریقہ میں اور مشہور کررہا تھا.... اور سالار سکندر نے مغربی میڈیا پر اپنی اس تقریر کے حوالے سے کوئی وضاحتیں ... صفائیاں اور معذرتیں پیش نہیں کی تھیں۔ اس کے آفس کا خیال تھا کہ اس تقریر کے اقتباسات کو کچھ ہلکا کرکے نئے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا جائے۔

سالار نے کسی بہانے 'معذرت' وضاحت اور سیاق و سباق کو اپنی اس تقریر کے لیے پیش کرنے سے انکار کردیا تھا.... اس کے آفس نے دو دن بعد ایک سطری بیان جاری کیا تھا کہ سالار سکندر اپنی اس تقریر کے ہر جملے اور لفظ پر یقین رکھتے ہوئے اس کی ذمہ داری لیتے ہیں اور اسے مکمل طور پر قبول کرتے ہیں۔"

یہ جیسے اس میڈیا کے منہ پر مارا جانے والا طمانچہ تھا جو اس کی طرف سے اس تنقید کے بعد کسی وضاحتی بیان اور معذرت کا منتظر تھا۔

وہ ورلڈ بینک کا پہلا بنیاد پرست نائب صدر قرار دیا گیا تھا۔ سی آئی اے کو سالار سکندر کو مانیٹر کرتے ہوئے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی اسلامی مالیاتی نظام کو قائم کرنے کی بات کر رہا تھا جو سود سے پاک ہوتا... ان کے لیے یہ پریشان کن بات نہیں تھی... سالار سکندر ورلڈ بینک کے ساتھ منسلک رہتے ہوئے عملی طور پر ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا... اور جو خواب وہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کو وہ ایک خیالی پلاؤ سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے اگر کوئی بات پریشان کن تھی تو وہ سالار سکندر کا یک دم سامنے آنے والا مذہبی شخص تھا جو ان کے نزدیک افریقہ جیسی حساس جگہ پر ان کے لیے پریشانیاں کھڑی کرنے کا باعث ہو سکتا تھا... ضروری ہو گیا تھا کہ سالار سکندر کو صرف افریقہ ہی میں نہیں' ہر جگہ ہی مانیٹر کیا جائے اور سی آئی اے نے یہی کیا تھا... اس کی سرگرمیاں سی آئی اے کے ریکارڈ کا حصہ بن رہی تھیں... اور پہلی غیر معمولی سرگرمی جو سی آئی اے نے ریکارڈ کی تھی وہ ایبا کا کی تدفین کے تین ہفتے بعد مسقط میں سالار سکندر کی سمندر میں ایک لانچ پر پانچ لوگوں سے ایک ملاقات تھی' جس میں سے ایک مسقط کی رائل فیملی سے تھا... بظاہر اس ملاقات کو ایک گیٹ ٹوگیدر سمجھا جا سکتا تھا۔ سالار سمیت وہ پانچوں پرانے شناسا اور دوست تھے۔ ایک ہی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ مختلف قومیتوں اور پروفیشنز سے تعلق رکھتے تھے... اور اپنی اپنی فیلڈ کے نامور لوگ تھے اور ان میں سے کسی کا بھی کانگو اور افریقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا سوائے سالار سکندر کے... نہ کانگو اور افریقہ سے تعلق تھا نہ ہی ورلڈ بینک سے لیکن اس کے باوجود ان سب میں کچھ باتیں مشترک تھیں... وہ سب سالار سکندر کے ہم عمر تھے... صرف ایک شخص مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس کے علاوہ باقی سب مختلف قومیت رکھنے کے باوجود امریکن شہریت رکھتے تھے اور مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھنے والا شخص بھی اس وقت امریکہ ہی میں مقیم تھا... وہ سب دنیا کے 100 انڈر 40 گلوبل لیڈرز کی فہرست میں شامل تھے جن کے بارے میں یہ پیش گوئی تھی کہ وہ دس سال بعد دنیا کے ممتاز ترین لیڈرز میں سے ہوں گے... ان میں سے کوئی بھی بات سی آئی اے کے لیے پریشان یا تشویش کن نہیں تھی سوائے ایک آخری مماثلت کے 'سالار سمیت وہ پانچ کے پانچ افراد مسلمان تھے... اور باعمل مسلمان تھے اور قرآن پاک کے حافظ تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ پاکستان میں امامہ کے قیام کا تیسرا ہفتہ تھا... وہ شروع کے دو ہفتے لاہور میں ڈاکٹر سبط علی اور سعیدہ اماں کے پاس گزار کر اب باقی دو ہفتے اسلام آباد رہنے آئی تھی۔ زندگی اب یوں بھاگم دوڑ میں گزر رہی تھی کہ اسے اس "برابر والے گھر" کو دیکھ کر بار بار اداس ہونا بھی یاد نہیں رہا تھا... وہ گھر بک چکا تھا۔ امامہ جانتی تھی اور اس کے کھلے کشادہ لان پر اب مزید تعمیرات ہو چکی تھیں۔ گھر کا نقشہ بھی کچھ کا کچھ کر دیا تھا اس کے نئے مکینوں نے... اور اب سکندر عثمان کے گھر سے شاپنگ کے لیے بار بار باہر آتے جاتے اس گھر کو دیکھ کر وہ نظریں چرا لیتی تھی۔ وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی نہ ماضی کے اس حصے میں دوبارہ جانا چاہتی تھی جو کسی دلدل کی طرح اسے اندر ہی اندر کھینچنے لگتا تھا۔ اور نظریں چرانا آسان ان تین نعمتوں کی وجہ سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی تھیں... جبریل' عنایہ اور حمین نے جیسے اس کی زندگی کو ماضی سے نکال کر مستقبل میں بھیج دیا تھا... ان کے وجود سے وابستہ مصروفیات نے اس کی زندگی کی رفتار کو بے حد تیز کر دیا تھا... سوچنے اور یادوں میں بھٹکنے کا وقت نہیں رہا تھا اس کے پاس... اور یہ بھی جیسے ایک نعمت تھی اس کے لیے۔

سکندر عثمان اور طیبہ اب وہاں اکیلے رہتے تھے... طیبہ وقتاً" فوقتاً" اپنے سب بیٹوں کے پاس دوسرے ملکوں میں آتی جاتی رہتی تھیں لیکن ان کا زیادہ تر وقت اسلام آباد میں ہی گزرتا تھا... امامہ اور اس کے بچوں نے سکندر عثمان اور ان کی روٹین کی زندگی کو اسی طرح توڑا تھا جیسے ان کے باقی بچوں کا اپنی فیملیز کے ساتھ آنا توڑتا تھا۔

سالار پاکستان امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ ان کی فلائٹ اسلام آباد ہی کی تھی۔ دو تین دن امامہ اس کے ساتھ وہاں رہتی پھر اس کے ساتھ لاہور چلی جاتی اور پھر وہاں سعیدہ اماں اور ڈاکٹر سبط علی کے پاس کچھ دن گزار کر واپس اسلام آباد آجاتی اور پھر وہیں سے واپس کانگو چلا جانا تھا اسے...

وہ وہاں ان کی آمد کا دوسرا دن تھا جب سالار نے اسے امریکہ میں اپنے کسی پرانے دوست کے بارے میں بتایا تھا جو اب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان میں مقیم تھا اور سالار سکندر سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے مبارک باد دینے کے لیے... سالار اپنے پرسنل وزٹ پر تھا لیکن اس ایک ہفتے میں بھی اسے مسلسل بہت سے سرکاری عہدے داران اور احباب سے ملنا تھا جو اس کو ورلڈ بینک کی نائب صدارت سنبھالنے پر ابھی تک ذاتی طور پر مل کر مبارکباد نہیں دے سکے تھے۔

کئی سالوں بعد سعد اپنی فیملی کے ساتھ سالار سے ملنے اس کے گھر آیا تھا اور سالار فوری طور پر اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا... وہ مکمل طور پر باریش تھا۔ اور اس کی داڑھی اسی فی صد سفید ہو چکی تھی جسے رنگنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ وہ بے حد مہنگے برانڈڈ شلوار قمیض میں ملبوس تھا لیکن شلوار اس کے ٹخنوں سے اوپر تھی... وہ فربہی مائل تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کھانے پینے کا شوقین تھا اور ایکسرسائز سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ نقاب لیے ہوئے اس کی بیوی ایک آٹھ سالہ بچہ اور دو چھوٹی بچیاں تھیں۔

وہ اور اس کی بیوی سالار اور امامہ سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔ امامہ جانتی تھی سعد سالار کے شناساؤں میں سے تھا قریبی دوستوں میں سے نہیں لیکن اس کے باوجود سعد اپنی گپ شپ اور بلند و بانگ قہقہوں کے دوران سالار کے اس کے ساتھ امریکہ میں گزرے ہوئے وقت کے بارے میں ایسے ایسے قصے نکال کر سناتا رہا جیسے وہ اور سالار بہترین اور بے حد گہرے دوست رہے تھے... یار غار قسم کے دوست۔

"مجھے تو ہمیشہ سے ہی اندازہ تھا کہ سالار بڑی ترقی کرنے والا تھا بس ذرا قبلہ خراب تھا اس کا... وہ میں کھینچ کھینچ کر ٹھیک کرتا رہتا تھا۔"

چائے پینے کے دوران اس نے امامہ پر جیسے ایک انکشاف کیا۔ سالار اور امامہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گئے۔

"اور اب دیکھیں بھابھی! کیسا بدلا ہے؟ میری کوششیں کیسا رنگ لائی ہیں۔" سعد کہہ رہا تھا سالار نے اپنا کپ رکھتے ہوئے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن تم بالکل نہیں بدلے... میری کوششیں کوئی رنگ نہیں لا سکیں اس کا مجھے بڑا افسوس ہے۔" سالار نے جتانے والے انداز میں کہا۔ سعد نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"ارے ہم پر کہاں کسی کا رنگ چڑھنا تھا۔ ہم پر تو اپنا ہی رنگ بڑا پکا تھا۔ بھابھی یہ آپ کا شوہر نائٹ کلبز اور ڈسکوز کا بڑا شوقین تھا... مجھے بھی کھینچ کھینچ کر لے جانے کی کوشش کرتا رہتا تھا... نت نئی لڑکیوں سے دوستی تھی اس کی... بڑی رنگین زندگی گزاری ہے اس نے۔"

سالار نے سعد کے بارے میں ٹھیک کہا تھا وہ نہیں بدلا تھا... بیشتر لوگ خود کو بہترین مسلمان ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے ہر عیب اور خامی کو دکھانے اور جتانے کی وبا میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا اسلام انہیں صرف مقابلہ اور موازنہ سکھاتا ہے... پردہ پوشی نہیں... وہ کسی انسان کے حال اور کامیابیوں پر اسے مبارک باد تو دے

سکتے ہیں اس پر رشک بھی کر سکتے ہیں۔ اسے اپنا دوست کہنے پر فخر بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کے ماضی کے سابقوں اور لاحقوں کو بھلائے بغیر... دل آزاری اور دل شکنی ان کے اسلامی گناہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہوتے... سعد بھی یہی کر رہا تھا... وہ اپنی بیوی کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کتنے "نیک" شخص کی بیوی تھی جو دنیاوی کامیابیوں میں سالار سکندر سے پیچھے ہو سکتا تھا لیکن مومن تھا اور روحانی' دینی اور اخلاقی اعتبار سے اس سے بے حد بہتر تھا۔

احساس کمتری کی یہ ایک بے حد بھیانک شکل ہوتی ہے' جس میں کوئی شخص یہ بھی طے نہیں کرپاتا کہ اسے دوست کے ساتھ دوستی کرنی ہے یا دشمنی۔

سعد اب اپنے انکشاف سے جیسے خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے اپنی پلیٹ میں ایک نیا کباب لیتے ہوئے ہنس رہا تھا امامہ کا چہرہ پھیکا پڑا تھا... بہت سے انکشافات کسی کے لیے بھی بے تاثر اور بے اثر نہیں ہو سکتے۔ وہ بھی جب کوئی انکشاف اس طرح کھلے عام اتنے توہین آمیز انداز میں کیا گیا ہو۔

"بھابھی! بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سعد... میری کافی رنگ برنگی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن سعد کو صرف ایک ہی رنگ کی لڑکی پسند تھی اور میں ذرا شوقین مزاج تھا... ڈسکوز اور نائٹ کلبز آتا جاتا رہتا تھا ان لڑکیوں کے ساتھ لیکن سعد ظاہر ہے میرے جیسا شوقین مزاج نہیں تھا' اس لیے وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گھر پر ہی رہنا پسند کرتا تھا۔"

کباب تو سعد نے پلیٹ میں رکھ لیا تھا لیکن پلیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے ہی بچی تھی۔ سالار سکندر نے کئی سالوں کے بعد ایسی کم ظرفی اور بے لحاظی کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کا ایک زمانے میں شناختی نشان تھا اور اسے سعد کے تین کم سن بچوں اور بیوی کے سامنے اس گھٹیا پن کا مظاہرہ کرنے پر خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن سعد کے کسی اور ممکنہ تمغۂ امتیاز کو اپنے سینے پر سجانے سے روکنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی حفاظتی اقدام کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیا نام تھا اس کا... ہاں اسٹیفنی... اب تو علیک سلیک ہی رہ گئی ہوگی یا وہ بھی نہیں ہے؟" اس کی یادداشت سفاکانہ حد تک تیز تھی اور اس وقت اس نے سعد کا قتل ہی کر دیا تھا... سعد کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔ سالار یک دم اس طرح گفتگو کرنے لگا تھا جیسے وہ کسی بار یا پارک میں اکیلے بیٹھے تھے اور ان کے آس پاس کسی دوسرے شخص کا کوئی وجود نہیں تھا... اس سب کی ابتدا سعد نے کی تھی لیکن انتہا اب سالار کر رہا تھا۔ سعد جواب کیا دیتا' اس کا تو سانس لینا بھی محال ہو گیا تھا۔

امامہ اس کی بیوی کے تاثرات دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا لیکن اس کی آنکھیں یہ جتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ سالار کے انکشافات سے خوش نہیں ہوئی تھی۔ خود امامہ کو بھی سالار کا یہ جوابی وار کچھ زیادہ نہیں بھایا تھا۔

"بھابھی! آپ کچھ لیں۔" اس نے صورت حال کو سنبھالنے کی بروقت کوشش کرتے ہوئے سعد کی بیوی' عالیہ کی توجہ اس گفتگو سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں' بچے اور یہ لے رہے ہیں بس' کافی ہے۔ ہم کچھ دیر پہلے ہی کسی لنچ سے آئے ہیں تو مجھے بالکل طلب نہیں ہے۔"

امامہ کو عالیہ کا لہجہ بے حد کھردرا لگا تھا۔ وہ سعد کی طرح باتونی نہیں تھی یا پھر شاید سالار کے وہاں بیٹھے ہونے کی وجہ سے اور سعد کے اس سے مسلسل باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے اسے زیادہ بولنے کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔

"آپ تو ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتیں نا؟" کیا سوال تھا جو سعد کی بیوی کی زبان سے امامہ کے لیے نکلا تھا...

کمرے میں یک دم خاموشی نہیں 'سکتہ چھایا تھا۔ وہ تجسس نہیں تھا' جوابی وار تھا۔۔۔ سعد سے نہیں آیا تھا اس بار اس کی بیوی سے آیا تھا۔

"نہیں الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔" چائے کا کپ ہونٹوں سے ہٹا کر امامہ نے بے حد مشکل سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ بعض لاحقے کبھی سابقے نہیں بنتے۔۔۔ وہ بھی ایک ایسا ہی حصہ تھا اس کی زندگی کا۔۔۔ جس کا تعارف اس کا رنگ پھیکا کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

"اوہ اچھا۔۔۔ مجھے انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا۔" وہ اسی بے نیازی سے سعد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ "تو بھابھی! آپ پھر کوئی ادارہ جوائن کریں نا۔۔۔ آپ کو تو بہت زیادہ اصلاح اور علم کی ضرورت ہوگی۔ جب تک آپ پاکستان میں ہیں' آپ میرے ساتھ ایک مدرسے میں چلیں۔ وہاں درس قرآن بھی ہوتا ہے اور آپ کی روحانی اور اخلاقی تربیت۔۔۔"

"آپ کا بہت شکریہ لیکن مجھے اسلام قبول کیے اور قادیانیت چھوڑے سولہ' سترہ سال ہو چکے ہیں اور میں ایک حافظ قرآن کی بیوی ہوں۔" امامہ نے اس کی بات بڑی نرمی سے کاٹی تھی۔

"وہ تو میں بھی ہوں۔" عالیہ نے اسی انداز میں کہا "لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کو نہیں پڑا ہوگا مجھے پڑا ہے۔"

"بھابھی! آپ کو اس حوالے سے جب بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑے ہم حاضر ہیں۔ اب میل جول تو ہوتا ہی رہے گا۔۔۔ میں ان شاء اللہ اس سال وقت نکال کر تبلیغ کے لیے کچھ دنوں کے لیے کانگو بھی آؤں گا تو آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ ویسے بھی اچھا رہے گا اگر ہمارے بچے آپس میں ملتے جلتے رہیں۔" سعد نے اپنی طرف سے بروقت موقع پر مداخلت کرتے ہوئے گفتگو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"جی بھابھی! ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔ ہمارے بچوں کو آپس میں ملتے رہنا چاہیے اور ہمیں بھی۔۔۔ بہت سی چیزوں میں آپ کو اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہوئے ہماری رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔" عالیہ نے اپنے شوہر کی گفتگو کو مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی تو میں اور امامہ ضرور آپ سے رہنمائی لینے کی کوشش کریں گے لیکن فی الحال مجھے لگتا ہے ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑ رہی۔"

اس بار سالار نے اس گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے جیسے ایک فل اسٹاپ لگانے کی کوشش کی تھی۔

"یار! بچے کہاں ہیں تمہارے؟ تم ان سے تو ملواتے ہمیں چاہ رہا تھا احسن اور جبریل بھی آپس میں متعارف ہو جاتے۔"

سعد' سالار کو کم از کم اس حد تک ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے لہجے کی بے رخی اور بے اعتنائی کو پہچان لیتا اور وہ اس نے پہچان لی تھی اور ایک بار پھر اس نے بات بدل کر ماحول کو خوشگوار کرنے کی کوشش کی تھی۔

"جی جی ضرور' بچے ابھی لا ہی رہا ہوگا ملازم۔ باہر لان میں کھیل رہے تھے۔۔۔" امامہ نے سعد کی اس کوشش کو کامیاب کرنے میں ساتھ دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہاں کوئی اور بات ہوتی۔ ملازم کے ساتھ عنایہ اور جبریل کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ سعد نے بڑی گرم جوشی سے ان دونوں کو پیار کیا تھا پھر جبریل اور احسن کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ چار ساڑھے چار کا جبریل اور سات آٹھ سال کے احسن سعد کی وہ پہلی ملاقات تھی لیکن وہ آخری ملاقات نہیں تھی۔۔۔

وہ دونوں ایک جیسے تھے۔ مزاجاً" کم گو۔۔۔ ریزروڈ بہت تمیزدار۔۔۔ جبریل احسن سے عمر میں بہت چھوٹا ہونے کے باوجود اچھا قد کاٹھ رکھتا تھا اور دیکھنے میں ان کے درمیان عمر کا فرق اتنا نمایاں نہیں تھا۔۔۔ چھ سالہ آسیہ اور چار سالہ

مروہ ٔحسن کی نسبت اتنی ریزرو ڈ نہیں تھیں۔
وہ لوگ آدھ گھنٹہ اور بیٹھے تھے اور پھر انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر چلے گئے تھے۔ وہ ایک یادگار اور خوشگوار ملاقات نہیں تھی لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی ہر ملاقات ایسا ہی تاثر لیے ہوئے رہنے والی تھی۔

سعد اور عالیہ کے جانے کے بعد سالار اور امامہ نے اس ملاقات کے دوران ہونے والے انکشافات کو دہرایا تھا نہ ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ ان کا خیال تھا وہ ان کی زندگی میں صرف شناساؤں کی کٹیگری میں رہنے والے لوگ تھے۔ ان کا حلقہ احباب بننے والے نہیں تھے۔۔۔ انہیں اس وقت یہ اندازہ بالکل نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں خاندان ایک عجیب و غریب رشتے میں جڑنے والے تھے۔

✲ ✲ ✲

سالار ایک ہفتے کے بعد واپس کانگو چلا گیا تھا اور امامہ اسلام آباد سے لاہور' سالار کے ساتھ آئی تھی پھر وہیں اگلے دو ہفتے رہی تھی۔ کچھ دن ڈاکٹر سبط علی کے پاس اور کچھ دن سعیدہ اماں کے پاس۔۔۔ جو ان ہی دنوں پاکستان آئی ہوئی تھیں۔
وہاں سے واپس اسلام آباد آنے پر امامہ اور بچوں کو سکندر عثمان اور طیبہ کے ساتھ بہت سا وقت گزارنے کو ملا تھا اور اس کے واپس جانے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا' جب سکندر عثمان نے بڑے غور و خوض کے بعد اس کو ہاشم مبین کے بارے میں بتایا تھا۔
"وہ کئی دفعہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تمہارا نمبر لینے کے لیے۔۔۔ یا تمہارا ایڈریس لینے کے لیے لیکن میں اتنی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا کہ تمہارا اور ان کا رابطہ کرواتا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا تم پھر پریشان ہو۔۔۔"
سکندر عثمان اسی سے کہہ رہے تھے۔
"لیکن مجھے لگا میں بہت زیادتی کروں گا تمہارے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی۔۔۔ اگر میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کروں۔"
وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی "وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"
"یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا۔" سکندر عثمان نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا تھا۔ اس کے حلق میں جیسے پھندا لگا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا لیکن اسے تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کے ماں باپ بھی ہیں۔۔۔ زندگی کے سولہ سترہ سال اس نے ان کے بغیر گزارے تھے۔۔۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی۔۔۔ وہ آج بھی ان سے محبت کرتی تھی۔ آج بھی ان کے بارے میں جذباتی تھی۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں نے سب بدل دیا تھا۔۔۔ وسیم کی موت نے۔۔۔ جبریل اور عنایہ اور حمین نے۔۔۔ اور سالار نے۔
"اب ملنے کا فائدہ نہیں ہے۔"
اس نے سر جھکا کر سکندر عثمان سے کہا اور اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ان سے ملنے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ تو صرف اپنے خاندان سے ملنے کے لیے منتیں ہی کرتی رہی تھی۔ انکار تو ہمیشہ دوسری طرف سے ہوتا تھا۔۔۔ آج پہلی دفعہ وہ انکار کر رہی تھی۔۔۔ کچھ نہ کچھ بدلا تھا امامہ میں۔۔۔ یا پھر سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔
"ماں باپ کے بارے میں ہم فائدے اور نقصان بھی نہیں سوچتے۔۔۔ صرف حق اور فرض سوچتے ہیں۔"
سکندر عثمان نے ایک بار پھر بڑی رسانیت سے اس سے کہا تھا۔ انہوں نے اس بار بھی ٹھیک کہا تھا۔ سر جھکائے وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر جیسے ماضی کو ایک فلم کے فلیش بیک کی طرح گزرتے دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور وہ

یہ فلم اتنی بار دیکھ چکی تھی کہ اب وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی' وہ اپنی یادداشت کے اس حصے کو ہی جیسے کاٹ کر خود سے الگ کر دینا چاہتی تھی۔

"پاپا میں اب اس معلق پل پر نہیں جھول سکتی۔ میرے بچے ہیں اب میں اپنی ذہنی الجھنیں ان تک منتقل نہیں کرنا چاہتی۔ میں بہت خوش اور پُر سکون ہوں اپنی زندگی میں.... بس ایسے ہی رہنا چاہتی ہوں.... کسی لعنت ملامت کا بوجھ میں نہیں اٹھا سکتی اب.... کسی معافی تلافی کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے اب.... جو گزر گیا۔ بس گزر گیا۔ میں واپس پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی۔"

وہ سکندر عثمان سے کہہ رہی تھی اور اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں کب برسنا شروع ہوئی تھیں۔

"امامہ! وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔" وہ جامد ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا رد عمل دے' خوش ہو؟ وہ خوش تھی.... رو پڑے؟ وہ پہلے ہی رو رہی تھی۔ اللہ کا شکر ادا کرے؟ وہ ہمیشہ کرتی رہتی تھی۔

"وہ مسلمان نہ بھی ہوتے تب بھی میں تمہیں کہتا تم ان سے مل لو.... ہم سب بہت خامیوں والے انسان ہیں.. غلطیاں گناہ سب کرتے رہتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہی ہیں.... کچھ خوبیوں میں اچھے.... کچھ خامیوں میں برے... لیکن سب سے بہتر شاید وہ ہوتا ہے جو در گزر کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو.... اور بعض گناہوں کی سزا جب اللہ دے دیتا ہے تو پھر ہمیں نہیں دینی چاہیے۔"

سکندر عثمان نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ اس کے اندر کی کیفیت سے بے خبر تھے.... ہوتے تو یہ سب نہ کہتے.... سوال معافی کا تو تھا ہی نہیں.... اولاد اور ماں باپ کا تعلق معافی پر تو کبھی کھڑا کیا ہی نہیں جا سکتا.... گلے شکوے کا وقت بھی اب گزر چکا تھا.... وہ ان کا سامنا اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اپنے وجود کو بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اس نے بے حد مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹا تھا.... سالار کے لیے' اپنے بچوں کے لیے' اپنے گھر کے لیے۔

اس نے سکندر عثمان سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ اگلے دن ہاشم مبین سے ملنے پر بھی تیار ہو گئی تھی لیکن وہ اس رات سو نہیں سکی تھی۔ کچھ لوگوں کے روبرو ہونے کے لیے آپ ساری عمر ترستے رہتے ہیں اور پھر جب ان کا ہونا طے پا جاتا ہے تو سمجھ نہیں آتا انسان ان کا سامنا کرے گا کیسے۔

آج سے کچھ سال پہلے ہاشم مبین نے یہ کام کیا ہوتا تو اس وقت وہ ساتویں آسمان پر ہوتی۔ اپنے خاندان کو اپنے دین پر لے آنے' گمراہی کے راستے سے پلٹ آنے کے لیے اس نے بڑے سال دعائیں مانگی تھیں.... اور اس خاندان کا معزول سربراہ اب جب تائب ہو گیا تھا تو امامہ اپنے دل کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

وہ اگلی سہ پہر آئے تھے.... وہ کمرے میں آئی تو باپ پر پہلی نظر ڈالتے ہی رو پڑی تھی نہ رونے کا تہیہ کیے ہوئے بھی.... وہ بے حد ضعیف لگ رہے تھے۔ یہ تنتنے والا وہ وجود نہیں تھا جس سے وہ ساری عمر ڈرتی رہی تھی۔

ہاشم مبین نے اسے گلے لگایا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بھی بڑے حوصلے سے ان سے مل کر الگ ہوئی تھی' پہلے کی طرح۔ عادتاً" ان سے لپٹی نہیں رہی تھی اور پھر وہ آمنے سامنے دو صوفوں پر بیٹھ گئے تھے.... اس کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا.... وہ دونوں تھے اور طویل گہری خاموشی تھی.... پھر اس خاموشی کو ہاشم مبین کی ہچکیوں اور سسکیوں نے توڑا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی اب بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

امامہ انہیں چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی تھی' وہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے برسنے والے آنسو اس کی ٹھوڑی سے ٹپکتے ہوئے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

"وقت واقعی بڑا ظالم ہوتا ہے.... مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا۔ میں نے بہت ظلم کیا اپنے آپ پر.... اپنے

خاندان پر، پتا نہیں کیسے ہو گیا یہ سب کچھ؟"

ہاشم مبین روتے ہوئے اعتراف کر رہے تھے اور امامہ کو یاد آیا تھا انہوں نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جارہی تھی وہ اس پر بہت پچھتائے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ واپس پلٹ کر ان سے معافی مانگنے آئے گی۔ اور تب وہ اسے معاف نہیں کریں گے.... وقت واقعی بڑا بے رحم اور ظالم ہوتا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھ کر بچوں کی طرح روتا ہوا یہ بوڑھا شخص اس کا اپنا باپ نہ ہوتا تو وہ آج بہت فخر محسوس کرتی کہ اس کا سر نیچا نہیں ہوا تھا۔ کسی اور کا ہوا تھا پر سارا دکھ یہی تھا کہ اس کا باپ اگر اپنے کیے کی سزا پا رہا تھا تو بھی تکلیف اسی کو ہو رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے امامہ! مجھے تمہاری بددعا لگ گئی۔" ہاشم مبین نے روتے ہوئے کہا۔

"مجھے کبھی بددعا کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ابو.... آپ کے لیے کیا، کسی کے لیے بھی۔"

اس نے بالآخر ہاشم مبین سے کہا تھا.... وہ آج اس تنتنے کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے تو وہ انہیں کہتی کہ انہیں اس کی بددعا نہیں لگی۔ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کی سزا ملی ہے.... وہ رتبہ جو اللہ تعالیٰ نے صرف انہیں عطا کیا تھا اس رتبے کو کسی اور کو دے دینے کا خمیازہ بھگت رہا تھا ان کا خاندان، وہ صرف قادیانی نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس مذہب کی تبلیغ بھی پوری جانفشانی سے کی تھی.... پتا نہیں کتنوں کو گمراہ کیا تھا اور اس گمراہی کے بدلے میں کتنوں کی عاقبت خراب کی تھی ورنہ ان کے خاندان میں بھی یہ تو نہیں ہوا تھا جو ان کے ساتھ ہو رہا تھا.... وہ کروڑ پتی تھے اور ساری عمر آسائشوں میں گزارنے کے بعد وہ اپنا بڑھاپا اولڈ ہوم میں گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے.... ان کے خاندان میں پہلی بار کوئی ایسے بے گھر، بے در ہوا تھا۔ لیکن ان کے خاندان میں گمراہی کی روایت بھی ہاشم مبین ہی کی قائم کردہ تھی۔

"آپ نے دیر سے کیا لیکن صحیح اور اچھا فیصلہ کیا۔" یہ ایک جملہ کہتے ہوئے امامہ کو بے حد تکلیف ہوئی تھی اسے وسیم یاد آیا تھا۔ سعد یاد آیا تھا۔ اسے اپنا وہ خاندان یاد آیا تھا جو سارے کا سارا غیر مسلم تھا اور غیر مسلم ہی رہنے والا تھا.... واپس تو یا وہ پلٹی تھی یا ہاشم مبین۔

"تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں بہت وقت لگا دیا میں نے تمہارے سامنے آنے میں.... لیکن بس معافی مانگنا چاہتا تھا تم سے اور تمہاری ایک امانت تھی میرے پاس.... وہ مرنے سے پہلے تمہیں دے دینا چاہتا تھا۔"

"ہاشم مبین نے بالآخر اپنی ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو پا لیا تھا۔ وہ اب اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اسے دے رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے لفافہ تھامے بغیر ان سے پوچھا تھا۔ "جائیداد میں تمہارا حصہ.... اسی حصے کے لیے تمہارے بھائیوں کو خفا کر دیا ہے میں نے.... وہ یہ بھی لے لینا چاہتے تھے مجھ سے.... لیکن میں تمہاری چیز انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ ساری عمر تمہیں کچھ نہیں دے سکا.... کچھ تو دینا چاہتا تھا تمہیں مرنے سے پہلے۔"

وہ ان کی بات پر رو پڑی تھی۔ ابو اس کی ضرورت نہیں تھی مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے میں اسے لے کر کیا کروں گی.... اگر میرے بھائیوں کو میرا حصہ دے دینے سے ان کی زندگی میں آپ کے لیے کوئی گنجائش نکلتی ہے تو آپ یہ انہیں دے دیں۔"

ہاشم مبین نے بے حد مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "میں ان کے لیے اب "غیر مسلم" ہوں امامہ.... وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال کر پھینک چکے ہیں جیسے کبھی میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔" وہ شکست خوردہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

"پھر آپ میرے حصے کو بیچ کر اپنے لیے کوئی گھر لے لیں۔۔۔ کوئی جگہ۔۔۔ میرے پاس اب سب کچھ ہے۔ آپ کا کوئی روپیہ پیسہ اب میری ضرورت نہیں رہا۔" امامہ نے وہ لفافہ پکڑ کر ان کے بیگ میں واپس رکھ دیا تھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟" انہوں نے رنجیدگی سے کہا۔

میں آپ کو معاف کرنے نہ کرنے والی کون ہوتی ہوں ابو۔۔۔ یہ فیصلہ تو آپ کے لیے اللہ کو کرنا ہے۔۔۔ میں تو صرف یہ دعا کر سکتی ہوں کہ اللہ آپ کو معاف کر دے۔۔۔ بڑی معافی تو وہاں سے آنی چاہیے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھے رہے پھر انہوں نے کہا۔

"تم ہم سے ملتی رہو گی نا؟" عجیب آس اور حسرت تھی۔ امامہ نے سر ہلا دیا تھا۔۔۔ ماں باپ کا یہ حال اسے دل گرفتہ کیے ہوئے تھا۔۔۔ ہاشم مبین کے چہرے پر اس ملاقات کے دوران پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

"میں جائیداد کا یہ حصہ تمہارے بچوں کے نام کر دیتا ہوں امامہ۔"

"ابو میں آپ کی جائیداد اور روپے پیسے میں سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔ میں لوں گی بھی تو سالار واپس کر دے گا۔" اس نے ہاشم مبین سے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

ہاشم مبین کچھ دیر بیٹھ کر پھر اسے ساتھ لے کر اس کی ماں سے ملوانے گئے تھے۔ سکندر عثمان اور ان کی بیوی بھی ساتھ گئے تھے۔۔۔ وہ ایک اور جذباتی ملاقات تھی۔

"تم اب بہت بہادر ہو گئی ہو۔" اس رات سالار نے اس سے کہا تھا۔ اس نے اپنے دن کی روداد سنائی تھی فون پہ۔

"کیسے؟" وہ اس کے تبصرے پر حیران ہوئی تھی۔ "تم آج ایک بار بھی روئی نہیں مجھے اپنے پیرنٹس سے ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے۔" وہ چپ رہی پھر اس نے سالار سے کہا۔

"آج ایک اور بوجھ میرے کندھوں اور دل سے ہٹ گیا ہے۔۔۔ بہت دیر سے ہی سہی لیکن اللہ تعالیٰ نے گمراہی سے نکال ہی لیا ہے میرے ماں باپ کو۔۔۔ دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ سالار! دیر سے ہی سہی پر قبول ہو جاتی ہیں۔"

امامہ کے لہجے میں ایک عجیب طمانیت تھی جسے سالار نے ہزاروں میل دور بیٹھے بھی محسوس کیا تھا۔

"تمہاری ہو جاتی ہیں۔" اس نے مدھم آواز میں امامہ سے کہا۔

"کیا تمہاری نہیں ہوتیں؟" اس نے جواباً پوچھا۔

"میری بھی ہوتی ہیں لیکن تمہاری زیادہ ہوتی ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"الحمدللہ۔" امامہ نے جواباً کہا۔ وہ ہنس پڑا۔ "تم میرے پیرنٹس کو اولڈ ہوم سے نکال کر ایک گھر لے دو سالار۔۔۔ ان کے پاس میرے لیے جائیداد کا جو حصہ ہے اسے بیچ کر۔۔۔ بے شک کوئی چھوٹا گھر ہو لیکن انہیں وہاں اولڈ ہوم میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"میں بابا سے کہہ دوں گا وہ کر دیں گے یہ کام۔۔۔ ان کا خیال بھی رکھیں گے۔ تم اگر اسلام آباد میں مستقل رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو امامہ۔۔۔ تم اور بچے وہاں۔۔۔"

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "میں یہاں مستقل نہیں رہنا چاہتی۔۔۔ میں تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں اور واپس آرہی ہوں اسی تاریخ کو۔"

✵ ✵ ✵

سی آئی اے نے سالار سکندر کی اس سرگرمی کو صرف مانیٹر اور ریکارڈ نہیں کیا تھا انہوں نے اس ملاقات میں شامل پانچوں افراد کو بھی اپنی واچ لسٹ میں ڈال لیا تھا۔ اگلے آنے والے مہینوں میں سالار سکندر اور ان پانچ افراد

کے بہت سارے تفریحی دورے ہوتے رہے تھے۔۔۔ لیکن اب سی آئی اے صرف سالار سکندر کی نہیں ان پانچ افراد کی نقل و حرکت کو بھی مانیٹر کر رہی تھی۔۔۔ ایک عجیب پراسرار نیٹ ورک کام کر رہا تھا۔۔۔ وہ پانچ افراد سالار سکندر سے صرف چند ماہ اچانک ملتے رہے تھے لیکن اس کے بعد سالار سکندر کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ پانچ افراد اب آپس میں بھی نہیں مل رہے تھے لیکن وہ پانچ افراد انفرادی طور پر ایسی ہی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ پیٹرن وہی تھا' چار پانچ اپنی اپنی فیلڈ کے ممتاز ترین لوگ۔۔۔ لیکن دنیا کے مختلف ممالک میں۔۔۔ سب ہی ایک ہی عمر کے دائرے میں اور سب ہی امریکن نیشنل۔۔۔ اور پھر یہ مماثلتیں ایک جگہ جاکر مرکوز ہو جاتی تھیں' وہ سب بھی مسلمان تھے۔۔۔ ان میں کچھ حفاظ تھے۔ کچھ نہیں تھے لیکن وہ سب باعمل مسلمان تھے۔

وہ ایک اسلامی مالیاتی سسٹم پر کام کر رہے تھے اور یہ سی آئی اے جانتی تھی لیکن اس نظام کی شکل کیا تھی۔ خدوخال کیا تھے۔ وہ اسے بوجھنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے اور اس کی وجہ صرف ایک تھی۔۔۔ ایک **جگسا** پزل کی طرح اس نظام سے منسلک ہونے والے سب افراد کے پاس اس کا ایک ایک ٹکڑا تھا۔۔۔ اور وہ اس ٹکڑے کو اچھی طرح سمجھتا اور جانتا تھا لیکن وہ ٹکڑا اس تصویر میں کہاں لگتا تھا' یہ صرف ایک شخص جانتا تھا۔۔۔ سالار سکندر۔

☆ ☆ ☆

"ممی! حمین کب بڑا ہو گا؟" اس دن جبریل نے اپنی آرٹ بک میں کچھ بناتے ہوئے امامہ سے پوچھا جو روتے بلکتے حمین کو ہمیشہ کی طرح تھپک تھپک کر خاموش کرنے اور کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں بے حال ہو رہی تھی اور اس کی یہ حالت جبریل اور عنایہ بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ مہینے پہلے کانگو میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے۔ اس ہوٹل میں دو تین مہینے رہنے کے بعد۔

"بڑا تو ہو گیا ہے۔" امامہ نے اس کے سوال اور انداز پر غور کیے بغیر کہا۔

"تو پھر روتا کیوں رہتا ہے؟" امامہ بے چارگی سے اپنے بڑے بیٹے کو دیکھ کر رہ گئی۔
"آپ اس سے پوچھ لیں کہ اس کو کیا چاہیے۔" وہ امامہ کو جیسے مسئلے کا حل بتا رہا تھا۔
"میں پوچھ نہیں سکتی اور وہ بتا نہیں سکتا۔" امامہ اب بھی اسے اٹھائے لاؤنج میں ٹہلتے ہوئی اسے تھپک رہی تھی اور وہ اسی طرح روتے ہوئے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مچل رہا تھا۔ وہ اسے نیچے بٹھا دیتی تو وہ گود میں اٹھائے جانے کے لیے ہاتھ بلند کر کر کے دھاڑیں مارتا۔۔۔ اور یہ ڈرل دن میں دو تین بار کا معمول تھا۔۔۔ رونا حمین سکندر کا من پسند۔ مشغلہ تھا۔ وہ بغیر آنسوؤں کے گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا اور پھر رونے کے بیچوں بیچ کوئی بھی دلچسپ چیز نظر آنے پر یک دم رونا بند کر کے اس کا جائزہ لینے میں مصروف ہو جاتا اور جب اس کام سے فارغ ہو جاتا تو ایک بار پھر اپنے رونے کے سلسلے کو وہیں سے جاری کرتا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔
سات آٹھ ماہ کی عمر میں ہی اس نے بیک وقت چار دانت نکالنے شروع کر لیے تھے جو خرگوش کے دانتوں کی طرح اس کے منہ کے درمیان میں تھے اور اس کے رونے اور ہنسنے پر نظر آتے تھے۔
"اس کو جلدی کس بات کی ہے؟" بیک وقت چار دانتوں کو نکلتے دیکھ کر سالار نے کہا تھا۔ جبریل اور وہ حمین سکندر کے بارے میں ایک جیسے تاثرات اور خیالات رکھتے تھے۔
"یہ تم خود اس سے پوچھ لو۔" امامہ نے جواب دیا تھا۔
حمین کو پالنا اس کے پہلے دو بچوں کی نسبت زیادہ تھکانے اور آزمانے والا کام ثابت ہو رہا تھا۔ حمین سکندر ان چار دانتوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے بھی صرف بڑوں کے کھانے والی ہر اس چیز میں دلچسپی محسوس کرتا تھا جو چٹخارے دالی ہوتیں۔۔۔ اپنے پوپلے منہ کے ساتھ بھی چپس اس کی پسندیدہ خوراک تھی جسے وہ صرف چبا نہیں نگل بھی سکتا تھا۔۔۔ وہ چپس کا پیکٹ تک پہچانتا تھا اور ایسا ممکن نہیں تھا کہ جبریل اور عنایہ اس کے قریب بیٹھ کر کوئی چیز اطمینان سے اسے کھلائے بغیر خود کھا لیتے۔
وہ ایک عجیب و غریب بچہ تھا۔۔۔ اور یہ بیان اس کے بارے میں سالار سکندر نے دیا تھا جس کا خیال تھا اس نے ایسی مخلوق کبھی نہیں دیکھی۔
سکندر عثمان نے اس سے کہا تھا "میں نے دیکھی ہے۔ وہ تمہاری کاپی ہے۔"
"یہ زیادتی ہے۔" سالار نے ان کی بات پر احتجاج کیا تھا وہ اور طیبہ ان لوگوں کے پاس کانگو آئے ہوئے تھے جب وہ دونوں حمین سکندر کے ہاتھوں بننے والی ان کی درگت دیکھ رہے تھے۔ وہ تب دس ماہ کا تھا اور سب سے پہلے جو لفظ اس نے بولنا شروع کیا تھا وہ "سالا" تھا اور ہر بار سالار کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے حد خوشی سے ہاتھ پاؤں مارتا سالا' سالا چلاتے ہوئے اس کی طرف جانے کی کوشش کرتا تھا۔
یہ پہلا لفظ تھا جو اس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ جبریل اور عنایہ کی طرح وہ بھی جلدی بولنا سیکھ رہا تھا۔ اس میں چیزوں کی شناخت اور پہچان کی صلاحیت بھی ان ہی دونوں کی طرح منفرد تھی لیکن اس کی بولنے کی صلاحیت ان دونوں سے بھی اچھی تھی

"بیٹا بابا!" پہلی بار سالار کے لیے وہ لفظ سن کر ہنسی سے بے حال ہونے کے باوجود امامہ نے اس لفظ کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سالار پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے توڑ توڑ کر سکھا رہی تھی۔۔۔ با۔۔۔ با"
"سالا۔" حمین نے ماں کی محنت پر پانی پھیرتے ہوئے سالار کے لیے وہی لفظ استعمال کیا جو وہ سالار کے لیے ماں کو پکارتے سنتا تھا۔

"تم اسے بابا مت سکھاؤ' صرف رلگوا دو میرے نام کے ساتھ' یہ بھی غنیمت ہوگا میرے لیے۔"
سالار نے اسے مشورہ دیا تھا۔۔۔ وہ بہرحال کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوا تھا اس طرز تخاطب سے جو سکندر عثمان اور طیبہ کے لیے ایک تفریح بن گئی تھی۔
اور پانچ سالہ جبریل بدھا کے سے تحمل اور دانائی کے ساتھ اپنے اس اکلوتے چھوٹے بھائی کو دیکھتا رہتا تھا جس نے ان کے گھر کے امن اور سکون کو پچھلے تقریباً" ایک سال سے تہ و بالا کر کے رکھا ہوا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا حمین بڑا ہو جائے اور چلنا شروع ہو جائے تو ٹھیک ہو جائے گا لیکن جب بالآخر اس نے چلنا شروع کیا تو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس "مسئلے" کا غلط "حل" تھا۔
حمین سکندر کو پیر نہیں پر مل گئے تھے۔۔۔ اور وہ اب کہیں بھی جا سکتا تھا اور کہیں سے مراد "کہیں" بھی تھا۔ اور اس کی فیورٹ جگہ باتھ روم تھی۔ وہ بھی وہاں اس وقت جانا پسند کرتا تھا جب جبریل اسے باتھ روم میں جاتا دکھائی دیتا۔۔۔ اور جبریل نے اس کے ہاتھوں کئی بار خاصی شرم ناک صورت حال کا سامنا کیا۔۔۔ جس باتھ روم کو بچے استعمال کرتے تھے اس باتھ روم میں لاک نہیں تھا اور دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے کھولنا حمین کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جبریل کے لیے حمین کی موجودگی میں باتھ روم جانا جان جوکھوں کا کام بن جاتا تھا۔ وہ امامہ یا پیڈی کے آس پاس نہ ہونے پر باتھ روم کے دروازے کے اندرونی طرف باتھ روم میں پڑی ان سب چیزوں کو رکاوٹوں کے طور پر دروازے کے سامنے ڈھیر کر کے پھر باتھ روم کا استعمال کرتا تھا۔
سالار سکندر اگر اسے "عجیب و غریب" کہتا تھا تو حمین سکندر باپ کے دیے گئے اس ٹائٹل پر پورا اترنے کی کوشش کر رہا تھا اور پوری دل جمعی کے ساتھ۔۔۔ کبھی کبھی ان سب کو لگتا تھا' حمین سکندر کو کوئی بھی کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ مگر دنیا میں ہر فرعون را موسیٰ ہوتا ہے اور چنی کی ان کی زندگی میں آمد ایک ایسی ہی نعمت کے طور پر ہوئی تھی۔

☸ ☸ ☸

نائب صدر کے طور پر سالار سکندر نے افریقہ کے لیے کسی انسان کی طرح نہیں مشین کی طرح کام کیا تھا۔ اس کی ملازمت کا دورانیہ افریقہ کی تاریخ کے سنہری ترین سالوں میں گردانا جاتا تھا۔ وہ افریقہ میں تقرر ہونے سے پہلے افریقہ کی معیشت کا ماہر سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں اپنے قیام کے دوران سالار سکندر افریقہ کے انسائیکلو پیڈیا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ افریقہ کا کوئی ملک یا علاقہ ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں معلومات اس کی انگلیوں پر نہیں تھیں اور جہاں اس نے کانٹیکٹس نہیں بنائے تھے۔
وہ ورلڈ بینک کی نمائندگی کرتے ہوئے افریقہ کی فلاح اور ترقی کے لیے کام کی خواہش رکھتے ہوئے جیسے وہاں ایک دو دھاری تلوار پر چل رہا تھا۔۔۔ اسے ورلڈ بینک یعنی عالمی طاقتوں کے اہداف بھی حاصل کرنے تھے۔ انہیں ناراض بھی نہیں کرنا تھا اور اسے افریقہ میں افریقی عوام کی فلاح و بہبود کو بھی مدنظر رکھنا تھا۔۔۔ وہ مشکل ترین اہداف کے حصول کے لیے نامساعد ترین حالات میں کام کر رہا تھا۔۔۔ اور کامیابی سے کر رہا تھا۔۔۔ پیٹرس ایباکا کی موت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات ورلڈ بینک کے لیے ایک وقتی جھٹکا تھے۔ وہ مصلحتاً" پسپا ہونے پر مجبور ہوئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ افریقہ کے لیے عالمی طاقتوں کی پالیسیاں بدل گئی تھیں۔۔۔ اور سالار یہ بات بخوبی جانتا تھا۔۔۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ سب کچھ نظروں سے اوجھل اور یادداشت سے محو ہونا شروع ہو گیا تھا۔ غریب قوموں کی یادداشت ان کے پیٹ کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ پیٹ خالی ہوتا ہے تو ان کی

یادداشت بھی خالی ہو جاتی ہے۔
پیٹرس ایباکا بھی بہت جلد اپنی قوم کی یادداشت سے غائب ہونا شروع ہو گیا تھا... اور سالار کو اس بات کا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وقتی ابال ہے جو کچھ عرصہ اس قوم کو مشغول رکھے گا اس کے بعد زمینی حقائق انہیں یہ سب بھولنے پر مجبور کر دیں گے۔ اور زمینی حقائق یہ تھے کہ افریقہ کے عوام اپنی ہر ضرورت کے لیے ترقی یافتہ قوموں پر انحصار کرتے تھے۔ ان کی روزی روٹی ان کے پروجیکٹس میں کام کر کے ہی چلتی تھی۔ ان کے اپنے لیڈرز اور حکومتیں کرپٹ تھیں' چور تھیں جو ملکی وسائل کو صرف اپنے فارن بینک اکاؤنٹس کو بھرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں' اپنے ملک اور عوام کی زندگی اور حالات بدلنے کے لیے نہیں۔
افریقہ میں سب کچھ تھا۔ اپنے حالات بدلنے کی نیت نہیں تھی... اور یہ نیت کوئی دوسرا انسان ان کے اندر پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ سالار سکندر بھی نہیں اور یہ وہ حقائق تھے جن سے مغربی دنیا واقف تھی تو افریقہ بھی انجان نہیں تھا۔
سالار سکندر کی وجہ سے اگر کوئی فرق پڑا تھا تو صرف یہ کہ اگر پہلے ان پروجیکٹس کا دس فی صد وہاں کے عوام کی بہتری پر خرچ ہو رہا تھا تو اب اس کا تناسب اب بیس سے تیس فیصد کے درمیان ہو گیا تھا... وہ اس سے بڑی تبدیلی نہیں لا سکتا تھا۔ وہ بیس سے تیس فیصد وسائل بھی اگر ٹھیک استعمال ہوتے تو وہاں بہتری کی رفتار چار گنا کی جا سکتی تھی اور یہ کام سالار نے کیا تھا۔ وہ ان وسائل کے استعمال کو سو فیصد شفاف نہیں بنا سکتا تھا لیکن اس کے استعمال کا فوکس ٹھیک کر سکتا تھا۔ ترجیحات درست کر سکتا تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔
ایک نائب صدر کے طور پر افریقہ میں اس کی اور اس کے آفس کی کارکردگی اور استعداد دنیا کے دوسرے خطوں میں کام کرنے والے نائب صدور کے مقابلے میں بہترین تھی۔ وہاں شروع ہونے والے پروجیکٹس کیس اسٹڈیز کے طور پر دوسرے خطوں میں ورلڈ بینک کے دوسرے نائب صدور اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے... وہ ورلڈ بینک کا سربراہ نہیں تھا لیکن سالار سکندر نے اپنے آپ کو بہت نمایاں نہ رکھتے ہوئے بھی ورلڈ بینک کے باقی تمام نائب صدور کو نہ صرف کنارے لگا کر غیر فعال کر دیا تھا۔ بلکہ ورلڈ بینک کے اس اگلے صدر کو بھی پس منظر میں دھکیل دیا تھا جسے پیٹرس ایباکا کی موت کے دوران پیدا ہونے والے کرائسس پر قابو نہ پا سکنے کی پاداش میں پرانے صدر کو ہٹا کر تعینات کیا گیا تھا۔
وہ تین سال مسلسل "ٹائم" کے مین آف دا ایئر کے طور پر اس کے سرورق کا حصہ بنا تھا اور ورلڈ بینک کے ساتھ ہونے والے اس پروجیکٹ کے بارے میں اختلافات سے پہلے وہ ورلڈ بینک کے حلقوں میں ایک بہت زیادہ پروفیشنل ورکر کی شہرت رکھتا تھا جو ہر لحاظ سے غیر متنازعہ اور بے حد اچھی شہرت کا مالک تھا... اور اب اس شہرت کو "خراب" کرنے والی شے صرف ایک تھی۔ اس کا "بنیاد پرست" مسلمان ہونا جو اس ایک تقریر کے علاوہ اور اس کے لائف اسٹائل کے علاوہ اس کے کام اور پالیسیوں میں کبھی نہیں جھلکا تھا...
سالار سکندر کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے کے قریب آ رہا تھا۔ بینک نے یہ دورانیہ ختم ہونے سے دو سال پیشتر ہی سالار سکندر کو ملازمت میں توسیع کی آفر کی تھی اور اس نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ پھر اس آفر کو وقفے وقفے سے بار بار بہتر پیکجز کے ساتھ اسے اصرار کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا... لیکن سالار کا انکار قائم رہا تھا۔ وہ افریقہ میں اپنے قیام کو اب ختم کرنا چاہتا تھا۔ اور ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکن حکومت کے لیے بھی یہ تشویش کی بات تھی۔ افریقہ کو سالار سکندر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس بات پر بورڈ آف ڈائریکٹرز میں کوئی دو رائے نہیں تھیں اور نہ ہی امریکن حکومت کو کوئی شبہ تھا... اس نے پچھلے چند سالوں میں نہ صرف ورلڈ

بینک کی ساکھ اور امیج ہی افریقہ میں بدل کر رکھ دیا تھا' بلکہ اس نے امریکن حکومت کے لیے بھی وہاں خیر سگالی کے جذبات دوبارہ پیدا کرنے میں بہت کامیابی حاصل کی تھی۔۔۔ اس کا ورلڈ بینک کو اس وقت چھوڑ کر جانا ان کے لیے بہت بڑا دھچکا ہوتا۔۔۔ لیکن وہ رکنے پر تیار نہیں تھا اور امریکن حکومت کو سوچنا پڑ رہا تھا کہ وہ اسے ایسی کیا چیز پیش کرے جو اسے روک سکے۔

ورلڈ بینک کی صدارت ہی یقیناً" ایسا ایک تاج تھا جو اس کو پہنا کر اسے روکا جا سکتا تھا۔ سالار سکندر اس عہدے کے لیے موزوں ترین اور کم عمر ترین امیدوار تھا مگر اس عہدے پر سالار سکندر کی تعیناتی امریکی حکومت کے لیے خود ایک مسئلہ بن گئی تھی۔۔۔ وہ ایک "بنیاد پرست" مسلمان کو ورلڈ بینک کا صدر نہیں بنا سکتے تھے اور وہ اس "بنیاد پرست" مسلمان کو کسی اور چیز کی آفر کر کے روک بھی نہیں پا رہے تھے۔ یہ فیصلہ انہیں کرنا تھا کہ کیا اس کی مسلم بنیاد پرستی کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ابھی امریکی حکومت اور ورلڈ بینک کے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت تھا کیونکہ سالار کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے میں ایک سال باقی تھا۔

اس ایک سال میں سالار سکندر کی زندگی میں تین بڑے واقعات ہوئے تھے اور تینوں نے اس کی زندگی پر بہت گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ گہرے اور ہمیشہ رہ جانے والے۔۔۔ اور یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ ان واقعات نے ایک بار پھر اس کی زندگی بدل دی تھی۔

چنی غلام فرید بھی اس کی زندگی میں اس کی آخری اور چوتھی اولاد کے طور پر اسی سال آئی تھی۔ اس کی زندگی کا پہلا بڑا واقعہ۔

☼ ☼ ☼

چنی سے سالار سکندر کا غائبانہ تعارف ہمیشہ بے نام رہا تھا۔۔۔ غلام فرید کے حوالے سے سکندر عثمان سے اسے کئی بار خبریں ملتی رہی تھیں بالکل اسی طرح جس طرح گاؤں میں قائم اس اسکول کے بہت سے دوسری ملازمین کے بارے میں پتا چلتا رہتا تھا' سکندر عثمان نے غلام فرید کے ذریعے گاؤں کی مسجد کے امام کو پہنچائی جانے والی امداد کے بارے میں بھی سالار کو مطلع کر دیا تھا کیونکہ یہ امداد سالار کے کہنے پر ہی سکندر عثمان نے شروع کی تھی۔ غلام فرید کو اس امداد میں ہیرپھیر کے نتیجے میں ملازمت سے فارغ کرنے کا حکم بھی سالار ہی کا تھا۔ بددیانتی اور بے ایمانی اس کے لیے قطعاً" ناقابل برداشت تھی اور یہ معاملہ اسے اس لیے زیادہ سنگین اور زیادہ ناقابل برداشت لگا تھا کہ جس رقم میں ہیرپھیر کیا گیا تھا وہ مسجد کے لیے دی گئی تھی اور مسجد کی رقم میں بددیانتی کرنے والے شخص کو وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا سکندر عثمان بھی غلام فرید کو دی جانے والی اس سزا کے حق میں تھے۔ اس لیے انہوں نے سالار سکندر کی ہدایات پر پوری طرح عمل درآمد کیا تھا۔

غلام فرید کے ہاتھوں ایک بچی کے سوا اپنے پورے خاندان کا قتل سکندر عثمان کو بری طرح ہلا گیا تھا۔ اس دل خراش واقعہ کو میڈیا نے بہت دن اچھالا تھا۔۔۔ غلام فرید سے پوچھے جانے والے سوالوں کے جوابات وہ ہیڈ لائنز کی شکل میں دکھاتے اور چھاپتے رہے تھے۔ جو صرف سکندر عثمان ہی نہیں سالار کی نظروں سے بھی گزرتے رہے تھے' اپنی فیملی کو اس طرح بے رحمی سے مار دینے والا شخص میڈیا کو ذہنی عدم توازن کا شکار لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس حادثے کی توجیہات ہر روز بدل دیتا تھا۔

"اسے اپنی بیوی کے کردار پر شک تھا۔۔۔ اس لیے اس نے اپنے خاندان کو مارا۔"

یہ حادثے کے فوراً" بعد میڈیا کی طرف سے بریکنگ نیوز حاصل کرنے کے چکروں میں نشر اور شائع ہونے والی

پہلی خبر تھی۔

یہ ایک غیر ذمہ دار صحافی نے اندازا" بنا کر اپنے ٹی وی پر نشر کی تھی اور باقیوں نے آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کی تھی۔ ڈیسک جرنلزم کی یہ چھوٹی سی بددیانتی کئی سالوں بعد کسی شخص کے گلے کا پھندا بن جانے والی تھی' یہ اس صحافی کو اندازہ بھی نہیں تھا۔

جوں جوں غلام فرید سے مختلف صحافیوں کو ملنے اور بات کرنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ مختلف انکشافات سامنے آتے رہے۔ وہ پہلی خبر چھپ گئی تھی۔ اب اس قتل کی وجہ غربت سامنے آئی تھی۔ بیوی سے لڑائی جھگڑے تھے۔ گھر میں بھوک اور بیماری تھی۔ رشتہ داروں اور قرض خواہوں کے اپنی رقم کے تقاضے تھے۔ اور ان سب کے آخر میں اسکول کی ایک نوکری سے ایک مالی بددیانتی پر نکالا جانا اور بے گھر کیا جانا تھا جو سکندر عثمان اور سالار کو احساس جرم میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

وہ اب غلام فرید کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ اس کی بچ جانے والی واحد اولاد کی دیکھ بھال اور کفالت کی ذمہ داری اٹھالیتے اور سالار کے کہنے پر وہ سکندر عثمان نے اٹھالی تھی۔ وہ اس کے لیے ماہانہ رقم بھیجتے تھے جو اس کے رشتہ دار آکر لے جاتے تھے اور کبھی کبھار سکندر عثمان کے کہنے پر وہ چنی کو لاکر انہیں دکھا بھی جاتے تھے تاکہ انہیں یہ تسلی رہے کہ وہ رقم واقعی اس پر خرچ ہو رہی تھی۔ اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی تھی اور وہ محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ یہ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر اس سال سالار اپنی فیملی کے ساتھ دو ہفتوں کے لیے پاکستان نہ آتا... اور ایک لمبے عرصے کے بعد سکندر عثمان کے بجائے خود گاؤں اسکول دیکھنے نہ جاتا یا وہاں جا کر غلام فرید کی بیٹی کا خیال آنے پر اس کے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی اور ہمیشہ کی طرح چنی کے رشتہ دار کو چنی کو اسکول لے کر آنے کے بجائے اسکول ہی کی انتظامیہ کے چند لوگوں کے ساتھ سالار خود اچانک اس کے گھر نہ چلا جاتا۔

جس ڈیڑھ سال کی چنی کو سالار سکندر نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اسے سات آٹھ ماہ کی ایک بچی لگی تھی۔ بے حد کمزور... دبلی پتلی... اس کی سانولی رنگت یرقان جیسی پیلاہٹ لیے ہوئے تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ کسی جلدی انفیکشن کے نتیجے میں چھوٹے بڑے رسنے والے پیپ زدہ دانوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال دھوپ' گندگی میں رہ رہ کر بھوری لٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے جو دھلنے اور کنگھی نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے اوپری دھڑ پر جو فراک تھا۔ وہ بوسیدگی اور خستہ حالی کو تو ظاہر کر ہی رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے سائز سے بہت بڑا ہونے پر یہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی کوئی اور استعمال کرتا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں جیسے وہ جسم میں پانی کی کمی کا شکار ہو' ہاتھ پیروں کے بڑھے ہوئے اور میل سے بھرے ٹیڑھے میڑھے ٹوٹے ہوئے ناخن یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس کی دیکھ بھال کتنے اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔

جس وقت سالار اس گھر کے صحن میں داخل ہوا وہ گھر کے کچے صحن میں دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کے پاس بیٹھی تھی اور اسی دانے اور گندگی کو بلا تکلف اپنے منہ میں ڈال رہی تھی۔ سالار نے اس بڑے صحن کے ایک کونے میں مرغیوں کے پاس بیٹھی اس بچی کو غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی کفالت کے لیے معقول رقم بھیجنے کے باوجود وہ اس حال میں ہو سکتی تھی۔

چنی کے رشتہ دار بے حد نروس اور گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ سالار کو اندر لائے تھے اور مہمان خانے میں اسے بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ سالار کو جلدی تھی۔ اسے صرف ایک نظر اس بچی کو دیکھنا تھا اور واپس جانا تھا۔ گھر کے

اندرونی حصے میں جانے کے بجائے یہ کام وہ وہیں صحن میں کھڑے کھڑے نمٹانا چاہتا تھا اور چنی کے رشتہ داروں کی یہ بدقسمتی اور چنی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت وہیں صحن میں تھی وہ لوگ presentation اور display کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اسے اب سجا سنوار نہیں سکتے تھے۔

"یہ بس ایسے ہی رہتی ہے۔ جتنی بار بھی کپڑے بدلو' یہ جا کر مرغیوں میں گھس جاتی ہے۔ حمیدہ! ارے او حمیدہ! ذرا دیکھ چنی کو۔ کپڑے بدلوا صاحب نے ملنا ہے۔"

گھر کے مالک نے بے حد گھبرائے اور شرمندہ سے انداز میں چنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی کو آواز لگائی تھی اور وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے چنی کو بغور دیکھا تھا اور وہ بھی اپنا نام پکارنے جانے پر کچھ خوف زدہ انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

حمیدہ نے ہنگامی بنیادوں پر لپک کر چنی کو اندر لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن سالار نے روک دیا' وہ جو چھپانا چاہتے تھے' اسے چھپا نہیں پائے تھے اس لیے وہ اسے سالار کے پاس لے آئے تھے۔

حمیدہ کی گود میں اٹھائی ہوئی بہتی ہوئی نزلہ زدہ ناک والی اس بچی کو دیکھتے ہوئے سالار سکندر کو عجیب رحم آیا تھا اس پر... وہ افریقہ میں بچوں کو اس سے بھی برے حالات میں دیکھ چکا تھا لیکن ان بچوں کے ساتھ سالار سکندر کا کوئی احساس جرم نہیں تھا... جو چنی کو دیکھتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا۔

"نہیں نہیں۔ اس کو نہ اٹھائیں' یہ بڑی گندی ہے جی... آپ کے کپڑے نہ خراب کردے۔ اس کو ابھی لیٹرین میں جانا نہیں آیا۔"

حمیدہ سے پہلے اس کے میاں نے سالار کو اس بچی کو اٹھانے سے روکا تھا۔ سالار نے اس کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اس بچی کو اٹھالیا تھا اور چنی بڑے آرام سے کسی جھجک کے بغیر اس کے پاس آگئی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سالار سکندر جیسے حلیے والا کوئی شخص دیکھا تھا۔ سالار نے اسے تھپکتے ہوئے پچکارا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے جواب دیے بغیر لیکن اس سے چپکے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔

"ہاں بس تھوڑی بیمار ہی رہتی ہے۔ شروع سے ہی ایسی ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی سے فرق نہیں پڑا۔ اب پیر صاحب سے دم کرا کے لائے ہیں۔ انہوں نے تعویذ بھی دیا ہے گلے میں ڈالنے کے لیے۔ حمیدہ! وہ تو نے ڈالا نہیں ابھی تک۔"

سالار میاں بیوی سے اب اس بچی کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور وہ گڑبڑائے ہوئے اس کے چہرے اور جسم پر رستے ہوئے دانوں کی وجوہات اور علاج بیان کررہے تھے۔

سالار سکندر کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ وہ غلط جگہ پر تھی۔ اس کا خیال نہیں رکھا جارہا تھا اور اس کی کفالت کے لیے دی جانے والی امداد اس پر استعمال نہیں ہورہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون سی ذہنی رو تھی جس میں اس نے چنی کو فوری طور پر وہاں سے لے جانے اور کسی دارالامان میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا تھا یا کسی ایسی جگہ جہاں پر وہ بچی اچھی طرح پرورش کی پاتی اور اس ذہنی رو میں یہ فیصلہ اس نے چنی کے رشتہ داروں کو سنا بھی دیا تھا۔ ان کے احتجاج کے باوجود وہ چنی کو وہاں سے لے آیا تھا اور وہ اسے روک نہیں پائے تھے۔ بدحواسی اور پریشانی کے باوجود... وہ چنی کو نہیں لے جارہا تھا۔ ان کا ماہانہ وظیفہ لے جارہا تھا اور وہ پیسے بند ہوجاتے تو... اس تو کے آگے ان سب کو بہت ساری فکریں لاحق ہوگئی تھیں لیکن سالار کے ساتھ اسکول کی انتظامیہ بھی تھی اور کچھ سیکیورٹی اہلکار بھی' وہ زبانی احتجاج کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکے تھے۔

حیران کن بات یہ تھی کہ اس سارے شور شرابے اور احتجاج میں چنی بے حد اطمینان اور پرسکون انداز میں سالار کی گود میں چڑھی اس کا کالر پکڑے رہی تھی... اس کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے بھی وہ بے قرار اور پریشان

نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھائے جاتے ہوئے۔

اس گاؤں سے اسلام آباد واپسی پر سالار اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا رہا تھا اور چنی برابر والی سیٹ پر بیٹھی دروازے کی کھڑکی سے چپکی بے حد خاموشی اور اطمینان سے پورا راستہ باہر دیکھتی رہی تھی۔ وہ اگر بے چین ہوئی تھی تو صرف تب جب سالار نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اسے سیفٹی بیلٹ باندھنے کی کوشش کی تھی۔ جو اس کے ہاتھ پاؤں مارنے پر سالار نے کھول دی تھی' اسے اس وقت حمین یاد آیا تھا۔ وہ بھی اس عمر میں اسی طرح سیفٹی بیلٹ سے جان چھڑاتا تھا۔

سیفٹی بیلٹ کھول دینے پر وہ ایک بار پھر سے پر سکون ہو گئی تھی۔ پورا راستہ سالار اسے وقتاً" فوقتاً" دیکھتا رہا لیکن وہ اس قدر اطمینان کے ساتھ شیشے سے باہر نظر آنے والی سڑک اور اس پر گزرنے والی ٹریفک کو دیکھنے میں مگن تھی کہ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر گاڑی کے اندر موجود سالار کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سالار اس کا یہ انہماک دیکھ کر مسکراتا رہا تھا۔ اس نے رستے میں ایک جگہ رک کر اسے ایک جوس کا ڈبہ اور بسکٹ کا ایک پیکٹ لے کر دیا تھا۔ وہ منٹوں میں وہ دونوں چیزیں کھا گئی تھی یوں جیسے وہ کئی دنوں کی بھوکی تھی۔

اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی کے سفر کے دوران سالار اس بچی کی رہائش کے لیے مناسب ترین جگہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے خود پالے گا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر سوچ بھی لیتا تو بھی یہ کام امامہ سے پوچھے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔

جو بھی ممکنہ باتیں چنی کے لیے اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔ وہ خود ہی انہیں مسترد کرتا رہا تھا۔ اسلام آباد پہنچنے پر گھر کے گیراج میں اس کے بچوں نے بھاگتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا اور گاڑی کے اندر چنی کو سب سے پہلے ساڑھے تین سالہ حمین نے دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح گول ہو گئی تھیں یوں جیسے اس نے جنگل کا کوئی جانور دیکھ لیا ہو۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے ناک اور منہ چپکائے ہیلو کہہ کر چنی کو مخاطب کیا تھا جو کھڑکی کے اندر والی سائیڈ سے شیشے سے چہرہ چپکائے ہوئے تھی اور حمین دوسری طرف سے۔ وہ کچھ خائف ہو کر تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔ اس سے پہلے کہ حمین کوئی اور حرکت کرتا۔ سالار گاڑی سے نکل کر دوسری طرف آچکا تھا۔ اس نے حمین کو ہٹا کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور چنی کو باہر نکال لیا۔ چنی سے آنے والے بدبو کے بھبھکے سب سے پہلے حمین نے ہی محسوس کیے تھے۔ اس نے بے اختیار اپنے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

"Oh my God! she is so smelly and dirty and ugly"

(اوہ مائی گاڈ! یہ کتنی بدبودار گندی اور بدصورت ہے) وہ بے اختیار ناک پر ہاتھ رکھے کہتا گیا تھا جبکہ جبریل اور عنایہ کچھ فاصلے پر کھڑے کسی تبصرے اور سوال کے بغیر گھر میں باپ کے ساتھ آنے والے اس مہمان کو دیکھ رہے تھے۔

"حمین۔" سالار نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں پکارا اور گھورا۔۔۔

Oh but then that's ok ....
May be she likes to live like this
I mean some people like to be different
I like her hairstyle.....She is cool....

("لیکن ٹھیک ہے۔ شاید اسے اسی طرح رہنا پسند ہو' میرا مطلب ہے کہ کچھ لوگ مختلف ۔۔۔۔ ہوتے ہیں مجھے اس کا ہیئر اسٹائل اچھا لگا ہے۔ یہ کول ہے۔")

حمین نے ہمیشہ کی طرح باپ کی پھٹکار کے بعد سیکنڈز میں اپنا بیان تبدیل کیا اور اپنی بات کے آخر میں چنی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

"Baba I also want to have her hair style"

(بابا میں بھی اس کی طرح ہیئر اسٹائل بنانا چاہتا ہوں)

سالار نے اس کی زبان کی قینچی کو نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سائز کا خاموش نہ ہونے والا "جن" تھا جو اس گھر کے افراد کے ارد گرد ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اور اس کے سوالات... ختم نہ ہونے والے سوالات نے امامہ اور سالار کی آئیڈیل والدین بننے کی ہر خواہش، خوبی اور معلومات کو ختم کر دیا تھا۔

"I think she is goldi lock"

حمین کی تعریفوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ اب باپ کو یہ جتا کر خوش کرنا چاہتا تھا کہ اسے وہ بچی اچھی لگی تھی۔

"یہ گولڈی لاک نہیں ہے گندی ہے اس نے کئی ہفتوں سے اپنے بال نہیں دھوئے بلکہ شاید کئی مہینوں سے۔"

جبریل نے اسے ٹوک کر بتایا تھا... وہ تینوں اب سالار کے پیچھے پیچھے اندر جا رہے تھے...

"آل رائٹ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کول نہیں ہے۔"

جواب پھر سے تڑاخ سے ہی آیا تھا جبریل بے اختیار پچھتایا... اس نے اس کے تبصرے کا جواب دے کر سالار کے پیچھے لگنے والی بلا اپنے پیچھے لگا لی تھی۔

"اگر میں کئی مہینوں تک اپنے بال نہ دھوؤں تو میرے بال بھی ایسے ہی ہوں گے' میرا مطلب ہے گولڈن براؤن یا ایش گرے یا مسٹرڈ یلو۔" اس کا ذہن اب کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔

"نہیں۔" جبریل نے بے حد سخت لہجے میں فل اسٹاپ لگایا۔

"اوکے۔" حمین نے بے حد اطمینان سے کہا "لیکن میں اپنے بال ڈائی تو کر سکتا ہوں۔"

جبریل نے اس بار اسے مکمل طور پر نظرانداز کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا وہ بالوں کے بعد چنی جیسے ناخنوں کو بھی اپنانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دے۔

امامہ نے سالار کو اس بچی کو اٹھائے دیکھا تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ بیٹھی اس وقت چائے پی رہی تھی اور وہ چائے پینا ہی بھول گئی تھی۔

"یہ کون ہے؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ تم اسے نہلا کر کپڑے بدل دو اس کے' پھر میں اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے چنی کو گود سے اتارتے ہوئے کہا تھا۔

امامہ کچھ الجھی تھی لیکن وہ اسے لے کر چلی گئی تھی اور اس کو نہلانے کی کوشش کے آغاز میں ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ اس بچی کے بالوں کو کاٹے بغیر اس کو نہلایا نہیں جا سکتا۔ اس کے سر میں بڑے بڑے پھوڑے تھے اور ان پھوڑوں سے رسنے والی پیپ نے اس کے بادلوں کی لٹوں کو آپس میں اس طرح جوڑ دیا تھا کہ اب ان کا کھلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے شیونگ کٹ میں پڑی قینچی سے چنی کے سارے بال جڑوں تک کاٹ دیے تھے... وہ اس کا سر گنجا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ پھوڑوں سے بھرا ہوا تھا... امامہ کو اس بچی کو نہلاتے ہوئے بہت رحم اور ترس آیا تھا اور بے حد حیرانی بھی ہوئی تھی اسے... چنی بالکل چپ چاپ بیٹھی نہاتی رہی تھی۔ اس نے عام بچوں کی طرح رونا دھونا نہیں مچایا تھا... نہ ہی اپنے بال کٹنے یا ان پھنسیوں اور پھوڑوں پر ہاتھ لگنے پر کسی تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

بیڈ روم میں جبریل اور عنایہ باتھ روم میں جا کر اس بچی کی صفائی ستھرائی کو بذات خود جا کر دیکھنے سے حمین کو روکنے کی کوششوں میں مصروف تھے جنہیں اس کام پر امامہ تعینات کر کے گئی تھی۔

وہ بالآخر جب چنی کو بالکل کریو کٹ میں نہلا دھلا کر حمین ہی کا ایک جوڑا پہنائے باہر لائی تھی تو اسے دیکھ کر سب سے پہلی چیخ مارنے والا حمین ہی تھا۔

"Oh my God! Momy you have made her uglier horrible and you have destroyed my most favourite shirt

"اوہ مائی گاڈ ممی! آپ نے اسے مزید بدصورت... خوفناک بنا دیا ہے اور آپ نے میری سب سے فیورٹ شرٹ بھی خراب کر دی ہے۔"

اس کو ہرا غم تھا چنی کے بالوں کے ساتھ ساتھ اپنی شرٹ کو اس کے جسم پر دیکھ کر بھی دکھ ہوا تھا۔

"Momy she was a girl. You have made her a boy. God will never forgive you for that.

"ممی یہ لڑکی تھی۔ آپ نے اسے لڑکا بنا دیا۔ اللہ اس کے لیے آپ کو معاف نہیں کرے گا۔"

امامہ کو اس کی بات پر ہنسی آئی۔ سالار ٹھیک کہتا تھا۔ وہ "عجیب و غریب" ہی تھا اور چنی اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی سے... اپنے اس نئے خاندان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رہنے آئی تھی لیکن اس وقت کسی کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ مہمان نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

اس سال صرف چنی سالار سکندر کے خاندان میں نہیں آئی تھی۔ اس سال کا دوسرا بڑا واقعہ سالار سکندر کے برین ٹیومر کی تشخیص تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حنا یاسمین

ہم کہاں کے عقل مند

"جب کبھی بچے والدین سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں' ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔" ابا جی نے اپنی مخصوص کالی عینک کو کوئی تیسری دفعہ صاف کرتے ہوئے غصہ نکالا۔ امی بڑے مصروف انداز میں سبزی کاٹنے میں مصروف تھیں۔

ابا جی شروع ہو چکے تھے۔ "یہ سارا تمہاری تربیت کا اثر ہے۔" حورعین کے جمائی روکنے پر ابا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تو ابا جی آپ کا مخصوص فقرہ ہے.... آج کچھ نیا ہو جائے۔" زاریان نے فریج سے قلفہ نکال کر مزے لے لے کر کھاتے ہوئے کہا۔

ابا جی کو ناخلف اولاد پر شدید غصہ تو آنا ہی تھا کہ حورعین کی دلخراش چیخ نے سب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ امی جی.... جو اونگھ اونگھ کر ابا جی کی تقریر سن



رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے بھی چھری گر گئی۔ اباجی کی نظروں سے بچتے بچاتے' چھپ چھپ کر سیڑھیاں چڑھتے عون نے بھی گردن موڑی۔ اباجی تقریر بھلائے حورعین کی طرف بھاگے۔

"بیٹا کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" اباجی ایسے ہی مزاج کے تھے جتنے اولاد سے نالاں رہتے' اتنے ہی ان کی ذرا سی تکلیف پر بھی تڑپ تڑپ جاتے۔

"میرا قلفہ...." حورعین نے باقاعدہ بلک بلک کے روتے ہوئے زاریان کی طرف اشارہ کیا۔ سب کے چہرے یک دم اطمینان سے پر ہو گئے کہ خدانخواستہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

"کتنے سو میٹر کے فاصلے پر میں تھا جو اتنی خطرناک چیخ ماری ہے۔" اس کے یک دم چیخنے پر قلفے کا باؤل ہاتھ سے گر کر نیچے جا چکا تھا۔ سو اب زاریان کو غصہ آرہا تھا۔

"یہ گھر ہے یا سارے پاگلوں کا ٹھکانہ ہے۔ صرف ایک مجھے نکال کے...." اباجی غصے سے کہتے اذان دینے روانہ ہو گئے جبکہ پیچھے رہ جانے والوں کے چہروں پر رینگتی مسکراہٹ.... باقاعدہ قہقہوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اباجی کا زاریان کے فارغ رہنے اور عون کے تیسری دفعہ فیل ہونے پر پارہ بار بار ہائی رہتا۔ زاریان کو علمی و ادبی محفلوں میں جانے کا شوق تھا۔ اللہ کے فضل سے تھوڑی بہت شعروشاعری پر بھی طبع آزمائی کی جاتی۔ سو کام چل رہا تھا۔ پر اباجی کی نظر میں پاکستان کے سارے گھسے پٹے شاعر ادیب حضرات زیادہ تر ویلے ہی تھے۔ (معذرت کے ساتھ یہ صرف میرے ابا کے خیالات ہیں....) اور جو نامور ادیب.... شاعر ہیں.... ان میں سے آدھے تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور آدھے تیاری کرکے بیٹھے ہیں۔

"ہر بندے کو اپنے دور کے ہی شاعر و ادیب اچھے لگتے ہیں۔" کبھی کبھی زاریان چڑ کر کہتا۔ ادبی حلقوں میں زاریان کا نام بھی مشہور تھا۔ دو دفعہ مشاعروں کے سلسلے میں وہ انڈیا بھی جا چکا تھا۔ آج کل میں ویت نام کا چکر بھی لگانا تھا۔ پر اباجی کو کیا کہتا.... ساری عمر دکان داری کی' نماز پڑھی.... بس تین چار دوست بنائے رکھے۔ ان کی دنیا جتنی محدود تھی.... سوچ بھی اتنی ہی محدود تھی۔ پر وہ اباجی تھے' زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔ ہاں.... کبھی کبھی کچھ زیادہ رقم ہاتھ لگتی تو اباجی کے ہاتھ میں ضرور رکھتا۔ اباجی خوش ہو جاتے۔

زاریان کے علاوہ حورعین.... عون اور چھوٹا فیضی تھا۔ سب بہن' بھائی' والدین کے فرماں بردار تھے.... باوجود یہ کہ اباجی کی طبیعت ذرا گرم تھی۔ پر بچوں کی فرماں برداری پر ان کا مزاج خوش گوار ہو جاتا۔

☼ ☼ ☼

پنجابی ادبی کانفرنس تھی۔ زاریان پر بھی کچھ ذمہ داری ڈالی گئی۔ وہ آج کل اسی میں مصروف تھا۔ ایک وفد انڈیا سے بھی آنا تھا۔ رمضان شروع ہونے والا تھا اور اباجی نے سامان کی ایک لسٹ اسے تھمائی ہوئی تھی۔ خیال تو یہی تھا کہ سستا رمضان بازار سے جاکر اشیائے خورد و نوش خرید لے گا۔ سستی بھی مل جائیں گی۔ پر زید نے کچھ اور کام اس کے سر پر ڈال دیے۔ چاروناچار وہ بھی کرنے پڑے تب۔

اباجی کی کال آگئی۔ "اوئے.... الو کے کان کدھر ہو؟" اباجی کی گرج چمک شروع ہو چکی تھی۔

"اباجی! غصے میں خود کو کچھ کہنے سے باز رہا کریں۔" وہ کان کھجاتا ہنستے ہوئے بولا۔

"دانت اندر کرو.... زیادہ مخول نہ کیا کرو.... پتا نہیں کن میراثیوں کے ساتھ رہتے ہو۔" سامنے بیٹھے زید کے لمبے بال اور ہاتھوں میں پہنے چھلوں کو اس نے گھبرا کر دیکھا۔ جلدی سے موبائل کان سے لگائے ایک طرف ہو گیا۔

"گھر کا سودا سلف لانا ہے کہ نہیں یا میں خود جاؤں...." اباجی جب سے دل کے مریض ہوئے تھے زاریان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ باقی سارے کام وہ خود کرے۔ صرف اباجی دکان میں ملازموں کے سر پر

بیٹھے رہا کریں۔

"نہیں نہیں ابا جی! میں خود لے آؤں گا۔"

"کتنے دن لگ جائیں گے بیٹا۔" ابا جی کے طنزیہ انداز میں پوچھنے پر وہ شرمسار ہو گیا۔

"ابا جی ابھی لے آتا ہوں۔" وہ انہیں اطمینان دلاتے بولا۔

"تیرے لارے تے رہ گئے کنوارے۔" (تمہارے بہانوں سے کنوارے رہ گئے۔) یہ کہاوت تھی اور ابا جی کو شوق تھا۔ پنجابی کہاوتیں کہنے کا... ادھر سے زید اشارے پہ اشارے کیے جا رہا تھا۔

اس نے ابا جی کی کال ڈس کنیکٹ کی اور خود تیزی سے مڑتے ہوئے جوں ہی اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا' وہاں تاروں سے الجھ کر اسٹیج کے ایک کونے کے پاس سجدے میں جا گرا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ دو منٹ کے لیے وہ گڑبڑا ہی گیا۔ لائٹنگ کا انتظام کرتے وہ دونوں چھوٹے لڑکے دانت نکالنے لگے۔ جبکہ اسٹیج پر موجود نو آموز شاعرہ کے بھی دانت نکلنے لگے۔

وہ گڑبڑا کر اٹھا۔ "کتنی بری لگ رہی ہیں۔ ہنستے ہوئے..." اس نے اونہہ کہہ کر اونچی آواز میں کہا۔

"ہائے جی... تب تو اگلا بندہ بڑا برا لگتا ہے۔ جب وہ آپ کو مزاحیہ انداز میں گرتا ہوا دیکھ لے۔" چائے لاتا لڑکا اسے اپنی طرف سے بڑا سیانا بن کر بتاتا' آگے نکل گیا۔ اس کا موڈ اور خراب ہو گیا۔ شاعرہ صاحبہ کے دانت ابھی بھی نکل رہے تھے جبکہ وہ منہ بناتا زید کی طرف چلا گیا۔

"یار... یہ چڑیل کون ہے؟ دانت دیکھو اس کے اور بال ایسے کھول کر آئی ہے جیسے یہاں مشاعرہ نہیں ماڈلنگ ہونی ہے۔" اس نے زید کے سامنے اپنی بھڑاس نکالی' آخر دوست تھا۔ پر یہ کیا زید کے چہرے کا رنگ یک دم متغیر ہو گیا۔

"تمہاری ہونے والی بھابھی ہے وہ۔ اس کا نام شمائلہ ہے۔ شکل اچھی نہ ہو تو بات تو اچھی کر لینی چاہیے۔" اس کا دل چاہا کہ یہیں پر بھسم ہو جائے۔ ابا جی ٹھیک کہتے ہیں کہ جس دن انسان صبح کی نماز نہ پڑھے۔ اس کی سارے دن بے عزتی ہوتی ہے۔ آج کا سورج شاید اسی لیے طلوع ہوا تھا کہ زاریان... ایم اے فلاسفی کی ڈگری کا حامل چھوٹے چھوٹے شاعروں سے بے عزتی کراتا پھرے۔ وہ وہاں سے کھسک گیا۔

☼ ☼ ☼

بازار جا کر گھر کے لیے سودا سلف لیا۔ بھاڑ میں جائے 'مشاعرہ'... دل میں زید پر تین حرف بھیج کر وہ گھر کی طرف آ گیا۔ ابا جی اس کے اتنی جلدی سامان لانے پر کھل اٹھے۔ ورنہ انہیں پوری امید تھی کہ آج کی تاریخ میں سامان نہیں آنے والا۔

"آج تو آپ بڑی جلدی آ گئے ہیں۔" عون نے زاریان کی طرف دیکھ کر دانت نکالے۔

"اس لیے جلدی آیا ہوں کہ تمہارے دانت توڑ دوں۔" وہ فریج سے بوتل نکال کر منہ سے بوتل لگائے آرام سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ گرنے کا اور زید کے ہاتھوں عزت افزائی کا دکھ پھر سے جاگنے لگا۔

"ہاہاہا..." عون پھر بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ اسے پتا تھا زاریان کا موڈ اس کی کسی دھلائی کے بعد ہی خراب ہوتا ہے۔

"تمہارے میٹرک کے رزلٹ کا میں نے پتا کروالیا ہے۔" وہ بھنا کر بولا۔

"ابھی رزلٹ آنے میں دو ماہ ہیں۔" وہ زاریان کی بات کو مکھی کی طرح اڑاتے' وائٹ قورمے سے انصاف کر رہا تھا۔

"دیکھوں گا کہ بھلا کیا بنتا ہے؟" زاریان کے طنزیہ انداز پر عون منہ بنا کر بیٹھ گیا۔

پتا نہیں کیا مصیبت ہے؟ بڑے بہن بھائی خود تو پڑھ لیتے ہیں اور چھوٹوں پر دھونس جماتے ہیں کہ وہ بھی یہ غلطی کر کے ہی سکون لیں۔ عون نے برا سا منہ بناتے سوچا۔

"اگر میں گھڑا بھی رکھ دوں تو تم اس کو بھی منہ لگا لو زاری! تمہیں کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ گلاس میں پانی پیا کرو۔ بوتلیں دھو دھو کر بھر کر رکھتی ہوں اور تم لوگ منہ لگا کر پھر سے جھوٹی کر دیتے ہو؟" امی نے اسے

بوتل منہ سے لگائے پکڑ لیا اور شروع ہو گئیں۔ عون پھر سے ہنسنے لگا۔

"بہتر ہے کہ بندہ اس گھر میں کسی کو منہ نہ لگائے۔" زاریان پہلے ہی جلا بھنا تھا۔ مزید جل کر بولا۔

"ہاں... یہ تو بھائی آپ ٹھیک ہی کرتے ہیں۔" حورعین منہ پر ماسک لگائے لاؤنج کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھی کسی افریقن بھوتنی سے بات کرنے کا کوئی شوق نہیں..." ماسک کے پیچھے چھپی حورعین کی گوری رنگت اس خطاب پر چیخ ہی پڑی۔

"اوئے! میرے امریکن بھتیجے... تمہارا فون ہے... آج لگتا ہے کہ دماغ حاضر نہیں' جو میرے دواؤں والے شاپر میں اپنا موبائل رکھ دیا ہے۔" ابا جی... آدھی بجی بجھی بات سن کر اس پر چوٹ کرتے بولے۔

حورعین کو اپنے ہمراہ اکیڈمی لے جانے کے لیے ابا جی کے پیچھے پیچھے آتی پلوشہ نے زور سے قہقہہ مارا۔ زاریان خجل ہو گیا۔ پلوشہ ابا جی کے تایا زاد کی بیٹی تھی۔ سنہری رنگت والی' تیکھے سے نقوش والی پلوشہ اسے بڑی اچھی لگتی۔ موبائل پر آنے والی زید کی کال نے اس کی پلوشہ پر مرکوز توجہ ہٹائی تھی۔

"یار! کدھر ہو تم؟ واپس آؤ جلدی سے۔ ایک سکھ پارٹی کو ڈیل کرنا ہے۔ ان میں کوئی گل چرن سنگھ ہے۔ سن سینتالیس میں اس کی خالہ چک سینتیس میں یہیں پر رہ گئی تھیں۔ وہ اپنی خالہ سے ملنا چاہتا ہے۔ آجاؤ جلدی..." زاریان نے غصے سے فون بند کر دیا۔

"خیریت ہے..." ابا جی نے اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ اس نے ساری بات انہیں بتائی۔

ابا جی جوش میں آگئے۔ "بیٹا! چلو ملواتے ہیں۔ میں بھی سکھوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہیں نہیں پتا سینتالیس کے سن میں ملنے والے دکھوں کا..." ابا جی کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"ابا جی! سینتالیس کے دکھوں کو 2015ء کے جوان بھول گئے ہیں۔ انہیں کسی دکھ کا احساس تو دور کی بات' اس کے بارے میں معلومات تک نہیں۔"

"ہاں بیٹا! ٹھیک کہتے ہو... پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ہر دم دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ کیا حرج ہے اگر ہم ان کی مدد کر دیں؟" ابا جی نے زاریان سے کوئی بات منوانی ہوتی تو مذہب کا ٹچ دے دیتے۔ وہ مان گیا اور ابا جی کو لے کر زید کی طرف آگیا۔ زید کے حلیے کی طرف دیکھ کر ابا جی کے چہرے پر پھیلی ناگواری اور اس کے دل میں اترتی شرمندگی خواہ مخواہ بڑھ گئی۔

"یہ میراثی تمہارا دوست ہے؟" ابا جی اس کے کان کے پاس ہو کر بولے۔ زاریان ایک دم گڑبڑا گیا۔

"یار تم تو غصہ ہی کر گئے۔" زید خوش گوار لہجے میں بولا۔ "چلو آؤ... تمہیں گل چرن سنگھ سے ملواؤں۔" تین چار سکھوں کی طرف وہ انہیں لے گیا۔ میں تمہیں گاڑی اور ڈرائیور دے دیتا ہوں۔ تم انہیں مطلوبہ گاؤں تک لے جاؤ۔"

زید مصروف سے انداز میں بولتا دوبارہ موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سکھ حضرات زاریان سے اور ابا جی سے خوش دلی سے ملے۔ ان کے سلام کرنے پر تو ابا جی کھل اٹھے۔ نہ پرنام' نہ نمستے۔ مسلمانوں کو دیکھ کر انہوں نے ان ہی کے انداز میں سلامتی بھیجی۔ زید کا ڈرائیور ان کے پاس آگیا اور وہ لوگ گاڑی میں آبیٹھے۔ راستے میں گل چرن نے ابا جی کو بچھڑی خالہ کی کہانی سنائی۔

"ہماری ماسی صرف ادھر رہ گئی تھی۔ باقی سب انڈیا ہجرت کر گئے۔ بہنوں میں چھوٹی تھی۔ میرے ابا جی کا ان سے بڑا پیار تھا۔ مرتے سمے بھی اپنی بہن کو یاد کر کر کے روتے رہے۔ تب سے میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ میں جب بھی کبھی پاکستان گیا' اپنی ماسی سے ضرور مل کر آؤں گا۔"

ابا جی نے سن سینتالیس کے قصے چھیڑ دیے۔ سکھ برادران پورے راستے باتیں کرتے آئے۔ راستے میں انہیں ایک مشہور دکان سے سردائی بھی پلوائی گئی۔ زاریان ڈر رہا تھا کہ سکھوں کو چڑھ گئی تو اول فول بولیں

گے۔ پر ان پر بنے لطیفوں کے برعکس یہ کافی سلجھے ہوئے سمجھ دار سکھ لگ رہے تھے۔

خیر وہ لوگ مطلوبہ گاؤں تک پہنچ گئے۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے ماسی کا گھر بالآخر مل ہی گیا۔

ماسی کے ماشاءاللہ نو بچے تھے۔

جب تعارف ہوا تو سین دیکھنے والا تھا۔ "ہائے تسی پہلے آجاؤندے تے اماں نہ مردی" (ہائے... اگر آپ پہلے آجاتے تو اماں نہ مرتی۔) ماسی کا بڑا بیٹا روتے ہوئے بولا۔ وہاں ان نو بچوں میں سے کسی کی چھوٹی بیٹی کھڑی تھی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

ہاہاہا... "ابا وی سکھ ای اے" (ابا بھی سکھ ہی ہے۔) ایک دم سے ابا گڑبڑا گیا کہ سکھوں کے سامنے سکھوں کو ہی ٹانٹ (طنز) مار دیا ہے۔

گل چرن سنگھ کے منہ کے زاویے چند ثانیے کے لیے بدلے تھے مگر پھر وہ نارمل ہو گیا۔

لمحے بھر کی خاموشی نے وہاں کھڑے تمام نفوس کو شرمندہ کر دیا تھا۔

"لے ابا تو مروندا بن گیا نا۔" ابا جی نے ہنس کے زاریان کے کان میں کہا اور وہ اپنے ابا کو دیکھ کر ہولنے لگا کہ کہیں کوئی گل افشانی ادھر سے بھی نہ پھوٹ پڑے۔

"نی کون آیا اے... "اتنی گرمی میں... درجن بھر چوڑیوں سے بھرے بازو والی سانولے سے رنگ کی موٹی لمبی سی عورت ایک دم کہیں سے نکلی۔

"لے ماسی زلیخا دے انڈیا والے رشتہ دار تے میرے وی رشتہ دار ہوئے۔ (لو ماسی زلیخا کے انڈیا والے رشتہ دار تو میرے بھی رشتہ دار ہوئے۔)"

"کی سوغاتاں لیائے جے۔ (کیا تحفے لائے ہو۔)"

ایک میلے سے صافے کو پہنے ایک پتلا سا لڑکا بھی پیچھے سے برآمد ہوا۔ زاریان اور تذبذب کا شکار ہو گیا۔

"سوری گل چرن جی۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"کوئی بات نہیں زاریان صاب... ہم انڈیا پاکستان نہیں، ہم برصغیر کے لوگ ہیں۔ جنہوں نے ایک عرصہ غلامی کی ہے۔ آزاد وطن میں رہ کر بھی وہی سوچیں، وہی باتیں..." گل چرن سنگھ کے تبصرے نے ان سب پر گھڑوں پانی گرا دیا۔

"دراصل میں سکھ پائی جان نے میری چھوٹی کاکی کا غصہ نکالا ہے۔" ان میں سے ایک حضرت نے تبصرہ کیا۔ ماحول گرم ہو رہا تھا۔ گل چرن کے ساتھ کھڑا ایک اور سکھ گوبند سنگھ خاصا سمجھ دار تھا۔

"او چھڈو جی... سانوں تہاڈے نال مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" اس نے ساری اردو ایک سائیڈ پر رکھی اور پنجابیوں کے پنجابی اسٹائل میں آتے ہوئے خوشدلی سے ملا۔ "اپنوں کو شرمندہ نہیں کرتے۔ اپنوں کے رنگ میں اسی طرح رنگ جاتے ہیں۔" گوبند سنگھ کی بات پر کئی چہروں پر مسکراہٹیں ایک ساتھ نمودار ہوئیں۔

پھر خوشگوار ماحول میں کھانا بھی کھایا گیا۔ باتیں بھی ہوئیں۔ تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔ ماسی پر آنسو بھی بہائے گئے۔ ایک خوشگوار دن کا اختتام ہوا۔

رات کو جانے لگے تو عورتیں یوں زار و قطار رو رہی تھیں۔ جیسے ماسی کے رشتے دار صدیوں سے یہیں مقیم تھے اور اچانک جانے کی وجہ سے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ صبح والے تند و ترش جملے کسی کے ذہن میں نہ تھے۔ ابا بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ واپسی کے راستے پر...

"تمہاری نوکری بری نہیں... بہت سارے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ زندگی کے بہت سے رنگ سیکھنے کو ملتے ہیں۔" ابا کے تبصرے پر وہ کھل کر مسکرایا۔ ورنہ اس کے ادبی ذوق نے ابا کی نظر میں اسے خاصا بے ادب کر دیا تھا۔

"پر بیٹا جی... کچھ اور کام بھی کرو... زندگی کے مسائل اور وسائل دونوں ہی حجم کے لحاظ سے خاصے بڑے ہیں۔" اس نے سعادت مند بیٹوں کی طرح سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

گھر آئے تو پھپھو، بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔

کافی عرصہ سے ان کے ساتھ بول چال بند تھی۔

زاریان ابا کی طبیعت کو جانتا تھا۔ انہوں نے فوراً" کمرے کی طرف بڑھ جانا تھا۔ پھپھو کو مکمل نظرانداز کرکے.... اور یہ "عمل یقیناً" پھپھو کے لیے خاصا تکلیف دہ بھی تھا۔ اس کے دل میں یہ سوچ کر ہی منوں بوجھ پڑ گیا۔ پر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ابو سارے گلے شکوے بھلائے پھپھو سے مل رہے تھے۔

"ابا جی نے کوئی مووی تو نہیں دیکھ لی.... جذباتی سی....“ عون نے اس کے کندھے سے سر نکال کر حیرت سے پوچھا۔ وہ بھی غالباً" ابھی گھر آیا تھا۔

"آج تو ابا.... ابا ہی نہیں لگ رہے۔" حورعین کے اونچی آواز سے کیے گئے تبصرے پر اسے اماں کی طرف سے ایک دھپ بر سید ہوئی تھی۔

ابا مسکرا رہے تھے۔

سدا کے غصے والے.... انا پرست ابا کا اچانک ردعمل.... وہ بھی اتنا خوشگوار.... سارے بچوں کو چونکانے کے لیے کافی تھا۔

"یہ ہمارے ہی ابا ہیں نا؟" عون نے دوبارہ پوچھا۔

پچھلی دفعہ جس طرح پھپھو روتے ہوئے گئی تھیں اور ابا کے اونچے جملے جو سلوک ان کے ساتھ کیا تھا۔ وہ سارے بہن بھائی اس پر افسردہ تھے۔ لڑائی پھوپھا جی سے تھی اور ابا ناراضگی پھپھو پر نکال رہے تھے اور لڑائی بھی فضول بات پر کہ عمرے کے لیے جانے والے گروپ میں پھپھا جی نے ابا کو کیوں نہ شامل کیا۔

"میں نے اپنے سکھ بھائیوں سے سیکھا ہے کہ اپنوں کے رنگ میں رنگ جانے سے ہی اصل خوشی ملتی ہے۔"

سب خوش تھے۔

اور زاریان سوچ رہا تھا کہ سکھ برادران پر لطیفے بنانے والے اور مذاق اڑانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہر بندے پر زندگی کے سارے ہی رنگ اترتے ہیں۔ عقل مندی کے.... بے وقوفی کے.... افسردگی کے.... خوشی کے.... ہم کہاں کے عقل مند ہیں؟

جیسے اس کے ابا جی، جو پھپھا جی سے صرف اس لیے ناراض ہوئے کہ عمرے جانے والے گروپ میں ان کی بہن کو اور انہیں کیوں نہ شامل کیا۔ پھر اسی بہن پر اس کے خاوند کا غصہ نکالتے رہے۔

اس نے زید کو ساری بات بتائی تاکہ وہ افسانہ لکھ لے، بے چارے کو نئے نئے موضوع چاہیے ہوتے ہیں۔

"یار زاریان! کوئی بندہ اگر یہ سوچ لے کر سکھ کوئی ذات نہیں بلکہ ہم سب کے اندر ایک سکھ چھپا بیٹھا ہے.... ہم سب کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں سکھ بن جاتے ہیں تو کبھی بھی ہم دوسروں کا مذاق نہ اڑائیں۔"

بظاہر حلیے سے بقول اس کے ابا کے میراثی نظر آنے والے اس کے دوست نے بات بڑی گہری کردی تھی۔

اب آپ لوگ سوچیں کہ کہیں آپ لوگ میں تو کوئی سکھ نہیں، کہیں آپ لوگوں کے اندر تو کوئی سکھ نہیں چھپا بیٹھا؟

نو اسموکنگ والی جگہ پر اسموکنگ کرتا سکھ....

نو پارکنگ والی جگہ پر پارکنگ کرتا سکھ۔

چار ماڈرن فرینڈز کے درمیان بیٹھ کر اپنے سے کم تر کو دیکھتے ہوئے (اسمائل) پاس کرتا سکھ....

ایک ساتھ اسٹوڈیو کے سامنے والے گھر سے کسی نے کبوتر اڑائے تھے اور وہ گروپ میں اونچی اڑان بھرتے ہوئے آسمان کی وسعتوں کو چھونا چاہتے تھے۔

"ہم تب تک بحیثیت قوم ایک اونچی اڑان نہیں بھر سکتے تھے جب تک ہماری سوچ اونچی نہیں ہو جاتی۔" وہ افسردگی سے سوچتا رہ گیا۔

ٹوں ٹوں.... اس کا موبائل بجا.... دوست کا میسج تھا۔

"ایک دفعہ دو عورتیں بس میں باتیں کر رہی تھیں، پیچھے ایک سکھ بیٹھا تھا۔" پتا نہیں اس سے آگے کیا تھا۔ اس نے میسج پورا پڑھے بغیر ڈیلیٹ کرکے موبائل جیب میں ڈال لیا۔

ھاجرہ ریحان

فریب

کسی کی نظروں میں آنا کیسا لگتا ہے' یقیناً" بہت اچھا لگتا ہے... مگر اس کو دیکھ کر... یہ دیکھ کر کہ وہ مجھے بڑے غور و خوض سے دیکھ رہا ہے' مجھے کچھ خاص اچھا نہیں لگا۔ میں نے ناگواری سے منہ پھیر لیا' مگر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی نظریں ابھی بھی مجھ پر ہی ٹکی ہوئی ہیں... آج اتنے سالوں کے بعد اس سے اچانک ٹکراؤ ہو جانا میرے لیے پھر سے ایک آزمائش بن گیا تھا۔ مجھے کب تک انجانے میں کیے گئے قتل کی سزا ملتی رہے گی میرے مالک...! میں نے تڑپ کر دل ہی دل میں سوچا... معاف بھی کر دے میرے مالک! کیا اب تک میں نے کم سزا بھگتی ہے... کہ یہ پھر سے میرے سامنے ایک نئی سزا بن کر آگیا ہے۔ میں دکھ سے بھری بیٹھی ہوئی تھی کہ میرے برابر میں کرسی گھسیٹ کر وہ بیٹھتے ہوئے چہکا۔

"ابھی تک ویسی ہی رونی صورت ہے تمہاری۔"

میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا... یہ کیسا سنگ دل انسان ہے۔ اس قتل میں وہ برابر کا شریک رہا ہے میرا... لیکن کیسے خوش و خرم نظر آرہا ہے جیسے اس کو یاد ہی نہ ہو اس قتل کے بارے میں... میں اٹھ کر جانے کے لیے پہلو بدلنے لگی تو اس نے میری کہنی کو چھوتے ہوئے ہلکے سے کہا۔

"بیٹھ جاؤ... میں بس چند لمحے ہی لوں گا... جانتا ہوں کہ ناپسندیدہ ہوں تمہارے لیے مگر برائے مہربانی بس چند لمحے..."

میں نے اپنے اردگرد دیکھا... میں اپنے بڑے بھائی کے بچوں کے ساتھ اس آرٹ گیلری میں آئی ہوئی تھی اور اب تھک کر' ایک طرف کونے پر جو کرسیاں پڑی تھیں' ان میں سے ایک پر براجمان تھی۔ وقت گزر چکا تھا۔ اب مجھ میں زیادہ دیر کھڑے رہنے کی ہمت کم ہی رہ گئی تھی۔ لہٰذا بچے مجھے یہاں بٹھا کر خود آگے بڑھ گئے تھے... میں کہاں تھی... کہاں آگئی ہوں... اس کی موجودگی... یوں میرے قریب بیٹھ جانے پر' نہ جانے کیوں پھر سے وہ سب یاد آنے لگا تھا جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہو... کیا واقعی میں نے صدیاں گزار دیں یا یہ کل کا ہی قصہ ہے۔

میرے لیے تو اس کے دو میٹھے بول ہی کافی تھے مگر وہ تو پوری تقریر کر گیا تھا... میں دم بخود رہ گئی... جب اس نے مجھے میرے بازو سے پکڑ کر تقریباً" گھسیٹتے ہوئے لے جا کر اپنی بہن کے بالکل پاس بٹھا دیا تھا۔ میں کیسی شرمسار تھی۔ خود سے بھی اور اس کی بہن سے بھی جو دلہن بنی کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے دلہن کی بے بسی پر بھی افسوس تھا مگر کیا کرتی کہ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ جب اس نے مجھے اسٹیج پر جا کر سلامی دینے کا مشورہ دیا تو میری اس بات پر کہ میرا سایہ بھی نئی نویلی دلہن کے لیے اچھا نہیں۔ اس کو غصہ آگیا تھا۔ اس نے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا کہ اس طرح کی دقیانوسی باتوں پر وہ یقین کم ہی کرتا ہے اور نہ ہی مجھے کرنا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کسی نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں اور طلاق کوئی بیماری نہیں کہ قریب بیٹھنے سے

لگ جائے۔

اور پھر جو ہوا وہ سب نے دیکھا۔ مجھے شادی میں شرکت کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ میری ہی غلطی تھی... اور پھر میں جو بہت ہمت کر کے بڑی جدوجہد کے بعد پھر سے رشتہ داروں کا سامنا کرنے نکلی تھی۔ اپنی ہمت کھو بیٹھی... چھپ گئی... گم ہو گئی... مگر اس نے کھوج نکالا... جیسے اس کو میری کمزوری سے ضد ہو گئی تھی... پہلے پہل تو صرف میسج آتے رہے...



سلام دعا اور کچھ ادھر اُدھر کی باتیں' مگر پھر گپ شپ ہونے لگی... اس کا آفس کافی دور تھا آنے جانے میں بہت وقت لگتا' وہ آفس کی گاڑی میں بیٹھ کر تمام وقت مجھے دیتا اور اکثر راتوں کو بھی جگاتا... اس نے ہمیشہ ایک مخلص دوست کی طرح مجھ سے باتیں کیں۔ کبھی کوئی غلط بات نہیں کی اور میرے لیے اس کی دوستی بہت اہم ہوتی چلی گئی۔ میرے پاس تھا ہی کیا اس کی دوستی کے سوا... ہر کسی نے یہاں تک کے گھر والوں تک نے تو ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں گھر پر ہو کر بھی ان سب کے لیے تھی ہی نہیں۔ کام سب میرے ذمے لگ گئے تھے

مگر میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں نے جو گناہ یا جو خطا کی بھی نہیں تھی اس کی سزا بڑے تحمل سے برداشت کر رہی تھی۔ پھر بھی میں خوش تھی کہ مجھے گھر سے بے دخل تو نہیں کیا' شکر ہے کہ سر پر چھت ہے... اور ایک دوست... زندگی پھر سے اپنا رستہ بنا رہی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میرے گھر والوں کو وہ کچھ زیادہ پسند نہیں... ہمیشہ سے اپنی الگ سوچ رکھنا اور خاندان کے بڑے بوڑھوں کو احساس دلاتے جانا کہ نئے زمانے میں' جو خاندانی روایات ہیں' ان میں ردوبدل ضروری ہے۔ اسے بھی کچھ کم بدنام نہیں کر چکا تھا۔ مگر وہ پڑھا لکھا تھا۔ اچھا کماتا تھا۔ دو چھوٹی بہنوں کی اچھی جگہ شادی کر چکا تھا اور خود بھی شادی شدہ تھا۔ اس کی اپنی ایک الگ شناخت تھی اور میرے گھر والے جو ہمیشہ سے خاندانی روایات اور طور طریقوں سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے... اس کی شخصیت میں کجی محسوس کرتے تھے۔

اس کی بیوی جس کو میں بھابی کہتی تھی' کچھ دن ہی اس کے ساتھ رہ کر اپنے میکے جا کر بیٹھ گئی تھی۔ تمام خاندان میں مشہور تھا کہ قصوروار وہی ہے۔ جس کی ایسی عادتیں ہوں' اس سے بھلا کون نبھا کر سکتا ہے۔ میں جب تک اس کو جانتی نہیں تھی' اس کے بارے میں ایسے ہی سوچتی تھی جیسا کہ میرے گھر والوں کا

خیال تھا بلکہ میرے لیے تو اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو جب میری اس سے باتیں ہونے لگیں تو اندازہ ہوا کہ وہ کیسا ہے... ایک حساس اور نرم دل انسان... جس کو کسی بھی انسان کو دکھ دینے سے ہی خوف محسوس ہوتا ہو... جس کے لیے سب سے بڑی بات یہ ہو کہ وہ حق بات کہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا کہ...

"اگر آپ اتنے ہی اچھے ہیں تو بھابی کیوں ناراض ہو گئی ہیں؟"

اس نے بات گول مول کر دی اور مجھے کچھ شک ہوا کہ وہ مجھے سچ بتانے سے گریزاں ہے۔ ایک کسک سی بھی دل میں کہیں اٹھی تھی۔ مگر پھر اپنی حیثیت یاد آ گئی

اور میں توبہ توبہ کر کے کاموں میں لگ گئی... اب میرے لیے کسی کی بھی خواہش کرنا اور کسی کے بھی خواب دیکھنا ناممکن ہے... میری ایک ایک بات کو وہ پکڑ لیتا اور پھر اس کے لمبے لمبے لیکچر شروع ہو جاتے۔ میں ہنستی جاتی اور وہ بڑی سنجیدگی سے مجھے سمجھاتا رہتا۔

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کوئی ہے جو میرے لیے بھی پریشان ہوتا ہے۔ جس کو میری تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ کسی کام کا بہانا بنا کر میں اس کے لیکچر سے جان چھڑا لیتی... مگر گھنٹوں کام کے دوران اس کی باتوں کو یاد کر کر کے خوش ہوتی رہتی' زندگی ہے۔ بس اور کچھ نہیں چاہیے تھا مجھے... بس اتنا ہی کافی تھا... یہی بہت تھا... مگر اس نے میری ایک نہیں سنی... اور اپنی ماں کو رشتہ لے کر بھیج دیا۔

میرے گھر پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ تمام بھائی' بہن اپنے مورچے سنبھالتے گولہ بارود سے لیس سامنے آ گئے۔ اس کی والدہ کو تو سوچ کر جواب دینے کا کہہ دیا گیا جبکہ مجھ پر باقاعدہ حملے ہونے لگے اور ہر لمحے مجھے ایک نہایت سفاک اور خودغرض انسان کا خطاب دیا جانے لگا۔ جس نے پہلے گھر والوں کو بدنام کیا کہ اپنا گھر اجاڑا اور اب کسی معصوم لڑکی کا گھر اجاڑنے چلی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے بھی

کیا سوچ رکھا ہے۔ میں خود بھی یہ سب نہیں چاہتی تھی۔ اس نے نہ تو مجھے اپنی بیوی کے بارے میں بھی اعتماد میں لیا تھا اور نہ ہی میں اس سے ضد ہی کر سکی تھی۔

ایسے میں مجھے خود سے گھن آنے لگی... میں بستر سے جا لگی۔ سانس تو لیتی رہی مگر جان جیسے ختم ہو چکی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں نے ایسا کیسے ہو جانے دیا۔ میں کیوں نہیں روک سکی خود کو' کیسے میں جذبات میں آ کر بے قابو ہوتی چلی گئی اور بات اتنی بڑھا کر اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

میرے گھر والے کافی حد تک درست تھے۔ میں اپنا گھر اجاڑ کر اب کسی اور کا گھر اجاڑنے چلی تھی۔ مجھ پر

یہ بات بہت بھاری پڑ گئی تھی اور میں جھکتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے کئی دن تک مجھے فون کیے اور بھی طریقوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں خود میں ہمت ہی نہیں پا رہی تھی کہ اس کا سامنا کروں یا اس سے بات کروں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس کے سسرال تک بات پہنچ گئی اور ایک دن مجھے یہ خبر ملی کہ اس کی بیوی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے۔ میں بوجھ تلے دب گئی۔ یہ کیسا ظلم کر دیا تھا میں نے' کسی انسان کی جان چلی گئی۔ کیا قتل صرف اوزار کے استعمال سے ہوتا ہے۔ نہیں... نہیں... ایسے بھی قتل ہوتا ہے۔ میں نے کر دیا قتل... کسی انسان کی جان لے لی میں نے۔

میں اس حد تک بیمار ہو گئی کہ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا مگر افسوس میں اس کی بیوی کی طرح بہادر نہیں تھی... میں پھر بچ گئی اور زندہ رہ کر اپنی شرمندہ زندگی کو سہتی چلی گئی۔ میرے گھر والوں نے میرا باقاعدہ بائیکاٹ کر دیا اور جو بچی کھچی عزت تھی وہ بھی چلی گئی۔ اب میں صرف ایک قاتل تھی... اور قاتل کسی بھی رحم کا مستحق نہیں ہوتا... جو سزا کاٹ کر میں اب اپنے بھائی بہنوں کے بچوں میں پناہ پا چکی ہوں۔ کیسے بھول جاؤں کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں... مجھے تو اپنا آپ یاد ہی نہیں رہا ہے۔ خود کو بس ایک قاتل محسوس کرتی رہی ہوں... میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیا سمجھا تھا میں نے آپ کو... ایک دوست... ایک اچھا انسان... مگر..."

وہ مسکرا اٹھا۔ "ہاں ہاں آگے کہو... میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شکایت کرو... کوئی غصہ... کوئی گالی... کچھ کھری کھری ہی سنا ڈالو۔"

میں منہ پھیر کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے سے پتا ہوتا کہ آج اس سے ملاقات ہونی ہے تو میں کچھ جملے ہی سوچ کر آ جاتی۔ لے آتی ساتھ... میں تو کب سے بولنا چھوڑ چکی ہوں' اب اچانک کیسے بات کروں۔

"افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کے جرم میں برابر کی شریک ہو چکی ہوں میں... خود کو مجرم... قاتل سمجھتی رہی ہوں اب تک..."

اس کے منہ سے حیرت بھرے کچھ کلمات نکلے... جیسے وہ سمجھ ہی نہ پا رہا ہو کہ میں کیا بات کر رہی ہوں... میں نے لمبی سانس بھر کر پھر سے کہنا شروع کیا۔

"اپنی بیوی کے زہر کھا کر مر جانے کو آپ کس طرح لیتے ہیں؟ کیا وہ آپ کی ذمہ داری نہیں تھی؟ اس نے زہر کھا کر خودکشی نہیں کی' اس کو قتل کیا گیا ہے۔ آپ نے اس کی جان لی ہے... آپ ایک قاتل ہیں اور میں آپ کے ساتھ آپ کے اس جرم میں برابر کی شریک ہوں میں..."

"یہ تم کیا پاگلوں والی بات کر رہی ہو؟" وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے پہلو بدلا' اِدھر اُدھر دیکھا جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ کوئی اور تو ہماری گفتگو نہیں سن رہا۔ میں طنزاً مسکرا اٹھی۔

"کیوں' سچ سے ڈر لگتا ہے؟ مگر خدا کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں... میں نے... آپ نے جو بھی کیا اس کی سزا ہم یہاں بھی بھگتیں گے اور وہاں بھی... یہ کوئی معمولی بات..."

"تم بالکل ہی پاگل ہو چکی ہو کیا؟" وہ پھر میری بات

کاٹ کر چلا آیا۔

"بے وقوف عورت... کیا اس بات پر تم مجھ سے اب تک چھپتی رہی ہو؟ میں نے تمہارے بھائی اور پھر تمہاری بڑی بہن کو سب کچھ بتایا تو تھا... کیا ان لوگوں نے تم کو کچھ نہیں بتایا؟"

میں حیرانی سے اس کو تکنے لگی۔ یہ اب کون سا تماشا کرنے جا رہا ہے میں خود میں گم ہو گئی تھی کہ وہ پھر سے گویا ہوا۔

"سکینہ نے خودکشی میری وجہ سے نہیں کی۔ اس کے گھر والے اس کی بات نہیں مان رہے تھے، اس لیے کی... اس کو کوئی پسند تھا، اس کے گھر والوں نے زبردستی اس کی شادی مجھ سے کروادی تھی۔ سکینہ نے جب مجھے تمام روداد سنادی تو میں نے اس کو اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہے تو میں اس کو چھوڑ دوں گا، وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ شادی کرلے... اور میری اجازت لے کر ہی وہ اپنے میکے گئی تھی... مگر چھ مہینے گزرنے کے بعد بھی اس کے گھر والے نہیں مانے، جس پر اس نے خودکشی کرلی۔ اس سے میرا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ یہ اس کے اپنے گھر والوں کا ظلم تھا، جس کا سکینہ نشانہ بن گئی اور مجھے اس کی موت کا دکھ ضرور ہے مگر میں کسی بھی طرح سے خود کو اس کا قاتل نہیں سمجھتا۔ میں اس پر زبردستی کرکے اس کو کبھی بھی بیوی بنا کر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے تو وہی کیا جو مجھے ٹھیک لگا اور یہ بات، میں نے اپنی والدہ کو جب بھیجا تھا تو اس سے پہلے ہی تمہارے بڑے بھائی کو فون پر بتادی تھی اور پھر سکینہ کے انتقال کے بعد میں تمہاری بڑی بہن کو بھی سب دوبارہ سے بتا چکا تھا۔ مگر تم نے ایک دفعہ بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر تم ایسی چھپ گئیں کہ میں ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ مجھے تو تم سے بس یہی پوچھنا ہے کہ آخر تم کو ایسا کیا مجھ پر غصہ آگیا تھا کہ یوں غائب ہو گئیں؟"

میں سب سن کر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی... زندگی نے اب اس عمر میں لا کر مجھے کیوں یہ سب دکھایا ہے۔ میں اس موڑ پر آکر کیوں آزاد ہو گئی ہوں۔ جیسے میری پرواز مکمل ہوئی۔ مجھے سر اٹھانے کی اجازت ہے، نظریں ملانے کی اجازت ہے۔ اتنے دنوں تک کچھ لوگوں نے مجھے میرے ناکردہ گناہ پر دبوچے رکھا۔ میرے پروں کو کاٹ کر مجھے پرواز سے باز رکھا اور اب جبکہ میرے اندر ہمت ہی نہیں رہی تو مجھے پنجرے سے آزادی مل گئی۔ میں جذبات کے زیر اثر نہ جانے کب کھڑی ہو گئی تھی اور باقاعدہ ڈول رہی تھی۔ اس نے میرے بازو کو تھام رکھا تھا۔ میں حیرانی سے اس کو تکنے لگی اور پھر میرے منہ سے نکلا۔

"میں کہاں تھی اور کہاں آگئی ہوں۔"

وہ ڈبڈباتی آنکھیں لیے دھیرے سے مسکرا رہا تھا۔

ہم دونوں ہی وقت کے ہاتھوں کھلونا بنے رہے اور اب اپنے اپنے کھیل کے اختتام پر کیسے ایک دوسرے کو تھامے کھڑے تھے۔ میں بھی مسکرانے لگی۔

"تم جہاں سے بھی چلی تھیں، پہنچی مجھ تک ہی ہو... جہاں بھی تھیں، مجھ تک ہی آئی ہو، بس اب یہ دھوپ چھاؤں... چھپن چھپائی کا کھیل ختم کرو... میں نے ہار مان لی ہے۔ میں اب تھک گیا ہوں تم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے... چھوڑو... آؤ اب مجھ سے دوستی کرلو... ابھی بھی کچھ ایسی دیر نہیں ہوئی... ہم زندہ ہیں... ہمارے دل اب بھی دھڑکتے ہیں۔ ہم سانس لیتے ہوئے چلتے پھرتے ہیں، کیا بس اتنا کافی نہیں؟"

وہ بہت محتاط انداز میں مجھے بہلا رہا تھا۔ میں زندگی کے اس موڑ پر پھر سے کھڑی تھی جہاں سب کچھ حاصل ہو جانے کی خوشی سے زیادہ خوف غالب تھا۔ ایک ہاتھ کے فاصلے پر وہ کھڑا ہے۔ بس... مگر...

"مگر... دنیا... لوگ... ہم کیا کریں گے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ شرارت سے مسکرا اٹھا۔

"میں سب سنبھال لوں گا... مگر اب کی بار مجھ سے چھپنا نہیں... میرا اعتبار کرنا۔" اس نے دھیرے سے مجھے میرے بازو سے پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھا دیا تھا۔

خود کو کسی کی پناہ میں دے دینا کیسا لگتا ہے... یقیناً بہت اچھا لگتا ہے۔

☼

صدف ریحان گیلانی

مثل مہتاب ہیں ہم

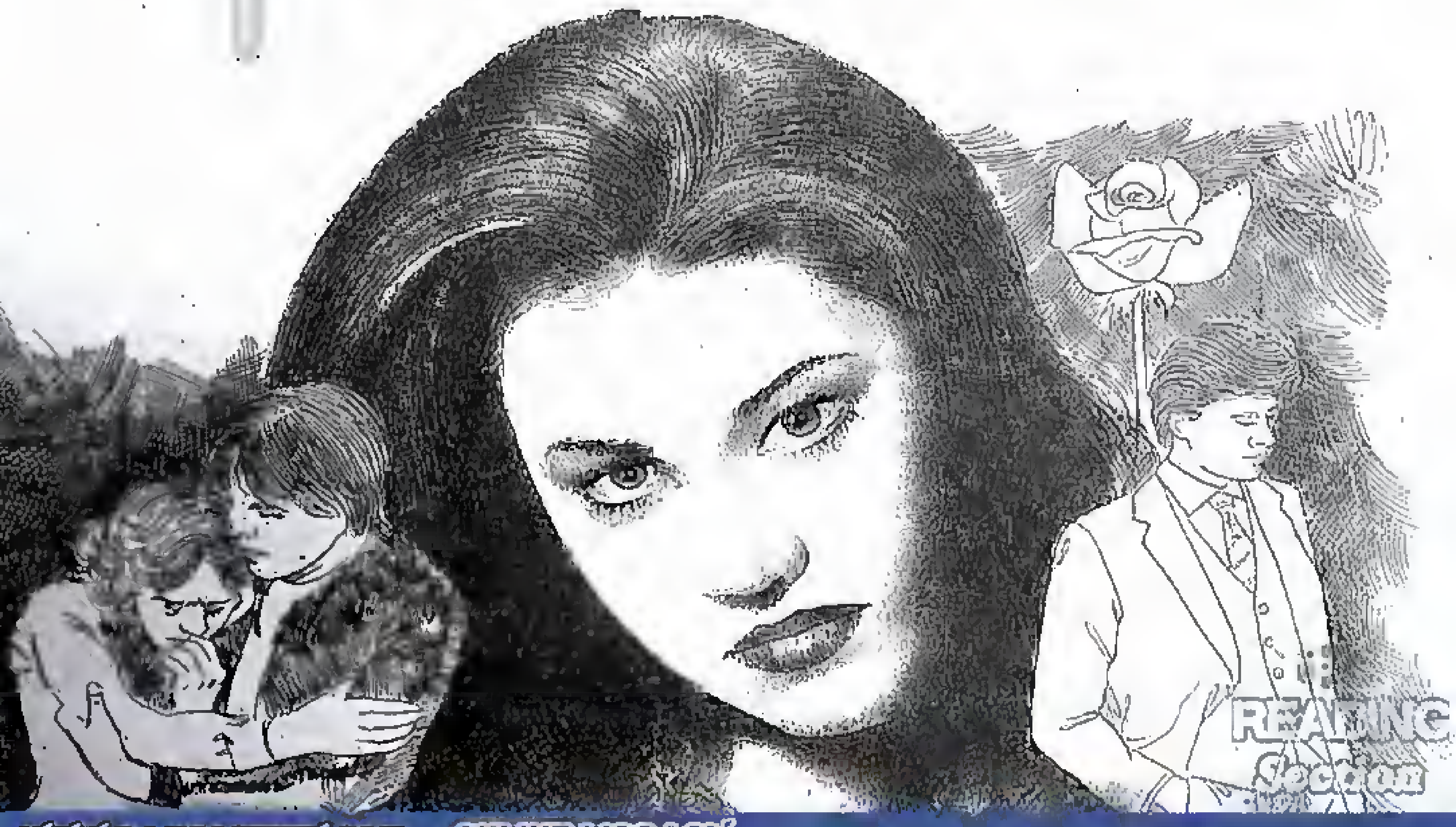


جاتی سردیوں کی خنک سی شام اپنے مزاج کی سختی اور روکھے پن کے قطعاً" برعکس نہایت پرلطف اور یادگار رہی تھی۔ شہر کے عین وسط میں بے حد مصروف شاہراہ پر واقع ریسٹورنٹ کے فرسٹ فلور پر بنے فیملی کیبن جو ہزاروں منچلوں کی رنگین و دلربا شاموں کے گواہ تھے۔ ان میں وہ بھی تھا۔ ایسا بھی نہ تھا کہ وہ بہت آوارہ منش یا دل پھینک قسم کا نوجوان تھا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا' ہمارے آج کل کے ننانوے فیصد جدت پسند' عام نوجوانوں جیسا۔ وہی خود نمائی کا شوق خالی خولی شوشا کا تڑکا' پھس پھسی پھوں پھاں کا رعب جن کی شکل ذرا اچھی ہو تو خود کو "بالی" کے کسی ہیرو سے کم نہیں سمجھتے اور اگر سونے پر سہاگہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ آجائے تو سمجھو بات "ہالی" تک چلی گئی اور اگر جیب میں اپنی کمائی کے چار پیسے بھی آنے لگیں تو پھر تو "ہالی" والے بھی بچارے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ (ان کو خوابوں میں)

جبکہ وہ کسی ایسی اونچی پوسٹ پر بھی نہ تھا کہ "عیاشیاں" کرتا پھرتا' کہنے کو سارا زمانہ جانتا تھا وہ کسی بڑے ہوٹل میں منیجر ہے مگر اندر کی بات یا تو وہ جانتا تھا یا پھر دور کے یار دوست' قریب کے اس لیے نہیں کہ وہ بے چارے اس ہوٹل میں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بھی فائدہ تھا' کیوں کہ اس طرح کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ منیجر صاحب خود روم سروس دینے جاتے ہیں۔ اتنے اچھے بااخلاق منیجر صاحب کہیں ہوں گے بھلا..... نہیں ناں' تو بس یوں عزت بنی ہوئی تھی۔

جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں لڑکیوں سے دوستی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا تو بس وہ بھی دیکھا دیکھی اس رنگ میں رنگتا گیا۔ خوب مزا رہتا' یار دوستوں میں ناک مزید اونچی ہو جاتی۔ کالر اور اکڑ جاتا بڑے گر کی باتیں تھیں یہ' جو وہ خوب سیکھ گیا تھا۔ حالانکہ جس علاقے و محلے سے اس کا تعلق تھا وہاں تو ایسی حرکتوں پر دفعات لگ جاتی ہیں' ہڈیاں توڑ دی جاتی ہیں۔ غیرت کے مسئلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں (ہر کام ہر جگہ ہو رہا ہے' بس کھلے بندوں نہ کرے کوئی) تو وہ بھی سیانا ہو گیا تھا۔ اپنے محلے والوں کے سامنے وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ پوری دنیا میں اس سے زیادہ شریف کوئی نہیں۔ وہ بڑا مطمئن سرشار' نئی ملاقات کے نشے میں سرشار وہ

ناولٹ



بائیک پر آہستہ روی سے آرہا تھا۔ علاقے کی لائٹ حسب معمول اس وقت ندارد تھی۔ اکا دکا کسی خوش نصیب گھر سے روشنی کھڑکیوں' دروازوں سے لکیروں کی صورت باہر ادھار کے اجالے بکھیر رہی تھی۔

اپنے دھیان میں گنگناتے ہوئے اس نے گلی کا موڑ کاٹا تھا اور بالکل اچانک سامنے آنے والی ہستی کو بچاتے بچاتے خود تو زمین بوس ہوا ہی تھا وہ بھی بچنے کی کوشش کرتی' پیچھے جا گری تھی۔

"او مائی گاڈ!" اتنا اچانک ہوا تھا یہ سب کہ چند ثانیے کو تو حواس ہی مختل ہو گئے۔ مگر وہ جلد ہی تیزی کی سی تیزی سے اٹھا اور اسی اٹھنے میں خبر ہوئی کہ کہیں گڑبڑ ہو گئی ہے لیکن وہ اپنی تکلیف بھلائے چادر میں چھپے وجود کی طرف لپکا جو ابھی اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جی میں تو آئی کہ ہاتھ بڑھا کر منع کر دے مگر وہ ایسا کر نہ پایا۔

"سوری' ویری سوری۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔"

قسم خدا کی اگر اس جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو وہ اس صورت حال پر اسے ایسی ماں بہن یاد کرواتا کہ الامان مگر سامنے ایک لڑکی تھی اور وہ سدا کا نرم دل۔ اگر وہ لڑکی بدصورت بھی ہوتی تو سو گناہ معاف کر دیتا۔ برابر کی قصوروار تو وہ لڑکی بھی تھی آدھی رات کو عین سڑک پر مٹرگشت کرنا کہاں کی عقل مندی ہے بھلا۔ مگر وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور الٹا اسی سے معافیاں مانگنے لگا۔

اتنی خراب صورت حال میں بھی کمال کی بات تھی' اس لڑکی نے چادر کو اپنے چہرے سے سرکنے نہیں دیا تھا۔ خود کو سنبھالتی کھڑی ہوئی تو بے اختیار ہتھیلی سامنے پھیلائی مٹی میں لت پت جو کہ اچھی خاصی چھل چکی تھی۔

"اوہو... آپ کو تو بہت زیادہ چوٹ آئی ہے۔"

باذل کا بس نہ چلا کہ نرم وگداز ہاتھ تھام لے۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔ غلطی میری تھی سوری تو مجھے کرنا چاہیے۔ آپ تو بائیک سمیت گرے ہیں' چوٹ تو آپ کو آئی ہوگی۔"

اوہ کوئی لطیف ٹھنڈا و میٹھا جھرنا سا پھوٹ پڑا تھا گویا۔

"نہیں' نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں البتہ آپ کو ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے' یہ آپ کا ہاتھ۔" اس نے لڑکی کے ہاتھ کو دیکھا جو وہ چادر سے صاف کر رہی تھی۔

"اوہو۔ ایسے مت کریں زخم اور چھل جائے گا۔"

وہ یوں کراہا گویا اس کے زخم کو رگڑا گیا ہو جبکہ لڑکی کوئی جواب دیے بنا چل پڑی اور یہ دیکھ کر تو باذل کے اوسان اڑان بھرنے کو ہوئے کہ وہ بمشکل دو قدم چل پائی تھی پھر کراہتی وہیں کھڑی ہو گئی۔

"اوہ آپ کے تو پاؤں پر بھی چوٹ آئی ہے۔ آپ کیسے جائیں گی' کہاں ہے آپ کا گھر؟"

اسے تذبذب میں دیکھ کر باذل نے یہی بہتر سمجھا کہ چند لمحے دے دیے جائیں۔ وہ لنگڑاتا بائیک تک آیا جسے سیدھی کرنے پر پتا چلا کہ وہ ان سے بھی زیادہ "انجرڈ" کا شکار ہو چکی تھی۔ "اللہ کی رحمت ہی ہو گی جو اگر اب یہ اسٹارٹ ہو جائے۔" وہ جائزہ لیتا سوچ رہا تھا۔

"پلیز اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کسی سواری کا انتظام کر دیں' میری مما کی طبیعت ٹھیک نہیں' انہیں ہسپتال لے جانا تھا اسی لیے گھر سے نکلی تھی میں اس وقت۔" وہ بے چاری روہانسی ہوتی اسی سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گئی تھی اور باذل نے تو دل و جان ہتھیلی پر رکھ لیے۔ صد شکر یہ کہ بائیک ہوش میں آ گئی۔ سو لاتیں مارنے کے بعد وہ لپک جھپک چنگ چی پکڑ لایا۔

اتنے عرصے میں وہ جانے کیسے شگفتہ خالہ کے دروازے تک پہنچی تھی اسے آتے دیکھ کر مما کو لے آئی۔ انتہائی خوب صورت و پروقار خاتون مگر بے حد نڈھال سی ان کی طبیعت واقعی بہت خراب لگ رہی تھی۔

"بہت شکریہ بیٹا تم تو اس وقت ہمارے لیے فرشتہ بن کر آئے ہو۔" وہ ان کو سہارا دینے آگے بڑھا تھا کہ ان کے الفاظ نے شرمندہ کر ڈالا۔ کچھ بولا ہی نہ گیا مارے خجالت اور احسان مندی کے۔ اب تو یہ ہو نہیں

سکتا تھا کہ یوں رات کے وقت دو معزز خواتین کو اس پریشانی کے عالم میں اکیلا چھوڑ دیتا۔ آخر اخلاقیات کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں' سو وہ پیچھے ہی ہولیا۔

وہ انہیں نزدیکی ڈاکٹر کے کلینک پر لے آیا اور جب تک ان کا ٹریٹمنٹ نہ ہو گیا وہیں رہا بلکہ باہر آکر سواری بھی ڈھونڈ کردی۔

آج کی شام ہی نہیں رات بھی بہت یادگار رہی تھی۔ اس کی مما کی بہت سی دعائیں اور اس کی جھکی پلکوں کو صرف ایک بار خود پر اٹھا دیکھنے کی خواہش اور دائیں ٹانگ میں انتہا شدید درد لے کر گھر پہنچا تو ابا جی' حکیم اظہار الدین رزاقی صاحب پوری طرح مورچہ بند ہو کر اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

پھر تو دن بھر میں کی گئی نیکیاں بھی رائیگاں جاتی لگنے لگیں کوئی عمل دیوار نہ بن سکا۔ اس کی کوئی بھی صفائی' وضاحت' تاویل سنے بغیر انہوں نے وہ لتے لیے' ایسے ایسے گولے داغے کہ اللہ کی پناہ۔ پھر تو اسے اندازہ کرنا مشکل ہو گیا کہ ٹانگ کا درد زیادہ شدید ہے یا اس دکھ کی اذیت جو اسے یہ محسوس کر کے ہو رہی تھی کہ کمینے ترین بہن بھائی کھڑکیوں' پردوں کے پیچھے سے جھانکتے اس کی ریکارڈ بے عزتی کا نظارہ کررہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

دو دن تو ٹانگ کے درد نے ہلنے نہیں دیا تھا دوائیاں' سکائیاں حتی کہ دادا جی کے قدیم نسخوں کے بعد آج وہ اس قابل ہوا تھا کہ خود اٹھ کر چل سکے اور اب کمرے میں تھوڑی واک کرنے سے اندازہ ہوا کہ سب فٹ ہے تو وہ سبک خرامی سے چلتا چھت پر چلا آیا۔

اف! ایسا لگا دو دن نہیں بلکہ دو سال کی قید کے بعد رہائی نصیب ہوئی ہو' صبح سویرے کی مخصوص تازگی اور فرحت بھری باد نسیم جو مشام جاں میں اتری تو ساری تھکن زائل ہونے لگی۔ اک بھرپور انگڑائی لے کر

صبح کی تمام رنگینی کو اندر اتارا' ساتھ ادھر ادھر بھٹکتی نظر بھی سرشاریت سے بھر گئی۔ سامنے ہی ماسٹر اجمل کی چھت پر ایک رنگین آنچل چھب دکھلا رہا تھا تو بائیں طرف بھی بہار جلوہ نما تھی۔ اس کے ہونٹ سیٹی کے سے انداز میں سکڑ گئے۔ بجائی اس لیے نہیں کہ نقص امن کا خدشہ تھا۔ انگڑائی کے لیے پھیلے بازو سمیٹتے ہوئے سامنے والی کو ہاتھ لہرایا پھر ذرا سا رخ موڑ کر تار پر جھولتی چڑیا کو اڑانے کے بہانے بائیں والی کو بھی "ہائے" کر ڈالا۔ اب رہ گئی عقب والی تو نظر ملنے پر اس کے لیے آنکھ کا اشارہ ہی بہت جانا اور یہ سب کرتے ہوئے اس نے خاص دھیان رکھا تھا کہ ایک کو کیا گیا اشارہ باقی نہ دیکھ لیں۔ اس کے بعد خود ہی اپنا کندھا تھپکا کہ کتنا نیک دل نوجوان تھا' وہ یعنی صبح صبح ہی اتنی نیکیاں کمالیں۔ کتنے خوب صورت چہروں پر خوشی بکھیر دی۔ ساتھ ہی فائدہ یہ ہوا تھا کہ اپنے جیسے یاروں کو سنانے کے لیے ایک تازہ کارنامہ انجام پا گیا تھا اور یونہی اس کی نظر چاچے بختو کے مکان ساتھ جڑے مکان کی کھڑکی تک گئی جہاں سے شگو خالہ کی موٹی سے بہو بڑا سا سر باہر نکالے گلی میں جھانک رہی تھی۔

آہ' اس مکان کو دیکھتے ہی کیا کیا نہ یاد آگیا تھا۔ کاش اس وقت کھڑکی میں اس تربوز کے بجائے وہ دو جھکی آنکھیں آجائیں' بے اختیار دل نے خواہش کی۔ شگو خالہ کی بہو کی نظریں اس سے چار ہوئیں' اس نے منہ میں کچھ بڑبڑا کر "ٹھاہ" سے کھڑکی بند کرلی۔ یقیناً" اس کی شان میں ہی کچھ فرمایا گیا ہو گا۔ لو جی' صبح سویرے اک گناہ بھی پلے پڑ گیا۔ لاحول ولا قوۃ' وہ بدمزا سا ہو کر منڈیر پر جھک گیا' برابر والے گھر کا صحن صاف نظر آرہا تھا۔

چچا ظہیر الدین رزاقی گیٹ پر لگا تالا کھول رہے تھے۔ سنا تھا نصیب دشمناں کل سے ان کی طبیعت بھی ناساز ہے۔ تو یہ منہ اندھیرے کدھر کو چلے؟ ابھی وہ غور کرہی رہا تھا کہ ایک ہاتھ میں توس پکڑے ایک ہاتھ سے بیگ سنبھالتی لہراتی بل کھاتی نازو اندر سے نکلی اس کا رخ بھی گیٹ کی جانب تھا۔ "اوہ! تو چچا اسے کالج چھوڑنے جارہے ہیں۔" یہ ان کی ہر روز کی ڈیوٹی تھی۔

چچا صاحب باہر نکل چکے تھے۔

وہ دوپٹہ پھیلا کر سلیقے سے اوڑھ رہی تھی کہ معاً" کسی احساس کے تحت سر اوپر کو اٹھ گیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی نازو کی آنکھوں میں یکبارگی حیرت اتری پھر اس حیرت پر مسرت جگمگاہٹ بن کر غالب آنے لگی اور پھر وہ مسرت بھی بھرپور مسکراہٹ میں بدل گئی اور چند ثانیے میں ہی اس کے چہرے کو اتنے رنگ بدلتے دیکھ کر بادل کا دل فخر و انبساط سے بھر گیا۔

کتنے مزے کی کیفیت ہوتی ہے ناں یہ کہ جب کوئی آپ کو دیکھتے ہی برقی قمقمہ بن جائے۔ وہ تو جلتا بجھتا ہے ہی آپ کے اپنے اندر بھی ایک خاص روشنی ریفلیکٹ ہونے لگتی ہے جس سے لگتا ہے سارا عالم روشن ہو گیا۔ وہ کئی بار گزرا تھا ایسی پرکیف کیفیتوں سے اور ہر بار اک نیا لطف ملتا تھا اور پھر خاص طور پر نازو' جسے وہ ظاہری طور پر ذرا گھاس نہیں ڈالتا تھا اور پھر وہ ڈالتا بھی کیوں۔ وہ تو بغیر چارے کے ہی دام میں آ گئی تھی اور صد شکر اس کی آنکھوں میں ابھی اتنی حیا باقی تھی کہ دیوار پار رہنے والی کزن کو کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا (باہر سے فرصت ملتی تو تب ہی ناں) بہرحال اب جب سے اس کی آنکھوں کا بھید جانا تھا' اس کے بعد سے تو وہ اور محتاط ہو گیا تھا۔ ارے بھئی آخر لڑکے بھی تو دل و جذبات رکھتے ہیں انہیں کوئی چپکے چپکے دیکھے' چاہے' سراہے تو خوشی انہیں بھی تو ہے تو بس.... وہ بھی مزے لوٹ رہا تھا۔ ایک تو خون کا رشتہ' دوسرے بچپن کا ساتھ تیسرے وہ کچھ عرصہ سے اڑتی پڑتی سن رہا تھا کہ ابا حضور اسے متوقع بہو کا درجہ دینے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔ اب بے شک ماضی و حال میں اسے ابا سے چاہے کتنے ہی شدید اختلافات کیوں نہ رہے ہوں' ان سب میں ایک یہ مقام ایسا تھا جہاں وہ ان کے آگے بے مثال فرمانبرداری کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لیے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ فربہی مائل' بے تکا گورا رنگ' اور پھیکے سے نقوش والی۔ کچھ سنجیدہ کچھ شوخ سی' بہت پڑھاکو اور پورے خاندان کی وہ واحد لڑکی جو باپ دادا کی روایت کو لے کر چلتے ہوئے طب کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ابا کی طرح چچا کا بھی خواب تھا کہ ان کا کوئی بچہ ڈاکٹر بنے۔ خود تو اپنے آباؤ اجداد کی حکمت کا فائدہ اٹھا نہیں سکے تھے کہ جب دادا جی کی وفات ہوئی تو ان کا قدیمی و خاندانی خزانہ یعنی حکمت اور نسخوں کی کتابیں ابا جان اپنے قبضے میں کر چکے تھے تب وہ جوانی کی بے خودو لاپروا کر دینے والی مستیوں میں گم تھے۔ دو بچوں کے والد محترم ہونے کے باوجود انہیں گھر اور گھر کے جھمیلوں سے قطعاً" رغبت نہ تھی۔ باپ زندہ تھا تو سب اکٹھے تھے۔ زندگی بے فکر تھی مگر جب وہ گئے تو پتا چلا کہ باپ نہیں رہا۔ تو کوئی بھی اپنا نہیں رہا بھائی نے پرکھوں کی کرسی سنبھال لی تو وہ سڑک پر آ گئے۔

مگر اللہ ہے سب کا رب' سب کا پالنہار' وہی ہے دینے والا۔ بس تب ان کے لیے بھی وسیلہ بن گیا۔ ایک دوست کے توسط سے انہوں نے کاسمیٹکس بنانی شروع کیں جن میں سرفہرست شیمپو اور رنگ گورا کرنے والی کریمیں شامل تھیں۔

شاہ عالمی کی اندرونی تنگ گلیوں میں بننے والی سستی کریم خرید کر اپنے کمپنی کا ٹیگ لگا کے ڈبیوں میں بھر کے بیچنا شروع کیں۔

عوام کی بڑی تعداد بخوشی ان کی مصنوعات کو خریدتی تھی۔ ان کا چند سو سے شروع کیا جانے والا کاروبار اب کروڑوں کا منافع دے رہا تھا۔

اور غالباً" بھائی کے ان ہی حالات کو دیکھتے ہوئے حکیم اظہار الدین نے یہ "مخلصانہ" فیصلہ کیا تھا کہ آخر بھائی پر پہلا حق ان ہی کا ہے۔ پھر لڑکی کا مستقبل بھی روشن تھا۔ وہ "ایم بی بی ایس" ڈاکٹر تو نہ بن پائی مگر ہومیوپیتھک کورس کر کے بھی ڈاکٹر کہلائے گی تو کل کو اپنا کلینک بھی بن جائے گا۔ یعنی گھاٹے کا سودا نہیں۔

ان کے بیٹے نے تو انہیں ہر جگہ زک ہی پہنچائی تھی۔ کوئی شوق پورا کر کے نہ دیا۔ ان کا بھی خواب تھا کہ بیٹا ڈاکٹر بنے مگر اس نے ڈاکٹر تو کجا حکیم بن کر بھی نہ دیا۔ ایسی ناہنجار' نالائق اولاد' ان کی ہزار ہا توجہ کے باوجود وہ ایف ایس سی میں ایک پیپر میں رہ گیا جو پھر ان

کے لتر کھا کھا کر رو دھو کر اس نے کلیئر کیا تھا۔
مگر حکیم صاحب تو اس کی اس نوکری سے بھی نالاں تھے مگر کیا کرتے اس کی ڈھٹائی کا جس پر کوئی اثر ہی نہ تھا جبکہ وہ خوب موج میں تھا۔ زندگی کس قدر خوش رنگ ہو گئی تھی کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ ڈور بیل ہوئی تھی ادھر نازو نے اسے اشارہ کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں ادھر ہی آ رہی ہوں۔
اور وہ اس کے سواگت کے لیے جلدی سے سیڑھیوں کی جانب لپکا اور ساتھ ہی جی میں آئی کہ وہ اسپائیڈر مین ہوتا تو ایک ہی جست میں نیچے جا پہنچتا۔ بعض خواہشیں کتنی بھونڈی ہوتی ہیں ناں ہم جانتے ہیں کہ یہ پوری نہیں ہونے والی مگر حیرت ہے پھر بھی ہم کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ سج سج نیچے اترا۔
"ہاں میاں! کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اس کے سلام کے جواب میں چچا نے مزاج پرسی کی۔ پیچھے ہی وہ کھڑی تھی جس پر اک سرسری نظر ڈال کر وہ یوں بن گیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو' مؤدبانہ چچا کو اپنی حالت سے آگاہ کیا۔ "کہاں ہیں بھائی صاحب' آج صبح ہی صبح ایک کام آن پڑا ہے ان سے۔" امی کچن سے نکلی تھیں' وہ ان سے پوچھنے لگے۔ نازو نے لپک کر انہیں سلام کیا۔
"وہ تو پڑے سو رہے ہیں۔ جانتے تو ہو ان کی عادت کو' دس بجے سے پہلے کب بستر چھوڑیں گے وہ۔" نازو کو گلے لگاتے انہوں نے برے منہ سے بتایا۔ میاں کی اس عادت سے خوب ہی بیزار رہتی تھیں وہ۔
"اے لو۔ یہ اچھے حکیم صاحب ہیں جو خود ہی دس بجے بیدار ہوتے ہیں یعنی وہ عمل جو ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ اپنے مریضوں کو کیا خاک نصیحت کرتے ہوں گے۔ علاج تو پھر دور کی بات ہے۔" چچا نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے تاک کر طعنہ دے مارا جو زیادتی ان کے ساتھ ہوئی تھی وہ انہیں بھولتی نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ ہی لیتے تھے۔
"بس بھیا میں تو خود پریشان ہوں۔ تم سناؤ' آج سویرے سویرے خیر تو ہے ناں اور کھڑے کیوں ہو آؤ بیٹھو۔ اے عمارہ' چچا اور بہن کے لیے ناشتا لے آؤ۔"
امی نے کچن کی جانب منہ کر کے آواز لگائی۔
"ارے نہیں بھابھی آپ لوگ بسم اللہ کیجیے میرے پاس تو بیٹھنے کا ٹائم نہیں۔ نازو کو کالج سے دیر ہو رہی ہے' آج اس کا بہت ضروری ٹیسٹ ہے۔ گاڑی دو دن سے ورکشاپ پہ کھڑی ہے' میں تو اس لیے ادھر آیا تھا کہ بھائی صاحب سے کہوں اسے کالج تک چھوڑ آئیں۔ آپ کو پتا ہے کبھی بچیوں کو اکیلے گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ میری اپنی طبیعت بھی کل سے ٹھیک نہیں۔ اب ہمت نہیں پڑ رہی تھی مگر چلیں خیر میں خود ہی چھوڑ آتا ہوں۔ چلو بیٹا۔" وہ نازو کی طرف مڑے۔
"آئے ہائے تمہاری اپنی طبیعت اچھی نہیں تو کیسے جاؤ گے۔ یہ باذل ہے ناں یہ چھوڑ آتا ہے اپنی بائیک پر۔" امی نے تو گویا مسئلہ ہی حل کر ڈالا۔ اس نے بھی خوب زور و شور سے سر ہلایا' ساتھ ہی نازو کے گول مٹول چہرے پر نگاہ کی جو تائی کے مشورے پر جگمگا اٹھا تھا۔
"جی' جی چچا جان میں چھوڑ آتا ہوں۔ آپ اس حالت میں کہاں جائیں گے۔" اور چچا نے اسے سر تا پیر ایسی جانچتی نظر سے دیکھا گویا ایکسرے کر رہے ہوں۔
"نہیں' نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں' چنگا بھلا ہوں میں اور تم نے دو دن پہلے ہی اتنی تکلیف مول لی ہے۔ تم آرام کرو ہم چلتے ہیں۔" وہ کہتے ساتھ ہی چل پڑے۔ نازو بھی چار و ناچار پیچھے ہولی۔
"ارے جلال! تم تو بالکل ہی غیروں والی باتیں کرنے لگے۔ باذل بالکل ٹھیک ہے اب۔" امی نے مروتاً "اک بار اور کہا مگر وہ نہ ٹھہرے۔ پھر وہ تو پلٹ کر کچن میں چلی گئیں۔ مگر وہ وہیں بت بنا جیسے ابھی تک چچا کی اک نظر کے حصار میں تھا۔ آخر کیا تھا اس نگاہ میں گویا اعتبار سے خالی۔ بڑی چبھی تھی اسے ان کی نظر۔ پھر تو اس کا موڈ بے حد بگڑ گیا۔
اپنے پریس شدہ کپڑے لے کر گولہ بنا کے دیوار پر دے مارے۔ اک بے قصور گملے کو ٹھوکر سے اڑایا۔ ناشتے سے واک آؤٹ کیا۔ یعنی صبح صبح ہی گھر میں اس

کی بے عزتی کردی گئی اور اتنے سلیقے سے اُسے تو جتنا بھی غصہ آتا کم تھا۔

☆ ☆ ☆

"اکیلے ہی اکیلے ناشتا ڈکار رہے ہو۔" بسورتی ہوئی شکل موصول ہوئی۔

"ہاں تو کیا کروں؟ اسامہ دنیا سے ہی چلا گیا' ادیاما کو فسادات پھیلانے سے فرصت نہیں۔ خان صاحب کسی کنٹینر میں پھنسے ہوئے ہیں' میاں صاحب دورے پر تو سوچا اکیلے ہی ناشتا کرلیا جائے۔" تیزی سے انگلیاں چلاتے میسج ٹائپ کیا اور بھیج دیا ابھی نان چنے کے نوالے کو منہ میں ٹھونس کر لسی کا ایک گھونٹ ہی بھرا تھا کہ پھر ٹوں ٹوں گونج اٹھی۔

"ارے گولی مارو سب کو میں مر گئی ہوں کیا؟" ادھر سے مکمل استحقاق جتایا گیا۔

"سو بسم اللہ آجاؤ پھر۔" اس نے بھی کی نہ کی۔ کھٹ سے دعوت دے ڈالی۔ ساتھ ہی مسکرا کر سامنے سڑک پار نظر ڈالی' جانتا تھا وہ کھڑکی سے دیدے چپکائے کھڑی ہوگی۔ اپنے محلے کی جانان میں یہ تو اس کے لیے وبال جان ہی بنتی جارہی تھی۔ سارے دن میں اتنے پیغامات کہ وہ اکثر تنگ آجاتا۔ سچ ہے اس کم بخت غضب ناک ایجاد نے بڑے بڑے ان پڑھوں کو لائق فائق کردیا تھا' وہ تو پھر مڈل پاس تھی۔ ہمیشہ رعایتی نمبر لینے والی ستارہ بی بی عرف تارو اتنی مہارت اور روانی سے جوابی پیغامات دیتی تھیں کہ وہ حیران رہ جاتا' پتا نہیں اس زمانے میں وقت بہت لمبا ہوگیا ہے یا دنیا میں کرنے کے لیے کام نہیں رہ گئے۔ بس یہ فضول کی مصروفیت جو اس جیسے بااخلاق و بامروت بندے کو بھی دق کردیتی۔ اسکرین پھر روشن ہوئی۔ جہاں نہ صرف دعوت قبول کرلی گئی تھی بلکہ مغموم و مظلوم حسینہ زمانے سے شکوہ کناں بھی تھی۔

"آتو جاؤں مگر ہائے یہ بے درد دنیا والے۔"

"محبت کرنے والے زمانے سے نہیں ڈرا کرتے۔" اس نے بھی محبوب کو آزمائش کی بھٹی میں تپانا چاہا۔

"ڈرتی ورتی میں کسی سے نہیں۔" جی دار محبوبہ نے ایک ٹانگ جہاں کے سینے پر رکھ دی۔

"ٹھیک ہے پھر چلی آؤ۔" وہ تو جوش میں ہی آگیا تھا مگر ادھر ابھی ہوش باقی تھا۔

"کیا ہوگیا ہے باؤلی' کیا تم مجھے سارے زمانے میں رسوا کرنا چاہو گے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے گھر آجاؤ۔"

"نا بابا نا' میں تم اکیلی کو تو ناشتا کروا سکتا ہوں مگر تمہارے اٹھارہ افراد پر مشتمل خاندان کو نہیں۔" وہ فوراً ہی کٹھور ہوا۔ صفاچٹ جواب ٹائپ کیا۔

"میرا خیال ہے تم پہلے ناشتا کرلو دھیان سے پھر باتیں کرتے رہنا' ایک تو یہ نری مصیبت بھی کسی کے ہاتھ میں نہ ہو۔" باسط بھائی کافی دیر سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دو گرما گرم عمدہ خوب پھولے ہوئے نان لے کر خود ہی اس کی میز پر آگئے۔ موبائل ہاتھ میں لے کر جیب میں ڈالا ساتھ ہی اک کینہ توز نگاہ سڑک پار کھڑکی پر ڈالی' اس کی گڈیاں کہاں کہاں اڑی ہوئی ہیں یہ ان سے بہتر اور کون جانتا تھا۔

"ارے بہت شکریہ باسو بھائی میں تو کرچکا ناشتا۔ آپ کی تو لسی ہی بڑی مزیدار ہوتی ہے اس سے ہی پیٹ بھر گیا' میرا یوں کریں یہ نان اور ایک پلیٹ جاجی کی طرف بھجوادیں۔"

"جاجی تو یہاں ہے ہی نہیں' رات کو ہی بڑا سا بیگ لے کر گیا ہے کہیں" باسط بھائی نے پاس سے گزرتے چھوٹے کو نان پکڑائے۔

"ہیں اب کہاں؟" ان کی بات نے اسے گڑبڑا ہی دیا (اف یہ تارو کی بچی سارے جہاں کی بکواس کرلے گی مگر اہم بات پھوٹ کر نہ دے گی۔ اب لے کر شرمندہ کروادیا الوکی....)

"پتا نہیں' دو چار دن سے کوئی دور پرے کا ماما آیا ہوا تھا۔ وہی اس آوارہ گرد کو لے کر گیا ہے کہیں نوکری ووکری کے لیے۔ ویسے کچھ دنوں سے جاجی کے ساتھ زیادہ دوستی نہیں بڑھ گئی تمہاری۔" بغور اس کا چہرہ

جا پہنچے وہ پلیٹ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ وہ جو ٹشو پیپر سے ہونٹ تھپتھپا رہا تھا خوامخواہ پورے منہ پر پھیر گیا۔

اف یہ باسو بھائی بھی ناں کبھی کبھی ''ابا جان'' ہی لگنے لگتے ہیں۔ وہ سر جھٹک کر بقیہ ناشتے کی جانب متوجہ ہوا۔ مگر برا ہو اس ٹوں ٹوں کا جو ان کی جیب میں ہو رہی تھی۔ تارو نے دیکھا بھی ہو گا کہ اس پر کیا بیتی ہے مگر پھر بھی۔۔۔ وہ سخت بدمزا ہوا۔

''چاچے باسو سے میں لے کر آؤں آپ کا موبائل.. اگلی میز پر بیٹھا گول مٹول سا منا اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ وہ کھڑکی کو گھورنے میں مشغول تھا۔ چونک کر اسے دیکھا' نیکر شرٹ میں ملبوس گورا چٹا موٹو سا بچہ جس کی آنکھوں سے ہی سمجھ داری ٹپکی پڑ رہی تھی اور وہ اسے پہچان بھی گیا۔ اس کے دیکھے بھالے نقش' ارے یہ تو شگو خالہ کا پوتا ہے۔

اور اس نسبت نے اسے کچھ اور بھی یاد کروا دیا۔ عمومی طور پر بچوں سے وہ اخلاقیات نبھانے کا عادی نہیں تھا مگر اب یک لخت ہی ہو گیا اتنا میٹھا جیسے جلیبی۔

''ارے نہیں یار لیو ان کے پاس بیلنس نہیں تھا' انہوں نے ایک ضروری کال کرنی تھی بس ابھی واپس کردیں گے۔''

''اچھا.....'' اور وہ بچہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر یوں ہنسا جیسے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہو۔ بازل نے بغور اسے دیکھا۔

''اور یہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو' اسکول نہیں گئے۔ کس کلاس میں پڑھتے ہو' ناشتا کرو گے؟'' اس نے خود پر سے اس کا دھیان ہٹانا چاہا اور کامیاب رہا۔ بچے نے منہ بسورا۔

''اف۔۔۔ اتنے سارے سوال ایک ساتھ۔ آپ تو مجھے ٹیچر لگ رہے ہو اور آپ کو یہ نہیں پتا کہ ایگزام ہو چکے ہیں۔ اب جب نیو بکس ملیں گی تو ہی اسکول جاؤں گا ناں اور ہاں ناشتا تو میں ضرور کروں گا۔ مجھے یہاں کی حلوہ پوری بہت پسند ہے اور ادھر ہی بیٹھ کر اکیلے کھانا اچھا لگتا ہے' گھر لے کر جاؤ تو سارے ہی چپک جاتے ہیں۔ کچھ بھی حصے میں نہیں آتا۔''

اف اس چھنکو کی باتیں' بازل نے ہنستے ہوئے اسے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ چھوٹے کو اس کا ناشتا آرڈر کیا۔

''اور سناؤ مہمان چلے گئے۔'' وہ اپنے مطلب کی بات پر آیا۔

''کیسے مہمان' ہمارے گھر تو کوئی مہمان نہیں آئے کافی دن سے؟'' چالاک منے کے چہرے پر حیرت اتری اور اس سے زیادہ اس کے منہ پر۔

''تو پھر وہ کون تھی؟'' بازل کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا انہیں شگو خالہ کے گھر سے ہی پک اینڈ ڈراپ کیا تھا۔

''یاد کرو ٹھیک سے۔ دو دن پہلے کوئی مہمان آئے ہوں۔'' جگ سے لسی انڈیل کر گلاس اس کے سامنے رکھا۔ ساتھ یادداشت کے پردے کو ہلایا۔ بچہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے مزید ہنٹ دیے۔

''ان کی طبیعت خراب تھی۔ میں ہی انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا اب کیسی ہیں وہ؟'' ساتھ ہی ہمدردانہ لہجے میں خیریت بھی پوچھ ڈالی گویا صرف یہی فکر ہوا ہے۔

''اوہ اچھا' اچھا آپ کہیں دادی کی بات تو نہیں کر رہے۔ پر وہ مہمان کب ہیں۔ وہ تو ہمارے گھر میں ہی رہتی ہیں۔ اور ہر روز ان کی طبیعت بھی خراب رہتی ہے ای تو کہتی ہیں وہ نخرے کرتی ہیں۔ اچھی بھلی ہٹی کٹی ہیں۔ بس انہیں عادت ہے دوسروں کے سامنے میری امی کو برا بنوانے کی۔''

''اف' میں تیری دادی کی نہیں کسی اور کی بات کر رہا ہوں اور تم مجھے کیا قصے سنانے لگے۔ چلو چپ کر کے ناشتا کرو۔'' بازل کا جی چاہا اپنے ہی بال نوچ لے۔ انتہائی نالائق بچہ تھا یہ تو۔ لسی کا گلاس اٹھا کر اس نے منہ کو لگا لیا جبکہ بچے کا منہ کھل گیا اتنی بے مروتی۔

''چل بے چھوٹو کاؤنٹر سے جا کر ناشتا لے اور ادھر ٹیبل پر جا کر بیٹھ اور ہاں جاتے ہوئے دہی لیتے جانا دادی نے منگوایا ہے پہنچا دینا ان تک سمجھا۔'' باسو بھائی نے اس کا سر تھپتھپا کر ادھر دوڑایا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

''تم کیا معلومات لے رہے تھے اس سے؟''

"کچھ نہیں بس ویسے ہی۔" بازل نے جھپٹ کر سیل فون قابو کیا جو ابھی انہوں نے ٹیبل پر رکھا تھا اور وہ اتنی تیزی پر چڑ ہی گئے۔

"توبہ ہے بھئی! اتنی فکر تو آج کل کے بچے اپنے ماں باپ یا کسی کتاب کی نہیں کرتے جتنا اس چار یا چھ انچ کے آلے کی کرتے ہیں۔ ساں آوازیں دے دے کر ہلکان ہو جائے۔ مگر اس کی ایک ٹوں ٹوں ٹانگوں کے سارے بل کس بل کھول دیتی ہے یوں لپکتے ہیں کہ اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہو گئی تو کہیں کوئی گناہ کبیرہ درج ہو جائے گا۔ کتاب سارا سال بند پڑی رہے' یہ بد بخت ایک پل کے لیے بھی بند نہ ہو' استغفار ہے بھئی استغفار' آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔" یاسو بھائی سخت کبیدہ خاطر نظر آرہے تھے۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا۔

"اور ایک ہم جیسے بھی شوہر حضرات ہیں جن کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ منحوس بند ہی رہے۔ گھر میں تو بیویاں ہر منٹ بعد اک نئی فرمائش کر کے جان کلساتی ہی ہیں اور اگر جو گھر سے نکل آؤ تو بھی خلاصی نہیں' اس کم بخت کی گھنٹی بج جاتی ہے کوئی نیا فتنہ اٹھانے کو۔ میرا تو جی چاہتا ہے اسے تو دیوار پر دے ماروں اس کے موجد سمیت۔"

"اوہو ہو' لگتا ہے بھابھی نے پھر کوئی زبردست سی فرمائش کر ڈالی ہے۔ ویسے اب کیا آرڈر کر دیا انہوں نے۔"

"اس کے آرڈر تو چلتے ہی رہتے ہیں ان کو گولی مارو۔ تم یہ بتاؤ تمہاری بات ہوئی اپنے باس سے' مل جائے گا تمہیں لون اور کمیٹی کے لیے اگلے ماہ کا کہا تھا کریم صاحب نے' دس دن رہ گئے ہیں مہینہ ختم ہونے میں۔ تمہیں جانا چاہیے یاد دہانی کے لیے ان کے پاس۔" وہ سب باتیں بھول بھال ایک دم سے سنجیدہ موضوع پر آگئے' اس نے سرہلایا۔

"جی' جی بس آج کل میں جاتا ہوں' اچھا ہوا آپ نے یاد کروا دیا اور آپ اپنے کام کی پروگریس بتائیں۔ آرکیٹیکٹ سے ملے؟ کب دے رہا ہے ہمیں" نقشہ۔۔۔

"چاہے تو آج ہی اٹھالیں' وہ تو بالکل تیار ہے۔ بس ٹھیکے دار تھوڑا ٹائم مانگ رہا ہے پھر میں بھی اس کے پیچھے اس لیے نہیں جا رہا کہ تمہارے رکے ہوئے کام ہو جائیں تو پھر اسے چاہے تو میں کلن سے بھی پکڑ کر لے آؤں۔"

"ہوں بس دعا کریں کمیٹی تو پکی اپنی ہے۔ لون بھی ساتھ ہی مل جائے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ میں نے کہا تھا باس سے تب تو حامی بھر لی تھی اب یہ ہے کہ ٹال مٹول نہ کرے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" یاسو بھائی نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

مین روڈ پر چوک کے بالکل سامنے کارنر پلاٹ پر واقع یہ چھوٹا سا ہوٹل جسے ڈھابہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا' باسط کو باپ سے وراثت میں ملا تھا اور جسے اب بڑھا کر ایک خوب صورت ریسٹورنٹ کی شکل میں ڈھالنا ان کا اولین خواب تھا اور اب تو ان کے خواب میں بازل بھی حصے دار بن چکا تھا۔ اپنے باپ دادا کی وراثت سے تو وہ کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکا تھا اپنی نالائقی کے ہاتھوں اور کچھ اس کا مزاج ہی نہ تھا اس طرف مگر جب سے اس نے ہیرا پھیری شروع کی تھی (حالانکہ یہ بھی اس کا مزاج نہ تھا) مگر تب سے ہی اس کے دل میں لگن لگ گئی تھی کہ دوسروں کی چاکری کرنے سے بہتر ہے اپنا کاروبار شروع کیا جائے۔

اور اس کی گڈلک کہ باسط کا ساتھ مل گیا۔ انہوں نے خود اسے آفر کی بلکہ اس کا ذہن انہوں نے ہی اس طرف لگایا۔ اکیلے تو وہ بھی اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں کر سکتے تھے اور بغیر کسی تجربے اور بڑے سرمائے کے وہ بھی کوئی بزنس اسٹیبلش نہیں کر سکتا تھا۔ سو دونوں نے مل کر کام کرنے کی ٹھانی۔ گھر میں تو وہ اپنی کمائی کا ایک آنہ نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنی ٹپ ٹاپ پر خرچ کرتا تھا یا صرف موج مستی پر مگر اب وہ کچھ عرصہ سے سیونگ کر رہا تھا لیکن سب مل ملا کر بھی اتنے نہیں ہو پا رہے تھے کہ اپنے خوابوں جیسا ریسٹورنٹ بن پائے۔ ابا جی نے تو ویسے ہی ایک روپیہ بھی دینے سے انکار کر

دیا تھا۔ ان کے خیال میں اس کی یہ سب پلاننگ سراسر فضول تھی۔ تنگ آکر اس نے قرض لینے کا سوچا۔ اب امید واثق تھی کہ ہر کام بہتر ہو جائے گا۔

"یار ایک پرابلم ہو گئی ہے۔" باسط بھائی بولے۔

"کیسی پرابلم" سیل فون پر پھر ٹوں ٹوں ہوئی تھی۔ وہ دھیان ہٹا کر ان کی جانب متوجہ ہوا۔

"یار! گھر کا حصہ بھی ریسٹورنٹ میں شامل کرنا ہے تو پہلے اسے گرانا پڑے گا۔ میں نے سوچا تھا کہیں اور جانے سے بہتر ہے اپنے ہی محلے میں شگفتہ خالہ کے دو کمرے کرائے پر لے لیں گے' رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کل تیری بھابھی کو اسی لیے بھیجا تھا وہاں کہ خالہ سے بات کر آئے مگر وہاں جا کر پتا چلا کہ خالہ نے تو کسی ماں بیٹی کو چپ چپاتے ہی وہ پورشن کرائے پر دے دیا ہے۔ حد ہو گئی نہ محلے میں کسی کو خبر ہوئی نہ کوئی ان کا سامان آیا۔ اللہ جانے اچانک کہاں سے ٹپک پڑی ہیں یہ ماں بیٹی بھی۔" وہ اپنی جگہ پریشان تھے اور ان کی پریشانی نے اس کی حیرانی ختم کر ڈالی۔ وہ تو تب سے سوچ میں پڑا تھا کہ اگر بقول منے کے ان کے گھر کئی دنوں سے مہمان نہیں آئے تو پھر وہ کون تھیں؟

"یعنی اب وہ یہیں رہے گی ہمارے محلے میں گھر کے سامنے اوہ ....." سارے حساب کتاب' سب پریشانیاں بھول کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ باسط بھائی کیا کہہ رہے ہیں' کیا بتا رہے ہیں' اسے اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ ٹھیک اس کے تین دن بعد کی بات ہے جب وہ سہ پہر میں ڈیوٹی آف کر کے آ رہا تھا' چوک کا موڑ مڑتے اس نے چنگ چی سے خالہ شگو اور ان کے ساتھ پردہ دار حسینہ کی والدہ کو اترتے دیکھا' دونوں کے پاس خوب سارے شاپرز تھے' لگتا تھا ڈھیر ساری شاپنگ کر کے آ رہی ہیں۔ چنگ چی والا تو انہیں اتار کر چلا گیا تھا اب آگے گھر تک انہوں نے یقیناً "پیدل" جانا تھا۔ اتنے سامان کے ساتھ وہ دونوں معمر خواتین کیسے جا ئیں گی۔

اب وہ اتنا بھی برخوردار نہیں تھا کہ ہر بزرگ کو مشکل میں دیکھ کے لپک پڑتا ہو حالانکہ اس وقت اس سڑک پر اور بھی کئی ایسے تھے جنہیں مدد کی ضرورت تھی۔ مگر وہ سیدھا بائیک ان ہی کے سامنے لے آیا۔

"کیسی ہیں خالہ' کدھر سے آ رہی ہیں۔ لگتا ہے سارا بازار ہی اٹھا لائی ہیں۔" سلام کے بعد وہ بڑے خوش گوار لہجے میں بولا۔

"ارے سارا بازار کہاں سے بچے' بس مہینہ بھر کا راشن لیا ہے اور کچھ برتن وغیرہ اور یہ بھی سب میں نے نہیں بہن ذکیہ نے خریداری کی ہے۔" شگو خالہ نے تفصیل سے بتایا جبکہ بہن ذکیہ اسے بغور دیکھتی پہچاننے کی سعی کر رہی تھیں اور آخر کار ان کی یاد داشت کام کر ہی گئی۔

"ارے بیٹا' آپ وہی ہو ناں جو اس رات مجھے کلینک تک لے گئے تھے۔ افوہ' دیکھو اس روز تو ایسی آفت پڑی تھی تم سے نام بھی نہ پوچھا۔ کیسے ہو بیٹا؟" اور وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا یعنی نیکی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اس نے خیریت بتاتے ساتھ ہی سارا سامان اٹھا کر بائیک پر دھر لیا جبکہ شگو خالہ' بہن ذکیہ سے اس کی نیکی اور شرافت کے وہ قصے کہہ رہی تھیں جن کے بارے وہ خود بھی بے خبر تھا اور انہیں خراماں خراماں چلتا چھوڑ کر وہ بائیک دوڑاتا پل میں مطلوبہ مکان کے آگے آن کھڑا ہوا' اس خواہش کے ساتھ کہ یا اللہ دروازہ وہی پردہ نشیں کھولے۔

وہ متحیر سا اس مقبول ساعت کے حصار میں گھرا اس سفید کبوتر سے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس کی مخروطی انگلیوں کی پوروں پر سجے شفاف ناخن کسی بھی پالش سے بے نیازیوں دمک رہے تھے جیسے دھوپ میں رکھا موتی۔

اور سماعت' وہ سحر آفریں لفظوں کے موتی چن رہی تھی جو لگتا تھا کسی مندر کی گھنٹی کے بجنے سے ہر سو بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ چند لمحے تو وہ کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا۔ پھر یکدم حواس بحال ہوئے۔

"جی یہ آپ کا سامان شگو خالہ نے بھیجا ہے۔" وہ

شاپر بائیک سے اتارنے لگا۔

"اور وہ خود کہاں ہیں؟" پردہ نشیں محتاط لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"وہ بھی آرہی ہیں بلکہ وہ لیجیے آگئی ہیں۔"

"آئے اللہ بھلا کرے یہ سب اندر بھی پہنچادو۔ ہم بڈھیوں سے کہاں اٹھایا جائے گا' لے آؤ' آجاؤ آجاؤ اندر۔" شگو خالہ نے بڑھ کر پورا دروازہ کھول دیا۔ وہ پری جھٹ غائب ہوئی۔ بازل کو اس کے دوپٹے کی جھلک دیکھنا ہی نصیب ہوئی جو بائیں دروازے میں غڑاپ سے گم ہوا تھا۔ وہ بے اختیار اک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ سب سامان ٹھکانے لگانے کے بعد وہ نامراد سا پلٹنے کو تھا کہ خالہ نے پکڑ کر بٹھالیا۔ ذکیہ خاتون نماز کے لیے جاچکی تھیں۔

"زمامہ بیٹا! دو کپ اچھی سی چائے تو بنا کر لاؤ۔" خالہ نے وہیں بیٹھے آرڈر پاس کیا تھا اور بھلا یہاں زمامہ اس کے علاوہ اور کون ہو سکتی تھی۔ زمامہ! واہ کتنا پیارا نام ہے منہ میں شکر سی گھل گئی تھی جیسے۔

شگو خالہ سب کا حال احوال لے رہی تھیں۔ پھر انہوں نے خود ہی تذکرہ چھیڑ دیا اپنی نئی کرایہ دار کا۔

"ارے یہ ذکیہ میری چچیری بہن کی نند کی نند ہے۔ (اف اتنا گنجلک رشتہ) اسے سن کر چکر سا ہی آگیا اور جب پوری داستان سنی تو.....

"آئے ہائے اللہ کسی کی ایسی قسمت نہ بنائے۔ بہت مظلوم ہے بے چاری' اتنا روپیہ پیسہ ہونے کے باوجود بے گھر ہونا پڑا غریب کو' وہ بھی سگے بیٹوں کے ہاتھوں۔ خدا ایسی نالائق' ناہنجار اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ ایسی دولت جائداد کو آگ لگے جو زندگی کا سارا سکھ ہی لے لے۔

پہلے تو اس جائیداد نے سر کا سائیں چھینا۔ بیٹے آپس میں لڑ پڑے اور باپ سے تقاضا کرنے لگے کہ ہمیں کاروبار میں سے ہمارا حصہ دو اور ساری جائیداد میں سے بھی بس باپ کو تو یہی صدمہ لے ڈوبا۔ بے چارا بہت نیک نفس انسان تھا' جوان بیٹوں کی منہ زوری برداشت ہی نہ کر سکا' جان ہار گیا اور وہ دونوں بدبخت باپ کی جان لے کر بھی نہ ٹلے۔ ساری جائیداد آپس میں بانٹ کر ماں بہن کو گھر بدر کر دیا۔ ہائے ہائے ایسا ظلم' ایسا قہر' کیسا زمانہ آگیا ہے۔ خون سفید تو کیا کالے پڑ گئے ہیں' دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ وہ تو شکر ہے باپ نے زندگی میں ہی بیٹی کے نام بینک میں خاصی رقم رکھوا دی تھی کچھ ذکیہ بہن کی اپنی بچت ہے۔ جو وہ عزت سے زندگی کے چار دن پورے کرلیں گی۔

اللہ ایسے ذلت کے دن بھی کسی کو نہ دکھائے۔ راتوں کی نیند حرام ہے بے چاری کی' جوان جہان بچی کی ذمہ داری روتی ہیں کہ کیسے پوری ہو گی۔ پر ایک بات ہے ماشاء اللہ خوب صورت' سگھڑ' سلیقہ شعار بچی ہے ہماری میں نے تو کہا ہے ذکیہ بہن سے۔ بس بیٹی کے ہاتھ پیلے کردو اور خود سکون سے رہو۔ اللہ نے چاہا تو ضرور اچھا بر مل جائے گا میں تو اب اسی کوشش میں ہوں۔ ایک دو جگہ رشتہ کے لیے کہا ہے۔

بیٹا' تمہاری بھی اتنی اچھی نوکری ہے۔ اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ کوئی اچھا سا لڑکا نظر میں ہو تو بتانا۔"

وہ اس سے کہہ رہی تھیں اور اس سے تو سر بھی نہ ہلایا گیا۔

اف' ایسے پیارے لوگ اور ان پر تقدیر کے کیسے کیسے ستم۔ وہ حقیقتاً "بہت دکھی" ہوا تھا سب سن کر۔

ذکیہ خاتون چائے لے آئی تھیں۔ جو اس نے بہت عقیدت سے نوش جاں کی۔ اس تصور کے ساتھ کہ کتنے خوب صورت ہاتھوں نے خاص اس کے لیے کتنے چاؤ سے چائے بنائی ہے۔ ویسے حد ہوتی ہے نا خوش فہمی کی بھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے ابا اور میں آج گئے تھے جلال کی طرف۔" وہ بہت انہماک سے "عزیزی" کی لن ترانیاں سن رہا تھا کہ امی نے اس کے آگے سے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے بتایا۔ اور یہ بات تو اسے شام میں نازو نے بھی بتائی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ اسے کبھی "صبح بخیر" تو کبھی "شب بخیر" کے ایس ایم ایس کرنے

لگی تھی اور جب وہ اپنی اتنی ٹف روٹین میں سے وقت نکال کر اسے یاد کرتی تھی تو اس کا بھی فرض بنتا تھا۔ پھر جب اتنے بے شمار دل رکھتا تھا انہیں خوش کرتا تھا تو جس کو تمام عمر خوش رکھنے کی ذمہ داری اٹھائی تھی اس کو ابھی سے کیوں نہیں۔ سو یہی سوچ کر وہ اس کے ساتھ روا رکھی سابقہ روش سے ذرا ہٹ گیا تھا۔

مگر نازو کے بتانے اور اب امی کے اطلاعی انداز میں کچھ فرق تھا۔ پروگرام میں در آتے وقفے نے اس کا دھیان ہٹایا۔ امی برتن کچن میں پہنچا کر واپس آرہی تھیں اور ان کے چہرے پر غیر معمولی کیفیت رقم تھی۔

گزشتہ دنوں عمارہ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا تھا جسے ضروری چھان پھٹک کے بعد منظور کر لیا گیا تھا اور اب ان لوگوں کی طرف سے منگنی کا اصرار تھا اور ابا جی کی خواہش تھی کہ اس کی اور نازو کی منگنی بھی ساتھ ہی کر دی جائے اور چھ ماہ بعد اکٹھی شادی۔ تب تک کہ نازو کی تعلیم بھی مکمل ہو جاتی۔ آج شام کا چچا کے ہاں جانا خاص اس حوالے سے تھا۔ امی اس کے برابر صوفے پر آکر بیٹھیں تو اس نے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"پہلے تو تمہاری چاچی نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا مگر جلال نے تو صاف کہہ دیا اسے تمہاری نوکری پر اعتراض ہے۔ وہ لوگوں کو کیا بتائے گا کیا کرتا ہے اس کا داماد اور نازو کے مقابلے میں تمہاری تعلیم بھی کم ہے۔"

"ہیں۔" امی کے الفاظ تھے یا جلتی تیلی جو سیدھی اس کی عزت نفس کو آکے لگی تھی۔

"میری تعلیم کم ہے بہت خوب' یہ اب یاد آیا انہیں اور میری نوکری پر کس بات کا اعتراض' ٹھیک ٹھاک کمائی ہے میری اور آپ نے بتایا نہیں کہ یہ نوکری تو بس اب عارضی ہے ان شاء اللہ بہت جلد میرا اپنا ہوٹل ہو گا۔"

"بتایا تھا۔ اسے تو اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ تم باسط کے ساتھ مل کے کاروبار کرو۔ وہ جدی پشتی نائی۔ باپ اس کا پورے محلے کی خوشی غمی پر دیگیں پکاتا رہا۔ ساری دنیا جانتی ہے۔ اب تم اپنے باپ دادا کا سب چھوڑ کر اس کا اپنا رہے ہو۔ وہ تو اس بات پر بھی خفا ہے کہتا ہے کوئی اور کام کرے بازل۔"

"ارے واہ یہ چچا جلال الدین "چچا اعتراض الدین" کب سے ہو گئے اور وہ بھی سارے کے سارے اعتراض مجھ پر' کمال ہے بھئی۔ جو کام مجھے آسان لگ رہا ہے۔ سمجھ میں آرہا ہے۔ جس کا میں تجربہ کر چکا ہوں میں وہی کام کروں گا ناں اور پھر اچھے اور حلال طریقے سے کما رہا ہوں کوئی چوری چکاری نہیں کر رہا نہ کوئی فراڈ اور پھر انہوں نے خود بھی تو باپ دادا کا کسب چھوڑ کر دوسرا اپنا لیا اور وہ بھی جس میں نری بے ایمانی کر رہے ہیں۔ اس پر تو کوئی دکھ تکلیف نہیں تو اب میری بار کیوں۔" وہ بری طرح بھڑکا۔

"ارے بھئی میں کیا جانوں' یہ تو جب سال ڈیڑھ سال پہلے تیرے ابا نے پہلی بار یہ بات کی تھی تب ہی مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگے تھے۔ مشکل ہی ہے کہ وہ اس بات پہ راضی ہو۔ یونہی آنے بہانے کر کے ٹالے گا وہ۔" امی نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"اچھا۔ تو کیا انہوں نے بیٹی سے نہیں پوچھا؟"

اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکان ابھری۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

"بھئی ان کی بیٹی تو بالکل راضی ہے' اسے تو کوئی اعتراض نہیں مجھ سے شادی پر۔ وہ تو مجھ سے فون پر باتیں بھی کرتی ہے' سارا سارا دن ٹیکسٹ بھی کرتی رہتی ہے۔ اسے تو مجھ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی نہ اس نے کبھی ایسی کوئی بات کی۔ چچا پہلے اس سے تو پوچھ لیتے پھر کوئی اعتراض اٹھاتے۔" پر کاکوا بناتے ہوئے اس نے صوفے سے ٹیک لگائی۔ انداز میں اترا ہٹ نمایاں تھی۔

"بہت خوب! اگر وہ تم سے فون پر بات کر لیتی ہے اور سارا دن بقول تمہارے ٹیکسٹ بھی کرتی ہے تو کیا تمہیں زیب دیتا ہے کہ تم بھری محفل میں بیٹھ کر اتنے فخر سے یہ بات کہو۔" حکیم اظہار الدین جانے کب

ادھر آنکلے تھے۔ کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں تو اباجی میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے ایسی بڑمارنے کی' آپ چاہیں تو میرا فون چیک کرلیں۔"

ان کی نظروں سے خائف ہوتا خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ ایک انتہائی احمقانہ بات کہہ گیا۔

سمجھ تو تب آئی جب انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔

"لاؤ دو۔" مطلب وہ سیل فون مانگ رہے تھے۔

"نہیں۔" اک پل کو تو حواس ہی پر پھیلا کر جانے لگے مگر فٹ سے قابو کیا۔

"وہ' وہ میرا مطلب ہے پھر چیک کرلیجئے گا ابھی فون کی بیٹری ختم ہے۔" وہ بری طرح ہکلایا۔ شکر ہے جلدی سے بہانہ سوجھ گیا ورنہ آج تو ان کی طرف سے سوجوتے پکے تھے۔

"بیٹری فون کی نہیں تمہارے دماغ کی ختم ہے۔ نالائق' نابنجار' بے ہدایت انسان' شرم نہیں آئی تمہیں یہ بات کرتے ہوئے۔ وہ لڑکی کون ہے پتا ہے ناں تمہیں؟" وہ چلائے تھے۔ اس نے تابعدار بچے کی طرح جھٹ سے سرہلایا۔

"خاک پتا ہے اگر پتا ہوتا تو یہ بات ہرگز نہ کرتے۔ قہر خدا کا' پرائی بچیوں کو ورغلا کر اس راہ پر لاتے تم لوگ خود ہو پھر بھرے بازار میں بیٹھ کر قصہ خوانی بھی کرتے ہو۔ تف ہے تمہاری اس جوانی پر جس میں غیرت نام کو نہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے اپنے جیسے آوارہ اور ناخلف لڑکوں میں بیٹھ کر یہ بات اسی زعم سے کہی ہوگی۔ نیکی کا کوئی کام پلے ہے نہیں تم جیسوں کے' بس آجا کر یہی ایک بدمعاشی رہ گئی ہے جس کا پرچار کرتے پھرتے ہو۔

کل کو وہ لڑکی بیوی بن جائے گی تو کیا پھر بھی یونہی باتیں پھیلاتے پھرو گے اس کی۔ اگر آج چار لوگوں کے بیچ بدخوئی کرو گے تو کل کون عزت کرے گا۔ کس کی زبان پکڑو گے تب۔ دنیا کی' سدھر جاؤ۔ جلال کے سارے اعتراضات درست ہیں۔ میری نگاہ میں چاند سی بیٹی ہے اس کی ہمہ صفت' نیک' تمیزدار' باعلم' با ادب' سلیقہ شعار۔

تم میں کیا گن ہیں؟ گنواؤ ذرا آج مجھے بھی۔" وہ تو اتنے تپے ہوئے تھے کہ باقاعدہ حساب کتاب پر اتر آئے۔

"مم میں نے ایسا بھی کیا غلط کہہ دیا اباجی؟ برائی تو مجھ میں بھی کوئی نہیں ہے۔ کسی غلط چیز کو ہاتھ نہیں لگایا آج تک' کسی بری صحبت میں نہیں ہوں۔ نکھٹو نکما نہیں ہوں' اپنا کما بھی رہا ہوں۔ پھر بھی آپ کو شکایتیں ہیں مجھ سے۔" اس نے تو منمنا کر اپنی صفتیں بیان کی تھیں اور یہی غضب ہوگیا پھر تو حکیم صاحب نے وہ لتے لیے کہ اللہ کی پناہ۔ سب اگلے پچھلے کھاتے کھول دیے۔ پورا گھر اس کی عزت افزائی کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یہ آج کوئی پہلی بار نہیں تھا مگر ہر بار تو وجہ صرف اسی کی ذات ہوتی تھی اور آج وجوہات کی نوعیت بہت مختلف تھی جو اس سے بھی برداشت نہ ہوئیں۔

چچا کے تیور تو اسے شروع سے ہی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے جب بھی ملتے ایسی نظروں سے گھورتے کہ وہ دنوں کھولتا رہتا۔

اسے اس رشتے میں صرف اس لیے دلچسپی تھی کہ نازو سیدھی سادی پڑھاکو قسم کی لڑکی تھی جسے وہ بچپن سے جانتا تھا پھر اس شادی سے اباجی کے تمام گلے شکوے بھی دور ہو جاتے۔ برخورداری' فرمانبرداری کا تمغہ الگ سے ملتا۔ مگر اب اتنی باتوں کے بعد کیا ثابت کرنا چاہ رہے تھے اگر رشتہ ہو بھی جائے تو اس کے دل سے یہ باتیں نہیں جائیں گی تو بہتر ہے کہ یہ فیصلہ کیا ہی نہ جائے اس لیے اس نے اس رشتے سے صاف انکار کردیا۔ وہ ایک خوبرو' کماؤ نوجوان تھا اسے بھلا رشتوں کی کیا کمی اور یہ اس کا ذاتی خیال تھا جس سے حکیم صاحب کا متفق ہونا ضروری نہ تھا اور وہ ہوئے بھی نہیں۔ وہ غصے سے کھولتے کف اڑاتے مسلسل اس کی شان میں بیان دیتے رہے۔ پھر تو اس نے بھی بدتمیزی کے گزشتہ تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے کہہ ڈالا۔

"اب میں آپ کو چند ہی دنوں میں اپنے لیے نازو سے بہتر لڑکی ڈھونڈ کر دکھاؤں گا۔" وہ چیلنج تو کر آیا مگر

ساری رات کھڑکی میں کھڑے چاند کو تکتے تکتے گزر گئی۔

'ایسی اچھی لڑکی ملے گی کہاں سے؟ جبکہ وہ تو جتنی بھی لڑکیوں سے واقف تھا وہ تو.....'

اور پھر جیسے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا سامنے والے مکان کی کھڑکی پر نظر گئی تھی اور اسے اپنے سارے مسئلے حل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اور جب قدرت مہربان ہوتی ہے تو راستے خود بخود صاف ہو جاتے ہیں۔

اباجی نے تو ویسے ہی اس کی ہر بات سے ہاتھ اٹھالیا تھا ان کے اس فیصلے سے منحرف ہو کر گویا اس نے ہر حد پار کرلی تھی۔ امی تو پہلے ہی دل سے راضی نہ تھیں۔ وہ قصہ تمام ہوا تو ہر مشرقی ماں کی طرح ان کے بھی چندے آفتاب مثل ماہتاب" بہو لانے کے ارمان جاگ اٹھے۔ لیکن باذل نے ان کی یہ مشکل یوں آسان کی کہ انہیں زمامہ کے متعلق بتایا اور وہ تو جب پہلی بار ہی اسے دیکھنے گئیں تو وہ اس طرح انہیں بھائی کہ پھر تو انہوں نے شگو خالہ کی چوکھٹ کی مٹی لی اور من کی مراد لے کر ہی اٹھیں اور پھر نیک کام میں دیر کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہ گیا تھا۔ کیونکہ ادھر سے ذکیہ خاتون کی خواہش بھی یہی تھی وہ بھی جلد از جلد اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتی تھیں۔ یوں حور شمائل سا روپ لیے زمامہ بہت جلد ان کے آنگن میں بہار بن کر اتر آئی تھی۔

باذل کا سر اٹھا ہوا تھا۔ اس نے جو کہا کر دکھایا تھا۔ نازو سے کہیں زیادہ خوب صورت، کہیں زیادہ امیر خاندان کی بیٹی، پڑھی لکھی، صوم صلوۃ کی پابند، بااخلاق باکردار وہ ہر خوبی سے مرصع تھی اور یہ خالص اس کی جوہر شناس نگاہ کا چنا ہوا ہیرا تھا جس پر وہ بے پناہ مسرور تھا۔

اس کے دوستوں نے اسے سبق پڑھایا کہ اگر خوب صورت عورت کی خوب صورتی کے سامنے پہلی ہی رات گھٹنے ٹیک دیے جائیں تو وہ سر چڑھ کر اگلے کو اپنی انگلیوں پر نچاتی ہے۔" اور وہ نہیں چاہتا تھا کل کو ساری دنیا اسے کاٹھ کا الو کے نام سے یاد کرے اس کا ماننا تھا کہ مرد کو مرد ہی نظر آنا چاہیے۔

"تمہاری آنکھیں مجھے کچھ دیکھی دیکھی سی لگ رہی ہیں۔ ارے ہاں یاد آیا میری ایک کلوز فرینڈ ہے نتاشا اس سے بہت مل رہی ہیں۔"

"اگر بیوی کو شروع سے ہی قابو میں رکھنا ہو تو کبھی اس کی تعریف ڈائریکٹ مت کرو" یہ سنہری قول باسط بھائی کا تھا جسے اس نے بہت احتیاط سے جیب میں ڈال لیا تھا اور وہ اب یہی صفحہ کھول کر بیٹھ گیا۔ مدح سرائی تو کی مگر کسی نہ کسی کے پلے ڈال کر۔ "تمہاری منہ دکھائی، نازو نے پسند کیا تھا ساتھ جا کر اس کی چوائس بہت کمال کی ہے اور وہ خود بھی بڑی جی دار ہے۔ تمہیں پتا ہے کون ہے وہ؟" اس کے گلے میں لاکٹ (یا پھندہ) ڈالتے ہوئے یہ تذکرہ بھی ضروری سمجھا۔ نہ صرف تذکرہ بلکہ پوری تاریخ بیان کر ڈالی۔ زمامہ بے چاری پوری آنکھیں کھولے گم صم سی بت بنی اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو ہی تکے جا رہی تھی۔ سرخ زرتار کپڑوں پر پڑے سرخ ہی مہندی سے سجے وہ خوب صورت و دلفریب ہاتھ جنہیں بے اختیار چھونے کو دل مچل رہا تھا مگر وہ صبر سے تقریر جھاڑے گیا اور جب کوئی سر نیہوڑائے نہایت عقیدت سے آپ کے ارشادات سنے تو پھر جوش بیان کا بڑھ جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں، باذل کو بھی یہی معاملہ درپیش تھا۔ وہ پہلی ہی رات بیوی پر کچھ ایسی دھاک بٹھا دینا چاہتا تھا کہ وہ باقی ساری زندگی اس کے سامنے چوں بھی نہ کر سکے۔

☼ ☼ ☼

اور پھر زندگی ایک دم سے بہت خوب صورت اور رواں دواں ہو گئی تھی۔ اس کی نوکری سخت تھی۔ ڈیوٹی کے اوقات بدلتے رہتے تھے پھر جو وقت ملتا وہ ریسٹورنٹ کے کام کو دیکھ لیتا۔

صرف ٹھیکے دار پر چھوڑ کر نہیں بیٹھے تھے دونوں،

کبھی باسط تو کبھی وہ خود دیکھ ریکھ کرتا۔ اپنے ریسٹورنٹ کا خواب بہت جلد تکمیل پا جائے گا۔ اب پوری امید تھی۔

زمامہ سے شادی کا فیصلہ بہترین ثابت ہوا تھا اس کے لیے۔ وہ جی بھر کر اپنے کندھے تھپکتا۔

بھلا نازو سے شادی کر کے کیا ملتا۔ بھئی صرف محبت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ دنیا میں اور بہت سی ضرورتیں ہیں جن کے بغیر جینا کار دشوار ہو جاتا ہے۔

اب اس کی خوش قسمتی بلکہ اس کے خیال میں یہ اس کی دور اندیشی کا پھل تھا کہ زمامہ نہ صرف اچھی بیوی کے معیار پر پوری اتری تھی بلکہ وہ مالی لحاظ سے بھی فائدے میں رہا تھا۔ ذکیہ خاتون نے سلامی میں ٹھیک ٹھاک رقم دی تھی اسے جس سے اس کے سارے رکے کام چل پڑے تھے لیکن اس سب کے بعد ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ زمامہ کے زیر احسان آ گیا تھا۔ بیوی کی ہر چیز پر حق سمجھتے ہوئے وہ پورے استحقاق سے سوچ کر رہا تھا۔

زمامہ شاید فطرتاً" خاموش طبع تھی یا پھر شاید اس کا رویہ ایسا تھا کہ وہ یوں گپ چپ رہتی کہ اگر ذرا سے بھی ہونٹ ہلائے تو کوئی جرمانہ بھرنا پڑ جائے گا اور باذل کے لیے تو یہ بہت خوش آئند بات تھی کہ اس نے اس خوب صورت عورت کو کیسے اپنا تابعدار کر لیا ہے مجال ہے جو بے چاری پر بھی مار سکے۔ اس کے کسی حکم سے سرتابی ناممکن اور اسی خیال سے اس کا سینہ پھول جاتا جبکہ دوسری طرف اس کی یہ حد سے بڑھی ہوئی تابعداری ہی گھر والوں کو کھٹکی تھی۔

"آئے ہائے لڑکی ہے کہ مٹی کا مادھو۔" اک دن تو امی نے باذل کو پکڑ ہی لیا۔ ابھی وہ تھکا ہارا باہر سے آ کر بیٹھا تھا کہ وہ شروع ہو گئیں۔

"ارے اس کے سامنے تو بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے جو بھی بولتے جاؤ اس کی بلا سے کوئی ہوں ہاں ہی نہیں کرتی۔ ٹھیک ہے ہمیں بھی اس کے حالات پر دکھ ہے پیچھے بہت صدمے دیکھ کر آئی ہے مگر اب ایسا بھی کیا کہ سوگ ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ نہ بولنا نہ ہنسنا۔ گونگی بیاہتا دلہن تو لگتی ہی نہیں۔ کوئی نہ کوئی آیا گیا ہی رہتا ہے گھر میں اور سب ملنے والوں نے یہ بات نوٹ کی ہے اور سچ پوچھو تو اس کے یہ انداز دیکھ کر اسے کسی سے ملانے کو دل ہی نہیں کرتا میرا تو۔ نری شرمندگی لوگ سو سو سوال کرتے ہیں پھر۔ اب کل کی ہی سن لو۔ عمارہ کی نند آئی تھی جاتے ہوئے اتنی باتیں کر کے گئی ہے وہ کہ آپ کی بہو تو روبوٹ لگتی ہے۔ ذرا بھی رونق نہیں اس کے چہرے پر یوں جیسے ڈری ہوئی ہو مسکراتے تو دیکھا نہیں اسے گیا۔ بہت دبا کے رکھا ہوا آپ سب نے۔ باذل اتنا ظالم لگتا تو نہیں مگر اس کی بیوی کو دیکھ کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بہت رعب داب رکھتا ہے اس پر۔

اے لو مت پوچھو اس کی باتیں سن کر کتنی سبکی ہوئی۔ ارے بیٹی کی نند تھی وہ میں تو اسے جھٹلا بھی نہ سکی۔ من من ہی کر سکی میں اس کے آگے۔ ذرا بتاؤ کہاں کہاں تک نہ بدنام ہو گئے ہم.... وہ تو ہمیں ہی برا بنا گئی ناں اور جانے کہاں کہاں قصے سنائے گی وہ۔ اب اگر خدانخواستہ کل کلاں کو انہوں نے میری بیٹی کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی تو کیا کریں گے ہم لوگ؟ ہم تو ان کا منہ بھی نہیں توڑ سکیں گے۔ ان کی نظر میں چور جو ٹھہرے۔

کوئی کہتا ہے شکر کریں گونگی بھولی ہے۔ کسی کو وہ مظلوم لگتی ہے اور ہم ظالم جس کے جو جی میں آئے مزے سے کہہ کر چلتا بنتا ہے۔ ارے کس کس کی سنوں میں؟" وہ سخت عاجز تھیں اور ماں کی دکھی داستان سن کر وہ کمرے میں آتے ہی بارود بھرے غبارے کی طرح زمامہ کے سر پر آ کر پھٹا تھا۔

وہ بے چاری پورے انہماک سے اس کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔ باذل نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا۔

"کیا بات ہے؟ کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو بہت خوب صورت ہو۔ ارے تم سے زیادہ خوب صورت تو میری جیب میں پڑی رہتی ہیں۔ پتا نہیں کس بات کا

نخرہ ہے تمہیں۔ اپنے ان چار پیسوں کا؟ ارے میں اس سے زیادہ کما کر لٹا چکا ہوں۔" اس نے خود ہی سوال خود ہی جواب کا سلسلہ شروع کیا پھر بے دریغ جو منہ میں آیا بولے چلا گیا۔

"سارے عاجز ہیں تمہارے رویے سے۔ ساری دنیا یتیم ہوتی ہے تم پہلی نہیں ہو دنیا میں۔ سارے دکھ بھول جاؤ۔ اب خدا نے ہر نعمت دے دی ہے' تمہارے مزاج پھر بھی ٹھکانے نہیں۔ گھر میں کوئی مہمان آجائے تو اس کے سامنے جاتے ہوئے یہ تھوبڑا درست رکھا کرو۔ سارے لوگ باتیں کرنے لگے ہیں۔ تمہاری اس بارہ بجے والی شکل نے برا بنوا دیا ہے ہمیں سارے خاندان میں' آخر چاہتی کیا ہو تم۔ امی سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہیں۔ سمجھتی کیوں نہیں ہو تم؟"

اور زمامہ اسے بولتے اِدھر سے اُدھر گھومتے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ اتنے ہتک آمیز الفاظ اس کے سیب سے گال سرخا سرخ ہو چکے تھے۔ زمردی آنکھوں میں مرچیں سی بھر رہی تھیں۔ زبان تو اس کے منہ میں بھی تھی مگر جانے کیوں وہ اسے اپنی صفائی کے لیے بھی استعمال کرنے سے گریزاں رہتی سر جھکا کر سننے گئی۔ باذل خوب بکتا جھکتا اس کے کمزور وجود پر دھونس جماتا دھپ دھپ کرتا ٹیرس پر جا بیٹھا۔ سیل فون نکال کر کانوں سے جوڑ لیا اور جانے کس سے ہنس ہنس کر باتیں مٹھارنے لگا۔

"کتنے بے حس اور بے درد ہوتے ہیں ناں ایسے مرد بھی جو زندگی کا ہر سکھ ہر آرام تو بیوی کے ہاتھوں پائیں مگر دل کسی اور کا بہلائیں۔ اس کی روح تک کو جھلسانے کے بعد وہ اپنے دل و دماغ کو تر و تازہ کر کے واپس کمرے میں آیا تو زمامہ کو وہیں کھڑے پایا" کسی پتھریلے بت کی طرح نصب" جس کے منہ پر لگتا تھا کسی نے پانی میں گھول کر لال رنگ پھیر دیا ہو۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں سختی سے جکڑی ہوئی تھیں۔

"ہیں' اب تک یہیں کھڑی ہو؟" باذل حیران ہوا۔

کندھے سے پکڑ کر بلایا۔ آیا' وہ ہے بھی یا... زمامہ نے پلکیں اٹھائیں۔ اف کیا تھا ان بھیگی سرخ آنکھوں میں ایسا دکھ ایسی وحشت کہ اس کا دل ہول گیا۔ دیکھ کر بے اختیار اس کے ہاتھ زمامہ کے رخساروں پر ٹھہرے تھے اور وہ جو کب سے ضبط کے کڑے درد سہہ رہی تھی اس کے ذرا سے التفات پر یوں بکھر کر روئی کہ باذل سے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت بری ہوں۔ میں نے سب کا دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں۔" بلک بلک کر روتے ہوئے جھٹکے لیتے ہچکیوں کے درمیان وہ ایک ہی گردان کیے جا رہی تھی۔

"اچھا ناں بس کرو اب چپ کر جاؤ۔" باذل تو گھبرا گیا۔

وہ اس کی بیوی تھی اور بیوی بھی وہ جو کسی نعمت سے کم نہ ہو۔ اسے تو زمامہ سے اب تک کوئی شکایت نہ ہوئی تھی بلکہ اس کی خاموش طبیعت بے حد اچھی لگی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی کبھی اس کی ذاتیات میں دخل نہ دیتی۔ کھوج اس کی فطرت میں نہ تھی جیسا کہ عام بیویوں میں ہوتی ہے اور جو کہ اکثر ازدواجی زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔ وہ کب آتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا ہے؟ فون پر بات کرتے اتنا خوش اخلاق کیوں ہو جاتا ہے؟ زمامہ نے ایک بار بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے خوامخواہ کے شوہرانہ رعب کو بھی وہ امرت کی طرح پیے جاتی اور اس کی ان ہی خوبیوں نے باذل کے دل میں گھر کر لیا تھا اور صرف اس کی سیرت ہی نہیں اس کی من موہنی صورت بھی اسے پوری طرح اپنا اسیر کر چکی تھی' اس لیے تو اب اس کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ باذل کو اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہوا۔ بازوؤں کے گھیرے میں لیے وہ بہت محبت سے اس کی پشت سہلا رہا تھا۔

زمامہ کا دل قدرے ہلکا ہوا تو اپنی پوزیشن کا احساس بھی جاگا۔ جھینپ کر اس کے حصار سے نکلی۔ وہ اتنی تیزی پر مسکرا دیا۔

پہلے کی سرخی کی نسبت اب رخساروں پر پھیلی لالی اس کے روپ کو بہت نکھرا سا رنگ دے رہی تھی۔ زمردی آنکھیں بھی دھل کر کانچ سی شفاف لو دینے لگیں۔وہ اتنی پیاری لگی کہ باذل نے پھر بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر قریب کرلیا۔

"آج تم میرے سامنے آخری بار روئی ہو۔ آئندہ میں تمہاری آنکھ میں آنسو نہ دیکھوں' سمجھیں تم۔" کیا تھا اس کے لہجے میں جس نے زمانہ کو اس قدر متحیر کیا کہ وہ سر اٹھا کر پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھے گئی اور اس کے اتنے مغموم و معصوم انداز نے باذل کو شرمسار تو کیا مگر وہ ہنس دیا۔ اور اسے مزید تاکید کرنے لگا جس سے اس کی تازہ تازہ محبت کا شیرہ ٹپک رہا تھا مگر جس پر زمانہ کے ہونٹ مسکرا نہ سکے۔

☼ ☼ ☼

"اور سنائیں باذل بھائی کب تک بن جائے گا آپ کا ہوٹل؟" دونوں ہاتھوں کے پیالے میں گول سا چہرہ رکھے وہ گپلو سا منا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیوں بھئی تم نے وہاں مفت کے ناشتے اڑانے ہیں۔" باذل نے تو اس کا شوق دھیان میں رکھتے ہوئے یونہی ہنس کر کہہ دیا تھا مگر منے کے جواب نے تو اس کے توتے اڑا دیے' وہ بھی عین زمانہ کے سامنے۔

"لڑکیوں کو تو کروا دیتے ہیں اگر میں مفت میں کر لوں گا تو کیا قیامت آجائے گی۔ وہ تارو باجی کو تو روز کرواتے ہیں ابھی پرسوں کی بات ہے سویرے میری گڈی ان کی چھت پر گر گئی تھی میں لینے گیا تو وہ بیٹھی حلوہ پوری اڑا رہی تھی اور فون پر سہیلی کو بتا رہی تھی کہ وہ ہوٹل والے بدھو باذل نے بھیجا ہے۔ اب تو میری موجیں ہیں۔ مزے مزے کے کھانے کھایا کروں گی۔" وہ مکمل صوتی تاثرات کے ساتھ بیچ چوراہے میں بھانڈے پھوڑ رہا تھا اور باذل کا منہ چوک پر لگا سگنل بن گیا۔ ایک پر ایک رنگ آرہا تھا چور نظروں سے زمانہ کا چہرہ جانچا وہ ایسی بن گئی تھی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو اس نے خجل سا ہوتے ہوئے منے کی گدی پر چپت لگائی۔

"بہت بولنا آتا ہے تمہیں۔ وہ تارو اول درجے کی جھوٹی شیخی خوری یونہی نمبر بنا رہی ہوگی سہیلی کے سامنے۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اسے ناشتے بھجوانے کی اور آج کل تو ہوٹل بند پڑا ہے۔ کام ہو رہا ہے وہاں اب دیگیں کیا اس کا ابا پکا رہا ہے۔ بکواس کرتی ہے خوامخواہ۔" وہ تارو کے بخیے ادھیڑ رہا تھا مقصد زمانہ کو جتانا مقصود تھا کہ وہ بہت سچا ہے۔

منے کو چپت ناگوار گزری تھی۔ وہ منہ پھلا کر کمرے میں گھس گیا۔ "توبہ ہے آج کل بچے فتنے ہیں' نرے' کیسے کیسے فسانے گھڑ لیتے ہیں۔ کتنا چالاک ہے یہ چنٹو کیسے کہانیاں بنا رہا ہے۔ سب بکواس کر رہا ہے تم اس کی باتوں پر نہ جانا۔" وہ زمانہ کا ہاتھ پکڑے اسے وضاحتیں دے رہا تھا۔ وہ نرمی سے ہاتھ چھڑاتی یہ کہتی اٹھ گئی۔

"میں دیکھوں امی اوپر کیا کر رہی ہیں۔" اور وہ ابھی سیڑھیوں تک بھی نہ پہنچی تھی کہ شگو خالہ آتی دکھائی دیں۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔

"اوئے ماں صدقے۔ میری بچی زمانہ آئی ہے۔ بسم اللہ۔" وہ جلدی جلدی اتریں گلے لگا کر سر ماتھا چوما۔

"اور پتر کیسی ہے۔ بڑے دنوں بعد منہ دکھایا۔ خوش تو ہے ناں اپنے گھر میں۔ کیوں باذل بچے ہماری بٹی کا خیال تو رکھتا ہے ناں تو۔" اس سے حال احوال لیتے وہ باذل کی طرف بھی گھوم گئیں۔

"جی' جی خالہ آپ کی بٹی آپ کے سامنے ہے پوچھ لیں اس سے۔" اس نے دانت نکوسے پورے اعتماد سے کہا۔ پہلے کی بات اور تھی اب تو وہ واقعی دل سے زمانہ کو خوش رکھتا تھا اور زمانہ بے چاری تو تھی ہی ان عورتوں میں سے جو گہرے اندھے کنویں جیسی ہوتی ہیں جس کے اندر کچھ بھی پھینک دو اندر کوئی شور ہوتو چاہے ہو مگر کمال حوصلہ ہوتا ہے کہ باہر کوئی آواز تو کیا کوئی چھینٹ بھی نہیں آنے پاتی۔ اور وہ خالہ کے کسی سوال سے پہلے بول پڑی۔

"امی کدھر ہیں' نظر نہیں آرہیں؟"

"اچھا تم لوگ یہ بتاؤ' چائے پیو گے یا ٹھنڈا۔ اچھا چلو چائے رہنے دیتے ہیں۔ دودھ نہیں ہے اس وقت گھر میں اور یہ ڈبوں کے دودھ کی چائے تو نری زہر لگتی ہے۔ مجھے اوئے منے جا بھاگ کے دو بوتلیں لے کر آ۔" شگو خالہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی شاید۔ وہ کچن میں جا گھسیں۔ لپک جھپک نمکو بسکٹ' پھل جو دستیاب ہوا لے کر آگئیں۔

"اور پتر بازل کیسا جا رہا ہے تیرا کام۔" پھر وہ جو اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوئیں تو نہ صرف اس کے کاروبار بلکہ کزنی اور بھتیجوں کے حالات کو بھی ڈسکس کر ڈالا۔ منا بوتلیں لے آیا تھا وہ بھی ختم ہو گئیں مگر ان کی باتیں۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کدھر بچے؟" شگو خالہ نے چونک کر دیکھا۔

"میں امی کو دیکھوں' اوپر ہیں ناں بھابھی کے پاس؟" وہ خاص ماں سے ملنے ہی تو آئی تھی اور اتنی دیر ہو چکی تھی امی ابھی تک سامنے نہیں آئی تھیں۔ اس کا دل ہولنے لگا تھا اور اس کی ہونق شکل دیکھ کر شگو خالہ نے پکڑ کر بٹھالیا۔

"تو بیٹھ میں ابھی آئی۔" وہ اٹھ کر کمرے میں چل دیں۔ چند لمحوں بعد واپس آئیں تو ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ جو لا کر انہوں نے اس کی جھولی میں رکھ دی۔ جس پر نظر پڑتے ہی گویا زمامہ کا دل بیٹھ گیا۔

"ام' می' ی۔" اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"ہفتہ پہلے آئے تھے تیرے بھائی' ماشاء اللہ یہ وڈی ساری گڈی میں' انہوں نے تو کچھ سننے گننے ہی نہیں دیا۔ تیری ماں وچاری کو سامان باندھنے کا بھی ٹائم نہیں دیا۔ سب برتن بھانڈے بھی اس کے یہیں رہ گئے۔ بس جاتے جاتے وہ یہ امانت دے گئی تھی تیرے لیے' کہہ رہی تھی اس کا سارا زیور ہے اور کوئی پلاٹ کے کاغذ جو وہ تیرے نام کر رہی ہے' بس پتر اب تو سنبھال اپنی امانت' اللہ برتنا نصیب کرے۔ دل ہولا نہ کریں بچے' شکر کر تیرے بھائیوں کو بھی عقل آئی۔ ماں کے دن عزت سے گزر جائیں گے اور وہ بھی اپنی روٹھی جنت منالیں گے۔ سچی بات ہے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی ذکیہ بہن' اللہ خوش رکھے۔ میں نے تیرے بھائیوں سے کہا تھا بہن کو بھی مل جاؤ پر وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے بس ماں کو لیا اور یہ جا وہ جا۔ اب کسی دن فرصت ہو تو تم دونوں جا کر مل آنا۔" شگو خالہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی جا رہی تھیں زمامہ جانے سن بھی رہی تھی یا نہیں۔ چہرہ بالکل بے تاثر اور آنکھیں جھولی میں پڑی پوٹلی پر ٹکی ہوئیں۔ بازل کے اندر کا دامادی مرد انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔

"کیوں خالہ! ہم کیوں جائیں ملنے جب ان لوگوں کو چاہ نہیں' یہ تو بہت زیادتی کی بات ہے۔ اول تو خالہ آپ کو چاہیے تھا امی کو ملنے ہی نہ دیتیں۔ ان سے اتنی زیادتی کے بعد وہ آکر مزے سے ماں کو لے کر چلتے بنے' بہن کیا سوتیلی تھی ان کی؟"

"ارے بیٹا! میں کیسے نہ ملنے دیتی ان کو۔ میری کیا مجال تھی۔ یہ تو ذکیہ بہن کی مرضی تھی' وہ چاہتی تو بیٹوں نے جتنا ظلم کیا تھا کچھ وہ بھی بدلہ لیتیں مگر بیٹا یہی تو بات ہے کہ اولاد کتنی بھی بری ہو ماں اس سے بدلہ نہیں لے سکتی۔"

"چلیں ٹھیک ہے وہ اس وقت تو چلی گئیں مگر کیا وہاں جا کر بھی بیٹی کو مطلع نہیں کر سکتی تھیں۔" بازل کا اعتراض بھی درست تھا۔ شگو خالہ نے محض سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

"اب تم کس سوچ میں ڈوب گئی ہو۔ جس ماں اور بھائیوں کو تمہارا خیال نہیں ناں تم بھی مت کرو ان کی پرواہ۔" وہ زمامہ سے کہہ رہا تھا۔ جو اس کی بات پر سر اٹھا کر غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ارے اس غریب پر کیوں گرم ہو رہے ہو۔ وہ بے چاری پہلے ہی پریشان ہے۔ چل پتر تو فکر نہ کر' جہاں رب نے اتنے کام آسان کیے وہاں یہ دکھ بھی دور ہو جائے گا۔ گھبرانا نہیں میں ہوں ناں تیری ماں۔" خالہ نے پہلے بازل کو جھڑکا پھر اسے ساتھ لگا کر تسلی دی اور وہ ایسی گم صم سی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر خالہ نے بہتیرا روکا پر وہ نہ رکی اور اسے تو کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا تھا مگر وہاں سے نکلتے ہوئے باذل وہ پوٹلی اٹھانا نہ بھولا تھا جو کسی بے وقعت شے کی طرح نیچے گری پڑی تھی اور جس پر پھر اس نے نظر ڈالنا بھی گوارہ نہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور اب باذل کو بھلا کیا فکر؟ اگلے ہی دن وہ جاب چھوڑ کر آگیا تھا۔ امی کی بازپرس پر اس نے ساری بات ان کے گوش گزار دی۔

"ارے واہ بھائی! آپ کے تو مزے آگئے۔ میں تو کہتی ہوں بیچ دیں پلاٹ اور سارا زیور اور باسط بھائی سے بات کر کے پورا ہوٹل خود خرید لیں۔" یہ عمارہ کا مشورہ تھا جسے توے پر روٹی ڈالتی زمامہ نے بھی سنا اور وہ یک لخت ہاتھ جلا بیٹھی مگر اس کی سسکاریوں پر کون آتا۔ وہ سب تو باہر لاؤنج میں بیٹھے اسے نت نئے مشورے دینے میں مشغول تھے۔ امی کہہ رہی تھیں۔

"بہتر ہوگا کہ تم اب اپنے سسرال بھی ہو آؤ۔ زمامہ کو ماں سے ملانے لے جاؤ اور جا کر دیکھو اس کے بھائیوں کو بھی۔ ارے بھئی، وہ آکر ماں کو لے گئے تو اس کا مطلب ہے۔ اپنے کیے پر پشیماں ہیں ہو سکتا ہے شرم کے مارے بہن کے سامنے نہ آئے ہوں۔ اب جا کر خود ملو گے تو تمہاری ہی قدر بڑھے گی۔" اور ان کی یہ بات باذل کے دل کو بھی لگی تھی۔ اسی لیے تو جب رات کو سب کام سمیٹنے کے بعد زمامہ چھت پر چلی آئی تھی تو وہ بھی اسے پکارتا تلاشتا وہیں آگیا۔ وہ فرش پر دیوار سے کمر ٹکائے بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر سر رکھے اپنے ہی دھیان میں۔

"ارے ایسے کیوں بیٹھی ہو خیریت تو ہے۔ کیا بات ہے یار! بہت چپ چپ رہنے لگی ہو۔ کھانا بھی تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا۔ امی کے لیے اداس ہو تو چلو کسی روز مل آتے ہیں انہیں بلکہ یوں کرتے ہیں انہیں فون کرتے ہیں، وہ بھی خوش ہو جائیں گی اور تمہیں بھی تسلی ہو جائے گی ٹھیک ہے ناں۔ اچھا اب بتاؤ جلدی سے نمبر؟" باذل نے تو فوری عمل کا بھی سوچ لیا جھٹ پاکٹ سے سیل فون نکالا۔ زمامہ نے سر اٹھایا؟ الجھی بکھری لٹوں کے درمیان ستا چہرہ، ملگجے اندھیرے میں بھی اس کی بھیگی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں اس کے اندر کی کیفیات کو وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"میرے پاس ان کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔ اور مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اب وہ کہاں اور کس شہر میں ہوں گی۔" بھیگے لہجے میں دی گئی یہ اطلاع یقیناً اچھی نہیں تھی باذل بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"کیوں۔" اور اسے سوال پر بہکلے تو زمامہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کئی لمحے لگے اسے پلکوں کی باڑھ پھلانگنے کی کوشش کرتے آوارہ آنسوؤں کو اندر دھکیلنے میں۔

"بابا کے بعد بھائیوں نے گھر بیچ دیا تھا پھر انہوں نے کہاں مکان خریدے مجھے کچھ علم نہیں۔" اس نے پھر گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ باذل کو انتہائی تاسف نے گھیر لیا اگر وہ ایسے حالات میں افسردہ تھی تو کچھ غلط بھی نہ تھی۔ اسے شدت سے زمامہ کے دکھ کا احساس ہوا۔ بے اختیار بازو پھیلا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

"اچھا چلو تم پریشان نہ ہو۔ یوں فکر مند ہونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ شگو خالہ ہیں ناں، ہو سکتا ہے امی انہیں کوئی ایڈریس وغیرہ بتا کر گئی ہوں۔ میں کل ہی پتا کرتا ہوں۔ تم تیاری رکھنا پھر ہم چلیں گے تم یوں غمگین رہتی ہو تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ کیا۔ تمہیں میری محبت پر یقین نہیں؟" باذل نے بڑے پیار سے ہاتھ تھاما تھا۔ مگر زمامہ کی سسکی نکل گئی۔

"اوہ کیا ہوا؟" وہ گھبرا ہی گیا۔

"کچھ نہیں، روٹی پکاتے ہاتھ ذرا سا توے کو چھو گیا تھا۔" زمامہ نے ہتھیلی سامنے پھیلائی۔ گول سا سرخ نشان عین وسط میں جہاں ننھے ننھے آبلے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔

"اوہ گاڈ ذرا سا تم اسے ذرا سا کہہ رہی ہو۔" باذل تو دیکھتے ہی تڑپ گیا۔ اسے بری طرح گھورا موبائل کی ٹارچ جلا کر اچھی طرح معائنہ کیا۔

"تم بہت ہی لاپرواہ لڑکی ہو۔ ذرا بھی خیال نہیں ہے تمہیں اپنا' تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا۔ اب یہاں بیٹھی رو رہی تھیں۔ تمہیں فوراً" اس پر کچھ لگانا چاہیے تھا۔ حد ہوتی ہے بیوقوفی کی بھی' اچھا بھلا زخم ہے اور مزے سے کہہ رہی ہو ذرا سا۔" اسے تو غصہ ہی آگیا۔

"چلو اٹھو فوراً"۔ اس زخم کو دوا کی ضرورت ہے۔ چلو نیچے چلیں۔"

بہت سارے زخم ہیں' سب کو دوا کی ضرورت ہے۔ آپ کس کس کی دوا کریں گے؟" وہ بھیگی پلکوں سے یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی بے خیالی میں بول گئی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے دل کا کوئی درد کہا تھا ورنہ تو اس سے پہلے لبوں پر چپ کے تالے ہی پڑے رہتے تھے۔ بازل اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

بیوی ہو تم میری' تمہارے ہر زخم کی دوا کرنا فرض ہے مجھ پر۔۔۔" گالوں پر لڑھکتے نمکین قطرے اپنی پوروں پر چنے۔

"آپ صرف میرے ہیں ناں؟" آج جانے زمامہ کو کیا ہوا تھا بڑے آس بھرے لہجے میں سوال کیا۔ آنکھوں میں عجب الجھن بھری کیفیت تیر رہی تھی۔

"صرف اور صرف تمہارا ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں' اکیلی بیٹھ کر پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔ چلو اٹھو۔" بازل کو اس کی آنکھوں کی غیر یقینی نے ندامت کی سوئی چبھوئی' خائف سا ہوتے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا تب ہی اس کی نظر برابر والے گھر کے ٹیرس تک گئی۔

"وہ نازو ہے نا؟" نہایت انہماک سے کتاب میں سر دیے بیٹھی لڑکی کی جانب اس نے اشارہ کیا۔ بازل نے بھی دیکھا اور سر ہلا دیا۔

"میں اکثر اسے یہاں سے دیکھتی ہوں۔ یہ ہمیشہ پڑھ رہی ہوتی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے نازو۔ میں نے سنا ہے اس کی شادی ہو رہی ہے کسی ڈاکٹر سے۔ کل امی بات کر رہی تھیں۔ آپ نے کیوں نہیں کی نازو سے شادی؟" وہ مسلسل ادھر ہی دیکھتے بول رہی تھی اور یہ اس کی نظروں کا ارتکاز ہی تھا کہ نازو نے سر اٹھا دیکھا اور نیم اندھیرے میں ایک ساتھ کھڑے دو ہیولوں کو دیکھ کر بے تاثر چہرے کے ساتھ پھر وہ کتاب پر جھک گئی اور بازل جسے اس کے سوال نے حیران کیا تھا نازو کی بجھے چراغ سی نظر نے تو اور متحیر کر دیا۔ اس پر اٹھتی ان نگاہوں میں کبھی کیسے روشن دیوں کی سی لو ہوتی تھی اور اب کیسی خالی نظر سے اس نے دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر اندر جا چکی تھی پیچھے خالی کرسی جھول رہی تھی۔ یک لخت جانے ذہن میں کیا آیا' اس نے بغور زمامہ کی آنکھوں کو جانچا۔ وہ کئی مہینوں سے اس کے ساتھ تھی اور بہت خوب صورت ہونے کے باوجود نری بے رونق آنکھیں' گرد آلود موتی جیسی جن میں دیکھتے پر ویرانی کا سا احساس ملے۔

"بتائیں ناں۔" وہ اس کے بازو کو ہلاتے پھر پوچھ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو' چلو آؤ۔" وہ خوامخواہ ہی چڑ گیا اور سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھائے تب ہی اس نے سنا' زمامہ کہہ رہی تھی۔

"آپ بھی مجھ سے خفا ہو گئے ہیں' پلیز آپ تو خفا نہ ہوں۔ آپ کے سوا میرا ہے ہی کون۔" ایسا درد تھا اس کے لہجے میں جس نے وہیں بازل کے قدموں میں زنجیر ڈال دی۔

"ایک وقت تھا جب میں سمجھتی تھی کہ میرے حصے کی سب خوشیاں جل گئیں ہیں۔ ختم ہو چکی ہیں میرے لیے اب اس دنیا میں سوائے دکھ اور ذلت کے کچھ نہیں مگر اب کبھی کبھی دل کو امید سی بندھتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں بھی زندوں میں ہوں۔ میری بھی خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ میں بہت بری ہوں' اس قابل تو نہیں جتنا مجھے نواز دیا گیا ہے۔ آپ بہت اچھے ہیں بازل' مجھے بے حد اچھا لگتا ہے جب آپ میرا خیال رکھتے ہیں لیکن اس وقت مجھے بہت ڈر لگتا ہے جب آپ غصہ ہوتے ہیں' مجھے ہر چیز سے خوف آنے لگتا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔" وہ بالکل ایک چھوٹے

بچے کی طرح سہمی ہوئی جانے کس بات کی معافی مانگ رہی تھی۔ وہی آنکھیں جو چند لمحے پیشتر بازل کو بری لگی تھیں اب ان ہی میں تیرتے جگنوؤں سے آنسوؤں نے اسے تڑپا دیا۔ دل یک بیک سرشاریت سے لبریز ہو گیا ہمیشہ اس کی محبتوں کے جواب میں چپ رہنے والی زامہ کے ان الفاظ و اقرار نے جیسے اس کے اندر اک نئی روح پھونک دی وہ لپک کر آیا۔

"کس بات کی معافی یار' کیا کیا ہے تم نے بالکل پگلی ہو تم بھی میں تم سے ناراض ہو سکتا ہوں بھلا۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ کیوں فضول کی سوچوں میں گھری خود کو پریشان کرتی رہتی ہو؟" بے اختیاری میں اس کا وہی زخم خوردہ ہاتھ تھام لیا تھا۔ ڈھیروں پیار کے ساتھ غصہ بھی آیا۔

"زخم چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اگر بروقت علاج نہ کریں تو وہی بہت بڑا ناسور بن جاتا ہے پاگل لڑکی چلو' آؤ پہلے تمہارے اس درد کے دوا کروں پھر باقی علاج بھی کرتا ہوں تمہارا۔ تم تو اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کر دو گی۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا اور زامہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

زندگی کتنی خوب صورت لگنے لگتی ہے ناں۔ جب آپ دل سے کسی کے ہو جاتے ہیں یا کسی کو دل سے اپنا مان لیتے ہیں۔

بازل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب سے زامہ شریک سفر ہوئی تھی تب سے اندر کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اب اس کے چہرے کے علاوہ آنکھوں کو اور کوئی صورت بھلی لگتی ہی نہ تھی۔ ہر دوسرا چہرہ اسے کم صورت اور پر فریب لگتا تھا یوں بھی جب سے ہوٹل کی مصروفیات بڑھی تھیں اس نے ادھر ادھر کی ہر سرگرمی ترک کر دی تھی۔ اب وہ پہلے والا لاابالی سا بازل کہیں سے بھی نہ دکھتا تھا بلکہ وہ ایک سمجھ دار اور ذمہ دار شخص کا روپ دھار چکا تھا زامہ نے حقیقی معنوں میں اسے خوشیوں سے ہمکنار کیا تھا بدلے میں اس کا بھی یہی دل چاہتا تھا زمانے بھر کی نعمتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے اور وہ کوئی کسر اٹھا بھی نہیں رکھتا تھا۔

اب تو یوں بھی کئی روز سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ صبح تو وہ بہت ہی زیادہ نڈھال نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے تاکید کر آیا تھا کہ امی کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں ضرور چلی جائے منتھلی چیک اپ کے لیے اور کافی دیر پہلے اسے زامہ کی کال بھی آئی تھی کہ وہ جا رہی ہے۔ ایک اطمینان سا ہونے کے باوجود اسے چین نہیں پڑ رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی نہ ہی کسی کام میں دل لگ رہا تھا۔ آخر رہا نہیں گیا۔ مزیدار سی مٹن بریانی' چکن بروسٹ ملائی بوٹی' سلاد' رائتہ پیک کروا کر اور راستے سے کچھ پھل خریدتا ہوا وہ گھر آ گیا۔ زامہ کھانے کی بہت چور تھی اسے علم تھا۔ بہت اصرار کے بعد بھی وہ ان سب میں سے چند ایک نوالے ہی کھائے گی جبکہ آج کل اسے اچھی خوراک کی ضرورت تھی۔ اسی لیے وہ اس کے کھانے پینے کا خود ہی خیال رکھتا تھا اور ایسا کرنا اسے اچھا بھی لگتا تھا۔

سارے شاپرز اس نے سینٹرل ٹیبل پر رکھے اور وہیں کھڑے کھڑے زامہ کا پرسنل نمبر ڈائل کیا۔ مگر یہ کیا ٹیون تو کمرے میں ہی بجنے لگی تھی۔

"اوہ' یہ زامہ بھی ناں' لگتا ہے جاتے ہوئے سیل فون اٹھانا بھول گئی ہے۔ اف یہ اس کی حواس باختگی' جانے کب سدھرے گی۔" وہ محبت سے مسکرا دیا۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بازل نے جدید اسٹائلش سا سیل فون اسے گفٹ کیا تھا اور تب زامہ کی وہ ہونق صورت اسے اچھی طرح یاد تھی۔ سیل فون دیکھ کر وہ یوں چپ ہوئی تھی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو اور بازل کو اندازہ تھا کہ وہ بہت سخت ماحول میں پلی بڑھی ہے ہو سکتا ہے اس نے کبھی سیل فون استعمال نہ کیا ہو اسی لیے اس نے بڑے تحمل اور پیار سے اسے استعمال کرنا سکھایا تھا اور وہ گپ چپ سی سنتی گئی تھی گویا بولنا جانتی ہی نہ ہو۔

اور اب اتنی سیانی ہو گئی تھی کہ اس کی کال پک کر

لیتی یا اسے بوقت ضرورت کال کر لیتی۔

بیڈ کی پائنتی پر رکھے کمبل کے پاس پڑا موبائل بازل کو نظر آ گیا تھا اس نے اٹھایا جس کی روشن اسکرین مزید دس مسڈ کالز ظاہر کر رہی تھی۔

"اوہ یہ کس کی کالز ہیں۔" اس نے نمبر دیکھا۔ کوئی انجانا نمبر تھا بازل نے کبھی ارادتاً بھی زمامہ کے فون کو چیک نہیں کیا تھا۔ اب یونہی کال لاگ کھول لیا اور دیکھ کر حیران رہ گیا اس نمبر پر زمامہ نے بے شمار کالز کی تھیں جبکہ ان کمنگ میں آج کی ہی مسڈ کالز تھیں۔

"چلو شکر اس نے بھی کوئی سہیلی بنائی۔ اچھی بات ہے دل بہلا رہے گا۔ اس خیال نے اسے مطمئن کر دیا۔ سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھتا وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ پھر فون بجنے لگا۔

اسکرین پر ایک بار پھر وہی نمبر جگمگا رہا تھا اور اس نے سیل اٹھا کر کال پک کر لی۔ ابھی "ہیلو" منہ میں ہی تھا کہ وہاں سے پاٹ دار آواز میں کہا گیا۔

"ہزار بار کہا ہے اس نمبر پر فون مت کرو۔ تمہیں میری بات کی سمجھ نہیں آتی۔ منحوس بدبخت! سارے خاندان کو اجاڑ کر بھی تیرے کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑی ابھی اور بھی کچھ کرنا باقی ہے کیا۔"

انتہائی پر تنفر آواز تھی اور الفاظ ایسے تلخ کہ بازل حیران و ششدر رہ گیا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں لب نیم وا ہی رہ گئے۔ جبکہ اگلی جانب سے بولنے والی ہستی نے اک لمحے کا توقف نہیں کیا تھا۔

"تو بھول گئی ہو سب ذلت پر ہمیں اذیت کا ایک ایک پل اچھی طرح یاد ہے۔ اب بھی بھگت رہے ہیں اپنے گھر سے نکلے، علاقے سے نکلے، دربدر ہونا پڑا سب کو صرف تیری وجہ سے۔ ایسے ننگ خاندان نکلی تو۔ مار پڑے ایسی جوانی پر جو ماں باپ کی عزت رول دے۔ ذرا سی بھی دید لحاظ ہوتی تو خود ہی شرم سے مر جاتی۔

پہلے باپ کو کھا گئی اور اب ہماری ماں کے پیچھے پڑی ہے نامراد اب تجھے احساس ہو رہا ہے اب معافیاں مانگ رہی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کس بات کی معافی! جب بابا نے تیرے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا تھا تب تو تجھے اختلاف ہو گیا تھا۔ تجھے تو وہ فون والا لفنگا اچھا لگتا تھا جس کے نہ دین کا پتا تھا نہ دنیا کا تب تجھے ہر سمجھانے والا برا لگتا تھا تب کیوں بیچ کھائی تھی عقل۔ عین نکاح کے دن انکار کر کے تو نے باپ کی جان لی۔ ارے تو کیوں نہ مر گئی تھی ان کی جگہ تجھے موت آ جاتی کاش تو اب سب سکون سے تو ہوتے۔ اونچی گردن تان کر چلتے تھے بھائی اب کسی سے نظر ملانے جوگے نہیں۔ تو شکر کر احسان مان ماں کا جس نے بھائیوں کے پیروں پر اپنا دوپٹہ ڈال کر تیری جان بخشوائی تھی۔ ماں تھی ناں تیری اتنی بھیانک غلطی کے باوجود اس نے تجھ سے انتقام نہیں لیا بلکہ الٹا اور احسان کر دیا تجھ پر تجھے ایک اچھے گھر بار میں بیاہ کر۔ میں تو حیران ہوں تم جیسے بدذاتوں پر بھی اللہ مہربان ہو جاتا ہے۔ اماں بتا رہی تھیں بہت اچھے لوگ ہیں اور تمہارا شوہر بھی۔ ارے تم تو ان کے پاؤں دھو دھو کر پیو جنہوں نے تم جیسی عورت کو سنبھال لیا اور خبردار جو اب ہمیں فون کیا۔ تمہارے فون سے اماں بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہیں۔ جہاں باپ چلا گیا سمجھو ماں بھی تم نے وہیں بھیج دی۔ اب تو خود ماں بننے والی ہے ناں اب تجھے بھی اپنے پیدا کرنے والوں کا درد سمجھ میں آئے گا۔ میری تو دعا ہے اللہ تجھے بیٹی دے اور وہ بالکل تیرے جیسی ہو۔ تب تجھے علم ہو گا کہ جب اولاد ماں باپ کا دل چیرتی ہے ناں تو کیسی اذیت ٹوٹتی ہے ان پر۔

خود کو عقل کل سمجھنے والی اولاد آخر ایک دن اپنے ہی فیصلوں کی رسی میں الجھ کر منہ کے بل ضرور گرتی ہے اور تب خرد کے دروازے کھلیں بھی تو کیا حاصل تب تک تو بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہوتا ہے۔ تو نے بالکل اچھا نہیں کیا زمامہ صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں اپنے ساتھ بھی اور ابھی تو اک عمر پڑی ہے۔

گناہ کبھی بھی نہیں مرتے ہمیشہ پیچھا کرتے رہتے ہیں تو بھی بھگتے گی ابھی بہت بھگتے گی۔" وہ عورت تسلسل بولتی چلی جا رہی تھی۔

باذل جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا تھا ایسا لگ رہا تھا کان کے ساتھ فون نہیں کوئی گرم پگھلتا سیسے کا ٹکڑا لگا ہوا ہے۔ ایسی تپش ایسی آگ کی لپٹیں جو ہر طرف پھیلتی جارہی تھیں۔ دھواں ہی دھواں چہار جانب پھیل رہا تھا اسے اپنا پورا وجود جلتا ہوا محسوس ہوا۔

کھلے دروازے سے اندر آتی زمامہ نے اسے مانند بتاں کھڑے دیکھ لیا تھا اور اس کے کان سے لگا اپنا فون بھی۔ وہ ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔ کوئی انجانا سا خدشہ پورے جسم و جاں کو لرزا گیا۔ سر سے پاؤں تک کالے عبایا میں چھپی وہ کتنی مقدس کتنی پاکیزہ لگ رہی تھی۔ اس کے بے حد خوب صورت چہرے پر اک الوہی سا روپ سایہ کیے رہتا تھا مگر اس پل عجب سا ہراس چھانے لگا۔

باذل کو لگا اب وہ کبھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر پائے گا وہ کھڑے کھڑے جل کر بھسم ہو گیا تھا۔

ایسی بے ایمانی' ایسا صریح دھوکا ایسے تو کوئی راہزن بھی نہ لوٹے' وہ تو جیسے قزاقوں کے ہاتھوں لٹا تھا' سب مال اسباب ختم۔ بیچ بھنور میں وہ ڈوب رہا تھا شدید دکھ و اذیت کا اک بگولہ اٹھا تھا جو اس کے جسم و جاں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ غم و غصے سے پاگل ہونے کو تھا۔ زمامہ پر نظر پڑتے ہی جی چاہا ہاتھ میں پکڑا موبائل پوری قوت سے اس کے خوش نما چہرے پر دے مارے اور بلا شبہ وہ ایسا کر گزرتا اگر جو سامنے ہی بڑے سے سنگھار میز کے آئینے سے نظر نہ جا ملتی۔

"چنے بو کر گندم کی امید! کمال آدمی ہو تم بھی۔"

اس کا عکس اسی پر ہنس رہا تھا۔

"یہ دنیا ہے میاں! یہاں جو کھیتی کاشت کی جاتی ہے وہی کاٹی جاتی ہے۔ چاندی کے بھاؤ میں کبھی بھی سونا نہیں ملتا پر انسان رہتا اسی بھول میں ہے کہ وہ کنکر دے کر موتی خرید لے گا۔ جبکہ جہاں سارے حساب ہوتے ہیں وہاں تو کوئی بھول ہے ہی نہیں وہاں تو پل پل کا کھرا اور کھوٹا الگ کر لیا جاتا ہے اور پھر سب سودا آپ کے آگے دھر دیا جاتا ہے چاہے وہ دنیا کے حصے کا ہو چاہے بعد کا۔

ہائے رے انسان۔ تیری خوش فہمیوں' خود غرضیوں کا کوئی انت ہے بھی کہ نہیں۔ جانے کس گمان میں جیے جاتے ہو۔

یہ عورت جو کئی مہینوں سے تمہارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ نے تمہیں بے شمار خوشیوں سے نوازا۔ اس کی خوب صورتی تو ایک ظاہری وصف ہے اس میں اس کا کوئی کمال نہیں مگر اس کی سلیقہ شعاری اطاعت گزاری' وفاداری یہ تو اس کے اندر کے وصف ہیں اور ایسے اوصاف بزدل اور کم حوصلہ لوگوں کے نہیں ہوتے یہ اس کی اپنی ہمت سے پیدا کردہ خوبیاں ہیں۔

تمہیں ان پر کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ۔ یہ دنیا ہے اور یہاں کوئی بھی فرشتہ نہیں۔ جب تم خود بھی نہیں تو پھر کیسے کسی اور سے امید رکھ سکتے ہو۔ کسی اور کا حساب لینے سے پہلے سوچ لینا۔ کیا تم اپنا حساب دے پاؤ گے۔ بولو' بتاؤ۔" ہنستا ہوا عکس اب اسی پر چلا رہا تھا۔

جسم سے روح کیسے کھینچی جائے گی اس پل میں اس پر یہ حقیقت کھلی تھی۔ جب عدالت جرم ثابت کر دیتی ہے تو مجرم اس لمحے کیسی شرمساری و لاچاری سے گزرتا ہوگا' وہ اچھی طرح جان گیا تھا۔ ایسی بے بسی تمام عمر میں اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آئینے میں کھڑا وہ دوسرا آدمی کھینچ کھینچ کر اس کی روح پر کوڑے برسا رہا تھا۔ باذل کا ہاتھ اپنے ہی پہلو میں لٹک گیا۔ زمامہ کے چہرے پر ابھی جو نظر ٹکی تھی وہ غضب ناکی سے پر تھی مگر جب وہ اس کے جسم سے پھسلتی پیروں تک آئی تو اس میں کون سا رنگ غالب تھا یہ سمجھنا اور بتانا بہت ہی مشکل تھا۔ اس کے دماغ نے جیسے پھر وہی ٹیپ چلا دی تھی جس میں ایک جملہ بار بار گونج رہا تھا۔

"میری تو دعا ہے اللہ تجھے بھی بیٹی دے اور وہ بالکل تیرے جیسی ہو۔" باذل کو لگا اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہو رہی ہیں۔ پل پل اس کے چہرے کے رنگ بدلتے دیکھ کر زمامہ لپک کر اس تک آئی۔

"باذل کیا ہوا ہے آپ کو۔ کس کا فون تھا۔" اگلے سوال پر اس کی زبان ہکلائی باذل نے چپ چاپ فون اس کی جانب بڑھا دیا جس کا کال لاگ چیک کرتے ہوئے زمامہ کا گلابی رنگ بالکل سفیدی مائل ہوا تھا دل یوں سکڑا گویا بند ہو جائے گا۔ حواس باختہ ہو کر اس نے باذل کی طرف دیکھا جو اسے دیکھنے کی بجائے نیچے فرش کو گھور رہا تھا۔ دونوں آمنے سامنے کسی بت کی طرح کھڑے تھے۔ کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد باذل نے چپ پر ضرب لگائی تھی۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا یہ کس کا نمبر ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا یہ پھر تمہارے فون میں نہ ہو۔ میں نے کال ریسیو کی تھی لیکن لائن ڈراپ ہو گئی۔ تمہیں نہیں پتا میں کتنا شکی مزاج آدمی ہوں بلکہ ہر مرد ہی ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں یہ فون اپنی سہولت کے لیے لے کر دیا ہے' ادھر اُدھر دوستیاں گانٹھنے کے لیے نہیں۔" اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا' وہ اسے دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔ زمامہ کی رکی ہوئی سانسیں اور چہرے کا رنگ ایک ساتھ بحال ہوئے۔ اگلے ہی پل وہ اس کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور اس کے ہاتھوں کی لرزش آنکھیں جھکی ہونے کے باوجود باذل سے مخفی نہیں رہ پائی تھی۔ وہ وہیں بیڈ پر ڈھے گیا۔ زمامہ کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ کر ایک چھناکے سے نیچے جا گرا' وہ گھبرا کر اس پر جھک گئی۔

"باذل' باذل آپ ٹھیک ہیں ناں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" از حد پریشان ہوتی وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوچھ گئی۔

"میں ٹھیک ہوں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ لیکن کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز۔" وہ اس کے ہاتھ پرے کرتے ہوئے منہ پھیر گیا۔

"کیوں ایسا کیا ہوا ہے کچھ بتائیں تو سہی۔ میرا دل بند ہو جائے گا۔"

"ہو جائے میری بلا سے' میں نے کہا ہے ناں آؤٹ۔" وہ پوری قوت سے چلایا تھا اور زمامہ کو کوئی شک نہ رہا کہ اس کی زندگی کے ساتھ بھیانک کھیل کھیلنے والا یہ منحوس آلہ' ایک بار پھر اسے زندہ در گور کر گیا ہے۔ کمرے سے نکلتے ہوئے دانستہ بکھرے ٹکڑوں پر وہ شکستہ قدم رکھتی ہوئی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

باذل کے لیے زندگی میں آنے والا یہ دھچکا بہت اذیت رساں ثابت ہوا تھا۔ سب خوش گمانیاں' مان و بھروسے اس بری طرح چکنا چور ہوئے تھے کہ اس کی پور پور زخم زخم ہو گئی تھی۔ نہ وہ اتنا بلند حوصلہ تھا نہ ایسا اعلا ظرف کہ سب پل بھر میں بھول جاتا۔

مگر اس سب کو بھلانے کے لیے ارادہ تو کیا جا سکتا ہے ناں.... ایک ننھی سی محبت اس کے آگے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اور یہ وہ محبت تھی جو اس کی بیوی اپنے وجود میں سمیٹے اس وقت رب کے حضور سجدہ ریز تھی اور کئی دنوں سے اپنے ظرف اور ضبط کو آزماتا آج وہ ارادے کی کرن کے آگے ہار گیا تھا۔ زندگی آپ کی اپنی ہوتی ہے اور کچھ اختیارات آپ کی مٹھی میں جنہیں استعمال کرتے ہوئے چاہے تو آپ زندگی مشکل کرلیں یا پھر آساں۔

اور زندگی کو آسان کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسروں کی خطاؤں کو در گزر کرنا سیکھ جائیں۔

"میرے لیے کچھ دعا کیا کرو۔ اللہ میرے دل کو سکون دے۔" زمامہ دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی' وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور وہ جو اس گھمن گھیری میں تھی کہ شکوہ کرے یا دعا اسے اتنے قریب دیکھ کر سب بھول گئی۔ کئی رتجگوں کے باعث سوجی آنکھیں' بڑھی شیو۔ ملگجے سے رف حلیے میں وہ کتنا بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ زمامہ کی پلکوں سے کچھ اور آنسو لڑھک آئے۔ دل پر کسی احساس نے بڑے زور سے چٹکی کاٹی تھی۔ زندگی کی بہت سی صعوبتوں سے نمٹنے کے بعد یہ وہ شخص تھا جس کا وجود اس کے لیے گھنیری چھاؤں جیسا تھا مگر اب اک ذرا سی درز سے چھن کر آتی دھوپ نے اسے جھلسا ڈالا تھا۔ اس کی

بے رخی اور بے اعتنائی کسی کھردرے رسے کی طرح دل و روح سے لپٹی دم گھونٹ رہی تھی۔ بے اختیار اس کے شانے سے سر ٹکا کر وہ سسک اٹھی۔

"اللہ کے بعد آپ ہی میرا سہارا ہیں باذل۔ مجھ سے خفا مت ہوں۔ میں آپ کی ہوں' صرف آپ کی۔ آپ نے بھی مجھے دھتکار دیا تو میں مرجاؤں گی۔"

"خدانخواستہ کیسی فضول باتیں کررہی ہو' بیوقوف ہو تم بھی اور توبہ ہے بھئی ہم عورتوں سے۔ کیسے اتنا سارا رو لیتی ہو۔ کہاں چھپا رکھے ہوتے ہیں اتنے آنسو۔ میں تو ایک دن رویا تھا تو چار دن میرے سر سے درد نہیں گیا تھا۔"

"آپ' آپ روئے تھے کیوں۔" اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

"کیوں بھئی میری بار اتنی حیرت کیوں؟ کیا میں انسان نہیں؟ مجھے بھی درد ہوتا ہے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ میں بھی رو سکتا ہوں رونے کا ٹھیکہ صرف تم خواتین کے پاس ہی تو نہیں۔" وہ مسکرادیا۔ زمامہ کو اور رونا آیا۔

"سس۔۔۔ سوری باذل۔"

"شش' باذل نے جھٹ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔ اس نے کبھی کسی کتاب میں پڑھا تھا ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے۔ آپ کا عمل چاہے اچھا ہو یا برا قدرت اسے کبھی بھی ضائع نہیں کرتی۔ وہ ایک بیج کی طرح محفوظ کرلیا جاتا ہے اور جب چاہتی ہے اسے پنپنے دیتی ہے۔ اب جیسا بیج ویسا ہی پھل ہی اگے گا ناں۔ تب آپ تقدیر کو دوش دے کر خود بری الذمہ نہیں ہوسکتے مگر آپ ہونا چاہتے ہیں اور ایسا ہی کرتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو الجھی گرہوں کو سلجھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن اس حوصلے سے عاری کہ دوسروں کے سامنے اپنی کوتاہیاں مان لیں۔

وہ بھی ان ہی کم ہمت لوگوں میں سے تھا۔ اسے ادراک ہوچکا تھا کہ اس کے اعمال کی سیاہی اس کے دامن پر آئی ہے مگر وہ کس زبان سے زمامہ کے سامنے اقرار کرتا یوں ہی خواہ مخواہ کا غصہ ناک پر چڑھا کر کچھ تیکھے لہجے میں بولا۔

"پھر تم کہو گی میں بھی تم سے سوری کروں۔" اور زمامہ نے تیزی سے نفی میں سر ہلاتے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں پلیز ایسی بات کر کے مجھے گناہ گار مت کریں۔ میرے گناہ تو پہلے ہی بہت زیادہ ہیں اور بوجھ مت ڈالیں مجھ پر پلیز۔" اس کے آنسو تھے کہ بہتے چلے آرہے تھے۔ نیر بہا بہا کے سوجے سرخ ہوئے پپوٹے' زرد کملایا چہرہ' پپڑی جمے ہونٹ' وہ اپنا خیال تو پہلے بھی اتنے اہتمام سے نہیں رکھتی تھی۔ مگر اب تو لگتا تھا ان گزرے دنوں میں وہ نہایت ہی خود فراموش رہی ہے۔ اس کے چہرے پر سایہ کیے حزن و ملال نے باذل کو احساس ندامت کے شکنجے میں کس لیا۔ اس سے کیسی لاپروائی سرزد ہوئی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی اور جس حال سے بھی وہ کیونکر غفلت برت گیا اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہوگیا تو کیا وہ خود کو معاف کرپائے گا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔

وہ اسے دیکھے جارہا تھا۔ زمامہ نے بوکھلا کر ہاتھ ہٹایا نظر بھی چرالی جبکہ اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ پھر وہی ہاتھ تھام کر لبوں سے چھولیا۔ اس کی نظر پھر اٹھی تھی حیران و سراسیمہ سی' اُدھر پورا چہرہ دلفریب مسکان سے سجا جگمگا رہا تھا۔ وہ مزید بحر حیرت میں غوطہ زن ہوئی۔ یہ رویہ یہ روپ یا میرے اللہ کہیں خواب تو نہیں۔ زمامہ نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔

"کتنے دنوں سے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تم نے' بہت ہی سست اور نکمی لڑکی ہو۔ مجال ہے جو ذرا بھی خیال رکھ سکو اپنا۔ ہر فکر مجھے ہی ڈالی ہوئی ہے۔ چلو اٹھو فوراً" جلدی سے فریش اپ ہو جاؤ آج میں تمہیں تمہارے ہوٹل کے سیکنڈ فلور پر مزیدار سا کینڈل لائٹ ڈنر کرواتا ہوں۔ آج کی شام اور پورا ہال تمہارے نام۔ میں ابھی باسط بھائی سے کہتا ہوں' وہ کوئی ٹیبل بک مت کریں۔ آج وہاں صرف میں ہوں گا اور تم اور ہماری پیار بھری باتیں۔ پھر کیا خیال ہے

اس کے بعد شاپنگ پر چلیں۔ پتا نہیں کیسے پھیکے پھیکے عجیب سے کلر پہنتی ہو تم' تمہاری ساری شاپنگ میری مرضی سے ہوگی۔ اور ہاں اگر میرے لیے تمہیں کچھ پسند آجائے تو نو پرابلم وہ بھی خرید لیں گے اور اس کے علاوہ...'' وہ مگن سا اپنی ہی دھن میں بولتا جا رہا تھا یوں جیسے ان کے درمیان کوئی بات ہوئی ہی نہ ہوئی ہو۔ وہ گزشتہ بہت سے دن کبھی زندگی میں آئے ہی نہ ہوں۔ اور کئی لمحے تو زندگی میں ایسے آجاتے ہیں جن کے گزر جانے کے بعد ہم ان کے نشانوں کو دیکھتے ہیں سوچتے ہیں کہ کاش یہ زندگی میں کبھی آئے ہی نہ ہوتے۔ اس کی زندگی میں بھی ایسی کئی بری گھڑیاں آگزری تھیں جن کی نحوست تمام عمر پر چھا گئی تھی۔

جو بیٹیاں والدین کی برسوں کی محبتوں پر جوش جوانی میں آکر چند دنوں کی محبت کو ترجیح دیں ان کے ساتھ تقدیر پھر وہ سلوک کرتی ہے کہ پھر ان کے ہاتھ صرف پچھتاووں کی خاک رہ جاتی ہے جو وہ اپنے ہی منہ پر مل مل کر ہزار غم مناتی رہتی ہیں۔ مگر پھر بھی دکھ کا عذاب کم نہیں ہوتا اسے بھی تو اپنی ایک غلطی بہت مہنگی پڑ گئی تھی۔

اب وہ چاہے جتنا ہی روتی' تڑپتی' سلگتی۔ کون تھا زخموں پر پھاہے رکھنے والا پھر ان کا درد بھی وہ جو کسی سے کہا بھی نہ جائے۔

اور جن سے کہنا چاہا تھا وہ سننے پر راضی نہ تھے۔ اب صرف ایک ہی واحد ہستی رہ گئی تھی جس کے آگے اس نے اپنا مقدمہ رکھ دیا تھا۔ وہ دل سے تائب تھی اور جب کوئی اپنا گناہ مان لے' شرمسار بھی ہو اور کثرت سے عرق ندامت بھی بہائے تو پھر کوئی شک نہیں کہ دامن پر لگے داغ نہ دھلیں۔

وہ گنگ سی اسے بولتے دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن حقیقتاً'' اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا' صرف اس کے لہجے کی کھنک تھی جو کسی دلآویز موسیقی کی طرح سماعتوں میں رس گھول رہی تھی' اس کی آنکھوں سے پھوٹتی وہ الوہی ان کہے جذبوں کی کرنیں جو روح کی ویرانی کو دور کرنے بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ اور وہ تو روز ہی کئی کئی بار صحن دل کو اشکوں کے پانی سے دھو دھو کر صاف کرتی رہتی تھی۔ وہاں تو کوئی گرد نہ تھی۔ جب کھلے کواڑوں سے بے پایاں خوشی اور مکمل ایقان نے اندر قدم رکھے تو اس نے جھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

ان مہمانوں کو قید رکھنا اب اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ضرور رکھے گی' وہ جس کے آگے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی' وہ یقیناً'' اس کی خطاؤں کو بخش دے گا۔ بے شک وہی کرتوں کو سہارا دینے والا ہے اور سچے دل سے توبہ کرنے والوں کو تو وہ خود دس قدم آگے بڑھ کر سنبھال لیتا ہے۔

باذل سیل فون پر نمبر ملاتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ باسط بھائی کو اپنا پلان بتا رہا تھا۔ کئی آنسو زمامہ کی آنکھوں سے لڑھکتے چلے گئے۔ لبوں پر خوشی سے لبریز ہنسی مچل رہی تھی۔ لیکن وہ کھل کر ہنس نہیں پائی۔ کیونکہ کوئی بھی خوشی منانے سے پہلے اس پر سجدۂ شکر واجب تھا۔ اسی لیے تو اس نے نفل کی نیت باندھ لی تھی۔

انیقہ محمد بیگ

دروازہ

”ہاں.... تم سے محبت تھی۔“
”اچھا...! یہ محبت تھی؟“ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔
”اب.... مجھے کبھی فون مت کرنا.... میں اس محبت کی کہانی کو ختم کرنا چاہتا ہوں.... اور نئی زندگی کی طرف جانا چاہتا ہوں۔“ وہ چپ چاپ سنتی رہی مگر شاید



آنسوؤں کے پاس زبان ہوتی تو وہ چیخ چیخ کر پوچھتے۔۔۔
"یہ کیسی محبت تھی تمہاری۔۔۔؟ جس کو تم خود ختم کر رہے ہو؟"
"تم سن رہی ہو نا۔۔۔؟" اس نے اس کی طویل خاموشی کے بعد اونچی آواز میں پوچھا۔
"ہاں۔۔۔" اس نے کانپتے ہونٹوں سے جواب دیا۔
"اچھا۔۔۔ اب میں فون رکھتا ہوں۔۔۔ خدا حافظ۔"
اس نے مضبوط لہجے میں بات ختم کی۔ اور فون کاٹ دیا۔ وہ بت بنی سیل فون کو صرف دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"سمعیہ! یہ کلر تم پر بہت اچھا لگے گا۔" اس نے دکان میں ڈھیر سارے جوڑوں میں سے ایک جوڑا اس کے لیے پسند کیا۔ وہ جو مختلف ڈیزائن دیکھ رہی تھی' اپنے شوہر کی آواز پر پلٹ کر اس نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں گلابی رنگ کا خوب صورت جوڑا تھا۔ جس پر گلابی رنگ ہی کی نفیس کڑھائی ہوئی تھی۔
"یہ اچھا ہے نا۔۔۔؟" اویس نے محبت سے پوچھا۔
"ہاں۔۔۔!" وہ رنگ۔۔۔ جو اسے اس کی یاد دلاتا تھا' اس نے پہننا چھوڑ دیا تھا مگر آج دو سال کے بعد۔۔۔ وہ رنگ پھر سے اس کا شوہر اسے پہنانا چاہتا تھا۔
"کیا ہوا۔۔۔؟ پسند نہیں آیا۔۔۔؟" وہ اس کے ایک دم بجھے چہرے کو بھانپ گیا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت جو کرتا تھا۔ اس نے سمعیہ کو پہلی بار ایک پارک میں بیٹھے دیکھا تھا۔ جو اپنی سوچوں میں یوں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے پارک میں آنے والے کسی شخص کی خبر ہی نہیں تھی۔
وہ اس پارک میں صبح کی سیر کرنے آتا تھا اور ہمیشہ سمعیہ کو تنہا بینچ پر بیٹھا دیکھتا اور نہ چاہ کر بھی اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا اور پھر ایک دن اس نے سمعیہ سے بات کرلی۔
"ہیلو! میں اویس۔۔۔ یہاں روز صبح سیر کرنے آتا ہوں اور آپ کو ہمیشہ اس بینچ پر دیکھتا ہوں۔ آپ ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں۔۔۔ کہ آپ یہاں۔۔۔ تنہا۔۔۔؟"
اس نے اویس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔۔۔ جو روز اسے دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ وہ دنیا سے بے خبر ہے۔
"جی۔۔۔ میں تنہا تو نہیں ہوں۔۔۔" اس نے عجیب سا جواب دیا۔ اور پھر اپنے ہی جواب پر شرمندہ سی ہوگئی۔۔۔ اس نے اگلے ہی لمحے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔
"سنیے۔۔۔ سنیے۔۔۔ مس۔۔۔!" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا' مگر وہ نہ رکی اور پارک سے باہر نکل گئی۔ وہ دیر تک گھر آکر اس کی بات کو سوچنے لگا "جی نہیں۔۔۔ میں تنہا تو نہیں ہوں۔۔۔" اس کا یہ "جملہ" پھر وہ بھول نہ پایا اور اس کے بارے میں جاننے کے لیے اپنے دوست حمزہ سے بات کی۔
"ہاں۔۔۔ اس کے والدین نہیں ہیں۔۔۔ اور وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں سیکنڈ شفٹ میں بچوں کو پڑھاتی ہے۔ اپنے بھائی بھابھی کے پاس رہتی ہے۔۔۔ اچھی لڑکی ہے۔۔۔" اس کے دوست نے اس کو ایک ہی دن میں ساری معلومات دے دیں۔
"حمزہ۔۔۔! میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے فوراً "فیصلہ کیا۔
"کیا۔۔۔؟ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟"
"ہاں حمزہ! تم اور صوبیہ بھابھی اس کے گھر جاکر میرے رشتے کی بات کرو۔"
"مگر اویس۔۔۔ تم ابھی ابھی پاکستان آئے ہو۔۔۔ اچانک ایک لڑکی۔۔۔ جس کو تم جانتے نہیں اس سے شادی کا فیصلہ۔۔۔؟" حمزہ نے اپنے جگری دوست کو حیرت سے دیکھا جو لندن سے ابھی دو ماہ پہلے بزنس کے سلسلے میں آیا تھا اور اس کے پاس ہی رہائش پذیر تھا۔
"بس حمزہ! میں نے فیصلہ کرلیا۔۔۔ میں اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔۔۔ تم بس اور مزید کچھ نہیں بولو گے۔"
اور یوں سمعیہ اویس کی دلہن بن کر اس کی زندگی میں آگئی۔ وہ دلہن کے روپ میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے بہت محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی نظریں جھکنے لگیں۔

"سعدیہ..... اب تم تنہا نہیں ہو اور میں تمہیں کبھی تنہا ہونے نہیں دوں گا۔" وہ اویس کو دیکھتی رہ گئی.... جس نے اس کے ایک جملے سے محسوس کر لیا کہ وہ کتنی تنہا ہے اور ایک وہ شخص تھا جس سے اس نے بے پناہ محبت کی تھی اور پھر بھی وہ اس کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔

کیا محبت وہ تھی جو اس نے نو سال اس شخص سے کی تھی یا پھر محبت یہ ہے.... جس نے ایک "جملے" میں ہی اس کو سمجھ لیا اور اسے عزت دے کر اپنا نام دیا۔ اپنے گھر لے آیا۔ اویس جیسا شوہر پا کر اسے احساس ہوا کہ اس نے محبت کو اب سمجھا ہے۔

اور وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا جب ہی فوراً گلابی جوڑے کو واپس ریک میں لٹکا دیا اور اس کے پسندیدہ نیلے رنگ کا سوٹ اٹھا لیا۔

"یہ رنگ تمہارا فیورٹ ہے نا.... یہ کیسا رہے گا۔" وہ مسکرائی.... "ہاں.... یہ اچھا رہے گا۔" اس نے ایک دم خود کو سنبھالا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کبھی بھی وہ "سعد" یا اس کے ماضی کو جان پائے۔

"تو پھر شاپنگ ہو گئی ہو تو گھر چلیں.... مجھے آفس سے کالز بھی آ رہی ہیں۔" اس نے اپنے سیل فون کو دیکھتے دیکھتے جواب دیا۔

اس نے سر ہلایا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

وہ اسے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر آفس چلا گیا۔ وہ شاپنگ بیگ اٹھا کر گھر میں داخل ہوئی اور ایک لمبا سانس اس نے صوفے پہ بیٹھ کر لیا۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اس کی سانس رک سی رہی تھی۔ وہ "شخص" اس کی یاد.... اس کے حلق میں پھنستی جا رہی تھی جس سے اس نے بے پناہ محبت کی تھی.... وہ پھر سے اپنے ماضی میں کھو گئی۔

"وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔" اس کی سہیلی طیبہ چیخی، جب اس نے بتایا وہ شادی کر رہا ہے۔

"وہ فیصلہ کر چکا ہے۔"

"وہ اکیلے فیصلہ نہیں کر سکتا۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"اس نے ہمیشہ اکیلے ہی فیصلے کیے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"تم نے اسے روکا نہیں....؟" وہ اس کے آنسو دیکھ کر پریشانی سے بولی۔

"وہ جا چکا تھا.... روکتی کیسے....؟" اس نے لمبا سانس کھینچا یوں جیسے وہ زندہ تو ہے۔

"نہیں.... مجھے نمبر دو.... میں بات کرتی ہوں.... اس سے....." اس نے پریشان ہو کر نمبر مانگا۔

"نمبر.... انمبر.... میں بھول چکی ہوں....." اس نے نظریں چرائیں اور آنسوؤں پر قابو پایا۔

"تم اتنی بہادر کیسے ہو.... سعدیہ..... میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید اس کی بات سن کر مر جاتی اور تم اتنا بڑا دھوکہ کھا کر جی رہی ہو؟"

"اللہ اس کو کبھی خوش نہیں رہنے دے گا.... وہ سکون مانگے گا مگر اس کو سکون نہیں ملے گا.... صرف.... مادی چیزوں کے لیے اس نے تمہیں ٹھکرا دیا۔"

"اس دنیا میں مادی چیزوں کے علاوہ کچھ ہے بھی تو نہیں.... اس نے بھی اپنا مستقبل سوچا۔ اس لیے مجھ جیسی سیدھی سادی لڑکی کو چھوڑ کر اس نے اس "ڈاکٹر" کو اپنا لیا۔"

"میری بددعا ہے.... وہ کبھی خوش نہ رہے گا.... سعدیہ۔"

"مت دو.... بددعا اسے.... اسے بھی حق ہے کہ وہ اپنا مستقبل بہتر بنائے اور اس کا بہتر مستقبل وہ لیڈی ڈاکٹر ہی ہے.... بس اب میں چاہتی ہوں.... طیبہ.... کہ ہم اس بارے میں بات نہ کریں۔"

"سعدیہ.... ! جی بھر کر رو لو.... میرے سامنے.... تمہاری آنکھیں آنسوؤں کی جلن کو برداشت نہیں کر پا رہیں.... دیکھو.... کتنی سرخ آنکھیں ہو گئی ہیں۔" طیبہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے جب اس نے اپنی

سہیلی کو اندر ہی اندر سلگتے دیکھا۔

اس نے اپنی آنکھیں مسلیں اور مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں ٹھیک ہوں۔"

اس کی بات پر طیبہ زاروقطار رونے لگی۔۔۔ اور وہ اسے دلاسا دیتے دیتے کہہ رہی تھی۔ "میں ٹھیک ہوں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔"

اللہ نے اسے بہت ہمت دی تھی اور ہمت بھی ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو اللہ کے بہت قریب ہوتے ہیں۔

وہ اپنے ماضی سے اویس کی آواز سے باہر نکلی۔

"سمعیہ۔۔۔ سمعیہ۔۔۔" وہ کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ جب وہ اس کے پاس بیٹھ کر اسے جگانے لگا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" وہ یک دم چونکی۔

"میں ہوں۔۔۔ اویس۔۔۔" وہ اس کے بوکھلانے پر فوراً بولا۔

"آپ۔۔۔ آپ آگئے۔۔۔؟" اس نے نظریں چرائیں جن میں آنسو تیر رہے تھے۔

"جی جناب۔۔۔ میں آگیا۔۔۔ اور آپ کی زندگی سے کبھی نہیں جانے والا۔" وہ اس کی بات پر مسکرانے لگی۔

"تمہاری مسکراہٹ میں میری زندگی ہے۔۔۔ سوچتا ہوں۔۔۔ کہ کبھی میں نے تمہیں روتا دیکھ لیا۔۔۔ تو کہیں میں مر نہ جاؤں۔۔۔ سچ سمعیہ! میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں۔۔۔ اللہ سے ہمیشہ یہی دعا مانگتا ہوں کہ ہماری زندگی میں کبھی کوئی پریشانی نہ آئے۔" اس نے لمبا سانس لے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ اس کا تھا۔۔۔ جو اس کے سامنے تھا۔۔۔ اس کا سہارا بن کر۔۔۔ اس کا شوہر بن کر۔

"اللہ نے آپ کو آپ کی محبت دے دی۔۔۔ اسی لیے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔۔۔ اور ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔۔۔ اور اب بس! بہت باتیں ہو گئیں۔۔۔ آپ چینج کر کے آرام کر لیں۔ صبح پھر ہم لوگوں نے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے اور چھوٹے بھائی کی شادی پر اگر بڑا بھائی دیر سے پہنچے گا تو لوگ کیا سوچیں گے؟" اس نے محبت سے اس کی طرف دیکھ کر خریدی گئی چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

وہ اپنے جوتے اتار رہا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے تیزی سے جوتے اتار دیے اور پھر فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔

سمعیہ نے محبت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر اس کے جوتوں پر پڑی۔ اس نے اویس کے جوتے اٹھائے اور انہیں کمرے سے باہر رکھ کر دروازہ بند کرنے لگی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سعد نے جوتے سمجھ کر اسے اپنی زندگی سے باہر نکال دیا تھا۔ مگر وہ شاید یہ جانتا نہیں تھا کہ محبت جوتا نہیں ہوتی جسے پیروں سے اتار دیا جائے وہ تو خوشی ہوتی ہے جو بغیر دستک دیے زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ اللہ نے سمعیہ کی زندگی میں بھی خوشیاں بھر دی تھیں۔۔۔ کیوں کہ اس نے اپنے حصے کی محبت میں کبھی بے ایمانی نہیں کی تھی۔



نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔



مکمل ناول

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی' ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیراں سے' جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے' بہانے سے پاس ورڈ حاصل کرکے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے' جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کرکے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈر کر لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔
بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہو جاتی ہیں۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے 'حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس ایور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس 'زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی 'ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم 'خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم 'خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث 'فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم 'فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ 'زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔
حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی اپیل ہائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں 'جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات 'زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے۔ اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔
سعدی 'فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔
سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالر شپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔
زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتادیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہوجاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کرواچکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مرواسکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کررہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کرلے جاچکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کردیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہوجاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہوجاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہوچکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو ماردیں گے۔

ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتاکر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین' نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کردیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔ سعدی' زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہوسکتا ہے۔

"مثلاً" کون؟" زمر نے پوچھا۔

"مثلاً" ۔۔۔ مثلاً" ہاشم کاردار....." سعدی نے ہمت کرکے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہوگئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو اِن کا ہے۔
ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔
ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔
فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔
زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔
جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔
حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔
اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔
زمر، فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی، وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔
جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی، ڈاکٹر توقیر بخاری، ڈاکٹر ایمن بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ.... فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا انتقام لے گا۔
سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتا دیا ہو گا۔
ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔
ہارون عبید مشہور سیاست دان جواہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر، احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ آب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے جو سعد کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔
فارس، زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔
(1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کر کے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے، وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔
تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔
حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتا دیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک او سی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہو سکتیا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے' جہاں احمر شفیع' ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔ زمر اور فارس' حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔

ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آجاتے ہیں۔

حنین اور زمر' ہاشم کی سیکرٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔

ہاشم' سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے' پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے' تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے' جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ "حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔" اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔

جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ اوسی پی کو قتل کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے' جو سعدی نے اوسی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔

زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گردہ جو سعدی نے دیا تھا۔ ناکارہ ہو چکا ہے۔

سولہویں قسط

"میرا مرض مستمر!"

میں نے ایک سمر کیمپ اٹینڈ کیا تھا۔
اس چھڑی جیسی لڑکی ٹوانلا اسٹنز بری کے ساتھ۔
وہ بہترین ایتھلیٹ تھی۔
اسے فٹنس کا جنون تھا۔
جتنی دبلی ہو جائے' کم تھا۔
ایک پاؤنڈ یہاں سے' ایک پاؤنڈ وہاں سے۔
ہرنی کی طرح بھاگتی تھی۔
مگر پھر... وہ چلنے کے قابل بھی نہ رہی'
تب میں نے جانا کہ وہ اینوریکسک (نفسیاتی بیمار) تھی۔
اس بیماری نے اس کی بصارت چھین لی تھی۔
میں نے نہیں دیکھا ٹوانلا سے زیادہ کسی کو
اپنے جسم کے بارے میں اتنا جنونی۔
ساری زندگی اس نے جس چیز کے پیچھے بھاگتے گزاری'
اس نے اسے تباہ کر دیا۔
تم کہتے ہو برلن' انتقام تمہارا جنون ہے۔
میں تمہیں بتاؤں' انتقام جنون نہیں ہوتا۔
یہ تو ایک بیماری ہے۔
جو دل کو کھاتی ہے'
اور روح کو زہریلا کر دیتی ہے۔
(دی بلیک لسٹ کے کردار "ریمنڈ ریڈنگٹن" کا مکالمہ)

ستمبر کے آخری ایام میں گرمی کم تھی' مگر حبس اب بھی تھا۔ ایسے میں اس اسپتال کی اونچی بلڈنگ کی ایک کھڑکی سے جھانکو تو اندر ڈاکٹر قاسم بشارت کے کمرے میں زمر بالکل خاموش بیٹھی تھی اور ڈاکٹر قاسم اس کو تاسف سے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کو اپنے ہزبینڈ کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔"

زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ مجھے میری کڈنی کا بتائیں۔ کیا وہ مکمل طور پہ ختم ہو چکی ہے؟" بظاہر مضبوط انداز سے پوچھا۔

"زمر! آپ نے چار سال اس ڈونیٹڈ کڈنی پہ گزارے ہیں..."

"مگر یہ پرفیکٹ میچ تھا' آپ نے کہا تھا' میری قسمت اچھی ہوئی تو بیس سال بھی گزار سکتی ہوں۔"

ڈاکٹر کی بھی آنکھوں میں کرب سا ابھرا۔
"آئی ایم سوری زمر مگر پچھلے تین ماہ سے نہ آپ دوا ٹھیک سے لے رہی ہیں، نہ چیک اپ کے لیے آتی ہیں، پچھلے ہفتے ٹیسٹس کے لیے بھی میں نے زبردستی آپ کو بلایا تھا۔" وہ رک کے گہری سانس لی۔ "آپ کی کڈنی تقریباً" ختم ہوچکی ہے۔ مکمل نہیں 'تقریباً'۔"
"کتنے عرصے بعد مجھے نئی کڈنی کی ضرورت پڑے گی؟"
"جلد از جلد۔ جتنی دیر کریں گی۔ اتنا مسئلہ ہوگا۔ کیا آپ نے کسی اور ڈاکٹر کی رائے لی؟"
"جی' میں ڈاکٹر فاروق احسان کے پاس گئی تھی۔ ٹیسٹس بھی دوبارہ کروائے۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ مجھے جلد از جلد ٹرانسپلانٹ کروانا ہوگا۔" کمرے میں ایک آزردہ سی خاموشی آٹھہری۔
"کیا آپ کی فیملی میں کوئی ایسا ہے جو آپ کو کڈنی ڈونیٹ کرسکے؟" قدرے توقف سے انہوں نے پوچھا۔
"میں کوئی گیم تو نہیں کھیل رہی کہ ایک چیز ضائع ہوجائے تو دوسرے سے مانگ لوں۔ کڈنی ڈونیشن بہت بڑی بات ہے اور میں اپنی فیملی سے کچھ بھی نہیں مانگنا چاہتی مزید۔" وہ اس سوال پہ ناخوش ہوئی۔
"اوکے ریلیکس!" انہوں نے اسے تسلی دی۔ "میں ڈونر کا بندوبست کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جتنی جلدی اور جن ملے' اتنی جلدی ہم ٹرانسپلانٹ کردیں گے' لیکن آپ نے پہلے کی طرح اب بداحتیاطی نہیں کرنی۔ میں پھر کہوں گا' آپ اپنی فیملی میں کسی کو راضی کرنے کی۔۔۔"
وہ مزید باتیں نہیں سن سکتی تھی۔ فضا میں موجود حبس اور گھٹن بڑھ گئی تھی' اس لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

اپنی تلاش کا سفر ختم بھی کیجیے کبھی
خواب میں چل رہے ہیں آپ

اسی حبس زدہ دن جب پرندے اکتائے اکتائے اڑ رہے تھے' ایک اور اسپتال کے پرائیویٹ روم میں آب دار عبید ایک کرسی پہ بیٹھی تھی اور سامنے بستر پہ لیٹے مریض کی باتیں توجہ سے سن رہی تھی۔ وہ ایک درمیانی عمر کے صاحب تھے۔ ابھی مکمل طور پہ صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ نالیاں وغیرہ ہنوز لگی تھیں۔ چہرے پہ بھی نقاہت تھی۔
"پچھلی ملاقات میں آپ مجھ سے اچھی طرح واقف ہوچکے ہیں۔" وہ نرمی اور رسان سے کہہ رہی تھی۔ "ویسے تو میں ہپنو تھراپسٹ ہوں' مگر ایک ریسرچ کے سلسلے میں مجھے آپ کا کیس سننا ہے۔ کیا آپ کمفرٹیبل ہیں؟"
"جی! آپ پوچھیے۔" انہوں نے نقاہت سے اسے دیکھتے سرہلایا۔
"اوکے۔" آب دار نے گہری سانس لی۔ "آپ کی سرجری کے دوران جواد صاحب! ایک وقت ایسا آیا تھا جب آپ کا دل بند ہوگیا تھا' اور آپ کو واپس لانے میں ڈاکٹرز کو پچاس سیکنڈ لگے تھے۔ ان پچاس سیکنڈز کے لیے آپ کلینیکلی مردہ ہوچکے تھے۔" وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے پھر اثبات میں سرہلایا۔ "ان پچاس سیکنڈز میں۔۔۔ کیا ہوا تھا؟ کیا دیکھا آپ نے؟"
جواد صاحب کے چہرے پہ تکلیف ابھری۔ ذرا سے شانے اچکائے۔ "آپ یقین نہیں کریں گی۔"
"ٹرائی می!" وہ مسکرائی۔
انہوں نے گہری سانس لی۔ آنکھیں بند کرکے یاد کیا۔ "اس وقت میری سرجری جاری تھی۔ نشے کے باوجود مجھے تکلیف ہورہی تھی' کچھ آوازیں بھی کانوں میں پڑتی تھیں' ڈاکٹرز وغیرہ کی' پھر میں نے سنا کہ وہ لوگ مجھے لوز کررہے ہیں' ذرا سی افراتفری پھیلی۔" وہ رکے۔
وہ غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ "پھر؟"
"پھر جیسے اچانک سے میری ساری تکلیف ختم

ہو گئی' میں نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ میں اس بارے میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتا' لیکن آپ پوچھ رہی ہیں تو۔۔۔" سر جھٹکا۔ "ایسے جیسے میں کسی بوجھ سے آزاد ہو گیا ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں نے۔۔۔ محسوس کیا کہ" وہ آنکھیں موندے وقت سے بول رہے تھے۔۔۔ "کہ جیسے کوئی مجھے کھینچ رہا ہے۔ میں آپریشن ٹیبل پہ لیٹا تھا۔ میں نے خود کو اس کے نیچے سے نکلتا محسوس کیا' ہلکا اور آزاد' اور اس کے آگے۔۔۔ ایک تاریک جگہ تھی' جیسے کوئی غار یا سرنگ ہوتی ہے' میں اس میں سے گزر کر دوسری طرف نکلتا گیا۔" آبدار نے نوٹ بک پہ کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔ "پھر؟"

"اس غار نما تاریکی سے نکل کر میں نے دیکھا کہ۔۔۔ میں اسی آپریشن تھیٹر میں ہوں' مگر اوپر۔۔۔ فضا میں تیر رہا ہوں۔ آپ یقین نہیں کریں گی' مگر میں نے اوپر سے دیکھا کہ نیچے ٹیبل پہ میرا جسم لیٹا ہے' اور ڈاکٹرز مجھے مسلسل ریوائیو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اس دفعہ آبدار نے کاغذ کو دیکھے بنا چند الفاظ گھسیٹے۔ "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد۔۔۔" انہوں نے یاد کیا۔ "میں نے اوپر فضا میں دیکھا' اپنے والد کو' اور ایک بچی کو جو میرے بچپن میں اسکول میں کرنٹ لگنے سے مر گئی تھی اور بھی چند فوت شدہ رشتہ داروں کو۔ وہ مجھے دیکھ رہے تھے لیکن میرے اور ان کے درمیان ایک سرحد تھی' مادی سرحد نہیں' نہ ہی کوئی لکیر۔ وہ ایک ایسی ان دیکھی باؤنڈری تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا' میں اس طرف تھا اور وہ لوگ دوسری طرف وہ مجھے مسلسل واپس جانے کا کہہ رہے تھے' اور میں نہ آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے مڑ سکتا تھا۔"

"کیا آپ نے وہاں کسی اور کو دیکھا؟"

کتنے ہی لمحے وہ کچھ نہ بولے۔ پھر اسی طرح بند آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔ "روشنی۔ وہ روشنی تھی' مگر ٹیوب لائٹ یا سورج یا چاند کے جیسی روشنی نہیں۔ وہ مختلف قسم کی تھی۔ شاید اسی کو نور کہتے ہیں' مگر وہ صرف نور نہیں تھا' وہ نور کا وجود تھا۔ A being of light۔ آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"میں سمجھ رہی ہوں۔ کیا اس نے آپ سے بات کی؟" وہ بغور ان کے چہرے کی اذیت دیکھ رہی تھی۔

"جی۔ مگر ایسے نہیں جیسے انسان کرتے ہیں' الفاظ سے نہیں' پھر بھی میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ابھی میرا وقت نہیں آیا' اور یہ کہ مجھے واپس جانا ہو گا۔" انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ "پھر ہر شے ریوائنڈ ہو گئی۔ میں واپس ہوتا ہوا اپنے جسم میں داخل ہو گیا۔ بھاری اور وزنی۔"

"اس وجود کے قریب کیا محسوس کیا آپ نے؟"

"غیر مشروط محبت۔ احساس قبولیت۔ علم کی تڑپ۔ وہ سراپا محبت تھا۔ وہ کون تھا؟ اور کیا یہ صرف ایک خواب تھا؟"

"نہیں' یہ NDE تھا Experiance Near Death (موت کی قربت کا تجربہ) آپ سمیت دنیا میں ہزاروں لوگ اس سے گزر چکے ہیں۔ چونکہ آپ کی موت کا مقررہ وقت ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے آپ مر کر بھی زندہ ہو گئے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "رہی بات کہ وہ کون تھا' تو آج تک کوئی انسان نہیں بتا سکا کہ وہ کون تھا۔ اس تجربے سے گزرنے والے یہود کہتے ہیں کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے' عیسائی کہتے ہیں وہ مسیح ابن مریم تھے' مسلمان کہتے ہیں کہ وہ ملک الموت عزرائیل علیہ السلام تھے' لیکن مجھ سے پوچھو تو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ نورانی وجود جو مر کر زندہ ہونے والوں کو ملتا ہے' وہ کون ہے۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ وہ آپ کو کیا سکھاتا ہے؟"

اپنی چیزیں سمیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"آپ خوش نہیں لگ رہیں' جیسے آپ کو جس چیز کی تلاش تھی وہ آپ کو نہیں ملی۔"

آب دار کی گردن میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ وہ جبراً" مسکرائی۔ "کوئی بات نہیں۔ آپ آرام کیجیے۔" اب وہ مسکرا کر الوداعی کلمات کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کہ جس ہاتھ میں پتھر' کماں میں تیر نہ ہو
کوئی بھی ایسا مرے شہر مہرباں میں نہ تھا

قصر کاردار کے لاؤنج میں اس صبح کھلی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ شہرین سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی اور ہاشم کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

اندر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا۔ شرٹ کے کالر کھڑے تھے اور میز پہ رکھی تین عدد ٹائیز میں سے ایک اٹھا رہا تھا۔ آہٹ پہ نظر اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ سفید شرٹ اور خاکی پینٹ میں ملبوس' سنہرے بالوں کی اونچی پونی بنائے شہری' مسکراتی ہوئی آرہی تھی۔

"سونی ہم دونوں کو اپنے اسکول فنکشن میں ساتھ ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ او نہ' گرے ٹائی نہیں چلے گی اس کے ساتھ۔" وہ آگے آئی اور ہاشم کے ہاتھ سے نرمی سے گرے لے کر رکھی اور بلیو اٹھائی۔ ہاشم نے بس مسکرا کر اسے دیکھا' بولا کچھ نہیں۔ شہری اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"شیرو کی کمپنی کیسی جارہی ہے؟ میں نے سنا ہے تم دونوں ہارون عبید کے ساتھ شراکت داری کررہے ہو اس کمپنی میں؟" اس کے کالر مزید کھڑے کیے اور ٹائی گردن میں ڈالی' پھر گرہ لگانے لگی۔

"تم نے صحیح سنا ہے۔"

وہ ہاشم کی آنکھوں میں دیکھ کر گرہ کو اوپر تک لائی۔

"ہاشم!" مٹھاس سے پکارا۔ "سعدی کہاں ہے؟"

"یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔ تمہاری بہت دوستی تھی اس سے۔" وہ بھی اسی انداز میں مسکرایا۔

"جس گن سے اسے مارا گیا ہے' وہ گلاک سترہ فورٹی ون تھی۔ شیرو کے پاس ہے ایسی گن۔ انکار مت کرنا۔" مسکرا کر اس کے کھڑے کالر سیدھے کیے' پھر ٹائی کی ناٹ پکی کی۔ "کہیں یہ نہ ہو کہ میں فارس کو کال کردوں۔" اب وہ ڈریسنگ ٹیبل سے ٹائی پن اٹھانے مڑی تو ہاشم نے اپنا موبائل اٹھایا۔ شہری واپس ہوئی' اس کی ٹائی کو شرٹ کے ساتھ پن کے ذریعے نتھی کیا' تو ہاشم نے نمبر ملا کر اسپیکر آن کیا۔ تیسری گھنٹی پہ فارس کا "ہیلو؟" کمرے میں گونجا۔ ٹائی پن لگاتی شہری نے چونک کر ہاشم کو دیکھا۔ وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

"فارس یار! شہری کو تم سے ضروری بات کرنی ہے' اس کے فون کی بیٹری ختم تھی۔ اس کی بات سن لو ذرا!" اعتماد سے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ شہری کے ہاتھ اس کی ٹائی پن پہ ہی جم گئے۔ دم بخود' ساکت۔ فارس "ہیلو؟" کہہ رہا تھا۔ اس نے بدقت تھوک نگلا۔

"ہاں فارس' کیسے ہو؟" زخمی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھتے جبراً" مسکرا کر بولی۔ "اکتوبر کے پہلے ویک اینڈ پہ ہماری ہاؤس وارمنگ ہے۔ تم آسکو گے؟"

"نہیں۔ بزی ہوں۔" ذرا توقف سے بولا۔ "اور کچھ؟"

"نہیں۔ تھینک یو۔" جلدی سے بولی۔ ہاشم نے فون بند کرکے میز پہ ڈالا۔ پرفیوم اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھتے گردن پہ چھڑکا۔ فضا ایک دم معطر ہوگئی۔

"تمہارے تو الفاظ ہی غائب ہوگئے شہری یقیناً اس لیے کہ تمہارے باپ کا سارا کاروبار میرے اوپر ہے تم نے سنا میرے اوپر انحصار کرتا ہے۔ رہی سعدی کی بات تو اس کو غائب کرنے میں میرا نہیں' تمہارا ہاتھ ہوسکتا ہے اور اگر تم نے فارس کو کچھ کہنا ہوتا تو بہت پہلے کہہ دیتیں۔ کوٹ؟" کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ شہری نے مرے مرے ہاتھوں سے کوٹ کو سامنے کیا۔ ہاشم نے اس میں اپنے بازو ڈالے اور پھر اسے کندھوں پہ برابر

کرتے اسی طرح بولتا گیا۔

"اور جو گن میں نے شیرو کو گفٹ کی تھی' وہ جی فورٹی فائیو تھی۔ اس کا تمام پیپر ورک میرے لاکر میں موجود ہے۔ سو اگلی دفعہ مجھے بلیک میل کرنے کے لیے کوئی بہتر طریقہ ڈھونڈنا بجائے...." کوٹ کو بٹن بند کرتے ہوئے اس کی طرف گھوما اور مسکرا کر اس کے کندھے پہ لٹکا پرس اتارا۔ بجھے چہرے والی شہری حرکت بھی نہ کرسکی۔ "بجائے میرا اعتراف ریکارڈ کرنے کے۔" پرس سے ریکارڈنگ پہ رکھا سیل فون نکال کر اس کے سامنے لہرایا' اور دروازے تک آیا۔ فیشونا کو بلایا۔

"اس کو چولہے میں پھینک دو۔" سیل فون اس کو تھماتے درشتی سے بولا۔ پھر مڑ کر بت بنی شہری کو دیکھا۔

"تم آرہی ہو یا میں اکیلا جاؤں؟"

"مجھے تمہاری نئی کمپنی میں شیئرز چاہئیں۔ تینتیس فیصد۔" بمشکل گردن اکڑا کر بولی۔ ہاشم مسکرایا۔

"شہری...." چہرہ اس کے کان کے قریب کیا۔ "میں تمہیں اپنی کمپنی سے ایک پائی بھی نہیں دینے والا۔" وہ باہر نکل گیا تو شہری نے تلملا کر پیر پٹخا۔

☼ ☼ ☼

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج؟
آنکھیں بھی ہیں' چراغ بھی ہے' آئینہ بھی ہے

اس صبح حنین اسٹڈی ٹیبل پہ اپنی پسندیدہ کتاب "درمیان" کھولے بیٹھی تھی۔ کچھ دن سے وہ اسے باقاعدگی سے پڑھ رہی تھی اور اٹھاسی فصلیں پڑھنے کے بعد' دل پہ گناہوں سے لگنے والے زنگ کو سمجھنے کے بعد وہ اس فصل پہ پہنچ گئی تھی جس کا اسے انتظار تھا۔

"باب 89 ۔ مرض عشق کی دوا!"

ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے پوری توجہ سے وہ دروازہ ڈھونڈا جو قدیم زمانوں میں لے جاتا تھا' اور پھر گزرے زمانوں ——— میں خود کو غرق

کرتے ہوئے پٹ کھول دیے۔

دوسری جانب ایک روشن دوپہر واضح ہوئی۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ ایک چراگاہ پہ بکھری تھی۔ سبزہ۔ ہر سو سبزہ۔ اور اس زمردی گھاس پر سفید، پھولے پھولے سے۔ بھیڑ جا بجا گھاس چرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کیا واقعی دمشق میں اتنا سبزہ تھا؟ مگر کوئی بات نہیں۔ یہ حنہ کی دنیا تھی۔ وہ قدم قدم چلتی آئی اور ایک پتھر پہ بیٹھے شیخ کے دائیں جانب آ بیٹھی۔ جھکے کندھوں کے ساتھ اس نے محض اتنا کہا۔

"میں آ گئی ہوں۔ مجھے بتایئے۔ کیا ہے میرا علاج؟"

شیخ اپنے سفید سرمئی لباس میں بیٹھے تھے۔ نگاہیں دور چرتے بھیڑوں پہ تھیں۔ دھیرے سے بولے۔

"وقف الھوی بی حیث انت فلیس لی۔ متاخر عنہ ولا متقدم"

(تیری محبت نے مجھے وہاں لا کھڑا کیا ہے جہاں تو ہے۔
اب یہاں سے مجھے نہ کوئی پیچھے ہٹا سکتا ہے نہ آگے بڑھا سکتا ہے۔)

"درست۔ میں بھی ایسے ہی نقطے پہ کھڑی ہوں۔" وہ بھی سامنے دیکھنے لگی۔ "میرا دل جل رہا ہے، میں بے چین ہوں، مضطرب ہوں۔ کیا اس قاتل جادو کے اتار کا کوئی منتر ہے؟ میرے دل میں یہ مرض مستمر (پرانا مسلسل چلے آنے والا مرض) اپنی جگہ بنا چکا ہے اور میں اپنا دل کھو چکی ہوں۔ کیا میں پھر سے اپنے دل کی مالکن بن سکتی ہوں؟ وہ گناہ گار ہے، قاتل ہے، پھر بھی میں اس سے نفرت نہیں کر پا رہی۔"

"مریض محبت کو سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہیے لڑکی! کہ کسی شخص کے قبضے سے اپنا دل چھڑانے کے لیے اس کو "بھولنا" یا اس سے نفرت کرنا ضروری نہیں۔"

"بھولے بغیر موو آن کیسے کیا جائے پھر؟"

"اس کا علاج کر کے۔ انسان کو چاہیے کہ اس مرض کو یا تو پیدا نہ ہونے دے، لیکن اگر پیدا ہو چکا ہے تو اس کے علاج کے دو طریقے ہیں۔ آج میں تمہیں پہلا طریقہ سمجھاتا ہوں۔"

"اور کیا گارنٹی ہے کہ میں یہ کروں گی تو میرا دل مجھے واپس مل جائے گا؟"

"یہ تمہارے اوپر منحصر ہے کہ تم کتنی اچھی دوا لیتی ہو۔"

اس کا دل پھر سے شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگا۔ سات سو سال پرانے شیخ کو کیا معلوم موبائل، انٹرنیٹ، آئل کارٹیلز، پاکستان کے مرڈر ٹرائلز اور ان سارے مسئلوں کا جو اسے درپیش تھے، مگر پھر بھی اس نے سننا چاہا۔ شیخ کا پہلا توڑ۔

"غض بصر۔"

"آ... مطلب؟" اسے عربی بھول بھال گئی تھی۔

"اپنی نگاہ کو پست رکھو، نگاہ کی حفاظت کرو۔ اس کو نہ دیکھو جس کی وجہ سے دل کھویا ہے۔" حنین نے حیرت سے ان کو دیکھا جن کی نگاہیں سامنے تھیں۔ بھیڑ چراگاہ میں چر رہے تھے۔ ہوا چل رہی تھی، مگر حنہ کا دماغ الجھ گیا۔

"نگاہ پست کرنے سے کیا ہوگا؟"

"دس فائدے ہیں۔ سنو گی؟" شیخ نے مسکرا کر چہرہ اس کی طرف موڑا۔ حنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پہلا۔ یہ اللہ کا حکم ہے، اور جو بھی انسان فلاح پاتا ہے، وہ حکم الٰہی مان کر ہی فلاح پاتا ہے، اور جو ناکام ہوتا ہے، وہ حکم نہ ماننے کی وجہ سے ناکام ہوتا ہے۔"

حنین مزید توجہ سے سننے لگی۔

"دوسرا فائدہ۔ اس کی نظر جو زہر آلود تیر تمہارے دل تک پہنچا کر تمہارا دل ہلاک کرتی ہے، آنکھ کی حفاظت سے وہ تیر تمہارے دل تک نہیں پہنچے گا۔" وہ انگلیوں پہ گنوا رہے تھے۔

"سوئم، نظر کی حفاظت سے دل میں پوری توجہ سے اللہ کے لیے محبت پیدا ہوتی ہے، ورنہ جن لوگوں کی نگاہ آزاد اور آوارہ رہتی ہے ان کا دل منتشر رہتا ہے۔ آزاد نگاہی بندے اور اللہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔"

"صحیح!" وہ منہمک ہو کر سن رہی تھی۔

"چہارم۔ آنکھ کی حفاظت سے دل مضبوط اور پُرسکون رہتا ہے اور آزاد نگاہی یعنی ہر غلط چیز یا شخص کو دیکھ لینے سے دل مغموم رہتا ہے۔"

"پنجم۔ نگاہ پست رکھنے سے دل میں "نور" پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ سورہ نور میں اللہ نے غض بصر کی آیت کے بعد ہی آیت نور پیش کی؟ کیونکہ دل میں نور نظروں کی حفاظت سے داخل ہوتا ہے' اور جب دل نورانی ہو جائے تو ہر طرف سے خیر اور برکت اس انسان کی طرف دوڑتی ہے۔ اور جن کے دل اندھیر ہوں' ان کو شر اور تکالیف کے بادل گھیرے رکھتے ہیں۔"

چراگاہ اور اس کے اجلے اجلے بھیڑ' ہر چیز حنین کے ذہن سے محو ہو چکی تھی اور وہ مکمل یکسوئی سے سن رہی تھی۔ بوڑھا استاد کہہ رہا تھا۔

"ششم۔ تم اللہ کا اصول جانتی ہو۔ اس کے لیے جو چھوڑو گے' وہ اس سے بہتر عطا کرے گا۔ تم "نگاہ" چھوڑو' وہ بدلے میں "نگاہ" عطا کرے گا۔ وہ تمہیں بصیرت دے گا' فہم و فراست کی نگاہ عطا کرے گا' اور تمہاری فراست کبھی خطا نہیں ہو گی۔ مومن اسی نگاہ کی وجہ سے ایک سوراخ سے دوسری بار نہیں ڈسا جاتا۔"

حنین کے دل کی گرہیں کھل رہی تھیں۔

"ساتویں چیز۔ آزاد نگاہی سے انسان ذلیل ہوتا ہے' اپنے نفس کے قدموں میں خود کو رول کو بے توقیر کر دیتا ہے' مگر جو نگاہ کی حفاظت کرتا ہے' اللہ اس کو عزت دیتا ہے' لوگوں میں بھی' فرشتوں میں بھی۔" وہ سانس لینے کو رکے۔

"آٹھویں بات۔ نگاہ کے ذریعے شیطان اتنی تیزی سے دل میں جا پہنچتا ہے جتنی تیزی سے کسی خالی جگہ میں خواہشات بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ امیدیں دلاتا ہے' گناہوں کی توجیہات پیش کرتا ہے' اور انسان گناہ کی آگ میں یوں جلتا ہے جیسے کسی بکری کو تنور میں ڈال کر بھونا جائے۔ اسی لیے شہوت پرستوں کو قیامت کے دن آگ کے تنوروں میں ڈالا جائے گا۔"

"اوہ۔" وہ چونکی۔ "یہ جو جہنم کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں' یہ گناہوں کو Symbilize کرتی ہیں' جیسا گناہ ویسی شکل کی سزا؟"

شیخ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"نویں چیز۔ غض بصر سے دل کو قرآن پہ غور و فکر کرنے کو موقع ملتا ہے۔ ورنہ جن کی نگاہیں آوارہ ہوں' ان کے دل اتنے پھنسے اور الجھے ہوتے ہیں کہ یہ فراغت ان کا مقدر نہیں بن سکتی۔"

"آخری یعنی دسویں چیز!" انہوں نے گہری سانس لی۔ "انسان کے دل اور آنکھ کے درمیان ایک سوراخ ہے' ایک راستہ ہے۔ جس کام میں آنکھ مشغول' اسی میں دل مشغول ہوتا ہے۔ ایک کی اصلاح سے دوسرے کی اصلاح ہوتی ہے' ایک کے فساد سے دوسرے کا فساد ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی نگاہ کو صاف رکھو' اس شخص کو نہ دیکھو جس کی طرف دل ہمکتا ہے' کیونکہ یہ تمہارے لیے حرام ہے۔ اگر حلال ہوتا تو ٹھیک تھا' لیکن حلال نہیں ہے۔ سو جب اپنی نگاہ کی مالک بن جاؤ گی تو دل کو بھی واپس حاصل کر لو گی۔ یہ پہلا طریقہ کرو۔"

حنین نے کتاب بند کی تو قدیم زمانوں کا فسوں' سبز چراگاہ اور اجلے بھیڑ سب غائب ہو گئے' آنکھیں موند کر اس نے کتاب پہ سر رکھ لیا۔ وہ صبح شام کھڑکی سے ہاشم کی بالکونی دیکھا کرتی تھی' وہ کب آتا ہے' کب جاتا ہے' اسے ساری خبر تھی۔ کیونکہ نگاہ وہیں لگی تھی۔ یہ نظر ہوتی ہے جو اونٹ کو ہانڈی اور انسان کو قبر تک پہنچاتی ہے۔ کیا نظر بد والی حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے؟ وہ کسی اور دنیا میں گم سوچے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں اپنے باپ کا یوسف تھا اس لیے محسن
سکوں سے سو نہ سکا' بھائیوں سے ڈرتا رہا

سعدی یوسف کے زنداں خانے میں خاموشی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑا قلم سے ایک لکیر لگا رہا

تھا۔ نیلی جینز پہ سبز ٹی شرٹ پہنے تھی وہ اب پہلے سے دبلا لگتا تھا۔ میری نے میز پہ کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہاں کونے میں کئی اور لکیریں بھی لگی تھیں۔ چار ماہ اور دو دن۔ وہ قید کے دنوں کا یوں حساب رکھتا تھا۔

"کیا آج ہماری عید ہے' میری؟" میز کی طرف آتے اس نے اداسی سے پوچھا۔

"نہیں' کل ہے۔"

(مجھے یہاں شاید چار ماہ ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی میرے لیے نہیں آیا۔ کیا واقعی میرے گھر والے میرے لیے کوشش کر رہے ہوں گے) سوچتے ہوئے وہ بے دلی سے کھانا شروع کرنے لگا۔ پھر رک کر اسے دیکھا۔

"میری اینجیو۔ رات کو کیا ہوا تھا؟ تم پڑھتے پڑھتے اس کاؤچ پہ سو گئی تھیں' پھر نیند میں ایک دم سے اٹھیں اور باہر چلی گئیں۔ دیکھو مجھے تمہارے ادھر آنے پہ اعتراض نہیں۔ اگر تو میں تمہیں پسند آ گیا ہوں تو میرے جیسے ہینڈسم لڑکے۔"

"بکومت۔ تم میرے بیٹے سے چند سال ہی بڑے ہو گے۔" خفگی سے اسے جھڑکا۔ پھر ایک ہاتھ سے کنپٹی سہلائی۔ "میں سونے جا رہی ہوں' گارڈ برتن لے جائے گا۔ ماما تو اب ویسے بھی نہیں آتی۔" اسے پتا تھا کہ میری کے سوا وہ کسی کو اپنے کمرے میں برداشت نہیں کرتا۔

"اگر تم نے رات کو کوئی برا خواب دیکھا ہے تو بتاؤ' میں تمہیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں' یا صاحب السجن!"

"خود کو جوزف سمجھنا چھوڑ دو اور کھانا کھاؤ۔" درشتی سے ٹوکتی وہ سامنے بیٹھ گئی۔ مگر سعدی نے کھانا ڈھک دیا۔

"کون سا خواب ہے جو تمہیں اکثر رات کو نیند سے جگا دیتا ہے؟"

میری کچھ لمحے خاموش رہی' پھر بولی تو لہجہ ذرا نرم تھا۔ "پہلے نہیں۔ پہلے تو میرے بیٹے کا ہی خیال آتا تھا۔ اب تو اس کا علاج ہاشم کروا رہا ہے نا۔ مگر جب سے

میں نے تمہیں وہ نیکلس والی بات بتائی ہے' وہ سب یاد آنے لگا ہے۔ جب مسز کاردار نے علاج کی رقم دینے سے انکار کیا تو کیسے فیونا میری ہمدرد بن کر مجھے اکساتی تھی کہ ان کا نیکلس چرا لوں۔ اس کو ان کے جیولری باکس کا کوڈ بھی معلوم تھا۔"

"اسے کیسے پتا تھا؟" وہ چونکا۔

"صاف بات ہے' مسز کاردار مجھے نوکری سے نکالنا چاہتی تھیں' مگر کانٹریکٹ کے تحت میرا دورانیہ رہتا تھا ابھی' سو فیونا نے ان کے ایما پہ سارا کھیل ترتیب دیا۔ میں نے چوری کر ڈالی اور ڈی پورٹ ہونے کے قریب تھی کہ تمہاری وجہ سے ہاشم مجھے یہاں لے آیا۔"

"مسز کاردار کو کانٹریکٹ سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ہاشم بلاوجہ ان کو اپنے باپ کی ملازمہ کو نہ نکالنے دیتا۔"

"مطلب؟" وہ الجھا۔

"ان میاں بیوی کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔ اورنگ زیب کاردار مجھ سے جواہرات پہ نظر رکھواتے تھے' وہ اسی لیے مجھ سے بدظن رہتی تھیں۔ حالانکہ ان کی پسند کی شادی تھی۔ جواہرات نے اپنے ایک بے حد چاہنے والے کو ٹھکرا کر اورنگ زیب سے شادی کی' اور اورنگ زیب کی پہلی شادی بھی تڑوائی' اس سے اورنگ زیب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ جواہرات نے اورنگ زیب کو دو بیٹے دیے۔ دولت دی۔ مگر اب وہ ایک دوسرے سے بے زار ہو چکے تھے۔"

"تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے؟"

میری مسکرائی۔ "بے وقوف لڑکے' میں اس گھر کی ملازمہ رہی ہوں' مالک سمجھتے ہیں جیسے ہماری زبان نہیں' ویسے ہمارے کان بھی نہیں ہیں مگر ہم ہر کھانے پہ' ہر چائے پر موجود ہوتے ہیں۔ گھر کے سارے راز ہمارے سینوں میں دفن ہوتے ہیں۔"

"واؤ۔ خیر اب کیا چیز تمہیں ڈسٹرب کرتی ہے؟"

"وہ رات' جب اورنگ زیب کاردار کی موت

ہوئی۔"اس نے جھرجھری سی لی۔"شاید اندر سے میں خود اتنے برس مسز کاردار کی محبت بھری ایک پکار کی منتظر رہی ہوں۔اس رات زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ انہوں نے مجھ سے مسکرا کر بات کی تھی۔میں اوپر ہاشم کی بالکونی میں پودے دیکھ رہی تھی' ساتھ فون پہ اپنے بیٹے سے بات کر رہی تھی۔" وہ یاد کر کے بتا رہی تھی۔"وہ نیچے اپنے باتھ روم کے دروازے سے' جو پچھلے برآمدے میں کھلتا تھا' باہر نکل رہی تھیں۔ان کو سردی میں دیکھ کر مجھے فکر ہوئی' میں نے ان کو کچھ گرم اوڑھنے کا مشورہ دیا۔وہ مسکرائی تھیں۔پھر مجھے اورنگ زیب کے لیے کافی لانے کا کہا۔سب اچھا تھا۔مگر کچھ وقت بعد اورنگ زیب صاحب کی موت۔"جھرجھری لی۔"اس کے بعد سعدی! وہ کبھی بھی میرے ساتھ اچھی نہیں رہیں۔ہر وقت ترش اور خفا۔سعدی! میں نے گیارہ سال ان لوگوں کی خدمت کی۔مگر ان میں سے کسی نے گیارہ منٹ انٹرنیٹ پہ میرے بیٹے کے کیس کو سرچ نہیں کیا۔صرف تم نے احساس کیا تھا میرا۔کاش میں نے تمہارے لیے اس قصر کا دروازہ کبھی نہ کھولا ہوتا۔"

"میری!" وہ ہمدردی سے آگے ہوا۔"تم اس رات کو اس لیے بار بار دیکھتی ہو کیونکہ تم نے اورنگ زیب کاردار جیسے اپنے ایک حمایتی کو کھویا تھا۔تم دل سے چاہتی ہو کہ وہ واپس آجائیں۔اور کچھ نہیں۔"

"کیا میرے خواب کا کوئی مطلب نہیں نکلتا' جوزف؟" اسے مایوسی ہوئی۔

"اگر ہم قدیم مصر کے قید خانے میں ہوتے اور میرے ساتھ فرعون کی کنیز قید ہوتی تو تمہارا خواب بہت قیمتی ہوتا' اس کے بدلے میں یا تو تمہیں سزائے موت دی جاتی اور پرندے تمہارا سر نوچ کھاتے' یا تم ایک دفعہ پھر سے شاہی محل جا کر ملکہ اور اس کے بیٹوں کی خدمت کرتیں۔مگر نہ میں جوزف ہوں' نہ مجھے خواب کی تعبیر بتانی آتی ہے' میں تو تمہارا دل ہلکا کرنا چاہتا تھا۔"

میری نے غیر مطمئن انداز میں سر ہلایا مگر اٹھتے ہوئے وہ ناخوش لگ رہی تھی۔شاید کچھ اور تھا جو اسے ہمیشہ سے الجھاتا تھا۔

✿ ✿ ✿

میں اپنے ڈوبنے کی علامت کے طور پر
دریا میں ایک آدھ بھنور چھوڑ جاؤں گا

جسٹس سکندر کے ڈرائنگ روم میں زرد بتیاں جلی تھیں۔ٹی وی اسکرین پہ مسلسل وہی خبر چل رہی تھی۔سامنے ٹہلتے جسٹس صاحب نے غصے سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا۔پھر ہاشم کو دیکھا جو ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھا تھا' بازو صوفے کی پشت پہ پھیلا رکھا تھا اور ناخوشی کے باوجود خود کو پرسکون رکھے ہوئے تھا۔

"میرا گھر سے نکلنا تک عذاب کر دیا ہے رپورٹرز نے۔آپ کو تو کسی نے یہاں آتے نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔خاور نے کالونی خالی کروالی تھی پولیس سے۔" ہاشم نے ناک سے مکھی اڑائی۔تب ہی خاور اندر داخل ہوا۔دروازہ بند کیا اور جسٹس صاحب کے مقابل آکھڑا ہوا۔

"یہ سب نہ ہوا ہوتا سر' اگر آپ بیس مئی کو مجھے پوری بات بتاتے۔آپ نے بتایا کہ سعدی آپ کو آپ کے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات اور آپ کے افیئر کی تصاویر کے ساتھ بلیک میل کر رہا ہے جو اسے آپ کے کمپیوٹر سے ملی تھیں۔"

"یہ سچ ہے۔اس نے میرے کمپیوٹر کے ری سائیکل بن سے مٹائی ہوئی چیزیں نکال لی تھیں۔" وہ سچ کہہ رہے تھے۔

"اور ویڈیو؟ اس ویڈیو کا کیوں نہیں بتایا آپ نے؟"

جسٹس سکندر نے سر جھٹکا اور آگے پیچھے ٹہلنے لگے۔وہ سخت کبیدہ خاطر نظر آرہے تھے۔

ہاشم نے قدرے ٹھنڈے انداز میں پکارا۔"وہ ویڈیو سعدی کو کہاں سے ملی تھی۔"

"میں نہیں جانتا۔"

"کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ وہ اب کس کس کے پاس

ہوگی؟ کیونکہ میرے خیال میں یہ فارس غازی کا کام ہو سکتا ہے۔" ہاشم پر یقین تھا۔

"او نہوں۔" جسٹس سکندر نفی میں سر ہلاتے سامنے صوفے پہ بیٹھے۔ "وہ دماغ سے نہیں' ہاتھوں سے سوچتا ہے' اتنی لمبی پلاننگ وہ نہیں کر سکتا۔"

ہاشم اور خاور نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ہاشم نے گہری سانس لی۔ "وہ میرا کزن ہے' میں برسوں سے اس کو جانتا ہوں' یہ اسی کا کام ہے۔"

"اس لڑکے نے کہا تھا کہ یہ ویڈیو صرف اس کے وکیل کے پاس ہوگی' اگر سعدی کو کچھ ہوا تو وکیل اس کو ریلیز کردے گا۔" خاور نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ہاشم کے بھی ابرو بھنچے۔

"کون ہے اس کا وکیل؟"

"زمر یوسف نہیں ہے' کوئی اور ہے۔"

"تو سر اس نے چار ماہ انتظار کیوں کیا؟" خاور کو الجھن ہوئی۔ "اگلے ہی دن ویڈیو کیوں نہ ریلیز کردی؟"

"وہ (گالی) میرے ہائی کورٹ جج بننے کا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں کوئی عام جج نہیں ہوں' میرا بھائی سیکریٹری ہے' سیاسی خاندان ہے میرا۔ اور اب (گالی) کی وجہ سے مجھے استعفیٰ دینا پڑ رہا ہے۔ مجھے نہیں پتا ہاشم! لیکن لڑکا تمہارے پاس ہے' اس سے پوچھو کہ ویڈیو کس نے ریلیز کی ہے' اس سے پوچھو ورنہ اگر میں ڈوبا تو یاد رکھنا' تم سب کو لے ڈوبوں گا۔" وہ غصے سے انگلی اٹھا کر کہہ رہے تھے۔ ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر دھیرج کا اشارہ کیا۔

"آرام سے یور آنر۔ ہارون عبید اور ہاشم کاردار جیسے دوستوں کی موجودگی میں آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔" مگر واپس کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے خاور سے کہا تھا۔

"سعدی سے اس وکیل کے بارے میں پوچھنا ہوگا۔"

"آپ کو نہیں سر' مجھے پوچھنا ہوگا۔" خاور سختی سے بولا تو ہاشم نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔

"جو بھی پوچھنا منہ زبانی پوچھنا۔ اس پر کسی قسم کا ٹارچر مت کرنا۔" خاور اس بات سے شدید کوفت کا شکار ہوا مگر خاموش رہا۔ اسے فارس سے زیادہ وکیل پہ شبہ تھا۔

☆ ☆ ☆

میں جب بھی عالم حیرت میں آئینہ دیکھوں؟
ہزار نیزوں پہ اپنا ہی سر نظر آئے

انیکسی پہ دم توڑتے ستمبر کی وہ قدرے حبس آلود رات اتر رہی تھی۔ نیچے تہ خانے میں زمر چند کاغذات کھول کھول کر دیکھ رہی تھی' اور فارس ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے فون پہ بات کر رہا تھا۔ حنین انگلی سے میز پہ لکیریں بنا رہی تھی۔

"خلیجی صاحب نے بھی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ سعدی کا وکیل کون تھا۔" فارس نے فون رکھا تو زمر نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ بلیک پینٹ پہ گرے شرٹ پہنے' وہ چھوٹے کٹے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے الجھا الجھا لگ رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے فارس' سعدی نے جھوٹ بولا ہو' اس کا کوئی وکیل نہ ہو۔"

"نہیں' اس نے کسی کو تو بتایا ہوگا۔" وہ مطمئن نہیں تھا۔

"حالانکہ بھائی کو یہ سب ہمیں بتانا چاہیے تھا۔" حنین نے صرف سوچا' مگر شاید اس کا ذمہ دار سعدی نہیں' وہ اور زمر تھیں۔

"ویڈیو کی فارنزک جلد آجائے گی۔ جج مستعفی ہوجائے گا مگر وہ کبھی گرفتار نہیں ہوگا' ویڈیو جعلی اور اوسی پی کی موت طبعی قرار دے دی جائے گی۔ کچھ دن بعد میڈیا نیا ایشو پکڑ لے گا اور اس کو سب بھول جائیں گے۔ ویلکم ٹو پاکستان!"

"ابھی تک سوائے پولیس کے' کوئی کھل کر جج کی حمایت میں سامنے نہیں آیا۔ دیکھتے ہیں۔" ان دونوں کی باتوں سے حنین کو بوریت ہونے لگی تو اوپر چلی آئی۔

کل عید تھی۔ اس دفعہ حنین نے نئے کپڑے نہیں لیے تھے۔ امی سعدی کے لیے بھی نئے کپڑے نہیں لائی تھیں۔ پتا نہیں کیوں۔

وہ کچن کی گول میز پہ آبیٹھی۔ لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا اور بڑے ابا قریب بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ندرت اس کے ساتھ آبیٹھیں۔

"شبنم باجی کے ہاں سے کارڈ آگیا ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ان کے بیٹے کی شادی ہے۔ سوچ رہی ہوں ولیمہ بھگتا آؤں ٹوکیہ خالہ اور سارہ کے ساتھ۔"

"امی! آپ کا جانا ضروری ہے کیا؟" وہ سوچ میں ڈوبی بولی۔ بڑے ابا نے چونک کر کتاب سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اے لو۔ ضروری کیوں نہیں؟ خاندان کا معاملہ ہے۔ پھر کچھ دینا دلانا بھی پڑتا ہے۔"

"اف امی، پوری بات تو سنیں۔" وہ جھلائی۔ "آپ کا بھی شائستہ خالہ سے وہی رشتہ ہے نا جو فارس ماموں کا ہے؟"

"ہاں تو؟"

"تو ماموں سے کہیں نا کہ وہ چلے جائیں۔" ابا اسے دیکھتے زیر لب مسکرائے۔ مگر ندرت نہیں سمجھی تھیں۔

"اس کو کیوں تنگ کروں حنین؟ وہ بے چارہ پہلے ہی کام میں مصروف رہتا ہے، اس کے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں امی۔ ان کے پاس وقت نہیں ہوتا کیونکہ وہ پچھلے چار ماہ سے سعدی بھائی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ امی، وہ لوگ اپنی شادی کے بعد سے ایک دفعہ بھی باہر کھانا کھانے نہیں گئے۔ کبھی ساتھ گھومنے نہیں گئے۔ سعدی بھائی کے ساتھ یہ سب انہوں نے نہیں کیا۔ پھر ہم کیوں سارا بوجھ ان دونوں پہ ڈال دیں۔ اور ان کو کوئی اسپیس ہی نہ دیں۔"

ندرت چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ "مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔"

"مگر مجھے تو آگیا نا۔ اب سنیں۔" پرجوش سی، راز داری سے کہنے لگی۔ "آپ کہہ دیں ماموں سے کہ آپ کے گھٹنوں میں درد ہے، اور آپ نہیں جاسکتیں سو وہ چلے جائیں۔ آگے سے وہ کہیں گے، اچھا میں حنین اور سیم کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ آپ کہنا، کوئی ضرورت نہیں، اپنی بیوی کو لے کر جاؤ۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے، بلکہ صرف زمر پھپھو کو دیکھیں گے، وہ خود ہی کہہ دیں گی کہ میرا تو کورٹ میں فلاں کام ہے، آپ کہنا، ہفتہ کی شام کون سا کورٹ ہوتا ہے؟ پھر دو تین جذباتی ڈائیلاگ بولنا کہ میرا سعدی ہوتا تو وہی چلا جاتا، ساتھ آنکھوں میں آنسو بھی لے آنا، جیسے دادی کے سامنے ایکٹنگ کرتی تھیں ویسے ہی، بس پھر دونوں مان جائیں گے۔"

چٹکی میں مسئلہ ہی حل کر دیا حنین نے۔ ندرت کا بس جوتے پہ ہاتھ جاتے جاتے رہ گیا۔ بڑے ابا مسکرا کر کتاب پڑھنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد کھانے کی میز کے گرد سب بیٹھے تھے اور خاموشی سے کھانا کھایا جا رہا تھا۔ تب ہی ندرت نے بات چھیڑی۔

"فارس! شبنم باجی کے بیٹے کا ولیمہ ہے اگلے ہفتے۔ تمہارا الگ کارڈ بھیجا ہے۔"

اس نے لقمہ لیتے ہوئے محض سر ہلا دیا۔

"میرے گھٹنوں میں بہت درد ہے آج کل، ایسا کرو تم چلے جاؤ، صرف چند گھنٹوں کی ہی تو بات ہے۔"

فارس نے رک کر انہیں دیکھا۔ بڑے ابا نے مسکرا کر سر جھکایا۔

"میں؟"

"میں نہ کہتی مگر جانا ضروری ہے، اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا۔" فارس کی نظریں حنین کی طرف اٹھیں۔ "حنہ اور سیم کو ساتھ بھیج دیں پھر۔"

بے خبر سیم کا چہرہ کھل اٹھا۔ "میں؟ سچی؟ کب جانا ہے؟" حنین نے زور سے اس کے پاؤں پہ اپنا جوتا مارا، اس کی بولتی بند ہوئی، پھر بے چارگی سے فارس کو دیکھا۔ "سوری ماموں، میرے ایگزامز ہیں۔"

"ان دونوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انہوں نے

تمہیں زمر کے ساتھ بلایا ہے' تو تم دونوں میاں بیوی چلے جاؤنا۔"

زمر نے نوالہ منہ میں رکھتے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھر فارس کو۔ اس نے بھی زمر کو دیکھا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔

"بھابھی' میں ضرور جاتی' مگر کورٹ میں میری ایک ضروری سماعت ہے اور۔"

"ارے ہفتے کی رات کون سا کورٹ ہوتا ہے؟ ویسے بھی اگر میرا سعدی ہوتا تو میں تمہیں کبھی نہ کہتی' مگر۔"

"ٹھیک ہے' ہم چلے جائیں گے۔" فارس نے سنجیدگی سے بات ختم کی۔ زمر بھی چپ ہو گئی۔ بڑے ابا مسلسل زیر لب مسکراتے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ حنہ نے ابا کو "میں نہ ہوتی تو اس گھر کا کیا بنتا؟" والی نظروں سے دیکھ کر فخریہ شانے اچکائے۔

☼ ☼ ☼

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

عید قربان بہت سی قربانیوں کی داستان اپنے اندر سموئے آئی۔ تو اداس موسم میں خوشی سی کھل گئی۔ سعدی یوسف نے اپنے کمرے کی دیوار پہ آج ایک لکیر کا مزید اضافہ کرتے ہوئے ان کو گنا تو معلوم ہوا' اس قید میں اسے چار ماہ اور دو دن بیت چکے تھے۔ دل کے نہاں خانے میں شکوہ پھر سے اٹھا تھا۔ کیا ان چار ماہ میں کسی نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا؟ مگر پھر سر جھٹک دیا۔ اور باتھ روم میں آیا۔ کموڈ کے اوپری ٹینک کا ڈھکن کھولا۔ اندر کلنگ فلم (جو سینڈوچ کے اوپر سے وہ اتار کر سنبھال لیتا تھا) میں لپٹی چند چیزیں رکھی تھیں جو اس نے گزرے دنوں میں جمع کی تھیں۔ گارڈ کا لائٹر۔ ایک اسٹیل کا کانٹا۔ کانٹے کے دانتوں کو اس نے لائٹر سے پگھلا پگھلا کر ایک Pick بنانے کی کوشش کی تھی' مگر وہ پوری طرح سے نہ بن پائی تھی۔ اس کو یاد تھا کہ لاک کیسے کھولتے ہیں۔ مگر کیا یہ لاکس وہ کھول پائے گا؟ مایوسی اس کے رگ و پے میں پھیلنے لگی۔

پاکستان میں عید کی دوسری شام قصر کاردار میں باربی کیو کی مہک پھیلی تھی۔ طویل ڈائننگ ٹیبل پہ ڈنر سجا تھا اور تینوں کاردارز کے ہمراہ ان کے انیکسی والے رشتے دار موجود تھے۔ یہ ڈنر ہاشم کی طرف سے تھا' اور وہ' براہی کرسی پہ براجمان تھا۔ دوسری سربراہی کرسی پہ فارس بیٹھا تھا۔ ہاشم کی سیدھ میں۔

ڈنر سرو کیا جا رہا تھا' موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ملازم بار بار تازہ اشیاء لا رہے تھے۔ سیم کا دھیان صرف کھانے پہ تھا۔ ندرت جواہرات سے نارمل بات چیت کر رہی تھیں۔ بڑے ابا بھی نارمل تھے۔ نوشیرواں ازلی بے زار' سر جھکائے کھانا زہر مار کر رہا تھا۔ فارس اپنی کرسی پہ بیٹھا بے نیاز' مگر اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ سب نارمل تھے۔ سوائے دو لوگوں کے۔

ندرت کے دائیں بائیں بیٹھی زمر اور حنین۔

زمر تنے نقوش اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ گود میں رکھی دوسری مٹھی بار بار بھینچ لیتی لیکن حتی الامکان کوشش تھی کہ آنکھوں میں وہ غصہ نہ نظر آئے جو اندر ابل رہا تھا۔ ذہن میں وہ سارے ماہ و سال چل رہے تھے جب وہ ہاشم کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی رہی' کیسے جواہرات اسے اسپتال میں دیکھنے آتی تھی' اور وہ کبھی نہ جان سکی کہ یہ لوگ۔' آف زمر' یہ ابھی مت سوچو۔'

حنین بالکل سر جھکائے آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ وہ غصے میں نہیں تھی۔ وہ تکلیف میں تھی۔ ہاشم نے اسے ایک دفعہ بھی مخاطب نہیں کیا تھا' اس کا دل جل رہا تھا' لیکن اداکاری جاری تھی۔ (وہ کتنے سکون سے فون پہ سعدی کے سامنے اس امتحانی مرکز والے وکیل کو کال کر کے کہہ رہا تھا کہ وہ حنین کا کیس کھلوا سکتا ہے؟ حنین اس کے لیے کیا تھی؟ ایک بے وقوف لڑکی؟ کاش وہ اس سے نفرت کر سکے' مگر نفرت بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ مگر یہ تو طے تھا کہ وہ اس کو دیکھے گی نہیں۔ (نگاہ کی مالک بنے گی تو دل کی مالک بنے گی۔)

"جسٹس سکندر کے ساتھ بہت برا مذاق کیا گیا ہے'

"یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے زمر!" ہاشم نے جتنے سکون سے اسے مخاطب کیا' زمر نے اتنے ہی اطمینان سے چہرہ اٹھایا۔ فارس بالکل آرام سے کھانا کھاتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔

"ظاہر ہے ان کے کسی دشمن کی ہوگی لیکن نہ وہ گرفتار ہوں گے نہ کسی مشکل میں پڑیں گے۔"

"نگران کو اپنی کرسی چھوڑنی پڑے گی زمر!"

"تو کیا ہوا؟" وکالت شروع کردیں گے۔ الیکشن لڑیں گے' بار چلائیں گے۔ ایک قتل ہی کیا ہے نا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"اف!!" جواہرات نے نزاکت سے جھرجھری لی۔ "کوئی انسان اتنی سفاکی سے کیسے کسی کی جان لے سکتا ہے؟ پتا نہیں اس کو رات کو نیند کیسے آتی ہوگی؟" بہت ہی حیرت اور افسوس سے تبصرہ کیا۔ زمر نے گود میں رکھی مٹھی مزید زور سے بھینچ لی۔ ایک کاٹ دار نظر صرف جواہرات پہ ڈالی مگر خاموش رہی۔

"پھپھو! کس نے کیا ہوگا ان کے ساتھ ایسا؟" سامنے بیٹھے سیم نے پوچھا تو زمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ چودھویں سالگرہ کے بعد سے بڑا بڑا لگنے لگا تھا۔ قد بھی نکال رہا تھا۔ آواز بھی بھاری ہو رہی تھی۔

"یہ تو جج صاحب کو ہی معلوم ہوگا کہ ان کا دشمن کون ہے۔ مجھ سے پوچھو تو یہ گناہ ہیں جو انسان کا تعاقب کرتے ہیں۔ اب دیکھو۔" زمر لاپروائی سے بولی۔ "تمہارے سعدی کو کسی نے گولیوں سے بھون کر رکھ دیا ہم نے سعدی کو ڈھونڈ سکے نہ ان لوگوں کو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لوگ چین سے رہیں گے۔ کوئی بھی قتل کرکے بچ نہیں سکتا۔ جرم کی اذیت ہی انسان کی جان کو آجاتی ہے۔"

نوشیرواں کا پلیٹ میں چلتا کانٹا ست ہوگیا۔ جھکے چہرے پہ ایک دم اکتاہٹ اور اذیت نمودار ہوئی۔ ہاشم نے البتہ سرہلا کر شربت کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔ ایسا ہی ہے۔ ڈونٹ وری سیم' سعدی جلد مل جائے گا۔" مسکرا کر نرمی سے تسلی دی۔

حنین نے ضبط سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر گہری سانس لے کر دوبارہ سے کھانے لگی۔ وہ نارمل نہیں تھی۔ وہ نارمل رہی بھی نہیں تھی۔

"زمر کیا آپ نے جسٹس صاحب کی خیریت پتا کی؟ ہوسکتا ہے ان کو آپ کی کسی مدد کی ضرورت ہو۔" ہاشم نے اسے پھر مخاطب کیا۔ فارس نے گلاس لبوں سے لگاتے' ہاشم کی آنکھوں پہ نظریں جمائیں۔

"تمہیں اس جج کی اتنی فکر کیوں ہے ہاشم؟" ایک دم سے سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ مگر ہاشم کھلے دل سے مسکرایا۔

"تمہاری وجہ سے۔ تمہیں بری کرنے والے جج کی کریڈیبلٹی پہ حرف آئے گا' تو اصل پریشانی تو تمہیں ہوگی نا۔" فارس بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا' تب ہی فیونا کیمرہ لیے چلی آئی۔

"میں فیملی فوٹوز اتارلوں' سر؟" اس نے ہاشم سے پوچھا تو زمر نے چونک کر اسے دیکھا' پھر اشارہ کیا۔

"ابھی نہیں' کھانے کے بعد" فیونا نے تابع داری سے کیمرہ رکھ دیا۔

"اب ڈیزرٹ پہ توجہ دینی چاہیے۔" جواہرات نے مسکرا کر ماحول کا تناؤ کم کرنا چاہا۔ ندرت اور ابا سعدی کے ذکر کے بعد خاموش ہوگئے تھے۔ ملازم برتن بدلنے لگے۔ زمر نے موبائل پہ حنین کو ایک ٹیکسٹ کیا۔ وہ ذرا چونکی' لیکن پھر معذرت کرکے صداقت کو کوئی کام یاد کروانے کا کہہ کر چلی گئی۔ تین چار منٹ بعد واپس آکر خاموشی سے بیٹھ بھی گئی۔

کھانا ختم ہوا اور سب لاؤنج میں جانے لگے تو زمر نے فیونا سے تصاویر اتارنے کا کہہ دیا۔ اس نے خاموشی سے چند تصاویر اتریں' اور ہر دفعہ کی طرح ان کو ایک کاپی دینے کا وعدہ کیا۔

چائے بھی اسی رسمی' تناؤ سے بھرے ماحول میں پی گئی۔ نوشیرواں ڈسٹرب سا پہلے ہی اٹھ کر جاچکا تھا۔ ہاشم اور جواہرات آخری پل تک میزبانی نبھاتے رہے۔ جاتے سے زمر سے ملتے ہوئے جواہرات نے سرگوشی کی۔ "ہنی! مجھے لگتا ہے تم نے اپنا انتقام کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

زمر نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس ملکہ کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھا۔ "میں کچھ بھی نہیں بھولی۔ فی الحال صحیح موقعے کے انتظار میں اپنے دشمن کے ساتھ ایک چھت تلے رہنے کی پریکٹس کر رہی ہوں۔"

جواہرات نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا۔

ندرت اور ابا ابھی ہاشم کا شکریہ ہی ادا کر رہے تھے، وہ دونوں پہلے ہی نکل آئیں۔ اب برداشت ختم ہو چکی تھی۔

تاریک سبزہ زار پہ چلتے ہوئے حنین دبے دبے غصے سے بول رہی تھی۔

"یہ کس طرح کے لوگ ہیں؟ ان کو خود رات کو نیند کیسے آجاتی ہے؟"

زمر سر اٹھا کر تاریک آسمان دیکھنے لگی۔ پتا نہیں وہ کدھر ہوگا (اسے کو عید کا معلوم بھی ہوگا یا نہیں۔)

"پھپھو!" وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی۔ "میں ان کے کمپیوٹرز کو ہیک کرنے کی کوشش کروں؟ کہیں تو کوئی کانٹیکٹ نمبر ملے گا اس جگہ کا جہاں بھائی کو رکھا ہوگا۔"

"حنین، ہم ابھی کوئی غلطی افورڈ نہیں کر سکتے۔ خاور پکڑ لے گا اور سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔ ابھی ہم خاموشی سے فارس کو اس کا کام کرنے دیتے ہیں۔ ہاشم کے ساتھ ساتھ تمام ملوث افراد کا سامنے آنا ضروری ہے۔"

"مگر مجھے بھائی سے بات کرنی ہے۔"

"تم نے ابھی اس سے بات کرلی ہے۔"

وہ چونکی۔ پھر مٹھی میں دبی شے کو دیکھا۔

"مطلب؟"

"یہ ہر تہوار یا پارٹی پہ ہماری تصویریں کیوں بناتے ہیں؟ پہلے تو اتنا خاص طور پر نہیں پوچھا کرتے تھے۔ یہ تصویریں وہ سعدی کو دکھاتے ہوں گے۔"

حنین یک دم سن رہ گئی۔

"وہ چاہیں تو خفیہ طور پر بھی اتروا سکتے ہیں، لیکن وہ اپنے ساتھ اچھے پوز میں تصویریں بنوانے پہ زور دیتے ہیں۔ تاکہ سعدی کو مینٹلی ٹارچر کر سکیں کہ دیکھو، تمہاری فیملی تم سے بے فکر ہو کر اپنی دنیا میں گم ہے۔"

"اوہ!" اس کے لب سکڑے، پھر آنکھیں یکدم چمکیں۔ "یعنی ہمیں ان کے فونز ہیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ان کے ہاتھوں سے ان ہی کے ذریعے بھائی کو پیغام بھیج سکتے ہیں، پھپھو!"

زمر نے نرمی سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تم مجھے صرف زمر بھی کہہ سکتی ہو۔"

حنین یک دم بالکل ٹھہر گئی۔ منظر دھندلا ہو گیا۔ وہ ایک چھ سالہ بچی کے روپ میں ڈھل گئی جو شرمیلی آواز میں ندرت سے کہہ رہی تھی۔ "بھائی پھپھو کو پھپھو نہیں کہتا امی۔ میں بھی زمر کہہ لیا کروں؟"

"بیٹا بھائی بڑا ہے، اس کی اور بات ہے مگر تم تمیز سے پھپھو کہا کرو۔" شرمیلی آنکھوں کی جوت ایک دم بجھ گئی۔ دھندلا منظر گم ہو گیا، وہ واپس سبزہ زار پہ کھڑی تھی اور زمر اس کے آگے چلتی دور جا رہی تھی۔ اس کے آدھے بندھے گھونگھریالے بال ہلکے ہلکے جھول رہے تھے۔

حنین نم آنکھوں سے مسکرائی۔ "اوکے، زمر!" اور اس کے عقب میں ہولی۔

❋ ❋ ❋

عجیب پیشہ وری کے عجیب تر ہیں معیار
جو سنگ زن ہے وہ آئینہ گر نظر آئے

ہارون عبید کے اونچے قصر کو گھیرے، سبزہ زار سے شام کی ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ گھاس نم تھی اور اس پہ مور ٹہل رہے تھے۔ آب دار بھی سوچ میں گم، ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ چہرہ سرخ اسکارف میں لپٹا تھا۔

دفعتاً" وہ رکی۔ آنکھوں کی پتلیوں کو سکیڑا۔ دور سے ایک ملازم ایک گھوڑا لیے چلا آرہا تھا۔ سفید براق سا ننھا گھوڑا۔ ساتھ ہاشم کاردار چلا آرہا تھا۔ بلیک سوٹ، جیل سے پیچھے کو سیٹ بال، وجیہہ چہرے کی مسکراہٹ۔ دور سے اس کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ نہیں

مسکرائی۔ صرف سوچتی رہ گئی۔

لمحے بھر میں اس کا ذہن چھ سال پیچھے چلا گیا تھا۔

وہ اٹھارہ انیس برس کی تھی تب۔ چہرے کے گرد تب بھی سرخ اسکارف لپٹا ہوتا تھا۔ اور وہ قدم قدم پانی میں چل رہی تھی۔ مڑ کر اس نے ساحل پہ بیٹھے بابا کو دیکھا جو موبائل پہ کسی سے بات کر رہے تھے۔ بیرے ان کی ڈنر ٹیبل سیٹ کر رہے تھے۔ سوٹ میں ملبوس دو افراد اور ایک عورت جسے وہ جواہرات کاروبار کے نام سے پہچانتی تھی، ٹیبل پہ بابا سے مل رہے ہیں۔ وہ نظر انداز کیے جانے کا دکھ لیے چلتی رہی۔ پانی اس کے گھٹنوں برابر پہنچ گیا۔ وہ چلتی رہی۔ پھر اس نے پیچھے سے آوازیں سنیں۔ مگر وہ نہیں رکی۔ لبوں پہ شرارتی مسکراہٹ در آئی۔ ستانے کا شوق۔ وہ چلتی رہی۔ پانی کمر تک تھا جب اس کا پاؤں رپٹا۔ وہ اوندھے منہ گری پانی۔ سرمئی پانی۔ اندر سے سب نیلا۔ سیاہ۔ ہر جگہ پانی۔ بمشکل چہرہ باہر نکالا۔ دھندلا سا نظر آیا کہ گارڈ اس طرف بھاگے آرہے ہیں۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ بابا کا مہمان۔ وہ کوٹ اتار کر پرے پھینکتا پانی میں کودا تھا۔ پھر ہر سو پانی تھا۔ اگلے مناظر فلیشز کی طرح آبی کی آنکھوں میں چمکے تھے۔ وہ اسے نکال کر لایا تھا۔ وہ خود بھی بھیگ چکا تھا۔ مگر جب آبی کی آنکھ کھلی تو اس نے خود پہ جھکے شخص کو دیکھا تو اسے معلوم تھا کہ اس شخص کی پشت پہ سفید شرٹ پہ ایک ننھی سیپی چپکی تھی۔

اس کے لبوں سے پہلے الفاظ یہی نکلے تھے "گریم ریپر!" (موت کا فرشتہ) وہ گیلے چہرے کے ساتھ ہلکا سا ہنسا۔ "گریم ریپر اتنے قیمتی سوٹ نہیں پہنتے۔" اس نے بابا اور دوسرے چہرے بھی خود پہ جھکے دیکھے۔ مگر وہ اس شخص کو "ملک الموت" نہیں کہہ رہی تھی۔ پھر بھی گزرے ماہ و سال میں، وہ جب بھی آتا، اس سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ اسے گریم ریپر ہی کہتی تھی۔ یہ نام اس ایک شخص کے ساتھ نتھی ہو چکا تھا۔ کوئی عجیب سا موت کا احساس بھی اس کے ساتھ نتھی ہو گیا تھا۔

اور آج بھی وہ اس کی سالگرہ نہیں بھولا تھا۔ مسکراتے ہوئے قریب آیا۔

"ہیپی برتھ ڈے، ریڈ!" آبی مسکرائی۔ گھوڑے کے سفید نرم بالوں کو چھوا۔ اعلا نسل کا قیمتی گھوڑا۔

"تھینک یو گریم ریپر! کیسے ہو تم؟" وہ اس سے ہمیشہ بہت تکلف سے ملتی تھی، اس کی کالز کا جواب دینا بھول جاتی، سالوں فون نہ کرتی، مگر پھر بھی وہ اسے "تم" کہہ کر پکارتی تھی۔

"میں اچھا ہوں۔ پسند آیا۔" گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ آبی نے مسکرا کر سہلایا۔

"بہت زیادہ۔" چند لمحے خاموشی میں کٹے۔ ہاشم نے اسی احتیاط پسندی سے سر کو خم دیا۔ "میں تمہارے بابا کے پاس جا رہا ہوں۔"

"میں بھی آتی ہوں۔" وہ مڑتے مڑتے رکا۔ ذرا چونکا۔ آبی اس طرح کبھی اس کے ساتھ نہیں بیٹھا کرتی تھی۔ اس کے پاس ہاشم سے کرنے کے لیے کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ اگر وہ اس کا برتھ ڈے یاد رکھتا تھا، تو وہ اس کی بیماری میں ضرور حال احوال پوچھنے آتی تھی۔ احسان کا بدلہ احسان۔ اور کچھ نہیں۔ ہاشم کاروار کے لیے یہ رشتہ ایک ایسا شیشہ تھا جس کو وہ اپنے سانس کی دھند سے بھی میلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر آج کچھ مختلف تھا۔

وہ اندر ہارون کی اسٹڈی میں آکر بیٹھا تو خاور، ہارون کو سعدی کے بارے میں اپ ڈیٹ کر رہا تھا۔ ہاشم خاموشی سے سنتا رہا۔

دفعتاً" دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ خاور خاموش ہو گیا۔ آب دار نرمی سے مسکراتی اندر آئی اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ میز کے پیچھے کنٹرول چیئر پہ بیٹھے ہارون، قریب کھڑا خاور، اور سامنے بیٹھا ہاشم۔ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ معصومیت سے مسکرائی۔ ابھی تک ننگے پیر تھی۔

"مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ لوگوں سے۔" سادگی سے گویا ہوئی۔ ہاشم نے "شیور، پوچھو۔" کہہ کر حوصلہ افزائی کی۔

"آپ لوگوں نے اسے کہاں رکھا ہے؟"
"کسے؟" ہارون کو تعجب ہوا۔
"وہ لڑکا جو مسنگ ہے۔" باری باری سب کے چہرے دیکھے۔ خاور صرف چونکا' لیکن ہارون مطمئن نظر آئے' اور ہاشم پرسکون۔
"کون سا لڑکا آب دار؟" ہاشم ناسمجھی سے بولا۔
"ہاشم!" اس نے آگے ہو کر پر یقین نظروں سے اسے دیکھا۔ "مجھے پتا ہے آپ لوگوں نے اسے کہیں رکھا ہوا ہے' آپ کو اس سے اہم معلومات چاہئیں مگر یہ غلط ہے ہاشم بابا!"
"آبی تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے بیٹا۔ ہم نے کسی کو کہیں نہیں رکھا ہوا۔"
"اور ہم کیوں کسی کو رکھیں گے ریڈ؟" وہ تعجب سے مسکرایا۔ جیسے اس کی کم علمی پہ تاسف ہوا ہو۔
"بس مجھے آپ لوگوں کی باتوں سے شک ہو رہا تھا۔ پلیز اگر ایسا ہے تو اس کو اس کی فیملی کے پاس بھیج دیں پلیز۔ وہ لوگ کتنا پریشان ہوں گے۔"
ہاشم پورے یقین سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "کیا تم ہمیں ایسا سمجھتی ہو کہ ہم یوں کسی کو اس کی فیملی سے الگ کر کے رکھیں گے؟ آبی کیا اتنے سالوں میں بھی تم مجھے نہیں سمجھ سکی؟ کیا تم اپنے باپ پہ بھی شک کر رہی ہو؟"
آبی کے چہرے پہ تذبذب نظر آیا۔ "آئی ایم سوری' میرا یہ مطلب نہیں تھا' مگر مجھے لگتا ہے وہ آپ لوگوں کے پاس ہے۔ میں اس کے ماموں سے بھی ملی تھی' وہ کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکا ایسے ہی نہیں کھویا بلکہ یہ کسی کرمنل کا کام ہے جس نے اسے گولیاں مار کر اغوا کر لیا ہے' وہ اتنا ڈیسینٹ آدمی جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا نا۔" ہاشم کے اندر ایک دم غصہ ابلا تھا۔
"اور وہ خود کیا ہے؟ وہ قتل کر کے جیل جانے والا؟ اس کی باتیں سن کر تم ہم پہ شک کر رہی ہو؟ آنکھیں کھولو آبدار' فارس غازی خود ایک خطرناک مجرم ہے۔" وہ غصے سے بولا۔
آب دار اداسی سے مسکرائی۔ پھر آگے ہوئی۔ ہاشم کی آنکھوں میں دیکھا۔
"ہاشم کاردار۔ پاکستان میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ لوگ مسنگ ہیں' میں نے تو کسی کا نام نہیں لیا' پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں فارس غازی کے بھانجے کی بات کر رہی ہوں؟"
ہاشم کے منہ پہ کسی نے کھولتا ہوا تیل پھینک دیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بالکل گنگ ہو گیا۔ وہ شہری کے ہاتھوں مات نہیں کھا سکتا تھا' وہ صرف ان ہی کے ہاتھوں مات کھاتا تھا جن سے اسے محبت ہوتی تھی۔
آب دار کے تاثرات بدل گئے۔ معصومیت معدوم ہوئی۔ وہ مسکرا کر پیچھے ہو بیٹھی' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔
"تو ثابت ہو گیا کہ سعدی یوسف نیسکام کا گمشدہ سائنس دان آپ لوگوں کے پاس ہی ہے۔ ویسے میں اس کے ماموں سے نہیں ملی' احمر سے ان کا ذکر سنا تھا صرف۔" کندھے اچکا کر بولی۔ ہارون ایک دم غصے سے بولے۔
"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے' اس میں تم نہ بولو آبی۔"
"اچھا ٹھیک ہے ہارون!" ہاشم نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر ان کو چپ کروایا۔ پھر آبی کو دیکھا۔ اس کی نظریں بھی بدل چکی تھیں۔ "مجھے معلوم ہے تم فارس کو کچھ نہیں بتاؤ گی کیوں کہ تم ایک قاتل کو اپنے باپ کا دشمن نہیں بنانا چاہوں گی۔ اب دھیان سے سنو۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "ہاں' وہ ہمارے پاس ہے' لیکن ہم اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ وہ سائنس دان ہے' اس کی جان کو خطرہ ہے' چند ماہ کے لیے اس کو منظر عام سے غائب کرنا ضروری تھا۔ اور وہ میرا دوست بھی ہے۔ اب بولو' اس میں کیا غلط ہے؟" اس کا لہجہ خشک ہو گیا تھا۔
"مجھے غلط صحیح سے سروکار نہیں ہے۔"
"تو کیا چاہتی ہو تم؟"
"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"
"ناممکن!" ہارون نے سختی سے اسے جھڑکا۔

"تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟" ہاشم نے پوچھا۔

"کیوں کہ میں نے اس کے میموریل ڈنر کی ویڈیو سوشل میڈیا پہ دیکھی ہے' اس میں اس کے ڈاکٹر نے تقریر کے دوران کہا تھا کہ وہ لڑکا آپریشن ٹیبل پہ چند لمحے کے لیے مر گیا تھا' مگر پھر اس کو ری کور کر لیا گیا۔ میں NDE سے گزرنے والے مریضوں کا انٹرویو کرتی ہوں' آپ سب کو پتا ہے۔ مجھے صرف اس کا انٹرویو کرنا ہے۔ آپ کے بقول وہ آپ کا مہمان ہے' قیدی نہیں۔ سو یہ آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔"

"میں تمہیں اس کی جگہ دس اور کیسز لا دوں گا! وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔"

"میں سائیکو تھراپسٹ ہوں ہاشم' میں اپنے جواب نکلوا لیتی ہوں۔" خاور نے ذرا چونک کر اسے دیکھا' مگر خاموش رہا۔

"ٹاپک کلوز' آب دار۔ تم اس سے نہیں مل رہیں' اور نہ تم کسی کو کچھ بتا کر اس کی اور ہماری جان خطرے میں ڈالو گی' سمجھیں؟" ہاشم نے کبھی اس سے اتنی درشتی سے بات نہیں کی تھی۔ آبی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ناراضی سے اٹھ گئی۔

ہارون خفا نظر آ رہے تھے اور ہاشم شدید ناخوش تھا۔ یہ دن اس کے لیے قیمتی تھا اور یہ آج سعدی کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ستارے گر بتا دیتے' سفر کتنا کٹھن ہو گا
پیالے شہد کے پیتے' تلخ ایام سے پہلے

اکتوبر کی پہلی دوپہر' سعدی یوسف اپنے کمرے کے باتھ روم میں کھڑا تھا اور آئینے میں کندھے پہ گولی کا نشان دیکھ رہا تھا' گول سا سرخ بھورا نشان جو اب ساری عمر اس کے ساتھ رہے گا۔ اسی وقت دروازہ زور سے پیٹا گیا۔ اس کے ابرو بھینچے۔ باہر نکلا تو ایک دم کسی نے گریبان سے پکڑ کر دیوار سے لگایا۔ سعدی بمشکل سنبھلا تو دیکھا' وہ خاور تھا۔ ہاشم کا پرنسپل سیکورٹی آفیسر۔

سیاہ کوٹ' بالوں کا کریو کٹ اور سیاہ مونچھوں والا اونچا لمبا' بھرے جسم والا خاور' اس کو دیوار سے لگائے' غصیلی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"تمہارا وکیل کون ہے؟" سعدی نے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی مگر خاور "کومبیٹ" میں اعلا درجے کی تربیت رکھتا تھا' ذرا سا بھی نہ ہلا۔

"سیدھی طرح بتاؤ' جج والی ویڈیو کس کو دی تھی تم نے؟ کس نے لیک کی وہ؟"

سعدی کے ابرو حیرت سے اٹھے۔ "وہ لیک ہو گئی ہے؟ گڈ!"

خاور اسے گردن سے دبوچے آگے لایا' اور بڑے سے پانی کے برتن میں اس کا چہرہ جھکایا۔ سعدی نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

"بولو۔ نام بولو وکیل کا۔"

"تم ایکس ملٹری مین ہو نا' خاور۔ کیا رینک تھا تمہارا؟"

خاور نے اس کا چہرہ پانی میں ڈبو دیا۔ چند لمحے رکا' پھر کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کا چہرہ بھیگ چکا تھا۔ منہ کھول کر وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔

"کون ہے تمہارا وکیل؟"

"تم ہاشم کے جتنے وفادار بن جاؤ' تم کاردار نہیں بن سکتے۔ تم ہمیشہ ان کے غلام رہو گے۔" خاور نے زور سے اسے دوبارہ ڈبکی دی۔ ساتھ ہی چلایا۔ "نام بتاؤ مجھے اس کا۔" پھر باہر نکالا۔ "ہا" منہ کھول کر سانس لیتا چہرہ سیدھا کیا۔ آنکھیں بند کیے وہ ہانپ رہا تھا۔

"تم ان کے ساتھ ہوتے ہو' لیکن تم ان کی ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ نہیں سکتے۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں بٹھاتے خاور! تم ہمیشہ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہو۔"

"نام بولو' ورنہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔"

اس نے چند مزید ڈبکیاں سعدی کو دیں۔ پھر اس کا رخ اپنے سامنے کیا۔ سعدی کا پورا سر اور چہرہ ٹپ ٹپ پانی ٹپکا رہا تھا۔ شرٹ بھیگ چکی تھی۔ ایسے گیلے چہرے

کے ساتھ وہ ہولے سے ہنسا۔
"تم نے مجھے ایک تھپڑ تک نہیں مارا۔ ہاشم کاردار نے تمہارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ مار بھی لو تو مجھ سے کچھ نہیں اگلوا سکتے۔ میں وکیل کا نام نہیں بتاؤں گا۔"
خاور کا چہرہ سرخ ہوا' اس نے جھٹکے سے سعدی کو بیڈ پہ دھکیلا۔ وہ مسلسل۔ "تم کاردار نہیں بن سکتے۔ وہ تمہیں کبھی اپنے ساتھ نہیں بٹھاتے۔" چلا رہا تھا۔
خاور کوٹ درست کرتا' منہ میں کچھ بڑبڑاتا باہر نکل آیا۔ ہاشم کی طرف سے بھجوائی گئی اس کی فیملی کی تصویریں اس نے آتے ساتھ ہی بیڈ پہ ڈال دی تھیں اور وہ اب بھی وہیں پڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

گھنے سے پیڑوں میں بھی سایہ ہمیں نصیب نہیں
میرے سورج کی بھی سب سمتیں تمہاری ہیں

یہ ہوٹل کا وہ فلور تھا جہاں چار سال قبل زمر کو گولی ماری گئی تھی۔ صبح کے اس وقت وہ خاموش اور سنسان پڑا تھا۔ احمر کے کہنے پہ زمر ادھر آگئی تھی اور اب وہ دونوں لفٹ کے پاس کھڑے تھے۔ احمر بولے جا رہا تھا اور زمر بے توجہی سے سن رہی تھی۔
"گواہوں کے مطابق فارس غازی اس لفٹ سے آیا تھا' لیکن جب میں نے تحقیق کی' یعنی اپنے قیمتی وقت سے چند گھنٹے نکالے' جن کے بیسے میں آپ سے روز قیامت مانگوں گا' تو دیکھا کہ ایک گواہ کے بیان میں تضاد ہے۔ اس نے ایک دفعہ کہا کہ غازی اس کے "ساتھ" لفٹ سے اترا تھا۔ مگر ایک دفعہ کہا کہ غازی اس کے "سامنے" لفٹ سے اترا۔ اب سامنے دیکھیے۔" احمر نے جوش سے اشارہ کیا۔ زمر نے بہت صبر سے ادھر دیکھا۔ وہاں ایک اور لفٹ تھی "یہ پرائیویٹ لفٹ ہے۔ ہوٹل کے مالکان کے لیے یا بہت خاص شخصیات کے لیے۔ سو ہمارا اٹرانی کلمکٹو بھی کوئی ایسی آسامی ہے جس کے ہوٹل مالکان سے روابط ہیں' وہ یقیناً" ادھر سے ہی آیا ہو گا۔ اور......"

زمر نے پرس سے ایک پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔
"یہ آپ کی ویڈیو ہے اور فیس بھی۔"
"ارے!" اس کو تعجب ہوا۔ پیکٹ کھول کر اندر جھانکا۔ پھر مسکرایا۔ "اس تکلف کی کیا ضرورت تھی' میں نے کچھ مانگا تھوڑی تھا؟"
"نہیں رکھنی تو واپس کر دیں۔" فوراً" ہاتھ پھیلایا۔ احمر نے جلدی سے پیکٹ اپنے پیچھے کیا۔ منہ بگڑا۔
"کیا آپ کی امی نے آپ کو رسمی انکار کرنا نہیں سکھایا؟" پھر دوبارہ لفٹ کی طرف دیکھا۔ "ویسے کام تو ابھی ختم نہیں ہوا۔ آپ ٹرانی کلمکٹو کے بارے میں مزید نہیں جاننا چاہتیں کیا؟"
"نہیں۔"
"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔"
"تصحیح کیجیے احمر! میں آپ سے بہت کچھ چھپا رہی ہوں۔" وہ آگے چلنے لگی تھی۔ احمر گہری سانس لے کر اس کے ساتھ ہولیا۔
"آپ کے خاندان میں کوئی ایک بندہ ہے جو مجھے عزت دے؟"
"احمر!" وہ سنجیدگی سے اس کی طرف گھومی۔ "کیا ہارون عبید نے آپ کو کوئی ہدایت دی ہے؟ جج صاحب کی مدد کے لیے؟ کیوں کہ جس ٹی وی چینل میں ہارون صاحب کے اکثریتی شیئرز ہیں' وہ آج کل جج صاحب کی بہت حمایت کر رہا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ احمر چپ ہوا۔ پھر شانے اچکائے۔
"کنسلٹنٹ کلائنٹ پریویلج کے تحت میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔"
"اچھا۔ کیا انہوں نے آپ سے کہا ہے کہ کسی اور مشہور شخص کا کوئی اسکینڈل لیک کیا جائے تاکہ یہ اسکینڈل دب جائے؟"
"میں پریویلج کے تحت جواب نہیں دے سکتا۔"
"وہ مجھے یاد آیا' کیا ہارون صاحب نے بتایا' وہ میری بھتیجی کی سالگرہ پہ ہمارے گھر آ رہے ہیں؟"

"نہیں تو۔" وہ حیران سا ایک دم بولا' پھر فوراً "چپ ہوا۔ زمر مسکرائی۔

"مطلب کہ پہلے تین جواب ہاں میں تھے۔ تھینک یو احمر!"

"میں نے کچھ بھی نہیں بتایا' اچھا!" وہ تلملایا تھا۔ (یہ ہوئے پورے ایک ہزار' چھے سو ننانوے درّے!)

"ویسے ہارون عبید کا کاروبار کتنے ممالک میں ہے؟" وہ چلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"مسز زمر!" وہ سنجیدہ ہوا۔ "وہ میرے باس ہیں' اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں ان کی معلومات آپ کو لیک کروں گا تو آپ غلط ہیں۔"

"اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ جو سعدی کے ساتھ ہوا' وہ آپ کے ساتھ نہیں ہو سکتا تو آپ بھی غلط ہیں۔ جج صاحب کی ایکسٹورشن میں آپ بھی ملوث تھے' آپ ہمارے ساتھ اس سارے میس میں برابر کے حصے دار ہیں۔ اس لیے مجھے شام تک وہ لسٹ چاہیے۔" ٹھنڈے اور نرم سے انداز میں وہ بولی۔ احمر ناخوش نظر آنے لگا۔

دور راہداری سے گزرتے ویٹر نے اوٹ میں کھڑے' موبائل سے ان دونوں کی تصویر لی اور پھر سر جھکائے آگے بڑھتا گیا۔ سیڑھیوں تک پہنچ کر اس نے وہ تصویر ایک نمبر پہ بھیجی اور پھر فون ملایا۔ تیسری گھنٹی پہ "ہیلو" سنائی دیا۔

"غازی بھائی' آپ نے مجھے کہا تھا کہ کوئی کام کی بات ہو تو بتاؤں۔" وہ دبی آواز میں زینے اترتے بول رہا تھا۔

"ہاں بولو۔" فارس ڈرائیو کر رہا تھا۔

"ایک نوجوان دو تین دفعہ یہاں آیا ہے' آج پھر نظر آیا' ساتھ میں لڑکی بھی ہے۔ اس نے سب کو یہی بتایا ہے کہ وہ جسٹس ڈپارٹمنٹ سے ہے اور آپ کے کیس کو ری اوپن کرنے کے لیے چھان بین کر رہا ہے۔ کچھ گواہ اب بھی ہوٹل میں تھے' ان کے انٹرویو بھی کیے ہیں۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔ ان کی تصویر بھی لے کر بھیج رہا ہوں۔" اور دوسری طرف فارس کے چہرے پہ تناؤ در آیا۔ شکریہ کر کے فون رکھا اور پھر میسج کھولا۔

تصویر پہ نظر پڑتے ہی اس کے ابرو تعجب سے بھینچے' کار آہستہ کر کے روکی۔ اچنبھے سے اسکرین کو زوم ان کر کے وہ تصویر دیکھی۔ بار بار (یہ دونوں میرا کیس ری اوپن ہے؟) ایک دم سے تفکرات نے اسے آن گھیرا تھا۔ اس نے کار کا رخ موڑ لیا۔

☆ ☆ ☆

یہ جانتا ہوں جانتے ہو مرا حال دل
یہ دیکھتا ہوں دیکھتے ہو کس نگاہ سے

سہ پہر میں احمر واپس ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ آ کر اپنے کیمپن آفس میں مصروف ہو گیا تھا۔ آب دار اپنے کلینک میں تھی۔ کسی کام سے وہ باہر نکلی تو دیکھا' ملازم ایک شخص کو لان میں لا رہا تھا۔ وہ اسمارٹ اور دراز قد تھا' جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلا آ رہا تھا۔ ملازم نے اسے لان چیئر پیش کی' وہ بیٹھ گیا تو ملازم آبی کی طرف آیا۔

"یہ کون ہے؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"احمر صاحب کے دوست آئے ہیں۔ فارس غازی۔"

آب دار نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "سنو' کچن میں چائے کے لیے بولو۔ اور اگلے آدھے گھنٹے تک احمر صاحب کو خبر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آہستہ سے کہتی وہ آگے چلتی آئی۔

وہ کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' بے نیاز سا بیٹھا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو فارس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اسٹیپ... احمر؟" ابرو اچکائے۔

"جی' وہ آتے ہی ہوں گے۔" آبی نے اپنے چہرے پہ اپنی ازلی معصومیت طاری کر لی اور مسکرائی۔ "آپ کا بھانجا ہے نا جو مسنگ ہے؟ احمر نے ذکر کیا تھا۔ سعدی یوسف کی یونیورسٹی میں' میں چند ماہ کے لیے گئی تھی' ایکس چینج پروگرام کے تحت۔ وہیں ایک دفعہ

دیکھا تھا اسے۔" فارس خاموشی سے اس لڑکی کی سرمئی آنکھیں دیکھتا رہا۔ زمر نے بتایا تھا کہ ٹھیکیدار کے بقول سعدی کی 'کی چین' لینے آنے والی لڑکی کی آنکھیں ہلکے رنگ کی تھیں۔ سرمئی نیلی۔ (سارہ اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ سمجھا تھا کہ وہ گواہ لڑکی سعدی کی عمر کی اس کی کوئی دوست 'کوئی کلاس فیلو ہو سکتی ہے۔)

"مجھے اس کے بارے میں بتائیں' کیسے ہوا یہ حادثہ؟" اس کی خاموشی کے باعث وہ چپ ہوئی' پھر دوبارہ ہمت کی۔

"سوشل میڈیا پہ دیکھ لیں' ساری تفصیل مل جائے گی۔" لاپروائی سے کہہ کر اس نے پھر سے گھڑی دیکھی۔ اور ذرا اکتا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ملازم ٹرالی دھکیلتا آرہا تھا۔

"چائے لیجیے۔" آب دار نے شائستگی سے پیش کش کی۔

"میں اپنی جیب سے چائے پیتا ہوں صرف۔" اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تب ہی احمر ادھر آتا دکھائی دیا۔ اسے فارس کا میسج مل گیا تھا۔ وہ ذرا حیران تھا۔

"تم ادھر؟"

"مجھے کام تھا' تم کدھر تھے؟ صبح سے کال کر رہا تھا۔" فارس نے بغور اس کے چہرے کو دیکھتے پوچھا۔ احمر ذرا رکا۔

"ایک کلائنٹ کے ساتھ تھا۔" احتیاط سے بولا۔

"تمہارے کلائنٹ ہارون عبید نہیں ہیں؟"

"وہ کسی دوسری نوعیت کا کلائنٹ ہے۔ لوگ مجھے بہت سے کاموں کے لیے ہائر کرتے ہیں' غازی!" سادگی سے مسکرایا' البتہ ذرا تشویش بھی ہوئی مگر جب فارس نے محض سر ہلا دیا تو اسے ذرا سکون ہوا۔ پھر خاموش بیٹھی آبی کا تعارف کروانے لگا۔

"یہ آب دار عبید ہیں' ہارون صاحب کی صاحبزادی۔ یہ کریم ریپرز سے obsessed ہیں۔ کلینکل ڈیتھ پہ ریسرچ کر رہی ہیں' لیکن پروفیشنلی یہ ایک ہپنو تھراپسٹ ہیں۔" ذرا ہلکی آواز میں اضافہ کیا۔ "وہ جو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے گھڑی لہرا کر ان کو ہپنٹائز کر کے کہتے ہیں کہ الٹے لٹک جاؤ۔"

"احمر صاحب' آپ کی hypnosis کے بارے میں معلومات کافی کمزور ہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔ "کوئی بھی کسی کو ہپنٹائز کر کے اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروا سکتا۔ یہ صرف فوکس کرنے کے لیے' بری عادتوں کو چھڑوانے کے لیے یا بھولی یادوں کو واپس لانے کے لیے ہوتا ہے۔ ہم سب دن میں کئی بار تنویمی کیفیت کا شکار ہوتے ہیں جب کوئی مووی دیکھتے ہوئے' کوئی کتاب پڑھتے ہوئے' ہم بے ارادہ اس میں کھو جاتے ہیں۔ یہ تنویم کی ایک ہلکی شکل ہے۔ اور میں گھڑی دکھا کر لوگوں کو ہپنٹائز نہیں کرتی۔" وہ ناراضی سے بولتی پلٹ گئی۔ احمر نے سر جھٹکا۔

"جانے دو۔ یہ بھی نارمل نہیں ہے۔ تمہارے خاندان کی طرح۔" آخری چار الفاظ بس دل میں کہے اور متوجہ ہوا۔ "کیا کام تھا؟"

"بہت دن پہلے تمہیں الیاس فاطمی کو ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا۔"

"پہلے میں سستی کر رہا تھا' لیکن اب کچھ کرتا ہوں کیوں کہ مجھے بس یوں ہی لگنے لگا ہے کہ تم بے گناہ ہو۔" وہ مسکرا کر بولتا جا رہا تھا اور فارس متضاد کیفیات میں گھرا اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ آسمان پہ سیاہ بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔

✲ ✲ ✲

ہم نے مدت سے الٹ رکھا ہے کاسہ اپنا
دست زردار! ترے درہم و دینار پہ خاک!

ان سب سے دور' سعدی یوسف اپنے قید خانے میں اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے قرآن کھلا تھا اور اردگرد سے بے نیاز' ایک ٹھنڈی میٹھی سی چھایا کے زیر اثر تھا۔

"میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔" وہ تعوذ پڑھ کر اسکرال اس جگہ سے کھول رہا تھا جہاں سے اس نے ایک روز چھوڑی

تھی۔ آج کل بے ترتیب زندگی کی طرح تلاوت بھی بے ترتیب ہوتی جارہی تھی۔ ہاشم نے سوائے نئے کپڑوں اور کتابوں کے اس کی کوئی ڈیمانڈ پوری نہیں کی تھی' سعدی کی طرف سے بھی اس کے ہر درہم' ہر دینار پہ خاک! قرآن بھی کبھی کہیں سے پڑھتا' کبھی کہیں سے۔ آج نمل میں ہدہد والے واقعے کو وہیں سے جوڑا۔

"سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ اب ہم دیکھیں گے (اے ہدہد) کہ تم نے سچ کہا یا ہو تم جھوٹوں میں سے؟ میرے اس خط کو لے جاکر اس کے پاس ڈال دے' پھر ان کے پاس سے ہٹ آ' پھر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔"

"اوہ پیارا ہدہد!" سعدی نے گہری سانس لی۔

"میں سوچتا ہوں اللہ تعالیٰ' کہ پہلے سلیمان علیہ السلام نے اس ہدہد کی غیر حاضری پہ معقول وجہ نہ پیش کرسکنے کی صورت میں اس کو ذبح کرنے کی دھمکی دے دی' اب وہ بے چارا خبر لے آیا' اتنی لمبی تقریر بھی کردی' پھر بھی سلیمان علیہ السلام نے کہا دیکھتے ہیں کہ تم سچے ہو بھی یا نہیں۔ کتنے عرصے سے وہ سلیمان علیہ السلام کا وفادار جاسوس رہا ہوگا' پھر بھی انہوں نے ایک دم سے اس کا یقین نہیں کرلیا' اور اگر کربھی لیا تو جتایا ضرور کہ تمہاری تحقیق ضرور کروں گا۔ میں نے بہت سوچا کہ کیوں؟ شاید اس لیے کہ انسان جتنے اہم عہدے پہ ہو' اتنے اس کے دشمن ہوتے ہیں' اتنا اس کو محتاط ہونا چاہیے اور آنکھیں' کان بند کرکے کسی کی بات پہ اعتبار نہیں کرلینا چاہیے۔ اور شاید ایک بادشاہ کی بارعب شخصیت کے بھی منافی تھا کہ ایک دم سے اس ہدہد کی تعریف کردیتے' جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ ڈسپلن ہر ادارے' ہر فوج اور ہر گھر کے لیے ضروری ہے۔"

پھر اگلی آیت کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ (ملکہ سبا' سلیمان کا خط پانے کے بعد) کہنے لگی' اے سردارو! میری طرف ایک باوقعت خط ڈالا گیا ہے۔ (خط کا مسودہ یہ تھا) "یہ ہے سلیمان کی طرف سے اور یہ شروع ہوتا ہے بخشش کرنے والے مہربان اللہ کے نام سے۔ (بس اتنا کہ) تم سرکشی نہ کرو میرے سامنے اور مسلمان بن کر میرے پاس چلی آؤ۔"

سعدی نے قلم سے اس آیت کو انڈر لائن کیا۔

"ملکہ بھی کیا ملکہ تھی۔ خط کی مہر سے پہچان لیا کہ یہ کسی عام آدمی کی طرف سے نہیں ہے' کنگ سلیمان کی طرف سے ہے۔ سو غرور سے اسے رد نہیں کردیا' بلکہ اپنے سرداروں کے پاس اسے لے کر گئی اور ان کو پڑھ کر سنایا۔ اس زمانے میں خط بھیجنے والے کا نام پہلے لکھا جاتا تھا۔ مجھے یاد آیا اللہ تعالیٰ' اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کو خط لکھے تھے' کسی کو صفحے جتنا لمبا' کسی کو صرف دو الفاظ (اسلام قبول کرلو' سلامت رہوگے) اور سلیمان علیہ السلام نے بھی محض دو فقرے لکھے۔ صرف دو فقرے۔ عجب بات ہے' آپ ایک اتنی بڑی ملکہ کو دعوت دے رہے ہیں' تو صرف دو فقرے کیوں لکھے؟ مگر اللہ تعالیٰ' یہ دیکھیں۔ ملکہ نے کہا کہ اس کی طرف باعزت خط ڈالا گیا ہے۔ خط پہ شاہی مہر تھی۔ اور وہ باقاعدہ قاصد کے ذریعے نہیں ڈالا گیا تھا۔ اسے ایک پرندہ روشن دان سے گراجاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے تبلیغ کے لیے الفاظ سے زیادہ طریقہ اہم ہوتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھا' کس کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ مگر ہم آج کے مسلمان ہم کیا کرتے ہیں؟"

اس کے چہرے پہ افسوس اترا۔ کمرے میں بھی اداسی بکھر گئی۔

"میرے جیسے لوگ جن کے عقائد قرآن اور صحیح حدیث کے مطابق ہوتے ہیں اور ہم بدعت سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور بدعت کو پہچانتے بھی ہیں' ہم جیسے لوگ اپنے ملک میں دن رات ہونے والی بدعتوں کے خلاف کیا کرتے ہیں؟ فیس بک جہادی بن کر لمبے لمبے کمنٹ کرتے ہیں۔ یہ حرام وہ حرام۔ کسی محفل میں بدعت دیکھ لیں تو وہیں شور برپا کیا اور پھر دو فریق بنا کر لڑائی شروع۔ کوئی بدعتی ایس ایم ایس بھیجے تو جواب میں گرماگرم میسج بھیج دیا۔ میں بتاؤں اللہ

تعالیٰ کہ میرے ملک کا ایک بڑا طبقہ بدعتی کیوں ہے؟ وہ بدعتی ہے میرے جیسے قرآن و سنت کے پیروکاروں کی وجہ سے۔"

قطعیت سے کہتے وہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔

"ان بدعتی مسلمانوں کو اگر کسی چیز کا علم نہ تھا' وہ اگر اپنے ماں باپ کے طریقے پہ چل رہے ہیں تو ہمیں تو اس کا علم تھا نا' ہم نے ان کو کیوں راہ راست پہ لانے کی کوشش نہ کی؟ اور اگر کوشش کی تو کیسے؟ ٹوک کر' غصہ کرکے؟ تنقید کرکے؟ خود کو درست ثابت کرنے کی ضد میں بحث کرکے؟ ہم وہ لوگ ہیں جو اندھیرے میں بھٹکتے لوگوں کو چلا چلا کر اندھی کھائیوں سے خبردار کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ چلانے سے صرف اتنا ہوگا کہ وہ لوگ ذرا ٹھہریں گے' اٹھیں گے' مگر پھر جتنا ان کی آنکھیں دیکھنے کی عادی ہوچکی ہیں' اتنے کو بہت سمجھ کر چلتے جائیں گے۔ اندھیروں میں چیخنا چلانا تھوڑی جاتا ہے؟ اندھیرے میں تو دیے جلائے جاتے ہیں۔ روشنی آئے گی تو تاریکی خود چھٹ جائے گی' حق آئے گا تو باطل خود بخود چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ! ہم مسلمان یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ بحث' ضد اور لڑائی سے کوئی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ علوم الحدیث دیکھنے میں' صحیح' حسن' ضعیف' موضوع حدیث کا فرق جاننے میں' حدیث کی سند' راوی کی شرائط' یہ سب باتیں سمجھنے میں ایک عرصہ لگتا ہے۔ ہم قرآن و حدیث کا علم رکھنے والے خود تو کئی مہینے اور کئی سال لگا کر دینی کورس کرتے ہیں' ڈپلومے یا سند لیتے ہیں' مگر دوسرے سے یہ امید کرتے ہیں کہ جو بات ہمیں خود کئی برس لگا کر سمجھ آئی ہے' وہ دوسرا شخص چار لائن کے ایک ایس ایم ایس میں سمجھ جائے؟ چلانا آسان ہے' لیکن دیے جلانا مشکل ہے۔ امر بالمعروف پہلے آتا ہے' نہی عن المنکر کا دوسرا نمبر ہے۔ آہستہ آہستہ نرمی سے' پیار سے' تحمل سے لوگوں کو تعلیم دی جائے تو وہ ہم سے اچھے سنت کے پیروکار بن سکتے ہیں' لیکن ہم مسلمان یہ تحمل کہاں سے لائیں؟ اللہ کی جنت بہت بڑی ہے' مگر ہم یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ ہمارے فرقے کے علاوہ کوئی دوسرا فرقہ بھی جنتی ہوسکتا ہے؟ یہ الفاظ نہیں ہوتے' یہ طریقہ ہوتا ہے' تبلیغ کا جو دلوں پہ اثر کرتا ہے۔ اسی لیے سلیمان علیہ السلام نے الفاظ کے بجائے طریقے کو سحر انگیز رکھا تھا۔ سوری اللہ تعالیٰ! میں بھی کچھ زیادہ ہی ایموشنل ہوگیا۔"

تاسف سے سر جھٹکتے اس نے قرآن بند کیا۔ پھر دل سے دعا کی' کہ کاش اس کے پاس بھی کوئی ہدہد ہوتا جو اس کے گھر والوں کا پیغام چونچ میں دبائے اس کی کھڑکی میں آگراتا' لیکن سعدی کے اس کمرے میں تو کھڑکی تک نہ تھی۔ وہ بھی کس چیز کی امید کررہا تھا۔ دعا کرتے کرتے اس نے چھوڑ دی۔ اور وہ پیکٹ کھولا جو خاور دے کر گیا تھا۔ اندر عید ڈنر کی تصاویر تھیں۔ وہ ان کو چند دن میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ سعدی کا دل پھر سے ایک دم خراب ہونے لگا۔

"سارہ نے کسی کو نہیں بتایا۔ وہ لوگ مجھے مس بھی نہیں کرتے کیا؟ یہ کیسے ہاشم کے ساتھ ایک میز پہ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں؟ اور وہ ان لوگوں کے لیے پیامبر پرندے کی دعا کررہا تھا۔۔۔؟" ان سے گلہ کرتے کرتے وہ ٹھہرا۔

یہ حنین اور زمر کی سیلفی تھی' دونوں مسکراتے ہوئے کیمرے میں دیکھ رہی تھیں۔ یہ تصویر اس نے کتنی دفعہ دیکھی تھی' لیکن جو آج نظر آیا' وہ پہلے نظر نہیں آیا تھا۔

حنین کے ہاتھ میں اس کے سیل کے ساتھ وہی سلور پین تھا۔ او سی پی کا پین کیمرہ۔ (زمر نے یہی اسے لانے بھیجا تھا تاکہ وہ اس کیمرے کے ساتھ تصاویر بنوائیں) سعدی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پھر سے حنین کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے سیلفی کے لیے دو انگلیوں کی وی بنا رکھی تھی۔ پہلی دفعہ سعدی کو لگا وہ وکٹری کی "وی" ہے۔

وہ پین حنین کے پاس ہے۔ وکیل نے نہیں حنین نے جج کی ویڈیو لیک کی ہے۔ سارہ نے اس کو اکیلا

نہیں چھوڑا' اس نے وہ پین حنین کو دے دیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی گردن کے بال تک کھڑے ہو گئے تھے۔

(کوئی ناممکن سمجھ کر یوں دعا مانگنا چھوڑا کرتا ہے سعدی؟)

☼ ☼ ☼

وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو تیرا انتظار اب بھی ہے

موسم کی بتدریج تبدیلی کے باعث انیکسی کا تہہ خانہ اب اتنا گرم اور پر حبس نہیں تھا۔ زمر ابھی ابھی تھکی ہاری گھر آئی تھی اور اب لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی حنین' رازداری سے اسے بتا رہی تھی۔

"میں نے ہاشم کی سیکریٹری کے ای میل پہ چند لنکس بھیجے تھے' ایک پہ اس نے کلک کر دیا تو اس سے میں نے اس کا سیل فون اپنے کمپیوٹر پہ مرر کر لیا ہے' یعنی وہ جو دیکھے گی وہ مجھے بھی نظر آئے گا اور ہاشم کا پچھلے چار ماہ کا سارا شیڈول بھی میں نے حاصل کر لیا ہے۔ اب بتائیں' آپ نے یہ کیوں مانگا تھا؟" اوپر ٹی وی لاؤنج میں سب بیٹھے تھے' سوائے فارس کے' وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔

"ہم رات کو ڈسکس کر رہے تھے نا کہ ہاشم نے سعدی کو کس جگہ رکھا ہو گا۔" وہ دبی آواز میں کہنے لگی۔ گزشتہ رات دیر تک وہ یہی بات کرتی رہی تھیں۔ "اور ہم نے ہر وہ شہر سوچا جس میں وہ اسے لے جا سکتے ہیں' لیکن سوچو حنین' وہ لوگ کتنے امیر' کتنے ری سورسز کے مالک ہیں' پرائیویٹ جیٹ' سیکورٹی گارڈز کی نفری' کیا کچھ نہیں ہے ان کے پاس؟ وہ وقت کے فرعون ہیں۔ وہ لوگ سعدی کو اس ملک میں کیوں رکھیں گے؟ جیسے آج کل کراچی سے لوگ اغواء کر کے افریقی ممالک میں لے جائے جا رہے ہیں' ویسے ہی ہو سکتا ہے کہ وہ سعدی کو بھی کسی دوسرے ملک میں لے گئے ہوں۔"

"اور ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ کون سا ملک ہے؟"

حنہ سنتے ہی پریشان ہو گئی۔

زمر میز کے کنارے بیٹھی' اور مزید سرگوشی کی۔ "جج کو بچانے کے لیے آنے والے بھی سعدی کے اغوا کار شمار ہوں گے نا' آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہارون عبید بھی چاہتے ہیں کہ جج کا اسکینڈل دب جائے اور ہارون عبید کاردارز کے فیملی فرینڈ ہیں۔"

"نہ صرف فیملی فرینڈ' بلکہ وہ ان کے کارٹیل کے رکن بھی ہیں اور ایک آئی پی پی (خود مختار بجلی بنانے والے ادارے کے مالک) بھی۔" حنین نے اسکرین دکھائی۔ اس پہ وہ تمام معلومات کھلی تھیں جو اس نے انٹرنیٹ سے اٹھائی تھیں۔ ان کی ویب سائٹس اور سوشل میڈیا وغیرہ سے۔

"بالکل۔ اور سعدی ٹھہرا تھرکول کا سائنس دان۔ آئی پی پیز اور تھرکول والوں کا پرانا کلیش ہے۔"

حنین اداسی سے مسکرائی۔ اسے یاد آیا وہ دن جب زمر' سعدی کی سالگرہ پہ سونی کی پارٹی کا کارڈ لے کر ان کے گھر چار سال کے وقفے بعد آئی تھی۔ (مجھے اتنا عرصہ پتا ہی نہیں تھا کہ کاردارز کا کاروبار کیا ہے' یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کارٹیل کیا ہوتا ہے۔ سب کچھ تب کتنا مختلف تھا۔)

"فرض کرو ہاشم اور ہارون عبید شریک جرم ہیں تو وہ دونوں بہت آسانی سے سعدی کو کسی بھی ملک لے جا سکتے ہیں۔"

"مگر کون سے ملک' زمر؟"

"اس کے لیے احمر ہے نا!" اس نے مسکرا کر موبائل کی اسکرین حنہ کو دکھائی۔ اس پہ احمر کی ای میل کھلی تھی۔ اس میں ممالک کی فہرست تھی' جس کے اوپر لکھا تھا۔ "یہ لسٹ میں نے آپ کو نہیں دی۔ یہ جو بھی آپ دیکھ رہی ہیں' یہ آپ کا تخیل اور تصور ہے' قوی امکان ہے کہ آپ ایک شیزوفرینک پیشنٹ بن چکی ہیں جو غیر مرئی چیزیں تصور کرتے رہتے ہیں' اس لیے پڑھنے کے بعد اسے مٹا دیجیے گا۔"

"اس لسٹ کا ہم کیا کریں گے؟"

"دیکھو' ہاشم کی رجسٹرڈ اکہتر سے زائد کمپنیز پوری دنیا

میں پھیلی ہیں، مگر کہاں کہاں؟ ان ممالک کی فہرست ہمارے پاس نہیں، لیکن ہارون عبید کے چودہ ممالک ہمیں معلوم ہیں۔ وہ سعدی کو کسی ایسے ملک میں رکھیں گے جہاں ان دونوں کا آنا جانا ہو۔"

"تو؟"

"تو مجھے یہ بتاؤ حنہ، کہ ہاشم پچھلے چار ماہ میں کتنے ممالک میں گیا ہے؟"

حنین کی آنکھیں چمکیں۔ آگے ہوئی۔ چند کیز دبائیں۔ ہاشم کا شیڈول دیکھا۔ "چھ ممالک۔" ذرا مایوسی ہوئی۔ "چھ ملک، بہت زیادہ ہیں۔"

"ہارون عبید کی فہرست کے چودہ ممالک اور ہاشم کے چھ ممالک میں کتنے ملک مشترک ہیں؟"

"تین!" حنین بھی قدرے پرجوش ہوئی۔ فہرست چھوٹی ہو گئی تھی۔

"گڈ۔" زمر بال جوڑے میں لپیٹتے بولی۔ "وہ سعدی کو ان ہی تین ملکوں میں سے کہیں لے کر گئے ہوں گے۔ پہلا ملک کون سا ہے؟"

"امریکا۔"

"اونہوں۔" زمر نے بالوں میں اسٹک لگاتے نفی میں سر ہلایا۔ "امریکا لے جانا ان کے لیے مشکل نہیں، مگر وہ اتنا رسک افورڈ نہیں کر سکتے۔ کوئی ایسا ملک ہونا چاہیے جس میں رسک کم ہو۔ دوسرا ملک؟"

"انڈیا۔ مگر یہاں...." احمر کی لسٹ سے پڑھا۔ "یہاں ہارون عبید کا کاروبار واجبی سا ہے۔ اور ہاشم صرف ایک دن کے لیے کسی سیمینار میں گیا تھا۔"

"نہیں، انڈیا بھی نہیں۔ بہت خطرناک ہے۔ تیسرا ملک بتاؤ۔"

حنین ذرا غور سے اسکرین کو دیکھنے لگی۔

"اس تیسرے ملک میں ہاشم پچھلے چار ماہ میں کئی دفعہ گیا ہے، یہاں ہارون عبید کا کاروبار بھی کافی زیادہ ہے۔ بلکہ اس ملک کے دارالحکومت میں سمندر کے ساتھ ان کا ایک ہوٹل بھی واقع ہے۔"

"کہاں؟" زمر دلچسپی سے آگے ہوئی۔

"سری لنکا کا شہر کولمبو۔" حنین نے یونہی چند تصویریں گوگل کر کے اس کے سامنے کیں۔ وہاں سری لنکا پھیلا تھا۔

پُرنم ہواؤں کا ملک۔ سری لنکا۔

"بالکل، سری لنکا۔" زمر نے میز پہ ہاتھ مارا۔ "انسانی اسمگلنگ کے لیے بے حد مشہور ملک۔ نوے فیصد امکان ہے کہ وہ اسے یہیں لے کر گئے ہوں گے۔"

"مجھے تو سو فیصد لگ رہا ہے۔" حنین ایک دم بے قرار ہو گئی۔ "زمر، چلیں ماموں کو بتائیں۔"

"حنین!" وہ اداسی سے مسکرائی۔ "ہم فارس کو ہارون عبید والی بات بتائیں گے، سوائے ہاشم کے ہم ہر بات اسے بتائیں گے تاکہ وہ ہاشم کے ساتھ باقی سب کو بھی ڈھونڈ نکالے، مگر ہم کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے وہ لوگ گھبرا کر سعدی کو مار دیں۔"

"مگر ہم سری لنکا کیوں نہیں جا سکتے؟"

"تمہیں یاد ہے بچپن میں پڑھی وہ کہانیاں جن میں ایک ظالم دیو شہزادی کو اغوا کر کے کالے پہاڑوں پہ لے جا کر قید کر دیتا ہے؟ اور ایک شہزادہ اس کو ڈھونڈنے نکلتا ہے؟ وہ شہزادہ، حنین! کالے پہاڑ پہ نہیں جاتا، وہ ایک جنگل میں جاتا ہے جہاں ایک طوطا ہے، وہ طوطا جس میں اس دیو کی جان ہے سو جب وہ طوطے کی گردن مروڑے گا تو دیو بھی اس کے قدموں میں آ گرے گا، کالے پہاڑ بھی تباہ ہو جائیں گے اور شہزادی خود بخود آزاد ہو جائے گی۔ سو فارس کو اپنا کام کرنے دو، تم ان فائلز کو کھولنے کی کوشش کرو۔ ہاشم کی جان ان ہی میں ہے۔"

اوپر سے فارس کی آواز آئی تو وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ وہ گھر آ گیا تھا اور زمر کا پوچھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ نیچے اترا تو کھانا دیا۔

اس کے بیٹھنے کے بعد زمر اس کو "مجھے احمر نے بتایا...." کہہ کر ہارون عبید کے بارے میں بتانے لگی اور یہ بھی کہ وہ سعدی کو کسی دوسرے ملک لے جا سکتے ہیں۔ سری لنکا ایک مشکوک ملک تھا۔ فارس بغور اسے دیکھتے سنتا رہا۔

"آپ آج احمر سے ملی تھیں؟" نارمل سے انداز میں سوال پوچھا۔

"نہیں۔ فون پہ بات ہوئی تھی۔" اس نے جی کڑا کر کے کہا اور سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ وہ چپ رہا' مگر جب اٹھنے لگا تو صرف اتنا کہا۔ "میں ہارون عبید کو چیک کرلوں گا۔ شاید اس کا کوئی تعلق ہو جج سے۔"

"شاید نہیں' یقیناً" ہے۔ ٹرسٹ می!" وہ زور دے کر بولی۔ فارس نے چند لمحے غور سے اسے دیکھا۔

"ڈونٹ وری! میں آپ پہ ٹرسٹ کرتا ہوں' اسی لیے زیادہ سوال جواب نہیں کر رہا۔" اور یہ کہہ کر وہ خود بھی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

زمر کا ذہن ابھی تک سری لنکا میں الجھا تھا۔ فارس اب کل کے لیے اپنی چیزیں تیار کر رہا تھا۔ کل اسے اے ایس پی سرمد شاہ سے اپنا حساب چکانا تھا۔ اذان کی آواز آئی تو زمر سر جھٹک کر عشا پڑھنے اٹھی۔ پھر ان دونوں کو دیکھا جو اپنے اپنے کمپیوٹرز پہ مصروف تھے۔

"کیا تم لوگوں پہ نماز فرض نہیں ہے؟"

"پڑھتا ہوں ابھی۔" وہ کچھ پیپرز پرنٹ کر رہا تھا' وہی کرتا رہا۔ حنہ نے ان سنا کرتے ہوئے چہرہ مکمل جھکا لیا۔ زمر کو پتا تھا کہ ان دونوں نے نہیں پڑھنی نماز۔ وہ گہری سانس لے کر اوپر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

یہ حسن اتفاق ہے یا حسن اہتمام
ہے جس جگہ فرات وہیں کربلا بھی ہے

اگلی شام جب شہر پہ جلوہ گر ہوئی تو اس میں اکتوبر کی خزاں آلود اداسی تھی۔ سیاہ بادل آسمان پہ جمع ہو رہے تھے اور گویا مینہ برسنے کو بے تاب تھا۔ ایسے میں جب وہ گھر سے نکلنے لگا تو حنین نے پوچھا۔

"کیا آپ کا جانا ضروری ہے؟" وہ دونوں داخلی دروازے کے اندر کھڑے تھے۔ فارس نے سنجیدگی سے سر کو خم دیا۔

"وہ ہوٹل جہاں سرمد شاہ کی خاندانی تقریب ہے' وہاں کیٹرنگ میں میرا بندہ ہے' وہ سب سنبھال لے گا' میں صرف اس کی بربادی دیکھنے جا رہا ہوں۔ ہر ٹیبل پہ موجود ایک زائد ڈش کا ڈھکن جب مہمان اٹھائیں گے تو اندر سے ان کاغذات کا ایک ایک پیکٹ نکلے گا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اور جب اس کے سسر' آئی جی صاحب یہ کاغذ دیکھیں گے' تو اے ایس پی اپنی سب سے بڑی سپورٹ کھودے گا۔ ایک وہی ہے جو کھل کر جج کی حمایت کر رہا ہے' اس کی تباہی کے بعد ان لوگوں کو خود سامنے آنا پڑے گا۔"

"آپ کا نام تو نہیں آئے گا نا؟" وہ متفکر ہوئی۔

"حنین اگر تم یہ نہ کہتیں تو مجھے یہ خیال ہی نہ آتا۔ میں تمہارا کیسے شکریہ ادا کروں؟" وہ خفا ہوا۔ حنہ کے ابرو ناراضی سے بھنچے۔

"اچھا نہ بتائیں۔ مجھے پتا ہے آپ نے الزام کسی اور کے سر ڈالنے کا انتظام کر لیا ہو گا۔" فارس نے محض شانے اچکائے اور باہر نکل گیا۔ حنہ نے گہری سانس بھری۔ پھر اوپر آئی۔ زمر کا دروازہ کھٹکھٹا کر دھکیلا۔

وہ اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی' ہتھیلی پہ گال جمائے سوچ میں گم تھی۔ حنہ میز کے ساتھ آکھڑی ہوئی تو وہ چونکی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟ آپ کی رنگت آج کل بہت زرد رہنے لگی ہے۔"

زمر نے گہری سانس لی۔ کندھے اچکائے۔

"ہاں یونہی بدلتے موسم کا اثر ہو گا۔"

"آپ میری طرح ہوتی جا رہی ہیں۔ سست اور' بے کار۔"

"چھوڑو۔ مجھے بتاؤ فلیش کہاں تک پہنچی۔"

"اس چین والی ویڈیو میں دیکھا تھا' کیسے خاور نے فلیش کے ذکر پہ گردن تان لی تھی۔ اسی نے وہ فائلز encrypt کی ہیں۔ اور وہ ایک بے حد ماہر' اور قابل آدمی ہے۔ اس کا فیکٹر کیا گیا Algorithm توڑنا میرے لیے ناممکن ہے۔"

زمر کے چہرے پہ بے چینی پھیلی۔ "یعنی اب ہم وہ

فائلز نہیں دیکھ سکتے؟"

حنین مسکرائی۔ "میں نے یہ نہیں کہا۔ بے شک میں اسے نہیں کھول سکتی۔ لیکن ایک شخص ہے جو اسے کھول سکتا ہے۔ سعدی بھائی کے پاس میرے جیسا دماغ نہیں تھا' اسی لیے وہ اس شخص کے پاس نہیں گئے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ یہ کھول سکتا ہے؟"

"بالکل۔ کیونکہ وہ ماہر ہے اور وہ بہترین ہے۔"

اس بات پر زمر الجھی۔

"مگر وہ کون ہے؟" حنہ نے مسکراتے ہوئے چہرہ اس کے قریب کیا۔

"آپ کو' سعدی بھائی کو' سب کو مجھ سے امید تھی کہ میں اسے کھول لوں گی' مگر نہیں زمر۔ یہ فلیش۔ یہ سارے فساد کی جڑ۔ اس کو وہی شخص کھولے گا' جس نے اسے مقفل کیا ہے۔ کرنل خاور! میں اس فلیش کو خاور سے کھلواؤں گی۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنے مخصوص نارمل نہیں' حنین والے انداز میں مسکرائی تھی۔ زمر نے بے حد تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جرس گل نے کئی بار بلایا لیکن
لے گئی راہ سے زنجیر کی جھنکار مجھے

اکتوبر کی وہ بارش ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ بھی برس رہی تھی۔ ایسے میں جب آبدار نے اسٹڈی روم کا دروازہ کھولا تو ہارون عبید کے سامنے کرسی پہ کرنل خاور براجمان نظر آیا۔

"بابا آپ نے بلایا؟" خاور کو نظر انداز کر کے اس نے کرسی کھینچی۔

ہارون قدرے ناخوش نظر آرہے تھے۔ مگر پھر بھی خاور کو اشارہ کیا۔ وہ آبدار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں نے آپ کے والد صاحب سے بات کر لی ہے' وہ راضی ہیں۔ آپ ہمارے سائنس دان سے ملنا چاہتی تھیں' میں آپ کو اس سے ملوا سکتا ہوں۔"

آبی نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ "اتنی مہربانی کی وجہ؟" جواب میں خاور سمجھانے لگا۔

"ہمارے ایک دوست کے بارے میں اس لڑکے نے کچھ معلومات کسی وکیل کو دی ہیں۔ وہ شخص ان کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ ہم اس لڑکے پہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے اور پیار سے وہ اس وکیل کا نام نہیں بتا رہا۔ میں نے کاردار صاحب سے بات کی تھی کہ کسی عامل تنویم (ہپناٹسٹ) کے ذریعے نام اگلوالوں' انہوں نے اجازت دے دی ہے۔ پھر مجھے آپ کا خیال آیا۔ آپ نے کچھ عرصہ فرانزک Hypnotist کے طور پہ بھی انگلینڈ میں کام کیا ہے۔ آپ سے زیادہ قابل اعتماد عامل تنویم میرے پاس کوئی نہیں۔ بدلے میں آپ کو اس کا تجربہ سننے کا موقع مل جائے گا' اور ہمیں ہماری معلومات کیا ہم یہ ڈیل کر سکتے ہیں؟"

آبی نے ایک دفعہ پھر دونوں کو دیکھا۔ یہ پہلی دفعہ نہیں تھا کہ ہارون نے اسے اپنے کسی کاروباری کام کے لیے استعمال کرنا چاہا تھا۔ "کیا ہاشم کو معلوم ہے کہ آپ مجھے وہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں' لیکن آپ راضی ہو جائیں میں ان کو بتا دوں گا۔"

"میں راضی ہوں۔" اس نے گردن اکڑائی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب وہ ہارون کے کام کے لیے راضی ہوئی تھی۔ "لیکن آپ ہاشم کو میرے واپس آنے کے بعد بتائیں گے' ورنہ وہ مجھے نہیں جانے دے گا۔" خاور لمحے بھر کو چپ ہوا۔ "لیکن ان کو بتائے بغیر۔"

"جیسے تم اس کو بتائے بغیر ادھر آئے ہو' اسی طرح تم اس کو بتائے بغیر یہ سارا کام کرو گے۔ وہ میرا قیدی ہے' ہاشم کا نہیں!" ہارون نے سختی سے کہا۔ آبدار نے اس بات پہ بے اختیار ہارون کو دیکھا۔ انہوں نے قیدی کو مہمان سے بدلنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ لمحے بھر کے تامل کے بعد شاہ کا وفادار راضی ہو گیا۔

"شیور۔ مجھے صرف معلومات سے غرض ہے۔" اور آبدار کو دیکھا۔ "ہمیں اگلے ہفتے جانا ہوگا۔"

"میں صرف فصیح کے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے

اپنے باپ کے پرسنل سیکورٹی آفیسر کا نام لیا۔ "میری رہائش اور روانگی کا بندوبست وہی کرے گا۔"

خاور نے بہت تحمل سے کڑوا گھونٹ پی لیا۔ "ڈشیور۔ لیکن سعدی کے ساتھ جو بھی بات ہوگی وہ آپ صرف مجھے بتائیں گی۔"

"بالکل۔ میں یہ بہت دفعہ کر چکی ہوں۔" پھر اسی سنجیدگی سے ہارون کو دیکھا۔ "پھر کہاں جانا ہے مجھے بابا؟ کس جگہ رکھا ہے آپ نے اپنے قیدی کو؟"

آواز میں طنز اور آنکھوں میں گلہ۔ یہی چیز ہارون کا ناخوش کر رہی تھی مگر وہ معلومات زیادہ اہم تھیں۔ سو تحمل سے بولے۔

"کولمبو۔" انہوں نے سری لنکا کے کمرشل دار الحکومت کا نام لیا۔ آبدار سرہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹے! ہم ابھی تفصیل سے اس بارے میں بات کرتے ہیں، ہم صرف اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔" انہوں نے قدرے نرمی سے پکارا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بابا۔" اور اسی خفگی سے باہر نکل گئی۔ ہارون گہری سانس لے کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

میں اس شان سے ہارا تھا
کہ دشمن جیت کے رویا تھا

ہوٹل کی کھڑکیوں پہ بھی بارش تڑ تڑ برس رہی تھی۔ سرمد شاہ کے بک شدہ ہال میں گہما گہمی تھی۔ تقریب کے لیے پہنچنے والے مہمان لابی سے گزر کر ہال کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھے فارس غازی کو وہ مہمان صاف نظر آرہے تھے۔ اس نے ہاتھ سے تھپتھپا کر اندرونی شرٹ میں موجود پیکٹ کو محسوس کیا، جس میں اے ایس پی سرمد شاہ کی اپنی دوسری بیوی، جو کہ ایک بدنام زمانہ نائیکہ کی بیٹی تھی، کے ساتھ تصاویر موجود تھیں۔ نکاح نامے کی کاپی تھی۔ اور اس گھر کے کاغذات تھے جو سرمد شاہ نے اس لڑکی کے نام سے خریدا تھا۔

فارس کو چند ماہ لگے تھے یہ سب حاصل کرنے میں۔ اسے یہ سب کس نے دیا، اس شخص کا قصہ تم بعد میں سنو گے، ابھی اتنا جان لو کہ سرمد شاہ کی ماں متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر اس کا ماموں، جو آئی جی کے عہدے پر فائز تھا، وہ امیر بھی تھا اور بارسوخ بھی۔ نہ صرف اس نے اپنی بیٹی (شہزا ملک کی بڑی بہن عائزہ) سے سرمد شاہ کی شادی کی، بلکہ اس کا کیریئر بھی بنوایا۔ اس کو اپنے طبقے میں پیر جمانے دیے۔ سرمد شاہ نے ان سب کو شیشے میں اتارا ہوا تھا۔ وہ شیشہ توڑنے کے لیے کنکر فارس کی جیب میں تھا۔

پی کیپ والا سر جھکا کر بیٹھا وہ گزرے سالوں کو سوچ رہا تھا۔ پھر ایک لمحہ ہر یاد پہ حاوی ہونے لگا۔ ارد گرد موجود "حال" تحلیل ہو کر ماضی میں بدلنے لگا۔

وہ سفید کرتے میں ملبوس اس کال کوٹھڑی میں تھا۔ اس کے ہاتھ دیوار کے ساتھ اونچے بندھے تھے۔ آنکھیں بند کیے سختی سے دانت پہ دانت جمائے وہ یوں کھڑا تھا کہ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ چہرے پہ اذیت کے آثار تھے۔ ایک سپاہی یکے بعد دیگرے اس کی کمر پہ ہنٹر سا مارتا تھا۔ سرمد شاہ بھی وہیں کھڑا تھا۔ یونیفارم کی بجائے سفید ٹی شرٹ پہنے وہ پسینے میں تر تھا۔ ایک دم لپک کر فارس کی گردن دبوچی۔

"مجھے تمہارا اقبالی بیان چاہیے۔ غازی!"

"میں نے... قتل... نہیں کیا۔" وہ بند آنکھوں سے نڈھال ہو کر بولا۔ جواب میں سرمد شاہ زور زور سے چیخنے لگا۔

ویٹر نے پیالی میز پہ رکھی تو فارس چونکا۔ ماضی تحلیل ہوا۔ وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں پہ بوندیں ہنوز گر رہی تھیں۔ ماحول نم اور ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ایسے میں اس نے بھاپ اڑاتی کافی کی پیالی لبوں سے لگائی۔

لابی میں سے گزرتے لوگ اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بل پے کر کے اٹھا اور سر جھکائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے چلا گیا۔ ذہن میں ہر وہ لمحہ گزر رہا تھا، وہ جیل کے اذیت ناک ماہ و سال اور وہ اس رات اسپتال میں گزرے چند گھنٹے۔ جب ان کے ہاتھوں سے اس اے ایس پی نے سعدی کو غائب

کروادیا تھا۔ نفرت' غصہ انتقام' وہ ہر جذبے میں گھرا آگے بڑھتا گیا۔

متعلقہ ہال کے داخلی حصے سے اندر کی رنگا رنگ تقریب نظر آرہی تھی۔ کونے میں رک کر فارس نے' دور کھڑے آئی جی صاحب کے ساتھ بات کرتے سرمد شاہ کو دیکھا۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا' اور مسکرا کر خوش باش سا اپنے سسر کے ساتھ مگن تھا۔ فارس کی سرد نظریں اس سے ہوتیں' مرکزی دیوار تک جارکیں۔

"ہیپی برتھ ڈے ارصم شاہ۔" وہاں لکھا تھا۔

ایک دم فارس کی نظروں میں الجھن ابھری۔ اس نے آگے پیچھے دیکھا۔ غبارے' پھول' اور اونچی سی کیک ٹیبل۔ مہمانوں میں جابجا نظر آتے بچے۔ اور سب سے نمایاں' وہ سیاہ ٹوپیس اور ٹائی میں کھڑا پیارا سا سات سالہ بچہ۔ جو سرمد شاہ کی بیوی عائزہ کے ساتھ کھڑا تھا۔

(تو وہ خاندانی تقریب سالگرہ کی تھی؟)

فارس بالکل سن سا ہو کر اس بچے کو دیکھے گیا۔ بچہ بہت پیارا تھا۔ اس کے ہونٹ گلابی اور آنکھیں کانچ جیسی تھیں۔ شرما کر' مسکرا کر وہ اپنے جیسے کم عمر بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ کسی ننھے شہزادے کی طرح۔ اس کی کانچ سی آنکھوں کی معصومیت ایک دم ہر شے' ہر جذبے پہ حاوی ہونے لگی۔

فارس کے تاثرات بدل چکے تھے۔ سردپن غائب ہوا۔ آنکھوں میں تکلیف سی ابھری۔ پھر ایک دم وہ مڑا۔

ہوٹل کے کچن کی پشت پہ جب وہ پہنچا تو ایک کیٹرر اس کا منتظر تھا۔

"لائیں پیکٹ دیں' میں ارینج کردوں گا۔" ادھر ادھر دیکھتے رازداری سے بولا۔

"نہیں۔ ابھی نہیں۔" وہ پریشان لگ رہا تھا۔

کیٹرر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "آپ نے ایک مہینہ مجھے تنخواہ دی اس کام کے لیے اور اب؟"

"میں نے کہا نا ابھی نہیں۔ تم جاؤ کام کرو۔" اور واپس پلٹ گیا۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا' بارش مسلسل برس رہی تھی۔ حنین اور زمر لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ وہ دروازہ لاک کرکے آگے آیا تو پانی میں بھیگا ہوا لگتا تھا۔ جانے کتنی دیر سڑک کنارے بارش میں چلتا رہا تھا۔

حنین اسے دیکھ کر بے قراری سے اٹھی۔ "کیا بنا اس آدمی کا جس نے میرے بھائی کو ہماری نظروں کے سامنے اسپتال سے غائب کروایا تھا؟"

فارس نے بس ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ حنین نے نا سمجھی سے زمر کو دیکھا۔ وہ خود بھی چونکی تھی۔ پھر فوراً پیچھے گئی۔

وہ کمرے میں کھڑا گھڑی اتار رہا تھا۔ زمر سامنے آئی۔

"کیا بنا؟"

"میں نے۔" وہ چپ ہوا۔ گھڑی اتار کر میز پہ رکھی۔ پھر پیکٹ نکال کر ساتھ رکھا۔ "میں نے نہیں کیا۔"

"کیا مطلب نہیں کیا؟" وہ حیران رہ گئی۔

"وہ اس کے بچے کی سالگرہ تھی۔ اس کا بیٹا وہاں موجود تھا۔" وہ اب صوفے پہ بیٹھا' سر جھکائے جوگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔

"تو؟"

"تو یہ کہ وہ ایک سات سال کا بچہ تھا۔" اس نے جوگرز اتارے۔

"تمہیں اس پر رحم آگیا؟" زمر کو آگ لگ گئی۔ "کیا تم وہ سب بھول گئے جو اس نے ہمارے خاندان کے ساتھ کیا؟"

"زمر بی بی۔ میرا دماغ اس وقت خراب مت کریں۔ میں اس بچے کے سامنے اس کے باپ کا کردار نہیں کھول سکتا تھا۔" وہ ایک دم غصے سے اس کے سامنے آیا۔ "تقریب میں سارے لوگ اس کے باپ پہ پل پڑتے' وہاں ایسی ایسی باتیں کی جاتیں جن کو وہ بچہ کبھی نہ بھولتا۔ اس کا باپ اس کی ماں سے بے وفائی کررہا ہے' اس سے جھوٹ بولتا رہا ہے' وہ کبھی نہ

بھولتا۔ وہ ساری زندگی کسی محبت کسی رشتے کا اعتبار نہ کرتا۔ ہر انسان کا باپ اس کے لیے آئیڈیل ہوتا ہے' آئیڈیل ٹوٹنے سے اس کی شخصیت بھی ٹوٹ جاتی ہے۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کھڑکی پہ بارش تڑتڑ برس رہی تھی۔ زمر نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"تمہاری سوتیلی ماں نے بھی ایسا ہی کیا تھا نا!" کوئی برف کا اولہ ساز ور سے کھڑکی پہ گرا تھا۔

"مجھے درمیان میں مت لائیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔ آنکھیں سرخ ہوئیں۔

"تم خود اپنے آپ کو درمیان میں لائے ہو۔ جو سعد شاہ نے کیا' وہ اس کے ذمے ہے۔ اس کے بچے کو کبھی نہ کبھی پتا چل جائے گا۔ یا تم اسے معاف کر رہے ہو؟"

"میں کسی کو معاف نہیں کر رہا۔ صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ یہ چیز کسی اور طریقے سے کسی اور وقت کی جاسکتی ہے۔ بعد میں وہ اپنے بچے کو کیسے ڈیل کرے' یہ میرا مسئلہ نہیں ہے' لیکن آج کی اہانت کی وجہ میں نہیں بننا چاہتا۔ میرا انتقام میری بیماری نہیں ہے' نہ اس نے مجھ سے میری انسانیت چھینی ہے۔" وہ مڑا اور خشک کپڑوں کے لیے الماری کھول لی۔

زمر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ "تم غلطی کر رہے ہو اور تم اس کے لیے بہت پچھتاؤ گے۔"

وہ نظر انداز کر کے کپڑے نکالنے لگا۔ بارش کی تڑتڑاہٹ مزید تیز ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

قاتل مراَنشان مٹانے پہ ہے بضد
میں بھی سِناں کی نوک پہ سر چھوڑ جاؤں گا

موسم اگلے چند دن ویسا ہی ٹھنڈا رہا' مگر پھر آہستہ آہستہ بارش کا اثر ختم ہو گیا' حبس اور گرمی واپس آگئی۔ البتہ آزاد کشمیر کی طرف جاتی اس پہاڑی' بل کھاتی سڑک پہ اب بھی ٹھنڈی چھایا سی تھی۔ ایک چمکتی کار وہاں دوڑ رہی تھی۔ نوشیرواں کار دار

اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے موجود تھا۔ آنکھوں پہ برانڈڈ گلاسز لگے تھے' کلائی میں قیمتی گھڑی۔ چیونگم چباتا' وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

ڈیش بورڈ پہ پڑے فون کی اسکرین دفعتا" چمکی۔ اس نے اسے اٹھایا۔ اسید کا پیغام تھا۔ سب دوست کشمیر پہنچ چکے تھے' اسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ "میں دوپہر تک پہنچ جاؤں گا۔" لکھ کر پیغام بھیجا اور پھر سے ڈرائیو کرنے لگا۔

یکدم اس نے کار کو بریک لگائی۔ ٹائر چرچرائے۔ خون کی بوندیں ونڈ اسکرین تک اڑ کر آئیں۔ لمحے بھر کو وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ لیکن پھر تیزی سے باہر نکلا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ مرنے والا کوئی کتا تھا اور اس نے اسے بچانے کی کوشش بھی کی تھی مگر.....

باہر آکر وہ رکا۔ اگلے ٹائروں تلے آیا۔ وہ کتا نہیں تھا۔

وہ کتے کا بچہ تھا۔ ایک معصوم سنہری لیبراڈار۔

وہ کچلا گیا تھا۔ خون جا بجا بکھرا تھا۔ نوشیرواں پنجوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔ پریشانی سے اس کو دیکھا۔ پلے کی گردن میں کالر تھا۔ "آریو" اور مالک کا نام "اینڈرس۔" دوسرا لفظ خون میں ڈوبنے کی وجہ سے نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی فارنر سیاح کا کتا تھا۔ شاید ہسپانوی۔

نوشیرواں کی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پھر اس نے آواز سنی۔ اوپر پہاڑ پہ درختوں سے کوئی عورت پکار رہی تھی۔ "آریو۔ آریو۔"

نوشیرواں نے بجلی کی تیزی سے اپنی ڈیزائنر جیکٹ اتاری' کتے کو اس میں لپیٹا اور بھاگتا ہوا کار کے اندر جا بیٹھا۔ جیکٹ کی گٹھڑی فرنٹ سیٹ پر ڈالی اور تیزی سے کار آگے بڑھالی۔ چند کوس آگے جا کر رفتار آہستہ کی۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ خون سے بھرے تھے۔

شیرو کو اک دم ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس نے کار روکی۔ اور جیکٹ کی گٹھڑی لیے باہر نکلا۔ سڑک کے دہانے پر کھڑے اس نے سوچا کہ کتے کی لاش نیچے

کھائی میں پھینک دے' مگر وہ اسے نہیں پھینک سکا۔
ٹھنڈی ہوا کے باوجود اس کا جسم پسینے سے تر تھا۔

وہ سڑک کنارے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور خون آلود ہاتھوں سے مٹی کھودنے لگا۔ نرم مٹی بھی نہیں کھودی جا رہی تھی۔ سانس چڑھنے لگا تھا۔ بمشکل' بدقت وہ ایک چھوٹا سا گڑھا کھود پایا پھر جیکٹ کھولی تو اندر ننھا معصوم پلا خون میں ڈوبا مرا پڑا تھا۔

نوشیرواں کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے چہرہ اٹھا کر اپنے چار سو دیکھا۔

ویران پہاڑ' اونچے درخت۔ کھائی۔ کھلا آسمان۔

وہ لاش کو وہیں چھوڑ کر کار میں آبیٹھا۔ خون آلود ہاتھ' خون آلود فرنٹ سیٹ۔ کپکپاتے ہاتھوں سے دوبارہ کار اسٹارٹ کی۔ اسے گھر جانا تھا۔

(کوئی جانور کو بھی ایسے نہیں مارتا' شیرو! وہ تو پھر انسان کا بچہ تھا۔)

شیرو نے سر جھٹکا اور ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھا دیا۔ وہ ہر جگہ تھا' وہ ہر منظر میں تھا' اس سے فرار ناممکن تھا۔ اور اب گلٹ کا یہ مرض بڑھتا جا رہا تھا۔

چند گھنٹوں بعد قصر کاردار میں جھانکو تو نوشیرواں کار گھر کے اندرونی گیراج میں لے آیا تھا' اور اب گارڈ کو ہدایات دے رہا تھا۔ "اس کو اچھی طرح صاف کرواؤ۔ ایک دھبہ بھی نہ باقی رہے۔"

لاؤنج میں جواہرات تیار بیٹھی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنائے' گردن میں دمکتے ہیرے۔ ہاتھ فیونا کے سامنے بچھا رکھا تھا جس پہ وہ کیوٹکس لگا رہی تھی۔ شیرو کو اس طرح آتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

"تم تو دوستوں کے ساتھ گئے تھے؟ اور یہ کپڑوں کو کیا ہوا ہے؟" وہ جواب دیے بنا اوپر چلا گیا۔ جواہرات نے چتون کے اشارے سے فیونا کو روکا' ہاتھ نکالا اور اس کے پیچھے اوپر گئی۔

شیرو اپنے کمرے کے ڈریسنگ روم میں' الماریوں کے پٹ کھولے کھڑا تھا۔ چہرے پہ عجیب بے زاری اور بے چینی تھی۔

"تمہارے کپڑوں پہ خون کیوں لگا ہے؟ کیا کسی سے لڑ کر آئے ہو؟" وہ فکر مندی سے اس کے سامنے آئی۔

"وہ فکر نہ کریں' کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔"

"مجھے سچ بتاؤ شیرو' کسی سے جھگڑا کیا ہے؟" اس نے اسے کہنی سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔ نوشیرواں بالکل ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ کو لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"تمہاری حالت جو بتا رہی ہے وہ تمہارے الفاظ نہیں کہہ رہے۔" اب کے وہ سختی سے بولی۔ شیرو نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"کتے کا بچہ تھا وہ ممی' کتے کا بچہ۔" وہ ایک دم بلند آواز میں بولا۔ "میں نے غلطی سے اسے مار دیا' مگر میں اس کا خون آلود وجود نہیں دیکھ سکا۔ میں اس کو دفنا بھی نہیں سکا۔ مجھے ہر جگہ اس کا خون نظر آ رہا تھا۔ اس کی مالکن اس کو پکار رہی تھی۔ وہ ممی' کتے کا بچہ۔" وہ ایک دم بلند آواز میں بولا۔ "میں نے غلطی سے اسے مار دیا' مگر میں اس کا خون آلود وجود نہیں دیکھ سکا۔ میں اس کو دفنا بھی نہیں سکا۔ مجھے ہر جگہ اس کا خون نظر آ رہا تھا۔ اس کی مالکن اس کو پکار رہی تھی۔ آریو' آریو۔ وہ آوازیں مجھے پاگل کر رہی ہیں" وہ وحشت سے چلایا۔

"اوکے اوکے!" جواہرات نے نرمی سے اس کو شانوں سے تھاما۔ "ریلیکس' کوئی بات نہیں' یہ صرف ایک حادثہ تھا۔ تم ان چیزوں سے بہت اوپر' بہت مضبوط ہو۔ تم ایک کاردار ہو اور۔۔۔"

"اور میں ایک بڑے خاندان کا بڑا آدمی ہوں' عظمت میرا مقدر ہے' یہی نا؟" یہی بتاتی آئی ہیں نا آپ مجھے ساری عمر؟" غصے سے کہنی چھڑائی۔ "بس کردیں' نہیں سننی مجھے یہ باتیں اس وقت۔ کیونکہ ممی۔ اب مجھے ان پہ یقین نہیں آتا۔" برہم سا صدمے سے اسے دیکھتا' کپڑے لیے باتھ روم میں چلا گیا اور دروازہ جواہرات کے منہ پہ بند کر دیا۔

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ (خیر' وہ نارمل ہو جائے گا۔) اور واپس نیچے چلی آئی۔ اس کی ابھی تیاری رہتی تھی۔

✿ ✿ ✿

میں ریگ زار تھا جس میں بسے تھے سناٹے
اسی لیے تو میں شہنائیوں سے ڈر تا رہا

ان سے دور چلے آؤ تو شام کے اس پہر' ایک اعلا درجے کے ہوٹل کے بینکوئٹ ہال میں ولیمہ کا فنکشن منعقد تھا۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ دلہا دلہن پھولوں سے سجے اسٹیج پہ بیٹھے' مسکرا کر تصویریں بنوا رہے تھے۔ نیچے ایک میز کے گرد زمر بیٹھی غیر دلچسپی سے اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے زرد لمبی قمیض پہن رکھی تھی' بال جوڑے میں تھے اور کانوں میں آویزے تھے' موقعے کی مناسبت سے ہلکی پھلکی سی تیار وہ اچھی لگ رہی تھی۔ فارس ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' مسلسل سیل کے بٹن دبا رہا تھا۔ ایک دوسرے سے کٹے کٹے اور بے نیاز۔

تب ہی سارہ ادھر آتی دکھائی دی۔ وہ سادہ سی تیار ہوئی تھی۔ ایک بیٹی اہل ساتھ تھی' دوسری کو نہ جانے کس وجہ سے ساتھ نہیں لائی تھی۔ ان کو دیکھ کر پھیکا سا مسکرائی۔ زمر بھی مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس نے نہیں دیکھا تھا' سر جھکائے سیل پہ لگا تھا' مگر اہل نے جیسے ہی اسے دیکھا' ایک دم ماں کی انگلی چھڑا کر آگے لپکی اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ چونکا' مگر پھر نگاہ بچی پہ پڑی تو نرمی سے اس کے گرد بازو حمائل کیے' اور اسے خود سے لگائے رکھا۔ سارہ جو زمر سے رسمی کلمات کہہ رہی تھی' ایک دم رک کر دیکھنے لگی۔ آنکھیں گلابی ہوئیں۔

وہ تو بس ایک دفعہ ملنے آیا تھا۔ رہائی کے بعد' اور سارہ نے اسے رکھائی سے خود سے دور رہنے کو کہا تھا' پھر وہ صرف دو دفعہ آئی ان کے گھر (ٹیکسی میں) مگر تب جب وہ گھر پہ نہیں تھا کہ فارس غازی کا مطلب تھا "مصیبت"۔ اور اہل تو اس سے پتا نہیں کتنے عرصے بعد مل رہی تھی' پھر بھی اسے وہ یاد تھا؟ اہل اب فارس سے الگ ہوئی تو وہ اسے دونوں کہنیوں سے تھامے' مسکرا کر اپنے سامنے کھڑا کیے' پوچھ رہا تھا۔

"تم کیسی ہو اہل؟"

"میں ٹھیک ہوں' آپ کیسے ہیں؟ میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔" اس نے اپنے ننھے ہاتھ کو فارس کے گال اور ٹھوڑی پہ پھیرا' جسے فارس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چوما۔

لمحے بھر کے لیے ان کے ارد گرد ولیمہ کا فنکشن غائب ہو گیا۔ وہ چار' ساڑھے چار سال پیچھے چلے گئے' جہاں قبرستان سے لوگ لوٹ رہے تھے' اور ایک تازہ کچی قبر پہ وہ کھڑا ہنوز مٹی ڈال رہا تھا۔ اس کا چہرہ ویران تھا' اور آنکھوں میں گلابی سا پانی تھا۔ قبر مکمل طور پر ڈھک چکی تھی۔ ساتھ پانچ سالہ اہل خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ لوگ دور جا رہے تھے۔ نور گھر تھی" وہ الگ مزاج کی تھی' اس کو سارہ نے نہیں آنے دیا تھا' مگر اہل کو وہ زبردستی اس کے باپ کے جنازے پہ لے آیا تھا۔

قبرستان تقریباً "سنسان ہو چلا تھا۔ سورج اوپر تپ رہا تھا۔ وہ بھی تکان زدہ سا مٹی پہ آبیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسلیں۔

"آپ رو رہے ہیں' چاچو؟" اہل نے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ فارس نے نفی میں چہرہ ہلایا' زکام زدہ سی سانس اندر کو کھینچی' آنکھوں میں گلابی پانی تھا مگر اس نے ان کو رگڑ لیا' پھر اہل کو دیکھا۔

"اپنے باپ کی قبر مت بھولنا کبھی اہل۔ اس کو اس لیے مار آگیا کیونکہ وہ ایک سچا آدمی تھا' ایک ایسا آدمی جو ظلم کے خلاف اٹھ گیا ہو۔ وہ بہادر تھا۔ میں بھی اسی کا بھائی ہوں۔ اللہ کی قسم میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ سمجھتے ہیں' ہم غریب ہیں' کمزور ہیں' تو ان کا ہاتھ نہیں روک سکتے؟ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ کبھی یہ نہیں سمجھو گی کہ تمہارے باپ نے خودکشی کی تھی اور میرا وعدہ ہے' میں اس کے ایک ایک قاتل کا سر تمہارے ہاتھ میں لا کر دوں گا۔" اسے پتا تھا اہل کو اس کی باتیں سمجھ نہیں آئیں گی مگر وہ جواب میں کچھ کہہ رہی تھی۔

قبرستان تحلیل ہو گیا' وہ روشنیوں سے مزین اس ہال میں موجود تھے۔ فارس بیٹھا ہوا تھا' اور اس نے اہل کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔

"آپ اتنے بزی کیوں ہوتے ہیں؟ جب بھی ماما سے کہوں آپ سے ملنا ہے' وہ کہتی ہیں" چاچو

پڑی ہیں۔" وہ اس کے کان کے قریب شکوہ کر رہی تھی۔

فارس نے زخمی نظر اٹھا کر سارہ کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہوں یہ میرا خون ہے، تم خون میں لکیر نہیں کھینچ سکتیں؟ سارہ کا گلا رندھا۔

"تم چاچو کو اتنا مس کر رہی تھیں تو کہتیں، میں تمہیں ملوا لاتی۔" بیٹی کو مخاطب کیا۔ شرمندگی اور خفت کے ساتھ۔ وہ اتنے سال انگلینڈ رہے، فارس کے ساتھ ایک شہر میں تو صرف چند ماہ رہے، پھر وہ جیل چلا گیا، لیکن ایسے وہ دوڑ کر اس کے پاس آئی تھی، جیسے برسوں کا ساتھ ہو۔ یہ خون کیا چیز تھی؟ ان کارگوں میں بہنا کیسے سب کو جوڑ کر رکھتا تھا۔ اس کا ناحق بہائے جانا کیسے سب کو توڑ دیتا تھا۔

زمر بس خاموشی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

"سعدی کا کچھ پتا چلا فارس؟" اس نے پوچھا، تو آواز میں آس بھی تھی، خفت بھی۔ وہ ان ہی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اہل کو کسی نے بلا لیا تھا سو وہ بھاگ گئی۔

"میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔" خشک انداز میں کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میز پہ عجیب سا تناؤ در آیا۔ اسے سارہ کا اپنے ساتھ رویہ یاد تھا۔

"تمہیں آئل کمپنیز۔ یعنی آئی پی پیز کو چیک کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ان کا اس میں کوئی ہاتھ ہو۔" سارہ نے خود کو کہتے سنا۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر سر ہلایا۔

"کر رہا ہوں۔" سارہ اٹھ گئی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس پرائیویٹ نمبر تھا، چاہتی تو خفیہ ایس ایم ایس بھی بھیج دیتی، لیکن وہ جانتی تھی، وہ اس کو ڈھونڈ لے گا، اور زمر اسے کورٹ میں دھکیل دے گی۔

"ہارون عبید والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟" وہ تنہا رہ گئے تو زمر نے سرگوشی کی۔ اے ایس پی کو وہ اب ڈسکس نہیں کرتے تھے، وہ مانتا تھا لیکن وہ اس کو معاف کر چکا تھا۔

"ہوں۔ میں ہارون عبید کے پیچھے ہی لگا ہوا ہوں، مگر اتنے دن میں اس کی ایک بھی قابل گرفت چیز نہیں مل سکی۔" وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ "میں جج، ہارون عبید، اور اے ایس پی کا لنک جوڑنا چاہتا ہوں، الیاس فاطمی کے ساتھ۔ مگر ان تینوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں بن رہا۔"

"یعنی درمیان میں کچھ مسنگ ہے؟"

درمیان میں "کوئی" مسنگ ہے۔ کوئی ایک شخص ہے ان سب کے درمیان۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ زمر نے تھوک نگلا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔

"کھانا لگ رہا ہے۔" وہ اٹھنے لگی تو ایک دم اسے چکر سا آیا۔ میز کا سہارا لے کر واپس بیٹھی۔ فارس اپنے فون پہ بٹن دبا رہا تھا، اس نے نہیں دیکھا۔ چند گہرے سانس لے کر اس نے خود پہ قابو پایا۔

"ہم باہر کہیں اور ڈنر کر سکتے ہیں فارس؟" اسے اتنے لوگوں میں ایک دم گھٹن ہونے لگی تھی۔ اتنی دور ٹیبل تک جائے گی کھانا ڈالنے تو کہیں گر جائے گی۔

فارس نے اس بات پہ بے اختیار اسے دیکھا اور پھر ہمیشہ کی طرح اس کی بات مان لی۔ ایک دم سے زمر کو احساس ہوا، کہ اسے فارس کو بتا دینا چاہیے۔ اپنی خرابی طبیعت، کڈنی، وہ سب۔ پرس میں ایک رپورٹ بھی تھی۔ اسے وہ فارس کو دکھا دینی چاہیے۔

☼ ☼ ☼

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
جب ان کو زباں ملی تو ہم ہی پہ برس پڑے

کچھ دیر بعد وہ اسی ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ وہاں زرد بتیاں تھیں۔ میز پہ تازہ پھول رکھے تھے۔ موم بتی جل رہی تھی۔ وہ ٹیک لگائے، مسلسل کان کی لو مسلتا، ویٹر کو آرڈر دے رہا تھا اور زمر کے ہاتھ گود میں رکھے پرس پہ تھے۔ فارس کے ساتھ پہلی دفعہ ایسی جگہ پہ ڈنر کرنا۔ بہت آکورڈ تھا۔ تب ہی زمر کا فون بجا۔ اس نے فوراً اٹھا لیا۔

"جی صداقت؟ جی ظاہر ہے وہ کپڑے استری کرنے

تھے۔ میں نے نہیں بتایا تو آپ کو خود سمجھنا چاہیے تھا۔" رک کر خفگی سے سنا۔ "میں نے وہاں کپڑے نہیں رکھے تھے تو کیا کسی چڑیل نے آکر رکھے تھے؟ روز اسٹینڈ پہ کپڑے کون رکھتا ہے؟ حد کرتے ہو آپ بھی۔" بڑبڑا کر فون رکھا تو دیکھا فارس ذرا چونک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے خود کو "چڑیل" کیوں کہا؟"

"مثال دی تھی۔ کیوں؟ کیا ہوا؟" اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ "تم مسکرا رہے ہو؟"

فارس نے مسکراہٹ دبائے چہرہ جھکا کر نفی میں سر ہلایا۔ "میں بالکل بھی نہیں مسکرا رہا۔"

وہ فوراً" آگے ہوئی۔ "نہیں سچ سچ بتاؤ۔ تم ایسے صرف تب مسکراتے ہو جب تمہیں کوئی بات معلوم ہوتی ہے اور مجھے نہیں۔" پھر رک کر اپنی بات پر غور کیا۔ "کیا کسی نے تمہارے سامنے مجھے چڑیل کہا ہے؟"

"میرے سامنے کوئی آپ کو چڑیل کہنے کی ہمت کر سکتا ہے کیا؟" فارس نے سنجیدگی سے اسے تسلی دی۔ زمر کے تنے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے۔ اس کے انداز میں اتنا مان، اتنا اعتماد تھا۔ پرس میں ہاتھ ڈال کر رپورٹ دو انگلیوں سے پکڑی۔ پھر سرسری انداز میں بولی۔

"اس بات کا کیا مطلب تھا جو اس رات تم نے کہی؟" اسے یقین تھا کہ فارس کو معلوم ہے وہ کسی بات کا ذکر کر رہی ہے۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے ہولے سے مسکرایا۔ "اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے مجھے۔ سات سال پہلے۔ قید میں ڈالا تھا۔"

وقت ایک لمحے کے لیے تھم گیا، موم بتی کا شعلہ دھیرے سے ٹمٹمایا۔ پھولوں کی خوشبو آس پاس پھیلی۔ زمر یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

(مجھے سات سال پہلے آپ سے محبت ہو گئی تھی)

"I Fell in Love with you Seven Years Ago!"

وہ آرام سے کہہ گیا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی، مگر وہ اس مسکراہٹ کو پہچانتی تھی۔ وہ انگلیاں اب بھی رپورٹ پہ تھیں۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ تیسری وجہ بھی بتائے دیتا ہوں۔" اس نے لمحے بھر کے لیے بھی زمر کی آنکھوں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ "میں سات سال پہلے جب اس شہر میں پوسٹڈ ہو کر آیا تھا تو میں نے آپ کی کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ مجھے۔ آپ سے محبت ہو گئی تھی۔"

وہ نرمی سے کہہ رہا تھا مگر یہ نرمی آنکھوں میں نہیں تھی۔ "میں آپ کے قریب رہنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ آپ کے بارے میں ہر چیز جاننے لگا تھا۔ آپ سعدی کی فیس دے رہی ہیں، آپ حنہ کے لیے اپنی جابیاں جان بوجھ کر اٹھانا بھول جاتی ہیں۔ آپ کو کب سے استھما ہے۔ مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ مجھے نوٹس نہیں ملے۔ مجھے ملے تھے۔ میں نے پھاڑ کر پھینک دیے تاکہ آپ مجھے زیادہ وقت دے سکیں۔ مجھے تب احساس ہوا کہ میں مریض عشق بنتا جا رہا ہوں۔"

وہ سانس لینے کو رکا۔ وہ بالکل دم سادھے اسے سن رہی تھی۔

"پانچ سال پیچھے چلتے ہیں زمر۔ میں نے آپ کو وہ نوزین بھیجی، مجھے لگا تھا آپ میری لکھائی پہچان جائیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسی لیے جب آپ کی والدہ نے رشتے سے انکار کیا تو میں نے دوبارہ کوشش نہیں کی۔ میں "آپ" کے لیے نہیں لڑا۔ میرے نزدیک ایک ایسی عورت کے لیے لڑنا بے سود تھا۔ جو میری لکھائی بھی نہ پہچان سکے۔ میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ شادی بھی کر لی لیکن میرا ایک حصہ پہلے بھی اور آئندہ بھی آپ سے محبت کرتا رہے گا۔ اس ایک حصے کی وجہ سے میں اپنی بیوی سے ویسی محبت نہیں کر سکا جیسی کرنی چاہیے تھی۔ شروع شروع میں، میں اس کے نام کو اپنے بھائی کے نام سے جوڑنے پہ لڑتا تھا، مجھے لگتا تھا یہ صرف اس سے محبت نہ کرنے کا گلٹ ہے ورنہ اس

کے حقوق و فرائض تو میں نے سب پورے کیے تھے۔ ڈانٹتا تھا مگر بلاوجہ نہیں۔ وہ میری بہت اچھی دوست تھی۔ لیکن جیل کے چار سال میں یہ نہیں سمجھ سکا' اگر میرا اور اس کا تعلق صرف دوستی یا گلٹ کا تھا میں اسے اتنا مس کیوں کرتا ہوں؟ محبت تو مجھے آپ سے تھی مگر آپ کے لیے میں کبھی نہیں لڑا' اس کے لیے پھر بھی لڑ رہا ہوں۔" فضا میں ایک دم Winters Rebecca De کی مہک پھیل گئی۔ وہ اب بھی سانس روکے ہوئے تھی۔

"مجھ سے شادی کرنے کی تیسری وجہ کیا تھی؟"

وہ مسکرایا۔ "محبت نہیں تھی۔ اگر محبت کے لیے آپ سے شادی کرنی ہوتی تو ساڑھے پانچ سال پہلے کرلیتا۔ مگر نہیں۔ میں نے آپ سے شادی بھی کی' اور آپ کی ہر بات برداشت کی۔" کہتے ہوئے وہ آگے کو ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اس لیے نہیں کہ میں کمزور تھا' محبت میں خاموش تھا' یا یہ میری شرافت تھی۔ ٹرسٹ می زمر' میرا ایک حصہ ساری زندگی آپ کی قید سے نہیں نکل سکے گا' میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا' اور میں آپ کو ایک ہزار دفعہ بھی معاف کرسکتا ہوں' مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ کے ساتھ جو بھی ہوا میری وجہ سے ہوا لیکن۔"

وہ رکا' وقت بھی رک گیا۔

وہ نمک کا مجسمہ بنی یک ٹک اس کو دیکھ رہی تھی۔

"لیکن میرا اور آپ کا تعلق' میری برداشت' میری خاموشی' میرا آپ کی پرواہ کرنا' آپ کے زخموں پر مرہم رکھنا محبت اس میں کبھی بھی شامل نہیں تھی۔ میں نے آپ سے غلط کہا تھا کہ میں آخر میں آپ سے اپنا حساب لوں گا' مجھے آپ سے نہ انتقام لینا ہے نہ کوئی حساب لیکن۔"

وہ پھر رکا' زمر کا سانس بھی رکا۔

"لیکن جو آپ نے میرے ساتھ کیا' میں ایک بات بھی نہیں بھولا۔ آپ سے شادی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ۔۔۔" چہرہ مزید آگے کیا۔ موم بتی کے ٹمٹماتے شعلے کے پیچھے اس کی پرتپش آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

"میں آپ کی آنکھوں میں گلٹ (پشیمانی) دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ تب کیا کریں گی جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ فارس غازی بے گناہ تھا۔ میں صرف اسی دن کے انتظار میں ہوں اس دن جب آپ کو سچائی معلوم ہوگی۔ میں اپنی بے گناہی ثابت کردوں گا اور آپ ٹوٹیں گی۔"

موم بتی کا شعلہ ایک دم بجھ گیا۔ زمر کی انگلیوں نے رپورٹ کو چھوڑ دیا۔ نگاہیں ہنوز فارس پہ جمی تھیں۔

"یہ جو آپ کو بہت غرور ہے نا خود پہ کہ آپ بہت قابل ہیں' میں یہ غرور ٹوٹتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی آنکھوں میں گلٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی انتقام' کوئی انصاف نہیں چاہیے مجھے آپ سے۔ صرف احساس ندامت' اسی لیے میں نے آپ سے کوئی تعلق جوڑنے کی کوشش نہیں کی' کوئی حق نہیں مانگا' کیوں کہ مجھے آپ کے ساتھ رشتہ بنانے میں دلچسپی نہیں رہی۔ وہ وقت کب کا گزر گیا۔ اب ہم صرف پارٹنرز ہیں' ساتھ کام کررہے ہیں' میں آپ سے کبھی نفرت نہیں کرسکتا اور محبت کرنا چھوڑ بھی نہیں سکتا' لیکن آپ جیسی عورت کے ساتھ میرے جیسا بندہ کبھی بھی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں' لیکن میں آپ کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے صرف اس دن کا انتظار ہے جب آپ میرے سامنے ٹوٹیں گی اور اس دن زمر بی بی! میں آپ کو آزاد کردوں گا' عزت سے طلاق کے کاغذات تھمادوں گا' مگر اس سے پہلے میں آپ کی ہر کڑوی بات برداشت کرتا رہوں گا' محبت یا شرافت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ میں آپ کو آزما رہا ہوں۔ یہی آپ کی سزا ہے۔ کیوں کہ میرے نزدیک آپ ایک بے وقوف عورت اور بہت بری وکیل ہیں۔"

موم بتی سرد ہوچکی تھی۔ پھولوں میں ریبکا کے ساتھ کافور کی بو بھی رچ بس گئی تھی۔ موم بتیاں پراسرار اور خوف ناک لگ رہی تھیں۔ وہ بہت سکون سے سرد لہجے میں کہہ کر پیچھے ہوا۔ ویٹر کھانا سرو کرنے آکھڑا ہوا تھا۔ سیزلر پلیٹ پہ گرم اسٹیک شڑ شڑ

کررہی تھی' یوں لگتا تھا زمر کے اندر تک کوئلے دہک رہے ہوں۔ کوئی آس سی ٹوٹ گئی تھی۔

ویٹر ہٹا تو وہ بیرلے سے بولا۔ "کھانا کھائیے۔ وہ وقت گزر چکا جب آپ کو مجھے سننا تھا۔ تب آپ کو اپنی صحت عزیز تھی۔ حالانکہ مری تو میری بیوی تھی' آپ کو تو ڈونیٹڈ کڈنی بھی مل گیا۔"

تلخی سے کہہ کر' وہ جو بے خبر تھا' کھانا شروع کرنے لگا' مگر یہ آخری بات۔۔۔ یہ آخری باتیں زمر کا دل ایسے ہی توڑ دیا کرتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سرخی در آئی۔ زور سے پرس کی زپ بند کی اور آگے کو ہوئی۔

"فارس غازی!" اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "ہزار سال بھی انتظار کرو تو وہ دن نہیں آئے گا۔ میں زمر یوسف ہوں اور اپنی نظروں میں میری بہت عزت ہے۔ زمر۔۔۔ تمہارے سامنے۔۔۔ نہیں ٹوٹے گی۔ کبھی بھی نہیں۔" پھر اسی تنی گردن کے ساتھ کھڑی ہوئی اور پرس اٹھالیا۔

"کہاں جارہی ہیں آپ؟" اس نے بند لبوں سے لقمہ چباتے ہوئے تحمل سے پوچھا۔ وہ ویسا ہی مدھم' خیال رکھنے والا فارس غازی بن گیا تھا۔

"گھر۔"

"اتنی رات کو آپ کیب سے نہیں جائیں گی۔ تھوڑی دیر رک جائیں' میں ڈراپ کردیتا ہوں آپ کو۔"

زمر نے بغیر جانے کو مڑی تو وہ کھڑا ہوا اور اس کے سامنے آیا۔

"اچھا آپ کار لے جائیں' میں کیب سے آجاؤں گا۔" چابی بڑھائی۔ زمر نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا' پھر چابی جھپٹی اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اسی سکون سے واپس بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

حنین نے قصر کاردار کی چوکھٹ عبور کی تو جواہرات' مکمل تیار' باہر کے لیے چلتی آرہی تھی۔ حنین مسکرا کر قریب آئی۔

"مسز کاردار! مائی گاڈ' آپ کتنی خوب صورت لگ رہی ہیں۔" سادگی اور معصومیت سے تعریف کی۔ جواہرات مسکرائی' نرمی سے اس کا گال چھوا۔

"مجھے معلوم ہے۔ تم کیسے آئیں؟"

"مجھے خاور سے کام تھا۔ کیا وہ اندر ہیں؟" پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ "پلیز آپ ان سے میری سفارش کردیں کہ وہ میرا کام لازمی کریں۔"

"جواہرات عجلت میں تھی' پھر بھی اس کے ساتھ کنٹرول روم تک آئی اور چوکھٹ سے حکم جاری کیا' "خاور' حنہ کو اسسٹ کرو۔" اور چلی گئی۔

اندر چند اسکرینز لگی تھیں۔ ایک لیپ ٹاپ کے سامنے خاور بیٹھا تھا' کام کرتے ہوئے اس نے سر اٹھایا اور قدرے ناراضی سے حنہ کو دیکھا۔

"ہیلو کرنل خاور!" وہ دوڑ کر آئی اور سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔

"ہیلو حنین! کیا کام ہے؟"

"بہت اہم کام ہے۔" ایک فلیش اس کی طرف بڑھائی۔ "اس میں میرے دو کورین ڈرامے ہیں۔ ان کو encrypt کردو۔"

خاور نے گہری سانس لی۔ "حنین' تم یہ کام خود بھی کرسکتی ہو۔ پاس ورڈ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔"

"مجھے پاس ورڈ چھوڑیں' اسٹینڈرڈ RSA تک کا معلوم ہے' مگر یہ سب میری اس دوست کو بھی معلوم ہے جس کو میں ٹریپ کرنے جارہی ہوں۔ سو مجھے ان فائلز کو ایسے encrypt کرکے دیں خاور کہ وہ اسے نہ کھول سکے۔"

"میرے پاس اس وقت بہت کام ہے حنین۔ کسی اور وقت آنا۔" اکتا کر کہتا وہ واپس ٹائپ کرنے لگا۔

"پلیز کرنل خاور!" منت کرتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔

خاور جواب دیے بنا کام کرتا رہا۔ حنہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ "ارے یہ ڈیجیٹل فریم ہے نا' اچک کر ایک فوٹو

فریم اٹھائی۔ "ان میں ہیری پوٹر کی طرح تصاویر چلتی پھرتی ہیں۔ یہ آپ کے بیٹے کی تصویر ہے؟"

"ہاں۔ اسے واپس رکھ دو۔" اس نے فریم حنہ کے ہاتھ سے لے کر واپس رکھا تو اس نے اچک کر لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھے گلاسز اٹھائے۔ "ان میں کیمرہ لگا ہے نا' واؤ یہ میں ایک دن کے لیے اپنی کزنز کو دکھا سکتی ہوں؟" خاور نے جلدی سے وہ اس سے واپس لی۔

"پلیز حنین کسی چیز کو ہاتھ مت لگاؤ۔" پھر بمشکل ضبط کرتے ہوئے ایک نظر اپنے سامنے پھیلے کام کو دیکھا اور دوسری اس پہ ڈالی جو معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر قدرے خفگی سے فلیش اس سے لی اور ایک دوسرے کمپیوٹر کی طرف آیا۔ حنہ بھی جلدی سے اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔

اب وہ خاموشی سے اس کا کام کرکے دے رہا تھا۔

"پاس ورڈ ٹائپ کرو۔" تھوڑی دیر بعد اس نے کی بورڈ اس کے سامنے کیا۔ اور کسی مہذب انسان کی طرح دوسری طرف دیکھنے لگا۔ حنہ نے ٹائپ کیا اور سیدھی ہوئی۔ چند منٹ مزید ضائع کیے خاور نے' پھر اس کی طرف گھوما۔

"ہو گیا تمہارا کام۔ اب جاؤ۔"

"مگر میں اسے کھولوں گی کیسے؟"

"اف۔" اس نے اکتا کر چند بٹن دبائے اور کی بورڈ اس کے سامنے کیا۔ "پاس ورڈ ٹائپ کرو' کھل جائے گا۔"

"تھینک یو سو مچ۔ کرنل خاور۔" خوشی سے کہتے ہوئے اس نے ٹائپ کیا۔ پھر مسکراہٹ الجھن میں بدلی۔

"یہ کیوں نہیں کھل رہا؟"

"کیوں کہ تم غلط پاس ورڈ لکھ رہی ہوگی۔ تمہیں یقین ہے کہ یہی پاس ورڈ تھا۔" تحمل سے بولا۔

"کیا مطلب یقین ہے؟ میں پاگل تو نہیں ہوں نا۔ اتنا سادہ پاس ورڈ تھا میرا۔ اف یہ کیوں نہیں کھل رہا۔"

وہ پریشانی سے بار بار پاس ورڈ ٹائپ کرنے لگی۔ خاور نے قدرے غصے سے ٹوکا۔ "مت کرو' تم فائلز کرپٹ کردو گی۔" مگر تیسری دفعہ جب پاس ورڈ نہ لگا تو۔۔۔ فائلز کرپٹڈ۔۔۔ لکھا آنے لگا۔

"اف حنین۔" خاور نے بے زاری سے فلیش کھینچی اور اسے تھمائی۔ "اب اسے جاکر آگ میں جھونکو اور مجھے کام کرنے دو۔"

"کیا مطلب؟ میں نے ایک ہفتہ لگا کر ان کو ڈاؤن لوڈ کیا ہے' میری فرینڈ سے شرط لگی ہے' پلیز کرنل خاور! مجھے یہ کھول کردیں۔" وہ بدحواس ہوگئی تھی۔

"حنین مجھے ایک سیمینار کے لیے سیکیورٹی پلان تیار کرنا ہے' میرے پاس بہت کام ہے' تمہاری ٹین ایج حرکتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ جاؤ۔" رکھائی سے کہہ کر وہ واپس اپنی کرسی پہ آیا۔

"پلیز کرنل خاور۔"

"جاؤ حنین!" وہ سنجیدگی سے ٹائپ کررہا تھا۔ چند لمحے وہ خاموش رہی تو خاور نے نگاہ اٹھائی۔

سامنے کھڑی حنین چہرہ جھکائے' رو رہی تھی۔ موٹے موٹے آنسو گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔ خاور نے کراہ کر کنپٹی مسلی۔ "اب کیا ہے؟"

"اگر میری جگہ آپ کا بیٹا ہوتا تو بھی ایسے ہی کرتے؟" اس نے جھکے چہرے کے ساتھ آنسو رگڑے اور فلیش پکڑ کر سست روی سے جانے کو مڑی۔ ساتھ ہی ہچکی لینے کی بھی آواز آئی۔

خاور نے آنکھیں میچ کر خود کو جیسے ڈھیروں صبر دلایا اور پھر اسے آواز دی۔

"میں صرف decrypt کرکے دوں گا' لیکن دوبارہ encrypt نہیں کروں گا۔"

وہ الٹے قدموں بھاگ کر واپس آئی۔ آنسوؤں والے چہرے کے ساتھ مسکرائی۔ "سچ؟"

"کتنی ڈرامہ ہو تم۔" ناگواری سے بولا۔ حنہ نے پلکیں جھپکاتے فلیش اس کو تھمائی۔ پھر اس کی کرسی کے ساتھ جاکھڑی ہوئی۔ وہ شدید کوفت زدہ سا فلیش اڑستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ لمبا کام ہے اور تم اس دوران خاموش رہو گی۔ مجھے زائد باتیں پسند نہیں۔ تمہارے پہلے لفظ پہ میں

کام روک دوں گا۔" تیزی سے ٹائپ کرتی انگلیاں مسلسل چل رہی تھیں۔ اس کی کرسی کے ساتھ کھڑی حنہ ہتھیلی تھوڑی تلے جمائے' دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی۔

"سو آپ نے... ElGamal کے ذریعے "کی" کو..." خاور نے پلٹ کر گھور کر اسے دیکھا' اس نے فوراً" اپنے لبوں پہ انگلی رکھ لی۔ "اچھا سوری' میں چپ!" وہ شدید کوفت زدہ سا کمانڈز دینے لگا۔ حنین لب دانتوں سے دبائے' ایکسائٹڈ سی دیکھ رہی تھی۔ جس کو اتنا ماہر استاد ملے' وہ اس سے نہ سیکھے' یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

☆ ☆ ☆

غرور حسن سراپا نیاز ہو تیرا
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے

اسامہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور ندرت فون پہ بات کر رہی تھی۔ ابا اپنے کمرے میں سونے جا چکے تھے۔

"اچھا ذکیہ خالہ۔ اللہ حافظ۔" ندرت سارہ کی امی سے فون پہ بات ختم کر کے سیم کی طرف مڑیں۔ وہ ناخوش لگ رہی تھیں۔ "فارس اور زمر کو دیکھو۔ ولیمہ کا فنکشن چھوڑ کر باہر ڈنر کرنے چلے گئے۔ اب اس کی کیا تک بنتی ہے؟ اگر وہاں کھانا نہیں کھانا تھا تو گھر آ جاتے' فضول پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ فارس بھی جہاں بیوی کہے چل پڑتا ہے۔"

سیم نے مڑ کر ان کو سنجیدگی سے دیکھا۔ "امی! کچن میں دیکھیں۔ چولہا بند ہے نا؟ کیوں کہ مجھے جلنے کی شدید بو آ رہی ہے۔"

"ہاں' ہاں' بند ہے۔ دودھ کڑھ گیا تھا تو میں نے اتار لیا۔" وہ اپنے ہی خیال میں گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے اٹھ گئیں۔ سیم نے سر جھٹکا اور واپس ٹی وی دیکھنے لگا۔

کافی دیر بعد دروازہ کھلا اور اس نے تھکی تھکی سی زمر کو آتے دیکھا۔ وہ بجھی' بے رونق لگ رہی تھی۔ سیدھی نیچے تہہ خانے میں چلی گئی۔ سیم آہستہ سے اس کے پیچھے گیا۔ وہ سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ اداس اور اکیلی۔

"آپ اکیلی کیوں آئی ہیں؟ ماموں کہاں ہیں؟"

"تمہارے ماموں کو خود نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں۔"

"آپ اپ سیٹ ہیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ زمر نے جواب دیے بنا سر گھٹنوں پہ رکھ لیا۔ سیم نے اس کے ساتھ زینے پہ کچھ رکھا۔ اور پھر اسی طرح واپس چلا گیا۔ زمر نے گردن موڑ کر دیکھا وہ چاکلیٹس کا ڈبہ تھا۔ زمر زخمی سا مسکرائی۔

"ضروری نہیں کہ جو چیز ایک دفعہ اچھی لگے' وہ ہمیشہ اچھی لگتی رہے۔ جیسے وہ اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتا' جتنا آج میں نے اسے جان لیا ہے۔"

"اسے خود بھی نہیں معلوم کہ اسے زرتاشہ سے اپنی سوچ سے زیادہ محبت تھی اور مجھ سے اپنی سوچ سے بہت کم۔"

اندھیرے تہہ خانے کی سیڑھیوں پہ ریپر میں لپٹی چاکلیٹس کی مہک کے اندر پھر سے "ریکا" کی خوشبو بھی بس گئی تھی۔

جنوں میں شوق کی گہرائیوں سے ڈرتا رہا
میں اپنی ذات کی سچائیوں سے ڈرتا رہا

زمر یوسف نے زندگی میں پہلی دفعہ فارس کے بارے میں اتنی بڑی بات بالکل درست کہی تھی' لیکن اگر وہ سن لیتا تو تعجب اور حیرت سے تردید کرتا۔ وہ جلد ہی گھر آ گیا تھا۔ پہلے وقت دیکھا۔ نماز کا خیال آیا پھر "کچھ دیر بعد" سوچ کر ٹال دیا۔ جیل سے آنے کے بعد وہ بہت کم نماز پڑھ پاتا تھا۔ کمرے میں صوفے پہ بیٹھتے ہوئے جوتے اتارے۔ دفعتاً" سیل بجنے کی آواز آئی۔ زمر شاید باتھ روم میں تھی' سیل بیڈ پہ پڑا تھا۔ فارس کسی خیال کے تحت اٹھا اور اس کا موبائل اٹھایا۔ احمر شفیع کا پیغام آیا تھا۔ اس کے ابرو بھنچے۔ سیل اٹھایا اور زمر کا پیٹرن ملا کر اسے کھولا۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے' کل می جب

میرا میسج دیکھیں۔" فارس کے ابرو مزید تن گئے۔ انگوٹھے سے اسکرین اوپر کی۔ پرانے میسجز۔ باہر ملنے کے۔ کسی کام کی طرف اشارہ۔ فیس کی بات۔ احمر کا فیس کے لیے شکریہ کرنا۔ سب مبہم تھا مگر۔۔۔ تنے ابرو اور بھینچے لبوں کے ساتھ اس نے فون واپس اپنی جگہ پہ رکھا اور باہر بالکونی میں آگیا۔

وہاں تاریکی تھی۔ فارس کرسی پہ پاؤں لمبے کر کے نیم دراز ہوا اور آنکھیں بند کرلیں۔ دل و دماغ دو حصوں میں بٹے تھے۔ (وہ اس کو کبھی دھوکا نہیں دے گی' وہ ایک بے وقوف عورت اور بدترین وکیل سہی' مگر وہ پیٹھ پیچھے حملہ کرنے والوں میں سے نہیں ہے' مگر پھر بھی وہ اتنا بے چین کیوں تھا؟ شک بڑھتا کیوں جارہا تھا؟) اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ تاریکی میں اس کی ساری زندگی کسی فلم کی طرح چلنے لگی۔۔۔۔

فارس غازی نے ایک ایسے گھر میں جنم لیا تھا جہاں ایک "بیمار" شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس کی ماں' جو مرض عشق میں مبتلا تھی۔

وہ ایک کاردار تھی۔ علیمہ کاردار۔ بے حد خوب صورت۔ ہاشم جیسے نقش اور نوشیرواں جیسا مزاج۔ نخرہ' غرور' غصہ' سب کسی کاردار جیسا تھا۔ کسی زمانے میں یہ سب اپنے جوبن پہ ہوتا ہوگا' مگر جس عمر میں اس کے ذہن نے شعور کی منزل پہ قدم رکھا' وہ بہت حد تک ڈھے چکی تھی۔ اسے ایک شادی شدہ آدمی سے محبت ہوئی تھی۔ گو کہ وہ اورنگ زیب کاردار کی بہن تھی' امیر تھی' خوب صورت تھی' لیکن پھر بھی محبوب کو خرید نہیں سکی تو خود کو اس کے قدموں میں رول دیا۔ ہر قیمت پہ اسے اپنانا چاہا' اور اپنا بھی لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کو بھی اس کی ماں سے محبت تھی' مگر یہ متوازن محبت تھی' اس میں "مرض" کا عنصر نہ تھا۔

علیمہ کے لیے طہیر نے سب کچھ کیا' اس کو اپنا نام دیا' اولاد دی' مگر ایک الگ گھر نہ لے کر دے سکا۔ علیمہ کو الگ گھر کی تمنا بھی نہیں تھی۔ وہ جہاں تبھی خوش تھی تب تک جب تک وہ ان ماں بیٹے سے ملنے آتا رہے اور وہ اکثر آتا تھا۔ فارس کے لیے وہ آئیڈیل مرد تھا۔ مضبوط اور بہادر۔ ہر بچے کے لیے اس کا باپ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی ایسا جس کو کوئی نہیں ہرا سکتا' جو ہر مسئلے کو حل کر سکتا ہے' ہر پریشانی میں ان کی ڈھال بن سکتا ہے۔

پھر ایک دن آئیڈیل کا یہ مجسمہ بھی زمین بوس ہوگیا۔

اس روز کس بات کی دعوت کی گئی تھی؟ بالکونی میں بیٹھے فارس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ہاں' ابا کے پاس ہونے کی خوشی میں۔ شاید کوئی پوزیشن لی تھی اس نے۔ اس کا باپ' اس کی ماں اور چھ سالہ فارس' وہ بہت مسرت اور تفخر سے اس دعوت کا حصہ بنے تھے۔ سب کچھ بہت اچھا تھا۔ تحفے' رنگ' خوشبو۔ روشنیاں۔ دعوت اورنگ زیب نے دی تھی۔ کسی زمانے میں ان کو اپنی بہن اور بھانجے سے بہت لگاؤ ہوتا تھا۔

لیکن پھر۔۔۔ جواہرات کاردار نے اپنے کسی ملازم کے ہاتھوں طہیر غازی کی پہلی بیوی کے گھر پیغام بھجوا دیا۔ وہ اپنے دو بچوں' ایک بڑی لڑکی اور ایک فارس سے کچھ بڑے لڑکے کے ساتھ اس دعوت پہ آدھمکی۔ ندرت اور وارث کی ماں ولایت بیگم۔ وہ سخت گیر' مذہبی مائل اور اوسط تعلیم یافتہ عورت تھی۔ اگر وہ کسی اونچی ڈگری کی حامل ہوتی' تب بھی شاید وہ یہی کرتی جو اس نے کیا۔ علیمہ کے سوشل سرکل' اورنگ زیب کے رشتے داروں اور دوستوں کے سامنے اس نے چلا چلا کر سب کو بتایا کہ وہ اس دھوکے باز انسان کی پہلی بیوی ہے۔ یہ تو دو بچوں کا باپ ہے' اور اب یہاں کھڑا ہے ایک خوب صورت اور جوان عورت کے ساتھ؟

جواہرات اپنے بیٹے کے ساتھ سکون سے بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی۔ علیمہ حق دق سی کھڑی رہی' اورنگ زیب اور طہیر اسے سمجھاتے رہے کہ علیمہ' اورنگ زیب سب جانتے ہیں کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا' اس نے نکاح کیا ہے' گناہ نہیں کیا مگر سارا مسئلہ یہی تھا کہ ولایت تو نہیں جانتی تھی۔ اسے تو آج علم ہوا تھا۔ اس نے اپنی زبان اور اپنے آنسوؤں

سے جو کچھ کہا' وہ کونے میں کھڑے فارس کے ذہن کو تا عمر اپنے باپ کے لیے داغدار کر گیا۔

یہ نہیں تھا کہ اس کی باپ کے لیے محبت میں کمی آئی یا وہ ان سے نفرت کرنے لگا۔ بس اتنا تھا کہ اس نے اپنے باپ کا مان اور اعتماد کھو دیا۔ اگر ولایت نہیں جانتی تھی' تو وہ بھی نہیں جانتا تھا' مگر اس وقت اس کا خیال کسی کو نہیں تھا۔ سب تقریب کی شرمندگی اور اہانت کو تحلیل کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ وہ وہیں اس کونے میں کھڑا رہا۔ ساکت۔ خوف زدہ۔ بے یقین۔ فکر مند۔ اس کو ایک دم اپنا آپ کمزور اور بے سہارا لگا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا اس کا باپ' ولایت بیگم کو صفائی پیش کر رہا تھا' وہ پریشان تھا' اور بے چین بھی۔ وہ سب کچھ لگ رہا تھا سوائے ایک بہادر مرد کے۔ اور یہ سب کرتے ہوئے اس نے علیمہ کا کردار کو قطعاً" نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ خوب صورت لڑکی بے بس اور بے سہارا کھڑی تھی۔ طہیر غازی ان دونوں کا سہارا نہیں بن سکا تھا۔ گھر کا سربراہ ایسا نہیں ہوتا۔ گھر کے سربراہ کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خاموشی سے اپنی ماں کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ علیمہ کی انگوٹھی کا نگینہ اسے چبھا تھا۔ اس چبھن میں بھی احساس تحفظ تھا۔

ان دونوں میں کون کس کو تحفظ دے رہا تھا؟ دونوں کو نہیں معلوم تھا مگر اس دن سے فارس کو لگنے لگا تھا کہ ہر رشتہ یا تو ختم ہو جاتا ہے یا دھوکا دے جاتا ہے۔ اس نے باپ سے محبت کرنا کم نہیں کی' لیکن یہ احساس ہو گیا کہ وہ ایک ایسا مرد ہے جو کٹھن وقت میں ان ماں بیٹے کے سر کی چھت نہیں بن سکتا۔ طہیر غازی اپنی پہلی بیوی اور خاندان کے ہاتھوں آہستہ آہستہ شکست تسلیم کرتے گئے۔ مہینوں بعد ادھر چکر لگاتے۔ یا بالکل نہ آتے۔ فارس کو نہیں معلوم کہ یہ فیصلہ کس نے کیا تھا' لیکن ایک دن وہ ان دونوں کو اپنے خاندانی گھر لے ہی آئے۔

یہاں سے زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا تھا۔ بچپن فلم جیسے بلیک اینڈ وائٹ اور mute ہو گئی تھی۔ ولایت بیگم کے گھر میں وہ دو قیدی عجیب انداز میں لائے گئے تھے۔ نہ ان کے کوئی حقوق تھے' نہ مان تھا۔ ان سے بات کرنا گناہ' ان کی پروا کرنا جرم تھا۔ گھر میں واضح لکیر کھینچ گئی تھی۔ ایک طرف ایک کمرے میں وہ نازوں میں پلی' مرض عشق میں مبتلا' ہر حال میں طہیر کے ساتھ رہنے کی خواہاں لڑکی' اپنے کم عمر بیٹے کے ساتھ تھی۔ اور دوسری طرف طہیر کی خاندانی بیوی اور اس کے دو بچے جن کو پورے خاندان کی سپورٹ حاصل تھی۔

اور اس کا کمزور باپ دریا کے دو کناروں کو ملانے کی کوشش میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو اس سے نکالنا چاہتا تھا' مگر ایک دن اسے احساس ہوا کہ وہ شخص کبھی اس پانی سے نہیں نکل پائے گا۔ اس دن فارس گھر چھوڑ کر واپس بھاگ آیا تھا۔۔۔

زمر کمرے میں آچکی تھی۔ آہٹ نے فارس کا ارتکاز توڑ دیا۔ وہ پرانی یادوں کو جھٹک کر موبائل نکال کر بے مقصد بٹن دبانے لگا۔

☆ ☆ ☆

یہ الگ بات تھی کہ اس سہ پہر ہارون عبید کی رہائش گاہ کا سبزہ اداس تھا۔ آب دار کی کھڑکی سے دکھائی دیتے لان میں مور خاموش بیٹھے تھے۔ بطخیں اداسی سے کونے میں دبکی تھیں۔ بلی جانے کہاں گم تھی۔ اور وہ خود۔ کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھی تھی۔ "مسیو سعدی یوسف" کا صفحہ کھول رکھا تھا اور آنکھوں میں شدید اداسی لیے اس لڑکے کی مسکراتی تصویر دیکھ رہی تھی۔ ذہن کے نہاں خانوں میں ایک منظر سا ابھر رہا تھا۔ آبی نے آنکھیں بند کر لیں اور اس یاد کے جھرنے کو بہنے دیا' اتنا کہ اس کے پانی میں وہ خود بہتی چلی گئی۔

وہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھی تھی۔ وہ سردی وہ سہ پہر تھی۔ سرما کی اداسی ہر جگہ گھلی ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے' جرنل پہ چند اہم نکات لکھے جا رہی تھی۔ جب اس نے وہ آواز سنی۔ کسی کو مارنے کی آواز۔

چونک کر سر اٹھایا تو کیفے کے ایک کونے میں' جہاں دیوار سی بنی تھی' تپلی گلی کی طرح' وہاں ایک لڑکا دوسرے کو پیٹ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ حیران پریشان سی اٹھتی' مار کھانے والے لڑکے کے چہرے پہ نظر پڑی۔ وہ نوشیرواں کاردار تھا۔ آبی نے ناک سکیڑی اور واپس بیٹھ گئی۔ (گڈ فار ہم!)

اس کے ساتھ والی میز پہ ایک قدرے درمیانی عمر کی دیسی عورت بیٹھی تھی۔ سر بالکل گرائے' چپ' خاموش۔ کن اکھیوں سے آبی کو نظر آیا' ایک گھنگھریالے بالوں والا لڑکا دو کافی کے مگ لیے ادھر آکر بیٹھا ہے۔ اس کی آبی کی طرف پشت تھی' وہ بھی توجہ دیے بنا کام کرتی رہی۔ البتہ ان کی باتیں کان میں پڑ رہی تھیں۔ وہ لڑکا شاید اس عورت کا اسٹوڈنٹ تھا اور عورت کو تو وہ ٹیچر کی حیثیت سے پہچانتی بھی تھی۔

"یہ تمہارا دوست ہے نا جو مار کھا رہا ہے۔" کیفے میں اس وقت لوگ بہت کم تھے' پھر بھی وہ اٹھ کر اس طرف دوڑے تھے' مگر وہ لڑکا کچھ بھی نہ سمجھے بغیر شیرو کو مارے جا رہا تھا۔ "تم بھی اس کی مدد کے لیے جاؤ۔"

"اس کی مدد کے لیے بہت سے لوگ ہیں' ابھی پولیس بلالیں گے' مگر آپ کی مدد کے لیے اس وقت صرف میں ہی ہوں۔"

آبی خاموشی سے گردن ترچھی کیے لکھتی رہی۔

"تم میری کیا مدد کرسکو گے؟ تم خود ایک بچے ہو۔ میرا تیسرا مس کیرج ہوا ہے' آج تو ڈاکٹر نے بھی ناامیدی کی باتیں کی ہیں۔ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔" آبی نے یونہی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ لڑکے کی پشت تھی' مگر عورت کا نیم رخ واضح تھا اور وہ سر جھکائے' آنسو پونچھ رہی تھی۔

"مسز مرجان! تھوڑے تحمل سے میری بات سنیں۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ آب وار پھر سے کام کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا اب وہ اسے تسلی دے گا۔ علاج کے طریقے یا پھر ایڈاپشن یا اس حقیقت کو قبول کرکے مثبت سوچ کے ساتھ رہنے کی نصیحت۔

"آپ کا ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے' آپ infertile ہیں۔ آپ کو یہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے۔"

لکھتے ہوئے آبی رکی۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ اسے برا لگا تھا۔ "ایسے کہتے ہیں کسی کو بھلا؟" مڑ کر شاکی نظروں سے دیکھا۔

دور کونے میں لوگ شیرو کو اٹھا رہے تھے' وہ لڑکا بھاگ چکا تھا۔

"آپ بانجھ کہلانے پہ اتنی اپ سیٹ کیوں ہیں؟"

"سعدی!" مسز مرجان نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ قرآن پڑھتی ہیں' مسز مرجان؟"

(اچھا اب وہ ابراہیم علیہ السلام یا ذکریا علیہ السلام والا واقعہ دہرائے گا۔) آبی نے دوبارہ سے کام کی طرف متوجہ ہوتے سوچا۔

"کبھی کبھی۔"

"یہی کبھی کبھی اس دنیا کے کروڑوں لوگوں کا مسئلہ ہے۔ خیر۔ آپ نے اس میں ذکریا علیہ السلام والا واقعہ تو پڑھا ہوگا' انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ان کو اکیلا نہ چھوڑیں۔ تو۔"

"تو اللہ نے انہیں یحییٰ عطا کیے' مگر وہ پیغمبر تھے سعدی۔"

سعدی نے گہری سانس لی۔ "میم! خوب صورت لڑکوں کی بات کاٹا نہیں کرتے۔ اس لیے تحمل سے مجھے سنیں۔ جب ذکریا علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ نے ان کو ایک دم سے اولاد نہیں دے دی' بلکہ پہلے بشارت دی' کہ ان کے ہاں بیٹا ہوگا' مگر جب یہ بشارت دی تو ذکریا علیہ السلام حیرت سے پوچھنے لگے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا' ہم نے اس سے پہلے آپ کو بھی تو تخلیق کیا تھا اور آپ بھی تو کچھ نہیں تھے۔ آپ مجھے بتائیں مسز مرجان' کیا آپ نے غور کیا اس پہ؟"

"دیکھو سعدی! میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ ذکریا علیہ السلام کو یہ بتا رہے تھے

کہ آپ کچھ بھی نہ تھے' یعنی ہر انسان پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے اور یہ اتنا امیزنگ ہے کہ وہ چھ فٹ کا انسان بن جاتا ہے' ہم سب کی پیدائش امیزنگ ہے۔"

"لیکن میرا کیس مختلف ہے۔"

"نہیں۔۔۔ یہیں پہ ہم دونوں مختلف ہیں' کیوں کہ قرآن پڑھنے اور قرآن پہ غور و فکر کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اب اسی آیت کو دیکھ لیں۔ اللہ نے ذکریا کو مخاطب کیا کہ "آپ بھی تو کچھ نہ تھے" آپ نے اس سے مراد ہر انسان کی پیدائش لی' لیکن میرے خیال میں اس کا ایک اور مطلب بھی ہے۔"

آبی بے اختیار گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ مسز مرجان نے بھی قدرے متذبذب ہو کر اس لڑکے کو دیکھا۔

"میرے خیال میں مسز مرجان اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم "ہر انسان" کی پیدائش نہیں صرف "ذکریا کی پیدائش" پہ غور کریں۔"

"مطلب؟"

"ذکریا علیہ السلام بنی اسرائیل تھے اور بنی اسرائیل' اسرائیل یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہوتے ہیں۔ آپ بتائیں یعقوب کس کے بیٹے تھے؟"

"اسحاق علیہ السلام کے۔۔۔"

"اور اسحاق علیہ السلام کس کے بیٹے تھے؟"

"ابراہیم علیہ السلام کے!"

"ابراہیم اور سارہ کے' علیہما السلام!" اس نے اضافہ کیا۔ پشت ہونے کے باوجود آبی کو لگا تھا وہ مسکرایا ہے۔

"آپ کو پتا ہے بنی اسرائیل اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوموں میں سے ایک ہے۔ ہم پٹھان ہوں یا گورے لوگ یا فلسطینی یا ملک اسرائیل کے یہودی' ہم بنی اسرائیل ہیں۔ اسی لیے پٹھانوں اور گوروں جن کو ہم انگریز کہتے ہیں' ان کی شکلیں ملتی ہیں' کیونکہ ہم سب پیچھے سے اسرائیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ذکریا علیہ السلام بھی اسرائیلی تھے۔ میں بھی اسرائیلی ہوں اور ہم سب کی ماں تھیں حضرت سارہ۔ آپ کو معلوم ہے سارہ کون تھیں؟"

"دنیا کی سب سے خوب صورت خاتون تھیں وہ۔" مسز مرجان کو یاد آیا۔

"بالکل۔۔۔ وہ دنیا کی سب سے خوب صورت خاتون تھیں اور وہ بانجھ تھیں۔"

ایک لمحے کے لیے آبدار کا سانس رک گیا۔ اردگرد ہر شے تھم گئی۔ مسز مرجان بھی بالکل ٹھہر کر سعدی کو دیکھ رہی تھیں۔

"تو اللہ تعالیٰ نے ذکریا علیہ السلام سے جو فرمایا شاید اس کا مطلب یہ بھی تھا مسز مرجان کہ آپ اپنی پیدائش پہ غور کریں ذکریا آپ بھی تو ایک بانجھ عورت کی اولاد ہیں۔ آج دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اسی بانجھ عورت کی اولاد ہے۔ اگر سارہ کے اولاد ہو سکتی ہے تو دنیا کے ہر مرد اور عورت کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے۔" مسز مرجان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"مگر وہ۔۔۔ وہ پیغمبر کی زوج تھیں۔ اس لیے ان کی اولاد ہوئی۔"

"نہیں۔۔۔ ان کی اولاد اس لیے ہوئی کیونکہ انہوں نے دعا کی تھی۔ جب ابراہیم السلام نے دعا کی' جب ذکریا علیہ السلام نے دعا کی' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا' ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ اللہ تعالیٰ دعا رد نہیں کرتا لیکن اس میں یقین ہونا چاہیے۔ آپ کسی قبر' کسی مزار' کسی تعویذ کو وسیلہ بنائیں گی تو اللہ آپ کو ان ہی کے حوالے کردے گا۔ آپ ایسا مت کیجیے گا۔ اگر آپ تہجد نہیں پڑھتیں کسی دعا کے لیے تو اس کا مطلب ہے آپ اس کو پانے کے لیے خود بھی سیریس نہیں ہیں۔ شدید پریشانی کے حالات میں دعائیں بھی شدید مانگنی ہوتی ہیں۔ یہ پانچ وقت کی نماز کے بعد روٹین کی طرح دعا مانگنا کافی نہیں ہوتا۔ جتنی بڑی آزمائش ہے' اتنا زیادہ اپنی دعا کو بڑھائیں۔ یہ وہی اللہ ہے جو حضرت سارہ کا اللہ تھا۔ کیا آپ کی دعا بھی ویسی ہے جیسی سارہ کے شوہر کی تھی؟"

مسز مرجان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ آبدار بالکل ٹھہر کر سن رہی تھی۔

"مگر سعدی۔۔۔ یہ میری آزمائش ہے یا گناہوں کی سزا؟ یہ فرق کیسے معلوم کروں؟"

"معلوم کر کے کیا کریں گی؟ سزا ہوئی تو معافی مانگیں گی' آزمائش ہوئی تو دعا کریں گی کہ اللہ اس میں کامیاب کرے؟ مسز مرجان' مجھ سے پوچھیں تو یہ معلوم کرنا لایعنی ہے۔ اس بحث کو چھوڑ دیں اور یہ دونوں کام کرتی رہیں۔ آپ کو پتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ آزمائش کیوں ڈالتا ہے؟"

بھیگے چہرے کے ساتھ مسز مرجان نے نفی میں سر ہلایا۔

"بعض دفعہ کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کوئی اونچا درجہ دینا ہے مگر اس کے اعمال اتنے نہیں ہوتے کہ وہ اس درجے تک پہنچ جائے۔ یعنی وہ اچھا آدمی ہوتا ہے مگر بہت زیادہ نیکیاں نہیں کر پا رہا ہوتا اور اللہ تعالیٰ ناانصافی تو نہیں کرسکتا نا' سو اس شخص کو اس درجے تک پہنچانے کے لیے۔۔۔ سمجھیں پہلی سیڑھی پہ کھڑے شخص کو دسویں سیڑھی تک پہنچانے کے لیے اللہ اس پہ پریشانیاں ڈالتا ہے' تاکہ اس کے گناہ جھڑیں۔ ظاہر ہے گناہ کم ہوں گے تو وہ اوپر اٹھتا جائے گا۔ جس دن وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی آزمائش کھول دی جاتی ہے۔ یہ میری خود سے گھڑی بات نہیں ہے' یہ صحیح حدیث کا مفہوم ہے۔"

"مطلب کہ۔۔۔ یہ سب ہمیں کسی مقام تک پہنچانے کے لیے ہوتا ہے؟"

"جی۔۔۔! اب یہ آپ پہ ہے کہ آپ اس مقام تک کتنی جلدی پہنچتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کریں تو جلدی زینے عبور کریں گی' حدیث میں آتا ہے کہ انسان کو کوئی چیز ملنے والی ہوتی ہے کہ اس کے گناہ آڑے آجاتے ہیں۔ اس لیے گناہوں سے بچیں اور زیادہ سے زیادہ اچھے اعمال کریں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کشادگی کا انتظار بہترین عبادت ہے۔ اس لیے اپنی کشادگی کا انتظار کیجیے۔ بے اولادی' اولاد کی معذوری یا بیماری یا اولاد کا ہو کر مر جانا' یہ سب کوئی Cures نہیں ہے۔ یہ تو انبیا کی آزمائش تھی۔ بڑے لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ روز قیامت آپ کو کشادگی کے انتظار میں گزارے یہ ماہ و سال' بہت قیمتی لگیں کیونکہ یہ وقت' آپ کو وہ دے جائے گا جو اور کوئی نہیں دے سکتا۔ میں پھر کہتا ہوں یہ Cures نہیں ہے کیونکہ اللہ ہمیشہ ان لوگوں کی سائیڈ پہ ہوگا جن کو وہ آزمانے کے لیے اتنے بڑے بڑے دکھ دیتا ہے۔"

آبدار عبید کو ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا' پھر بھی اس کو لگا' اس کی آنکھ سے آنسو گرا تھا۔ کوئی اتنا نرم' اتنا پیارا کیسے بول سکتا ہے؟ اس نے ایک دفعہ پھر گھوم کر اس لڑکے کو دیکھنا چاہا۔ اس کی پشت تھی مگر سامنے گلاس ڈور فریج میں اس کا چہرہ منعکس ہو رہا تھا۔ چھوٹے گھنگھریالے بال' خوب صورت چہرہ' صاف رنگت بھوری آنکھیں۔

"سعدی۔۔۔ تم نے میری امید پھر سے زندہ کر دی ہے۔ میں اس احسان کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گی۔" مسز مرجان آنسو رگڑتے ہوئے اسے ممنونیت سے دیکھتی کہہ رہی تھی۔ "کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"

"بالکل۔۔۔" وہ ذرا جوش سے آگے کو ہوا۔ "اگر کلاس میں کبھی کوئی ایسا مقابلہ ہو جس میں سب سے ہینڈسم لڑکے کو منتخب کیے جانا ہو تو وعدہ کریں آپ مجھے ووٹ دیں گی!" اور وہ روتے روتے ہنس دی تھیں۔

اور اب۔۔۔ اتنے سال بعد آبدار عبید اداسی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ میز پہ اس کا سفری بیگ تیار رکھا تھا۔ وہ قیدی تھا یا صرف مہمان' یہ فیصلہ اسے اس سفر کے بعد ہی کرنا تھا۔ لیکن اس فیصلے کے بعد وہ کیا کرے گی؟ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ قسمت بھی کیسے عجیب انداز میں اسے اس سے ملانے لے جا رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ اپنے زعم میں تھا' بے خبر رہا مجھ سے
اسے گماں بھی نہیں' میں نہیں رہا اس کا

اس صبح مطلع صاف تھا۔ سورج بھی مکمل روشن تھا۔ بڑے ابا کے آبائی قصبے میں ان کے چچیرے بھائی کی وفات کی اطلاع فجر کے قریب آئی تھی۔ ندرت فوراً" چلنے کی تیاری پکڑنے لگیں۔ ابا بہت آزردہ تھے مگر ان کا جانا بھی ضروری تھا۔ سوناشتے کے بعد ندرت' ابا اور صداقت سفر پہ نکل گئے اور دو تین دن کے لیے ریسٹورنٹ بند کرنے کا کہہ دیا۔

وہ گئے تو گھر میں خوامخواہ کا سناٹا چھا گیا۔ سیم اسکول جانے سے انکار کر کے سونے چلا گیا۔ فارس اور زمر کی اس رات سے بات چیت بند تھی۔ (گو کہ فارس کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی' سو وہ نارمل تھا مگر زمر کا دل بری طرح ٹوٹا تھا کہ وہ اس کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔)

صبح باسی ہو کر ایک روشن دوپہر میں ڈھلی تو ایک سرکاری دفاتر کی عمارت کے اندر ایک آفس میں فارس غازی بیٹھا تھا اور مسلسل کان کی لو مسلتے ہوئے سامنے براجمان آفیسر سے بات کر رہا تھا۔

"آپ نے اس کار کی تفصیلات چیک کیں؟"

"مجھے افسوس ہے' یہ حساس معلومات ہیں اور میں آپ کو نہیں دے سکتا۔" وہ صاحب نہایت افسوس سے کہہ رہے تھے۔ "آپ کو اس کے لیے کورٹ آرڈر لانا ہو گا۔" "فارس نو پرابلم" کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ تب ہی ملازم نے اندر جھانکا۔ "سر آپ کو وارثی صاحب بلا رہے ہیں۔"

آفیسر نے پہلے فارس کو دیکھا' پھر ملازم کو۔ "کیوں؟"

"سر وہ بہت غصے میں ہیں' ان کے کمرے میں کسی نے بارودی مواد کا بیگ رکھ دیا ہے۔ ان سے پہلے صرف آپ گئے تھے ادھر' وہ آپ کو فوری طلب کر رہے ہیں۔"

وہ صاحب تیزی سے اٹھے' فارس کو باہر بیٹھنے کو کہا تو وہ فوراً" اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے ساتھ ہی باہر نکلا مگر وہ پریشانی سے آگے بڑھتے گئے اور دوسرے لوگ بھی اسی طرف جاتے دکھائی دیے تو وہ الٹے قدموں واپس اندر آیا' دروازہ بند کیا اور تیزی سے ان کے کمپیوٹر کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ بیٹھنے کے بجائے جھک کر کھڑا وہ کی بورڈ پہ بٹن دباتا رہا۔ سسٹم آن تھا۔ چند لمحے لگے اسے مطلوبہ معلومات تک پہنچنے میں۔ (کورٹ آرڈر کی ایسی کی تیسی۔) وہ صفحے پرنٹ کیے' انہیں تہ کر کے جیب میں اڑسا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

دوپہر شام میں ڈھلی اور شام ایک سوگوار رات میں تبدیل ہو گئی۔ انیکسی کے باہر سبزہ زار تاریک تھا مگر اندر بتیاں جلی تھیں۔ حنین آج گل خان کے اسٹال سے بہت سے تازہ پھول لے آئی تھی۔ (اور اس نے زمر کی وجہ سے قیمت صرف دگنی بتائی تھی' چار گنا نہیں۔) در اب ان کو لاؤنج کی گول میز پہ رکھ رہی تھی۔ اسامہ اور حنین نے مل کر چائنیز بنایا تھا۔ (اور سارا کچن بے ترتیب کر کے رکھ دیا تھا۔) اب بس گرما گرم کھانا ڈش میں نکالنا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے آواز دی۔

"ماموں۔۔۔ زمر۔۔۔ نیچے آجائیں۔ کھانا لگ گیا ہے۔"

اوپر کمرے میں فارس صوفے پہ بیٹھا وہی کاغذات دیکھ رہا تھا۔

"الیاس فاطمی کے بیٹے کی کار کی کسٹم ڈیوٹی وارث کے قتل سے ایک روز پہلے ادا کی گئی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن کچھ بھی ایسا نہیں مل سکا جو ڈیوٹی ادا کرنے والے کی طرف اشارہ کرے۔ وہ شخص جس نے پیسے ادا کیے ہیں' اسی نے وارث کو قتل کروایا ہو گا۔"

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی زمر بال برش کر رہی تھی' اکتا کر بولی۔ "تمہارا مطلب ہے تمہارے ذریعے اس نے وارث کو قتل کروایا ہو گا؟"

فارس نے نظر اٹھا کر برہمی سے اسے دیکھا۔ "جی بالکل' بس مجھے وہ شخص یاد نہیں آ رہا جس کے کہنے پہ میں نے یہ کیا تھا۔" اور کاغذ رکھ کر باہر نکل گیا۔

اس نے تھکے تھکے انداز میں کنپٹی مسلی۔ کچھ روز

سے خرابیٔ طبیعت میں اضافہ ہو گیا تھا مگر کیا فرق پڑتا تھا۔ سر جھٹکتے وہ باہر نکل آئی۔

اسامہ برتن لگا رہا تھا اور حنین 'چاول ڈش میں نکال رہی تھی۔ فارس میز کے گرد بیٹھا تھا۔ زمر زینے اتر رہی تھی جب دروازے کی گھنٹی بجی۔

اس گھنٹی کی آواز صور جیسی تھی۔ عجیب وحشت ناک سی۔ وہ قریب تھی 'سو لاؤنج سے گزر کر راہ داری میں آئی۔ فارس بھی پیچھے آیا۔

راہ داری اندھیری تھی۔ دروازے کے ساتھ کھڑکی پہ پردہ پڑا تھا مگر اس سے روشنی چھلک رہی تھی۔ تیز لائٹس۔ زمر نے قدرے اچنبھے سے پردہ سرکایا۔

یوں لگتا تھا رات میں دن کا سماں ہو۔ گاڑیاں' روشنی' پولیس موبائلز' اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ مڑ کر دیکھا۔ فارس بھی اتنے ہی اچنبھے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر زمر نے بند دروازے سے پکارا۔ "کون؟"

"مسز زمر' فارس غازی گھر پہ ہے؟" اے ایس پی سرمد شاہ کی آواز سنائی دی۔ پیچھے پولیس کی گاڑیوں کا سائرن۔ فارس چونک کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

"آپ کو کیا کام ہے؟" اس نے دھڑکتے دل سے پکارا۔

"ہمارے پاس فارس غازی کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ اس سے کہیے کہ پرامن طریقے سے خود کو قانون کے حوالے کر دے۔"

کسی نے زمر کے دل پہ پیر رکھ دیا تھا۔ اس نے بے اختیار لبوں پہ ہاتھ رکھا' پھر آگے ہوئی۔ "لیٹر ہول سے مجھے وارنٹ پاس کریں۔ میں وارنٹ دیکھے بغیر دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

اگلے ہی لمحے کاغذ دروازے کی درز سے اندر داخل کیا گیا۔ زمر نے کپکپاتے ہاتھوں سے اسے پکڑ کر کھولا۔ چند الفاظ پڑھے۔ 28 اگست کی رات' قمر الدین چوہدری کا قتل' فارس غازی نامزد ملزم۔ تب ہی فارس نے پیچھے سے کاغذ اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ زمر نہیں مڑی' وہ بے بسی بھرے غصے سے پکار کر بولی تھی۔

"اے ایس پی صاحب' یہ پہلی پیشی پہ معطل ہو جانے والا وارنٹ ہے۔ آپ Circumastancial evidence کی بنا پہ کسی کو گرفتار نہیں۔۔۔" الفاظ اس کے لبوں میں رہ گئے جب فارس نے کہنی سے پکڑ کر اسے پیچھے کھینچا اور دوسری دیوار سے لگایا۔ پھر کاغذ اس کے سامنے لہرا کر سرخ غصیلی آنکھوں سے بولا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ڈونٹ وری یہ صرف۔۔۔"

"زمر بی بی' یہ کیا ہے؟" دستخط کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ زمر بالکل ٹھہر گئی۔ دستخط کو نہیں دیکھا۔ وہ صرف فارس کی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ زمر' جسٹس مکرم کے سائن ہیں' رائٹ؟ آپ کے ٹیچر کے۔ انہوں نے میرا وارنٹ جاری کیا اور آپ کو خبر بھی نہ ہوئی؟"

اس نے اچنبھے سے فارس کو دیکھا۔ "فارس تم۔۔۔"

"میں نے آپ پہ اعتبار کیا' کیونکہ ہم ایک ٹیم تھے مگر آپ نے اتنی جلدی کی مجھے دھوکا دینے میں؟" وہ صدمے' اور غصے سے بولا تھا' زمر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔

"فارس! یہ میں نے نہیں کیا۔"

"مجھ سے انتقام لینے کے لیے شادی کی تھی نا' تھوڑا صبر کرتیں' میں اپنے خاندان کو تو واپس جوڑ لیتا۔ پھر بھیج دیتیں مجھے جیل۔" کاغذ غصے سے نیچے مارا تھا۔

"فارس! یہ میں نے نہیں کیا۔" وہ بالکل سن تھی۔

"صرف آپ جانتی تھیں 28 اگست کے بارے میں۔ جسٹس مکرم آپ کے ٹیچر ہیں۔ احمر کو آپ نے ہائر کیا میرے خلاف ثبوت ڈھونڈنے کے لیے' کیوں؟ کیا نہیں کیا تھا؟" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔ زمر کے سارے الفاظ ہی ختم ہو گئے۔ "فارس! وہ اور معاملہ تھا میں۔۔۔"

"یہ جو اتنے دن سے آپ بار بار ڈاکٹر کی طرف جانے کا کہہ کر گھر سے نکلتی تھیں' یہ۔۔۔ یہ سب مجھے پھنسانے کے لیے کر رہی تھیں؟" وہ شدید ہرٹ ہوا

تھا۔

"فارس! میں... میں کیوں تمہیں دوبارہ جیل بھیجنا چاہوں گی؟"

"پہلی دفعہ بھی تو آپ نے ہی بھیجا تھا۔" دکھی' ملامت سے بھری نظروں سے اسے دیکھتے' اس نے زمر کی کہنی چھوڑی اور دروازے کی طرف آیا جو مسلسل بج رہا تھا۔ زمر سن سی کھڑی تھی۔ بالکل پتھر ہوئی۔

فارس نے دروازہ کھولا۔ اے ایس پی اور اس کی نفری باہر چوکس کھڑی تھی۔ بہت سی گنز کا رخ اس کی طرف تھا۔

اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہاشم نے مشروب کا گھونٹ بھرتے فخر سے جواہرات کو دیکھا۔

"میں نے کہا تھا نا' سب سنبھال لوں گا۔" جواہرات اتنی خوش نہیں تھی۔

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ برا پھنسا ہے۔"

"ممی..." وہ مسکرایا۔ "وہ قتل اٹھائیس اگست کی رات کو ہوا ہے۔ فارس غازی کے پاس اس رات کے لیے alibi نہیں ہے۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

"اس رات ڈاکٹر ایمن کا اسپتال جلایا گیا تھا۔ اب عدالت اس سے پوچھے گی کہ اس رات وہ کہاں تھا۔ اگر نہیں بتائے گا تو قاتل سمجھا جائے گا اور اگر سچ بتائے گا تو arsonist (آگ لگانے والا) ثابت ہوگا۔ فارس غازی برا پھنسا ہے۔ پچھلے پانچ مہینے سے زندگی عذاب کی ہوئی تھی اس نے۔ بالآخر میں نے اس سے سارے انتقام لے لیے ہیں۔ کیونکہ انتقام..." اپنا گلاس جواہرات کے گلاس سے ٹکرایا۔ "میرا جنون ہے!"

نیچے انیکسی کا دروازہ کھول کر فارس سامنے آیا اور دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ روشنی' بندوقیں' سب اس پہ تنی تھیں۔ اے ایس پی سرمد شاہ نے ایک اہلکار سے ہتھکڑی لی اور فارس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے کلائیوں کو جکڑا۔

"فارس طہیر غازی' تمہیں قمرالدین چوہدری کے قتل کے الزام میں حراست میں لیا جاتا ہے۔"

فارس نے سختی سے آنکھیں میچ کر بہت کچھ اندر اتارا۔ ایک آخری ملامت زدہ نظر چوکھٹ میں پتھر ہوئی زمر پہ ڈالی اور پھر ایک سلگتی نگاہ اس اے ایس پی پہ ڈالی جو اس کے ہاتھ پیچھے باندھے اسے ایک وین کی طرف لے جا رہے تھے۔

زمر ان ہی بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ بے قصور ہوتے ہوئے ناکردہ جرم کا الزام لگے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔

(باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ)

عمارہ خان

صاف گو

"باجی آپ نے یہ کس کلر کا ڈائی کر لیا۔ کچھ عجیب سی ہی لگ رہی ہیں۔"

"اف امی کبھی تو ڈل کلر کے کپڑوں کا پیچھا چھوڑیں۔"

"بھیا آپ کو کوئی کام نہیں سوائے بھابھی کے آگے پیچھے پھرنے کے۔"

"بھابھی کا سر درد بھی بس آپ کو دیکھ کر صحیح ہوتا ہے ورنہ صبح سے جو سر پہ دوپٹا بندھتا ہے وہ آپ کے آنے پہ ہی کھلتا ہے۔"

یہ جملے اکثر و بیشتر ہمارے گھر میں گونجتے رہتے تھے۔ کیوں کہ ہمارے گھر کے ایک فرد کو یہ فخر حاصل تھا وہ صاف گو ہے۔

ہر خاندان میں ایک نمونہ ضرور ایسا ہوتا ہے جس کو یہ بیماری ہوتی ہے کہ وہ خود کو سچائی کا علمبردار سمجھتا ہے۔ اسٹریٹ فارورڈ یا آوٹ اسپوکن اپنے لیے یہ الفاظ بہت فخر سے استعمال کرتا ہے وہ بندہ اس کے خیال میں وہ کسی کا دل نہیں دکھاتا بلکہ بغیر کسی لگی لپٹی کے سچ بولتا ہے تو کسی کو برا کیوں لگتا ہے۔۔۔ اب اگر سچ سے کسی کو تکلیف ہے تو بھی یہ سراسر اس کا ذاتی معاملہ ہے ہم تو سچ ہی بولیں گے کسی کو برا لگتا ہے لگے۔

میری بہنی سگی بہن اس نمونے پن پہ پوری اترتی ہے۔ کلثوم کے خیال میں وہ پیدا ہی اس لیے ہوئی ہے کہ لوگوں کو آئینہ دکھا سکے۔ اللہ نے دنیا میں اس کو اسی کام کے لیے بھیجا ہے۔

اب قصہ کچھ یوں ہے کہ سارے رشتے دار اس سے دور دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ اپنی عزت کس کو پیاری نہیں ہوتی ظاہر ہے سب کو پیاری ہوتی ہے۔ لیکن کلثوم سے ٹاکرے کا مطلب ہے عزت کا فالودہ ہونا۔

ہم لوگ اس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے زبان پہ قابو رکھو۔ ۔ لی بی ضروری نہیں سب باتیں منہ پہ بولی جائیں کچھ لحاظ مروت نام کے الفاظ بھی موجود ہیں بے چارے دنیا میں جس پہ عمل کرنا پڑتا ہے مگر نہ جی نہ وہ کلثوم ہی کیا جو اپنی اس خامی کو خامی تصور کر لے۔

مجھے یاد ہے جب اس کی شادی کے دن قریب تھے تو بس وہ ہی کچھ دن تھے کہ اس کے منہ سے گلاب جھڑتے تھے۔ یعنی وہ بس اپنے میں مگن تھی اور ہم لوگ بھی سکھ چین کی بانسری بجاتے تھے۔ امی بھی بلا جھجک دنیا کے مرے ہوئے رنگ کے کپڑے پہنتی تھیں۔ باجی لال کالا براون جو دل کرتا اس رنگ سے بال رنگا کرتیں۔ بھابھی دن ہی کیا رات میں بھی سر پہ دوپٹا باندھ کے پھرتیں اور بھیا بھی آزادی سے ان کے پیچھے پھرتے۔

خیر قصہ مختصر ہمارا یہ سہانا دور کلثوم کی شادی تک چلا اور اس کی شادی کے بعد ہم نے اس کو بہت مس کیا۔ کیوں کہ جیسی بھی تھی گھر کی رونق اسی کے دم سے تھی۔ سب سے پنگے لینا سب سے شرارتیں کرنا فقرے کسنا اسی کا کام تھا۔ اب تو گھر بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ مانو ایک دم ویران سا ہو گیا گھر۔

شادی کے ایک ہفتے بعد اس کی اور اس کے سسرال والوں کی دعوت رکھی ہم لوگوں نے۔ کلثوم کی بیاہتا نند روبینہ ایک کنواری نند ثریا دیور خرم اور سسر بس

ان لوگوں پہ مشتمل تھا اس کا سسرال' میاں بھی بظاہر اچھا دکھتا تھا۔

امی اور بھابھی نے مل کر سب پکوان کلثوم کی پسند کے بنائے اور باجی نے میٹھا بنایا۔ بس اب انتظار تھا تو ہمارے گھر کی چڑیا کا کہ وہ آئے اور ہمارے آنگن کی رونق کچھ دیر کو بڑھا جائے۔ خیر وہ لوگ آ گئے۔ کلثوم کے گلے لگ کر معلوم نہیں کیسے ہم سب نے اپنا رونا روکا لیکن مجھے کلثوم ذرا چپ چپ لگی۔ ظاہر ہے اتنی جلدی سسرال میں دل لگنا اور میکے کی یادیں ختم کرنا آسان کہاں۔ خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا تو چائے کی باری آئی۔ سب ٹولیاں بنا کے الگ الگ بیٹھ گئے۔ کلثوم کی نند روبینہ' ہماری بھابھی' باجی اور امی نے ٹوٹکے اور بچوں کے ٹاپک میں خود کو مصروف کر لیا۔ سسر صاحب اور ابو اپنے کاروبار کی باتیں کرنے لگے۔ کلثوم کا دیور' میاں اور ہمارے بھائی صاحب سیاست جیسے بورنگ ترین ٹاپک پہ گفتگو کرنے لگے۔ میں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور کلثوم کو اپنے ساتھ کچن میں لے آئی۔ "اور سناؤ کلثوم کیسا رہا شادی کا تجربہ۔" ایک شرمیلی مسکراہٹ نے بتا دیا فی الحال تجربہ اچھا ہی ہے۔

"کب جا رہی ہو بنو ہنی مون پہ۔" میں نے مزید شرارت کی۔ ایک ہلکے سے تبسم سے وہ بولی۔

"بس اگلے ہفتے ہی۔"

اس کے چہرے پہ پھیلی دھیمی سی مسکان مجھے اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ پرانے سب گلے شکوے کہیں ختم سے ہو گئے۔ ان ہی دو چار باتوں میں چائے بن گئی اور میں لاؤنج میں لے آئی۔ چائے سرو کر کے میں نے اور کلثوم نے بھی لاؤنج کا ایک کونہ پکڑ لیا۔

"ارے ثریا! تم کیوں اکیلی بیٹھی ہو۔ ہمارے ساتھ آ جاؤ نا۔" میری نظر کلثوم کی چھوٹی نند پہ پڑی جو اکیلی ایک فلور کشن پہ بیٹھی تھی۔

"شکر ہے آپ کو میں نظر آ گئی ورنہ ہماری بھابھی کو تو اپنے گھر آ کر یاد ہی نہیں رہا کہ ان کی ایک چھوٹی نند بھی ہے۔"

اور مجھے کلثوم کی خاموشی کا مطلب سمجھ آ گیا کہ اب اس کا پالا ایک صاف گو سے پڑ گیا ہے۔

☼



عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

"کتنی شرم کی بات ہے عون۔۔۔" ثانیہ کو اس پہ سخت غصہ تھا۔ اب بھی بہت بے زاری اور شرم دلانے والے انداز میں بولی تو عون نے سر دھنا۔

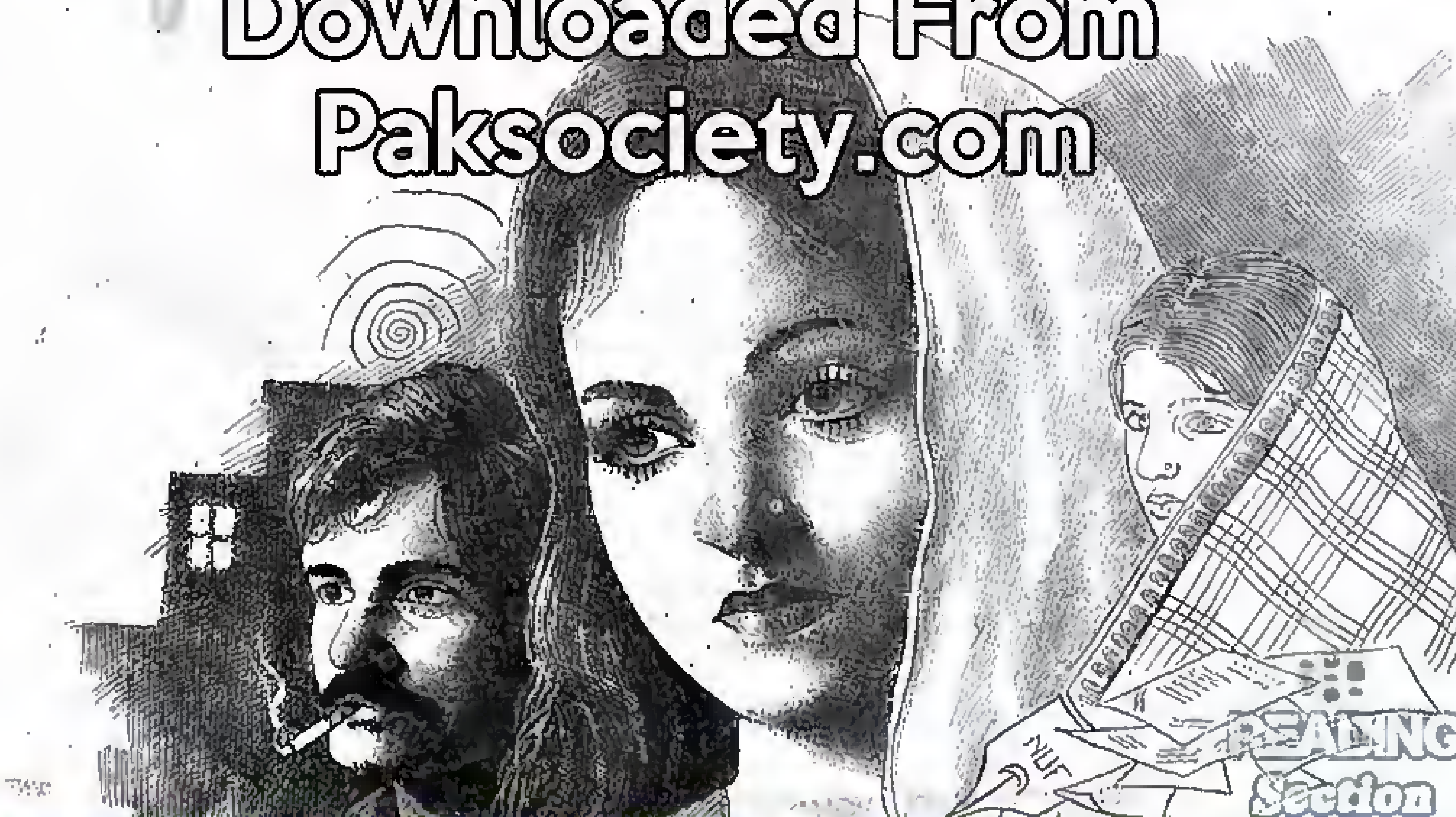
"واقعی۔۔۔ بہت شرم کی بات ہے۔ شوہر تھکا ہارا گھر آئے تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کی دل بستگی کا سامان کرے اور تم کلاشنکوف بنی برسٹ مارنا شروع کر دیتی ہو۔" ٹی وی کے چینلز سرچ کرتا وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تو سالن کا ڈونگا لیے کچن سے نکلتی بھابھی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

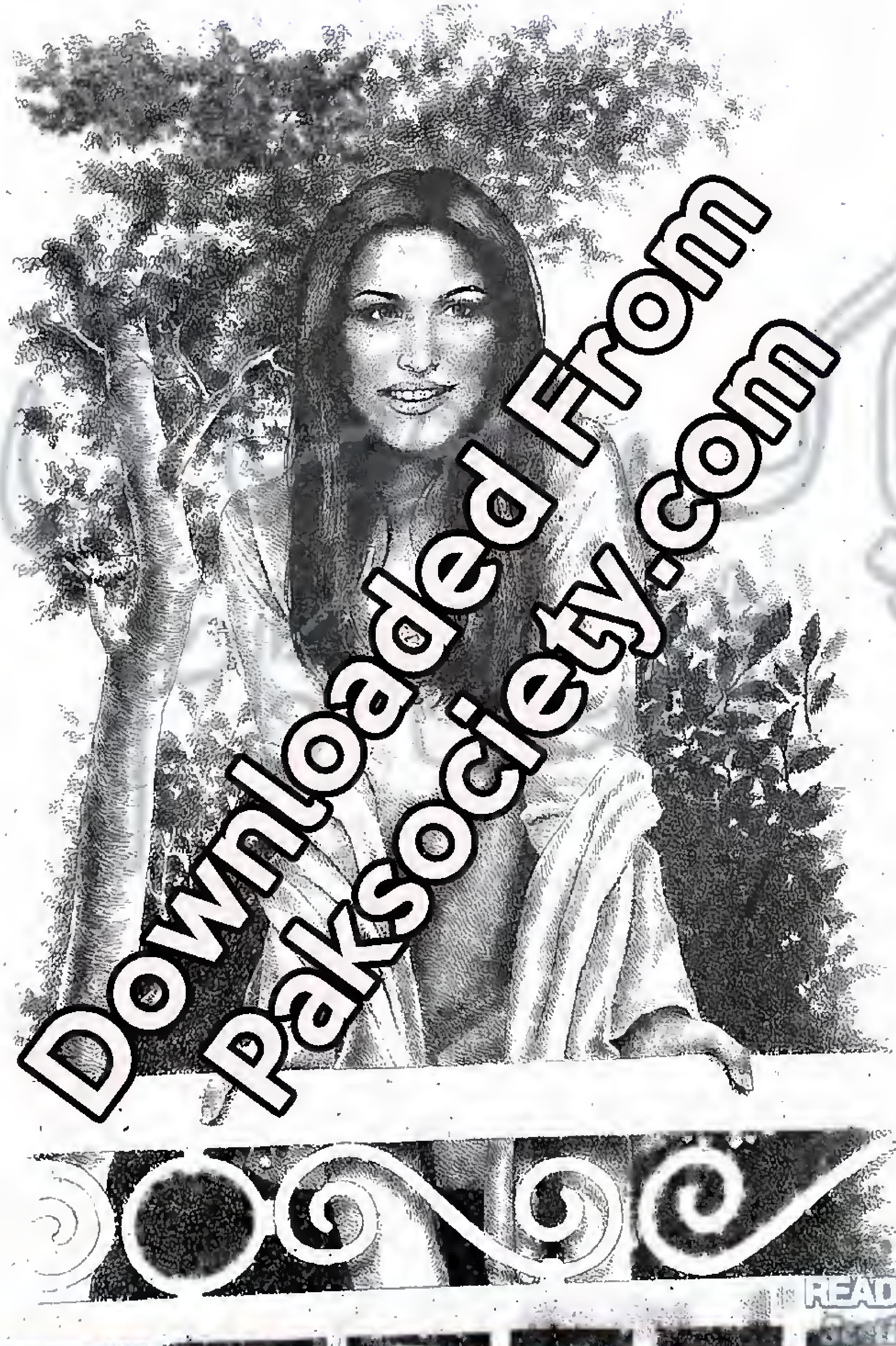
ثانیہ نے خفیف سی ہو کر دانت پیسے۔ پھر پاؤں پٹختی کچن میں چلی گئی۔ برتن پٹخ پٹخ کے غصہ نکالا۔ پھر بھابھی کے ساتھ مل کے کھانا لگانے لگی۔

"پیار سے کہو گی تو مان جائے گا۔" وہ منہ پھلائے کھانا کھا رہی تھی جب سرگوشی میں بھابھی نے مشورہ دیا بلکہ تسلی دی۔

"ہنہ۔۔۔" ثانیہ نے محض سر جھٹکا۔ دل بہت جلا تھا۔ "کب سے پیار سے ہی کہہ رہی ہوں۔ اب بتاؤں گی اسے" اور کمرے میں آتے ہی اس نے "بتانے" کی شروعات کی۔ اپنا تکیہ اٹھایا اور قالین پہ یوں پھینکا جیسے وہیں سونے کا ارادہ ہو۔

پچیسویں اور آخری قسط





واش روم سے نکلتا عون ٹھٹکا' پھر اسے ہنسی آگئی۔
"ایک تو تم لڑکیاں بھی نا.... "
"کیا... ہم لڑکیاں؟"
وہ مکمل لڑائی کے موڈ میں تھی۔ تیوری چڑھا کے عون کو دیکھا۔ تو وہ اسے پرانی والی ثانیہ لگی۔ لڑتی جھگڑتی رعب جماتی۔
"بس ایسے ہی... شادی ہوتے ہی ایک نیا پیکج نکل آتا ہے اندر سے.... "
وہ یقیناً "اسے غصہ دلا رہا تھا... چاہے مذاقاً" چھیڑ کر ہی سہی۔
"بدل تو تم گئے ہو' پہلے ہر بات مانتے تھے میری۔" ثانیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔
"اچھا... پہلے تکیہ اٹھا کے بیڈ پہ رکھو۔"
"نہیں... میں نیچے ہی سوؤں گی۔" وہ بضد رہی۔
"اُفوہ... اتنی دور سے تو میں تمہاری بات بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پاؤں گا۔"
عون نے اسے پچکارا۔
"تو قریب سے کون سا سن رہے ہو۔"
وہ روہانسی ہونے لگی۔ تو وہ برجستہ بولا۔
"تم نے قریب آکر کہا ہی نہیں۔ ذرا پاس آؤ۔ کوئی رشوت دو۔ پھر میں سوچوں گا۔"
"رشوت دینے کے بھی تم نے سوچا ہی ہے تو پھر میں دور ہی بھلی.... "
وہ چڑ کر بولی تو عون نے آگے بڑھ کے تکیہ اٹھا کر بیڈ پہ پھینکا اور ثانیہ کو دھمکایا۔
"اب تم شرافت سے لیٹ جاؤ' ورنہ تمہیں بھی ایسے ہی اٹھا کے پھینکوں گا۔"
وہ فوں فاں کرتی بستر پہ آگئی۔
"ایک تو تم مجھے زبردستی وہاں سے لے آئے' یہ بھی نہیں سوچا کہ ابیھا کی طبیعت مکمل طور پہ ٹھیک نہیں تھی۔ اب لے جانے کا کہتی ہوں تو تمہارے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔"
اسے رہ رہ کے خیال آتا۔ پتا نہیں ابیھا نے کیا سوچا ہوگا۔ شرمندگی کے مارے ثانیہ نے تب سے اسے کال بھی نہیں کی تھی۔ عون جو اسے دھڑلے سے واپس لے آیا تھا۔
"ٹھیک ہے وہ... بلکہ معیذ کی خوشی دیکھ کے حالات کی بہتری کا اچھے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔"
عون نے پاس بیٹھتے ہوئے اسے تسلی دی۔ تو وہ جل کر بولی۔
"وہ تو تب بھی خوش ہی رہتے تھے جب ابیھا برے حالات میں تھی۔"
"اونہوں... اس نے بھی بہت کڑا وقت گزارا ہے۔ اگر ابیھا نے تکلیفیں سہی ہیں تو معیذ کی ذہنی کیفیت بھی اس دوران ٹھیک نہیں تھی۔"
عون نے اس کی تصحیح کی۔ ثانیہ نے سر جھٹکا۔
"وہ اذیت ان کی اپنی مول لی ہوئی تھی۔ اگر تب ہی خدا کی رضا میں راضی ہو جاتے تو نہ وہ تکلیفوں سے گزرتی اور نہ خود معیذ بھائی کو ذہنی اذیت سے گزرنا پڑتا۔"
وہ متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔
"بلکہ ابیھا کا تو زیادہ برا حال تھا۔ محض جسمانی ہی نہیں ذہنی اور روحانی طور پر بھی تکالیف برداشت کی ہیں اس

نے، محض اپنے شوہر کی بے رخی کی وجہ سے۔"

"چلو خیر۔ پلٹ کے آنے والوں کو تو اللہ بھی معاف کر دیا کرتا ہے۔ اس نے بھی کھلے دل سے اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا ہے۔"

عون نے بات سمیٹی۔ پھر مسکرا کے اطلاع دی۔

"اب تو ایبہا اپنی شادی کی شاپنگ کر رہی ہے زارا کے ساتھ۔"

ثانیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"اور ان "ہٹلر آنٹی" نے اجازت دے دی؟" سفینہ بیگم کے بارے میں پوچھا۔

"اب وہ معیز احمد کی بیوی ہے۔ اس کی پوزیشن کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔"

"مگر پھر بھی..... میری بہن بنی ہوئی ہے وہ..... کیا میرا جانا نہیں بنتا وہاں..... ایک تمہاری ہٹ کہ اکیلی نہیں جا سکتیں اور خود وہاں لے کے جا نہیں رہے۔" ثانیہ کو اپنا مسئلہ پھر سے یاد آیا۔

"لے جاؤں گا یار! ابھی تو شادی میں دو ہفتے پڑے ہیں۔"

عون نے اسے تسلی دی تو وہ چلا ہی تو اٹھی۔

"کیا مطلب..... ڈائریکٹ شادی میں ہی لے جاؤ گے؟"

عون گڑبڑایا۔

"اُفوہ..... میرا مطلب ہے پہلے ہی لے کے جاؤں گا۔ ابھی کافی ٹائم ہے۔"

"کل اگر تم مجھے نہیں لے کے گئے تو پھر دیکھنا تم....." چند لمحوں تک اسے گھورنے کے بعد ثانیہ نے اسے دھمکایا۔

"میں تو اب بھی دیکھ ہی رہا ہوں بس....." عون نے شرارت سے آہ بھری۔ ثانیہ نے دانت پیسے۔

"ہاں..... تو آئندہ بھی صرف دیکھتے ہی رہو گے۔" پٹاخ سے کہا تو عون کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"اب تو لے جانا ہی پڑے گا۔ بھئی! اپنا حقہ پانی بند ہو جائے گا ورنہ....."

وہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ثانیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کن اکھیوں سے تکیے پہ پھیلے عون کے بازو کو دیکھا۔ پھر کھسک کر سر اس کے بازو پہ رکھ دیا۔

"مجھے پتا تھا عون! تم مان جاؤ گے کیونکہ تم بہت اچھے ہو۔"

بڑے مان سے کہا۔

"اچھا..... اور یہ تمہیں میری بڑبڑاہٹ سننے کے بعد پتا چلا ہوگا؟"

عون نے طنزاً پوچھا تو ثانیہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔ عون کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سفینہ بیگم نے ایک ہی نگاہ میں پورے ماحول کا جائزہ لے لیا۔ شاپنگ بیگز کی گنتی انہوں نے آتے ہی کر لی تھی۔

ایبہا کچن سے نکلی تو ان کو دیکھتے ہی جیسے خائف ہو کر زمین پہ جم سی گئی..... اس کی اس کیفیت نے سفینہ بیگم کو بہت تقویت پہنچائی۔ یعنی کہ ابھی بھی ان کا پلہ بھاری ہی تھا۔ معیز کا ساتھ پا کر بھی وہ ان کے رعب کی "حد" سے باہر نہیں نکلی تھی۔

"ہوں۔۔۔" انہوں نے اپنے مخصوص "ملکہ" والے انداز میں سر اٹھائے تنفر سے ہنکارا بھرا۔ پھر انگلی سے شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت سے بولیں۔

"بڑی عیاشی ہو رہی ہے تمہاری۔"

ابیہا کی پیشانی پر پسینہ چمک اٹھا۔

کل تک یہ اس معیز احمد کی ماں تھیں جس نے ابیہا کو قبول نہیں کیا تھا۔

اور آج وہ اس معیز احمد کی ماں تھیں جو دل و جان سے ابیہا کو قبول کرنے کا اذن دے چکا تھا تو اب اس کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟

اسے اپنے ذہن سے کوئی جواب نہ ملا تھا۔

وہ ہلکا سا کھنکھاری پھر ہمت جمع کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی۔

"آپ بیٹھیں پلیز۔۔۔ میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔"

"بس۔۔۔" وہ ہاتھ اٹھا کر گویا پھنکاریں۔ "مہمان نہیں آئی ہوں میں تمہارے گھر۔۔۔ اپنے غلیظ وجود کے ساتھ تم کھڑی ہو میری سلطنت میں۔۔۔"

اف۔۔۔ اف۔۔۔!!

ابیہا کا دل چاہا یہاں سے غائب ہو جائے۔

کسی کو اس کی اوقات یاد دلاتے وقت جو الفاظ ہمارے لبوں سے نکلتے ہیں وہ در حقیقت دوسروں کو ہماری اوقات بتا رہے ہوتے ہیں۔

سفینہ بیگم بھی جو منہ میں آئے وہ کہہ دینے کی عادی تھیں۔

"مگر تم در حقیقت اس کھیل کو سمجھ نہیں پا رہیں۔ معیز تمہارا شوہر بعد میں ہے۔ پہلے وہ میرا بیٹا ہے۔ میرے ذہن سے سوچنے اور میری زبان بولنے والا۔" انہوں نے اپنی بساط بچھانی شروع کی تھی۔

"اگر وہ تمہیں لفٹ کرانے لگا ہے تو کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ لڑکوں کو چار دن ایسے ہی کشش نظر آتی ہے لڑکیوں میں ورنہ پچھلے تین سالوں میں جو تمہاری اہمیت تھی اس کے نزدیک۔۔۔ وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

وہ اسے اتنی بری طرح رگیدنا چاہتی تھیں کہ وہ سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہے۔

ابیہا کا وجود کپکپانے لگا۔ سفینہ بیگم کے لب و لہجے کی یخ بستگی اسے اپنی ہڈیوں میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں نے بھی کہا جوان بچہ ہے ٹھیک ہے۔ اس کا بھی حق ہے اپنی زندگی میں من چاہے تجربات کرنے کا۔ دو ماہ کا ٹائم دیا ہے میں نے اسے تمہارے ساتھ۔۔۔ اس کے بعد پھر وہی ہو گا جو میں چاہتی ہوں۔"

وہ فاتحانہ کہہ رہی تھیں۔ ابیہا کا وجود سن ہونے لگا۔ پھر وہ پُراسرار انداز میں بولیں تو چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی۔

ان کے لفظوں کے سکے کھن کھن سماعتوں سے ٹکرا کر ذہن کے کشکول میں گرتے تو جیسے پگھلے ہوئے سیسے کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔

"چلو۔۔۔ انجوائے کرو تم بھی۔۔۔ دو ماہ ہیں تمہارے پاس۔۔۔ جتنا کچھ سمیٹ سکتی ہو سمیٹ لو مگر اس کے بعد یہ ہم ماں بیٹے میں طے ہے کہ تمہیں اس گھر سے دفع ہی ہونا ہے۔" انہیں اس کی شکل میں صالحہ دکھائی دیتی تھی۔ جیسے صالحہ موجود نہ ہوتے ہوئے بھی امتیاز احمد اور ان کے بیچ حائل رہی ویسے ہی یہ لڑکی ان کے بیٹے کے دل و دماغ پہ

قابض ہونے والی تھی۔ یہ جادوگر ماں بیٹی۔۔۔ صالحہ کا تو کچھ نہ بگاڑ سکیں مگر وہ ایبہا کی ایسی کی تیسی کرنا چاہتی تھیں۔ جیسے آئی تھیں ویسے ہی حقارت سے اسے دیکھتی چلی گئیں تو ایبہا کی لرزتی ٹانگوں نے اس کا مزید بوجھ برداشت کرنے سے انکار کردیا۔ وہ وہیں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

شارجہ سے شادی میں خاص طور پر شرکت کے لیے ماموں' ممانی اور عمر گھر میں کیا آئے رونق اور شادمانی کا نیا سامان آگیا۔

جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے

کے مصداق عمر جب معیز سے ملا تو دونوں نے لمبا معانقہ کیا۔ معیز کو یاد آیا وہ دونوں کتنے اچھے دوست ہوا کرتے تھے۔

"بہت مبارک ہو میرے دوست! زندگی میں واپسی کے لیے۔" عمر اس کے اس اقدام سے بہت خوش اور پُرجوش تھا کہ معیز نے ایبہا کو اپنالیا ہے۔

ممانی نے سفینہ بیگم کو دونوں شادیوں کی مبارک باد دی تو ان کی مسکراہٹ سکڑنے میں پل نہیں لگا۔

"معذرت چاہتی ہوں بھابھی۔۔۔ مگر میں صرف زارا کی شادی کی مبارک باد قبول کروں گی۔"

"ارے۔۔۔" انہوں نے حیرت سے نند کو دیکھا۔ "ابھی تک حالات درست نہیں ہوئے؟"

"ابھی تو میکے والوں کی تھو تھو باقی ہے۔ ساری عمر میں صالحہ کو کوستی رہی تو کیا سب طعنے نہیں دیں گے کہ اب اسی کی بیٹی کو بہو بنالیا۔ پوری دنیا میں معیز کے لیے اور کوئی نہیں ملی تھی۔"

وہ سخت برگشتہ تھیں۔

ممانی جان کو ان کے خیالات جان کر سخت تاسف ہوا۔ ان کی سخت طبیعت سے واقفیت تو اچھی طرح تھی اور باقی کی کہانی عمر نے جاکے انہیں من و عن سنائی تھی' انہیں ایبہا کو بنا دیکھے ہی اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ "بن ماں باپ کی بچی کیسی سزا کاٹ رہی تھی۔ وہ بھی اس جرم کی جو اس نے کیا ہی نہیں" اور یہ بات انہوں نے صاف گوئی سے سفینہ سے بھی کہہ دی۔ تو وہ تڑخ کر بولیں۔

"ہر کسی کو اپنے ہوتے سوتے کا بویا کاٹنا پڑتا ہے۔ اسے بھی صالحہ کی بیٹی ہونے کی سزا مل رہی ہے۔"

"یوں کہو کہ ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے اسے عمر بتارہا تھا دیکھنے لائق بچی ہے۔ اوپر سے صابر و شاکر بھی۔۔۔"

ممانی جان کو نند کی ذہنیت پر افسوس ہورہا تھا۔

"ہنہ۔۔۔ صابر و شاکر۔۔۔" سفینہ نے سر جھٹکا اور طنزیہ بولیں۔

"گھنی اور میسنی۔۔۔۔ ماں کی طرح پوری ادائیں ہیں اس کی' بلکہ ایک آدھ زیادہ ہی ہوگی۔ تب ہی تو امتیاز احمد نے صالحہ کو کسی طور چھوڑ ہی دیا مگر اس کمبخت نے تو پتا نہیں کیا جادو کیا۔ طلاق دیتے دیتے مکر گیا معیز۔۔۔"

"جو صبر کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں' دنیاوی جنگوں میں ان کی شکست ناممکن ہوتی ہے سفینہ۔۔۔ بہرحال۔۔۔ تم یہ بتاؤ داماد کیسا ہے۔ ہم نے تو بڑی تعریفیں سنی ہیں عمر سے۔"

انہوں نے تحمل سے کہتے ہوئے بات بدل دی تھی۔ سفیر کے ذکر پہ فی الفور سفینہ کی تیوریاں غائب ہوئیں اور

چہرے پر مسکراہٹ نے ڈیرہ ڈال لیا اور وہ انہیں سفیر کی بابت بتانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

خاندان والوں کو معیذ اور ایمہا کے نکاح کا پتا نہیں تھا۔ اب جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے یہی طے کیا گیا کہ زارا کی مہندی والے روز ان دونوں کا علی الاعلان نکاح کیا جائے گا۔ سفینہ بیگم تو ایسے ہر پروگرام پر خون کے گھونٹ بھر کے رہ جاتیں، ان سب نے تو قسم کھا رکھی تھی ان کی خوشیوں کو ملیامیٹ کرنے کی۔

ابھی تو انہیں سوچ سوچ کے ہول اٹھتے کہ بنا ماں' باپ کی بچی کا خاندان میں تعارف بھی کروانا تھا۔

ممانی جان خاص طور پر انیکسی میں ایمہا سے جاکر ملیں تو اس کا سوگوار سا روپ دیکھ کر بے ساختہ "ماشاءاللہ" کہہ اٹھیں۔ انہیں سفینہ پر افسوس ہوا۔

بہت سے اچھے لوگوں کو ہم محض اپنی انا کی خاطر ناقدری کی دھول میں رول دیتے ہیں۔

سفینہ بھی بدلے اور انتقام کی اسی منزل پر تھیں۔

ممانی جان آئیں تو سفینہ کا دھیان تھوڑا سا پلٹا۔ وہ اب دل جمعی سے زارا کی شادی کی باقی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

معیذ کی کال آئی تو ایمہا کا دل دھڑک اٹھا۔ جب سے سفینہ بیگم انیکسی سے ہو کر گئی تھیں معیذ کی پہلی کال آئی تھی اس کے بعد... اور ایمہا اس دوران میں یہ طے نہیں کرپائی تھی کہ معیذ کو ان کی "تماکھانی آمد" اور ان کے انکشافات کے بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں۔

"کیسی ہو...؟"

وہ بہت محبت سے پوچھ رہا تھا۔ ایمہا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"ٹھیک..."

"ابھی ریڈی ہو جاؤ... تھوڑی دیر میں شاپنگ کے لیے چلنا ہے ہمیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"سب مکمل ہو چکا ہے... پلیز اب بس..."

وہ بمشکل صاف آواز میں بولی۔ ورنہ آنسو تو گلے کا پھندا بننے لگے تھے۔

"ارے... رے..." وہ حیران سا ہوا۔ پھر ہونس سے بولا۔ "ایسے کیسے... آج برائیڈل ڈریس لینا ہے تمہیں۔ وہ بھی میری پسند کا۔"

ایمہا کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کے رو دے۔ جانے سفینہ بیگم نے کیا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

"ہوں..." وہ مبہم سا بولی۔ مبادا معیذ کو اس کے رونے کا پتا چل جائے۔

"چلو ٹھیک ہے۔ بس تم تیار ہو جاؤ۔ میں آتا ہوں۔" وہ مطمئن ہوا۔

"وہ... زارا کو بھی لے لیں ساتھ۔"

وہ مہمانوں کے سامنے کوئی تماشا نہیں چاہتی تھی۔

"اوہو... وہ تو پردے میں بیٹھ گئی بس... اور تمہارا ابھی بازار کا یہ لاسٹ چکر ہو گا۔ اس کے بعد تم بھی پردے میں..." وہ شرارت سے ہنسا تھا۔

"آپ خود اپنی پسند کا لے لیں پلیز... مجھے تو ان چیزوں کا کچھ نہیں پتا۔" وہ بے بسی سے بولی۔

واقعی پہلے تو زارا اپنی پسند سے اس کے لیے بھی شاپنگ کر لیتی تھی۔ کبھی کبھار وہ بھی مشورہ دے دیتی یا زارا

زبردستی اس سے پسند پوچھتی تو اسے بھی دلچسپی لینا پڑتی تھی۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ تم صرف میرے ساتھ چل رہی ہو۔باقی کام میرا ہے۔"

معیز کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ لے کر ہی جائے گا۔

"معیز۔۔۔" وہ ہچکچا کر چپ سی ہو گئی۔

"کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

ان چند دنوں میں وہ کم از کم اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے تو واقف ہو ہی چکا تھا۔

"آنٹی۔۔۔ راضی ہیں اس رشتے کے لیے؟"

اس نے مدھم لہجے میں پوچھا تو لمحہ بھر کو معیز چپ سا ہو گیا۔

"ہمارا نکاح ہو چکا ہے ایمہا۔ اب ان سب تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت سے لوگ رضامند نہیں ہوتے لیکن آہستہ آہستہ وہ حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں۔"

قدرے توقف کے بعد وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا تو ایمہا کو سفینہ بیگم کی "رضامندی" کا اندازہ ہو گیا۔

"کیا انہوں نے۔۔۔ کوئی شرط رکھی ہے آپ سے؟"

وہ ہچکچا کر بولی تو ایک ثانیے کے لیے معیز کا دماغ گھوم گیا۔

"تم سے کس نے کہا؟"

اس نے سوال کے بدلے فی الفور سوال کیا تھا۔ شک گزرا کہیں زارا نے تو۔۔۔

"کسی نے نہیں۔۔۔ یوں ہی۔۔۔ دل میں خیال آیا تھا۔" وہ مکر گئی۔

"ان دنوں اچھے اچھے خیالات لاؤ دل میں۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آئے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔"

ایمہا نے صرف بات بدلنے کی خاطر مختصراً "کہا۔ جس بات نے کل رات سے اسے ٹینشن کا شکار کر رکھا تھا۔ اسے معیز نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

"اوکے۔۔۔ پھر ریڈی ہو جاؤ میں آرہا ہوں۔"

وہ کہتے کہتے رکا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔

"ایمہا۔۔۔ کسی کے بارے میں مت سوچو۔۔۔ کوئی جو کرتا ہے کرنے دو' جو کہتا ہے کہنے دو۔ تم صرف میرے جذبات کے خالص پن پہ نظر رکھو' اس میں کوئی کمی بیشی ہوئی تو میں قابل سزا۔۔۔ باقی سب کو بھول جاؤ۔۔۔ سوائے میرے۔۔۔"

آخری بات پر اس کا لہجہ مسکراتا ہوا سا تھا۔ ایمہا بھی جھینپ گئی۔

☆ ☆ ☆

ممانی جان نے ڈھولک رکھوا کر گھر میں اچھی خاصی رونق لگادی۔ رشتہ داروں نے معیز کی دلہن کے روپ میں صالحہ کی بیٹی کو دیکھ کر حیرت کا اظہار تو ضرور کیا مگر اتنی باتیں نہ بنائیں جتنی کہ سفینہ بیگم کو توقع تھی۔ اس کی وجہ شاید صالحہ کا اس دنیا سے چلے جانا تھا۔ وہ زندہ ہوتی تو شاید لوگ چسکے لینے کی خاطر ضرور کرید تے۔ فی الحال تو وہ ایمہا کی من موہنی سی شکل اور معصومیت دیکھ کر معیز اور اس کی جوڑی کو سراہ ہی رہے تھے۔

زارا کی مہندی لڑکے والے بہت دھوم دھام سے لائے تھے۔ سفیر اور اس کے بھائیوں کے دوستوں کے

بھنگڑے کمال کے تھے۔
زارا کی مایوں کی رسم سے ذرا پہلے ایہا اور معیز کے نکاح کی سنّت ادا کی گئی۔ ایہا کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ کیا کیا یاد نہ آیا تھا اس لمحے... اور معیز شاد تھا۔ مطمئن اور پرسکون۔ جیسے من کی ہر مراد پالی ہو۔ جیسے لو میرج کرنے چلا ہو۔ ماضی کی کسی یاد کا شائبہ تک اس کے ذہن میں نہ تھا۔ اسے یقین تھا ان کی زندگی آج سے شروع ہونے والی ہے۔

آج ہی ایہا کی رخصتی تھی۔ اگلے دن زارا کی بارات کے ساتھ ان کے ولیمہ کی سنّت ادا ہو جاتی۔ رباب بھی تنے ہوئے تاثرات لیے تقریب میں موجود تھی مگر بحالت مجبوری۔ اگر اس کے بھائی کی شادی نہ ہوتی تو وہ کبھی مڑ کے بھی ادھر نہ دیکھتی۔
سفینہ بیگم معیز کی بے وفائی کے ازالے کے طور پر اسے خصوصی اہمیت دے رہی تھیں۔ مگر رباب کا انہیں بھی لفٹ کرانے کا موڈ نہیں تھا۔
سفینہ بیگم' رباب کو دیکھ دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ اگر اس کے ساتھ معیز کی شادی ہو جاتی تو زارا کی کامیاب شادی کی گارنٹی مل جاتی' حق ہاہ...
ثانیہ کتنی ہی بار ایہا کو لپٹا کر پیار کر چکی تھی۔
"ماشاءاللہ... بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"
اور ہر بار اس دعا پر ایہا کی آنکھیں بھر آتیں۔
معیز پر اعتبار اپنی جگہ' مگر سفینہ بیگم کی دھمکی ذہن سے جاتی ہی نہ تھی۔ وہ معیز کی اپنی ماں سے محبت اور لگاؤ سے اچھی طرح واقف تھی... سفینہ بیگم جیسی پتھر دل عورت اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھیں۔
ایراز اور عمر کے برجستہ جملوں اور لوگوں کے قہقہوں نے محفل کو زعفران زار بنا رکھا تھا۔ زارا اور سفیر کی مہندی اکٹھی ہو رہی تھی۔ سب نے ان دونوں کو تیل لگا لگا کر اور مٹھائی کھلا کھلا کر نڈھال کر دیا تھا۔
رات گئے محفل اپنے اختتام کو پہنچی اور لڑکے والے رخصت ہوئے۔ دولہا دلہن بنے معیز اور ایہا کے ساتھ سب کا فوٹو شوٹ بھی مکمل ہوا۔
اب ایہا کی معیز کے ساتھ رخصتی تھی۔ سفینہ بیگم تو کسی بھی رسم میں حصہ لے کر خود کو "گناہ گار" نہیں کر سکتی تھیں۔ سو بیمار بن کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ تب ممانی جان نے خوش اسلوبی سے ماں کے فرائض سرانجام دیے۔ ایہا کو تھام کر وہ معیز کے کمرے تک لائیں۔ ثانیہ اسے اندر لے گئی تھی۔

"واؤ..." خوشبوؤں اور گلابوں سے سجے بیڈ روم کو دیکھ کر ثانیہ مبہوت ہو گئی۔ مگر ایہا کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ اس نے سرد ہوتے ہاتھوں سے ثانیہ کے ہاتھ تھام لیے۔
"ارے... تمہیں کیا ہوا؟ اتنی گرمی میں بھی ٹھنڈی پڑ رہی ہو۔" ثانیہ حیران ہوئی۔
"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی تو ثانیہ ہنستے ہوئے بولی۔
"ابھی معیز بھائی آئیں گے تو یہ ڈر دراڑن چھو ہو جائے گا۔" ثانیہ نے اسے احتیاط کے ساتھ پھولوں سے سجے بستر پر بٹھایا۔
"معیز بھائی نے بیڈ روم میں فوٹو شوٹ سے منع کر دیا تھا۔ فوٹو گرافر کو... مووی میکر کو بھی نہیں آنے دیا ادھر..." ثانیہ بتا رہی تھی۔

اسی اثنا میں زارا پانی کا جگ اور گلاس لا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھنے لگی۔ پھر ابیہا کے پاس بیٹھی اور اسے پیار کیا۔
"اللہ کرے تم ہمارے گھر کو ہمیشہ خوشیوں سے بھرا رکھو۔" اس نے دل سے دعا دی تو اس کے ساتھ ابیہا کی آنکھوں میں بھی نمی اُتر آئی۔
"کیا خیال ہے گھر بھرنے کے لیے پانچ چھ خوشیاں کافی ہوں گی؟"
ثانیہ نے ماحول بدلنے کے لیے شرارت سے کہا تو اس کا مطلب سمجھ کر ابیہا جھینپ گئی۔ زارا ہنسی تھی۔
"ہاں... دو بچے خوش حال گھرانہ والوں کے موٹو کی ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔"
ثانیہ کا ارادہ تو ابھی اور رکنے کا تھا مگر عون کی کال آگئی۔
"شرم کرو... تم تو وہیں چپک گئی ہو اور ادھر ایک شریف بندہ اپنی بیوی سے پہلی ملاقات کے لیے بے چین و بے قرار ہو رہا ہے۔"
عون نے اسے اچھی خاصی سنائی تھیں۔ وہ موبائل آف کر کے ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔
"چلو بھئی... جن کی سلطنت ہے' وہ آنا چاہتے ہیں اب۔ ہمیں تو اشارہ مل گیا۔"
زارا اس کا گال تھپتھپاتی اٹھ گئی تو بے ترتیب دھڑکنیں لیے ابیہا اکیلی بیٹھی رہ گئی۔
معیز کمرے میں آیا تو اک طمانیت آمیز خوشی نے اس کے پورے وجود کا حصار کر رکھا تھا۔
مسکراتی نظروں سے وہ بیڈ کے وسط میں سر جھکائے ساکت بیٹھی ابیہا کو دیکھتا اس کے پاس آ بیٹھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں الجھائے وہ سنگی مجسمے کی طرح جامد تھی۔
"السلام علیکم!" معیز نے مسکرا کر کہا تو ابیہا نے چہرہ مزید جھکا لیا۔
معیز نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھاما۔

ٹپ... ٹپ...
وہ چونکا... آنسوؤں کے گرم قطرے اس کے ہاتھ کی پشت پر گرے تھے۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ابیہا کا چہرہ اوپر کیا تو وہ رو رہی تھی۔ معیز کا دل تاسف کا شکار ہونے لگا۔
"تم نے مجھے ابھی بھی معاف نہیں کیا بیا...؟"
"نہیں... ایسی بات نہیں ہے۔"
وہ جلدی سے بولی' مبادا وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔
معیز نے دونوں انگوٹھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔
"تو پھر... یہ آنسو...؟"
"یہ تو بس ایسے ہی..." وہ خجل سی ہو گئی مگر آنسوؤں کو کنٹرول کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ گزرے چار سالوں میں اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ معیز احمد کے دل میں کبھی اپنی جگہ بنا سکے گی۔
"تم نے بہت رو لیا ابیہا... میرے بغیر جتنا رونا تھا رو لیا۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں... اور کبھی تمہیں رونے نہیں دوں گا۔"
وہ تیقن بھرے انداز میں بولا تو ابیہا کو اس کی ہر ہر بات پہ یقین آنے لگا۔ معیز نے اس کے گرد بازوؤں کا حصار بنایا تو وہ اس کی مضبوط پناہوں میں سمٹ سی گئی۔
اس دنیا کے ہر غم اور ہر دکھ کو بھلائے۔ محبت کی صدا پر لبیک کہتے... ان دونوں پر محبت پر پھیلائے سایہ فگن

تھی۔

☆ ☆ ☆

سفینہ بیگم کو زارا کے مستقبل کی فکر کھائے جارہی تھی۔ رباب کی صورت وہاں زارا کے لیے ایک مستقل درد سر موجود تھا۔ کیا تھا اگر معیذ یہ بار اپنے سر لے کر زارا کی آزمائش ختم کردیتا۔ سفینہ بیگم کو شکوہ تھا۔ مگر آہ بھر کے رہ جاتیں' معیذ تو ایک طرف رہا خود زارا بے وقوف بھی اپنے مستقبل کے ان مسائل سے لاپروا تھی۔
وہی زارا جو پہلے رباب کو بھابی بنا کر سسرال میں اپنی حیثیت مضبوط بنانا چاہتی تھی۔ اب بھائی اور ایبہا "بھابھی" کی محبت میں گوڈے گوڈے ڈوبی ایبہا کی خوب طرف داری کرتی تھی۔ مگر۔۔۔ جب وہ ایبہا کو ڈرا دھمکا کر آئیں تو ان کے دل کو از حد طمانیت ملی جب انہوں نے ایبہا کا اپنے رعب کے آگے وہی سابقہ حال دیکھا۔ معیذ کے ساتھ نے اسے نہ تو زبان دراز بنایا تھا اور نہ ہی نڈر۔ وہ ابھی بھی ان کے جوتے تلے آیا کیڑا تھی۔ جسے وہ کبھی بھی مسل سکتی تھیں انہوں نے بڑی طمانیت اور تنفر سے سوچا۔
انسان سوچتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ "تذلیل انسانی" کے منصوبے بنانے والوں کے منصوبے اکثر فیل ہوجایا کرتے ہیں۔
مگر رب کی کرنی نہیں بدلا کرتی۔ اس کا "کن" "فیکون" ہوجایا کرتا ہے۔
تو کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟؟؟؟

☆ ☆ ☆

ان کا خیال تھا کہ رباب ان کا منصوبہ سن کے خوشی کے مارے اچھل پڑے گی۔ باغ باغ ہوجائے گی مگر وہ تو چلّا اٹھی۔
"کیا۔؟ آنٹی آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ واہ۔ واہ واہ وہ اس لڑکی کو محبوبہ بنا کے رکھے گا اور آپ فلمی ظالم ساس کی طرح ایبہا پہ طرح طرح کے ظلم ڈھا کر اسے یہاں سے بھگانے کی سازشیں کریں گی۔"
وہ تندو تیز لہجے میں بولتی چلی گئی تو سفینہ بیگم نے بے اختیار پہلو بدلا۔ ان کے سامنے اپنی اولاد کو بھی اس لب و لہجے میں بولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کبھی۔
(اگر یہ خبیث لڑکی اس گھر میں آگئی تو کیا کرے گی؟) انہیں بے ساختہ خیال آیا۔
مگر بہر حال فی الوقت تو اپنے سے زیادہ بیٹی کا گھر بچانے کی فکر تھی۔ سو لہجے کو نرم ہی رکھا۔
"تم فکر مت کرو رباب۔ معیذ صرف ہمدردی کے بخار میں مبتلا ہے اور کچھ نہیں۔"
"اسے دوسرے لفظوں میں عشق کا بخار کہتے ہیں آنٹی۔" اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ تو وہ خفیف سی ہوگئیں۔ تب وہ اطمینان سے بولی۔
"مگر میں نے اچھی طرح سے اس مسئلے کا حل سوچ لیا ہے۔"
وہ چونکیں۔ "کیا۔؟"
"یہی کہ میں آپ کی ہونے والی بہو کو اتنا بدنام کردوں گی کہ معیذ کے پاس اسے چھوڑنے کے سوا کوئی آپشن بچے گا ہی نہیں۔"
وہ رباب کے مقابل ہوتیں تو اس سے اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک دیکھ کر جھرجھری لے کر رہ جاتیں۔ اور شاید اسے اپنی بہو بنانے کی خواہش پر نظر ثانی بھی کرلیتیں۔ مگر ابھی چونکہ فون پر تھیں سو حیران ہو کر پوچھ ہی

سکیں۔
"ایسا کیا کردگی تم۔؟" بلا ارادہ ہی اعتراف کر گئیں۔ "معیذ اب اس سے متنفر ہونے والا نہیں ہے رباب۔ اس نے بہت آزمائشوں کے بعد اس لڑکی کو پایا ہے۔"
رباب تلملائی۔ (تو کیا میں مفت کا مال تھی اس کے لیے۔؟)
"اور اگر بھری محفل میں کوئی دوسرا مرد آکر آپ کی نام نہاد بہو کا ہاتھ تھام لے اور اپنے عشق کے قصے سنائے تو۔؟"

رباب نے چہکتی آواز میں کہا تو لحہ بھر کو وہ خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے ایبہا کو گھر سے نکالنے کے بہت سے طریقے سوچے تھے وہ اسے بدکردار بھگوڑی ماں کی بیٹی تک کہتی تھیں، مگر اس طرح سے اسے بدکردار ثابت کرنے کا انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ تب ہی بے ساختہ بولیں۔
"معیذ بے وقوف نہیں ہے رباب۔! جو لڑکی جائیداد کا حصہ لے کر بھی معیذ کو چھوڑ کر نہیں گئی اس کے فرضی عشقیہ قصے پر وہ یقین نہیں کرے گا۔"
"مگرے گا آنٹی! ضرور کرے گا۔" وہ پُراسرار انداز میں مسکرائی۔ پھر گویا دھماکا کیا۔
"اور اس معاملے کو ہوا دیں گی آپ۔"
"مم۔ میں۔؟" وہ اس اچانک افتاد پر گڑبڑائیں۔ "میں کیسے۔؟"
"معیذ اس پر جتنا بھی اعتماد کا اظہار کرے آپ ایسی بدکردار بہو کو اپنانے سے انکار کر دیجئے گا اینڈ ڈیٹس آل۔ اتنے سارے لوگوں کے درمیان تو ویسے بھی معیذ کی بولتی بند ہو جائے گی۔ ایسی سچویشن دیکھ کر۔"
آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ اپنے منصوبے پر اٹل ہے اور محظوظ بھی ہو رہی ہے۔
سفینہ بیگم ہچکچائیں۔ "تم صبر کر جاؤ تو میں معیذ کو اسے طلاق دینے پر مجبور کر دوں گی رباب۔"
"مگر مجھے برتا ہوا مرد نہیں چاہیے۔" رباب نے سرد اور قطعی لہجے میں جو الفاظ کہے انہوں نے لحہ بھر کو سفینہ بیگم کو سنسنا دیا۔
(یہ ایک کنواری لڑکی کا انداز گفتگو تھا کیا؟)
"آپ بس خاموشی سے تماشا دیکھیں۔ اور وقت آنے پر بس اپنا کردار نبھائیں۔ باقی ساری ٹینشن میرے لیے رہنے دیں۔"
وہ اپنے ہلکے پھلکے انداز میں لوٹتے ہوئے بولی تھی۔ ان کے لیے اب یہ منصوبہ چاہے ناقابل قبول تھا مگر اندر سے تو وہ بھی ایبہا سے چھٹکارا چاہتی تھیں، سو مان ہی گئیں، ضمیر کو بھی تاویل دے کر بہلا دیا۔
کون سا میں یہ سب کر رہی ہوں۔ میرا کام تو ساری صورت حال پر رد عمل ظاہر کرنا ہے اور بس۔
"اور وہ مرد کون ہو گا جو یہ ڈرامہ کرے گا۔؟" انہوں نے برسبیل تذکرہ پوچھا۔

"وہ آپ فکر مت کریں۔ میرا ایک بہت اچھا دوست ہے۔" سفینہ بیگم کو نیم رضامند پا کر۔ رباب کی آواز میں کھنک سی اتر آئی تھی۔ جبکہ وہ تو لفظ۔
"دوست" پر ہی اٹک گئیں۔
(اتنا گہرا دوست کہ ایسے منصوبے میں حصہ دار بنا لیا؟)
مگر جب عقل پر پردہ پڑ جائے تو آنکھوں کے ہوتے بھی انسان اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔ سفینہ بیگم بھی اسی صورت حال کا شکار تھیں۔

"اب جو بھی کرنا ہے' وہ ہم دونوں کو مل کر کرنا ہو گا آنٹی۔۔۔ آپ گھبرائیں مت۔ بس آپ کو موقع پر میرا ساتھ دینا ہے اور بس۔۔۔"
"بات بگاڑ مت دینا رباب۔"
"آپ بے فکر رہیں آنٹی! اب ہی تو صحیح معنوں میں بات بنے گی۔" رباب کا لہجہ عجیب سا تھا۔
"اتنی بدنامی ہو گی آپ کی بہو رانی کی۔۔۔ کہ معیز کے پاس اسے چھوڑنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں ہو گا۔" اور یہ خیال چاہے سفینہ کے لیے خوش کن ہی سہی کہ وہ ایبہا سے چھٹکارہ پا سکتی ہیں' ان کا دل بہت سے اوہام کا شکار تھا' مگر ایبہا کے لیے یہ گڑھے کھودنا بہت ضروری تھا۔ ورنہ تو کل کو وہ ان کی راجدھانی کی ملکہ بن بیٹھتی۔
انہوں نے اندر ہی اندر خود کو تاویلیں دے کر ضمیر کو تھپتھپایا تھا۔
دوسروں کے لیے گڑھے کھودنے والوں کے نصیب میں بھی خدا عموماً" وہی راستہ لکھ دیا کرتا ہے۔ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔۔۔ کبھی نہ کبھی وہ خود بھی اس راستے پہ ضرور آنکلتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک بے حد روشن' البیلی اور متوالی سی صبح تھی۔
ایبہا کی زندگی کی سب سے خوب صورت اور روشن صبح۔
معیز واش روم میں تھا۔ وہ خشک ہوتے بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے میں لپیٹے کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ نیچے وسیع لان میں پھولوں کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی' آج تو سورج سوا نیزے پر بھی ہوتا تب بھی ایبہا کے لیے یہ ایک جگمگاتی حسین ترین صبح تھی۔
وہ سحر زدہ سی ہواؤں کی پھولوں کے ساتھ اٹھکھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب معیز نے آہستگی سے آکر اسے بانہوں کے حصار میں لے لیا۔
لمحہ بھر کو وہ ہڑبڑا سی گئی۔
"کیا دیکھا جا رہا ہے؟"

وہ مسکرایا۔۔۔ ایبہا کے ہونٹوں پر بھی شرمگیں سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"زندگی۔۔۔" اس کا جواب بھرپور تھا۔
معیز نے اس کے جواب سے محظوظ ہوتے ہوئے اسے گھما کر اپنی طرف کیا۔
"تو پھر باہر کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔"
شرارت سے کہا تو وہ جھینپ سی گئی۔
"خوش ہو بیا۔۔۔؟" معیز کے دل کا ایک کونا شاید ہمیشہ کے لیے مضطرب رہنے والا تھا۔
"ہوں۔۔۔" اس نے بچوں کی طرح معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔ تو معیز نے اس کی پیشانی پہ لب رکھ دیے۔ ایبہا کے دل میں سکون سا اتر گیا۔
"جو بھی ہوا' اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں تھا معیز۔۔۔ یہ زندگی کے گزرنے کا ڈھنگ ہے اور ان طے شدہ راستوں پر سے ہر ایک نے گزرنا ہی ہے۔۔۔ مجھے حال میں جینا پسند ہے اور یہ اٹل حقیقت ہے کہ اس میں آپ میرے ساتھ ہیں۔ تو پھر میں خوش کیوں نہ ہوں گی۔"

اس کے مان بھرے لمس نے ایبہا کو بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔
"ارے۔۔۔" معیز ہنسا۔۔۔ پھر شرارت سے بولا۔
"میں تمہاری زبان چیک کروانے کا سوچ رہا تھا ڈاکٹر سے۔۔۔ مگر تم تو اچھا خاصا بول لیتی ہو۔"
ایبہا نے خفیف سا ہو کر اس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔ تو معیز بھرپور انداز میں مسکرا دیا۔

✡ ✡ ✡

معیز اور ایبہا ولیمے کی تقریب میں اس قدر مکمل اور ایک دوسرے کے جوڑ کے لگ رہے تھے کہ ہر ایک نے ان کی تعریف کی۔
سفینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بہو بیٹے کی تعریفیں سن کے خوش ہوں یا جلیں کڑھیں۔
فی الوقت تو ان کا دل رباب کے پلان میں اٹکا ہوا تھا۔
انہوں نے دور سے ایک گہری نگاہ اسٹیج پر ڈالی۔ معیز کے ساتھ شرمیلی سی مسکراہٹ لیے بیٹھی ایبہا آج ہمیشہ سے زیادہ پُراعتماد لگ رہی تھی۔
ان کا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ آج یہاں آنے سے پہلے وہ لحہ بھر کو ایبہا کے پاس رکیں، جب وہ اکیلی تھی۔
"آج دیکھنا۔۔۔ جو ذلت کی سیاہی تمہارے منہ پہ مل جائے گی۔ میرا بیٹا تھوکے گا بھی نہیں تم پر۔۔۔" انہوں نے زہریلے انداز میں کہا تو ایبہا گنگ رہ گئی تھی۔
بارات آئی تو معیز اور ایبہا بھی اسٹیج سے اتر آئے۔ زارا دلہن کے کمرے میں بالکل تیار بیٹھی تھی۔ چونکہ نکاح پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے کوئی افراتفری نہیں تھی۔
ایبہا نے معیز کا بازو تھاما۔ تو وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
"میں۔۔۔ زارا کے پاس چلی جاؤں۔"
وہ سب کے بیچ معیز کی وارفتہ نگاہوں سے نروس ہوئی جا رہی تھی۔
"اور اسے یوں ہی چھوڑ جائیں گی۔ شتر بے مہار۔" ثمر کی سماعت تیز تھی۔ اس نے لقمہ دیا تو ایک قہقہہ پڑا۔
"شٹ اپ۔۔۔" معیز ہنسا تھا۔
"چلو۔۔۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔"

اس نے ایبہا کا ہاتھ تھاما تو سب نے ہاؤ' ہو کا شور مچا دیا۔ معیز تو خیر عادی تھا مگر ایبہا کو شرم بھی آ رہی تھی اور ہنسی بھی۔
وہ اسے دلہن کے کمرے تک چھوڑ کر واپس پلٹ گیا تو ایبہا اطمینان کی سانس بھرتی اندر آ گئی۔
"شکر ہے۔۔۔ کوئی تو آیا ادھر۔۔۔ سب بارات دیکھنے بھاگ گئیں۔"
اسے دیکھ کر زارا نے شکر ادا کیا تھا۔
"بہت خوب صورت لگ رہی ہو زارا۔۔۔" ایبہا نے دل سے تعریف کی تو وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ صاف گوئی سے بولی۔
"مگر تم سے کم۔"
"ارے نہیں۔۔۔" ایبہا خجل سی ہو گئی۔
"سفیر بھائی بھی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔" جلدی سے کہا تو زارا مسکرائی۔

"ہاں۔۔۔ وہ ضرور لگ رہے ہوں گے۔"
باہر دودھ پلائی کی رسم ہو رہی تھی تو ہر کوئی اسٹیج پر چڑھا ہوا تھا۔
سفینہ بیگم تفکر کا شکار ہر جگہ ایبہا کو تلاشتی پھر رہی تھیں۔
وہ نہ ملی تو رباب کا پلان کیسے پورا ہوگا۔ یہیں ہال میں معیز کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اسے۔
انہوں نے دیکھا۔ معیز اکیلا ہی سب کزنز کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھا۔
انہیں کچھ خیال گزرا تو وہ تیزی سے دلہن کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئیں تو اندر کا عجیب سا ماحول دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔
اندر زارا اکیلی نہیں تھی۔ رباب اور اس کی امی بھی تھیں۔ زارا کے تاثرات عجیب سے تھے۔ ماں کو دیکھ کر وہ تیر کی تیزی سے لپک کر ان سے چمٹ گئی۔
"ماما۔۔۔!" اس کے آنسو بہنے لگے تو وہ پریشان ہو گئیں۔
"کیا ہوا میری جان۔۔۔ زارا کچھ بتاؤ تو۔۔۔"
انہوں نے تفکر سے باری باری رباب اور مسز احسن کی طرف دیکھا۔
پھر دوبارہ چونک کر رباب کو۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔
"میں بتاتی ہوں آنٹی۔۔۔ آپ کی بیٹی نے اپنے کسی پرانے واقف کار کو یہاں اکیلے میں ملنے کے لیے بلایا ہوا تھا۔"
رباب نے گویا دھماکا ہی کر دیا تھا۔ آن واحد میں جیسے سفینہ بیگم کے سر پہ چھت آگری۔
تب انہوں نے پہلی بار ایک طرف کھڑے چہرے پر خبیث مسکراہٹ سجائے شخص پر نظر ڈالی۔ جو بڑے اعتماد سے کھڑا تھا۔ ان کا دماغ سنسنانے لگا۔
رباب نے کہا تھا کہ یہ شخص میرج ہال میں سب کے سامنے جا کر ایبہا کے ساتھ اپنے افیئر اور ایبہا کی بے وفائی کا اعلان کرے گا۔۔۔ تو پھر غلطی کیسے ہوئی تھی؟ کسی کی بیٹی کی جگہ ان کی بیٹی کیسے بدنام ہونے لگی تھی؟
کیا یہی قانون قدرت تھا؟ اتنی جلدی وہ گڑھوں والے راستے پر نکل آئی تھیں؟ وہ گڑھے جو انہوں نے ایبہا کے لیے کھودے تھے۔
"یہ کیا بکواس ہے رباب۔۔۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔"
ان کی آواز مارے صدمے اور غم و غصے کے پھٹ سی گئی۔
انہوں نے سراسیمہ ہو کر مسز احسن کو دیکھا۔ ان کی رنگت بھی فق تھی۔ انہیں تو رباب لے کر آئی تھی کہ دیکھیں یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے۔
"جھوٹ یہ نہیں، آپ کی بیٹی بول رہی ہے۔" سیفی نے اطمینان سے کہا۔
زمین کانپ رہی تھی اور آسمان ان پہ گرنے کو تھا۔ ان کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہونے لگا۔
وہ رباب کا کھیل سمجھ گئی تھیں۔ وہ شخص معیز سے بدلہ نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ اس گھر سے منسلک ہر رشتے کو اپنے خاندان سے کاٹ پھینکنا چاہتی تھی۔
اور ایک اور لرزتا کپکپاتا وجود اسی کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں دروازے کے ساتھ لگ کے کھڑا تھا۔
سیفی کی نفرت انگیز آواز نے ایبہا کو کیا کیا یاد نہیں کروا دیا تھا۔۔۔ بے بس و معصوم لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرنے والا آج زارا کی زندگی سے خوشیاں چھیننے والا تھا۔

"ماما... یہ جھوٹ بول رہا ہے... میں تو اسے جانتی تک نہیں ہے ایک دم سے روم میں آگیا یہ..."
زارا روتے ہوئے اپنی صفائی دے رہی تھی۔
دفعتاً "ایہا" کو خیال آیا کہ وہاں کیا ہونے والا تھا۔
"میں بھائی کو بلا کے لاتی ہوں۔"
رباب کی پُرسکون آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس کے وجود پہ طاری لرزہ تھم گیا۔ زارا کی زندگی بربادی کے راستے پہ چل پڑی تھی۔
رباب نے سفیر کو کال کر دی تھی اور فی الفور برائیڈل روم میں آنے کا کہا تو پریشانی کے عالم میں معیذ بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔
"خدا گواہ ہے آنٹی! میں اس آدمی کو نہیں جانتی۔ میں بے گناہ ہوں۔" زارا اب سفیر کی امی کو یقین دلا رہی تھی۔
ایہا ایک دم سے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے لرزتے ہاتھ سے دروازہ کھول کے باہر نکلی۔
"زارا ٹھیک کہہ رہی ہے... یہ اس آدمی کو نہیں جانتی مگر میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"
اس نے مضبوط اور اونچی آواز میں کہا تو سب کے ساتھ بے اختیار سیفی بھی اس کی طرف گھوم گیا۔ حیرت و بے یقینی سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"یہ سفیان حمیدی ہے... سیفی... ہے نا؟"
وہ سفینہ بیگم کے بالکل ساتھ آکھڑی ہوئی اور اب بڑے اعتماد سے سیفی سے پوچھ رہی تھی۔
"یہ لو... یک نہ شد دو شد... بیٹی تو بیٹی... بہو بھی..." رباب ترخ کر کہنے لگی تھی کہ سفینہ بیگم اونچے سخت لہجے میں اسے ٹوک گئیں۔
"بکواس مت کرو رباب! میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں تمہاری چال کو..."
"آپ بے فکر رہیں آنٹی! یہ زارا سے نہیں مجھ سے ملنے آیا ہے۔ زارا تو اسے جانتی بھی نہیں۔"
مسز احسن سے کہتے ایک پل میں ہی ایہا نے زارا کو ہر الزام سے بری کر دیا تھا۔ رباب کا چہرہ نفرت سے سیاہ پڑنے لگا۔
اسی وقت دروازہ کھلا اور تیزی سے سفیر اور معیذ آگے پیچھے اندر داخل ہوئے اور اتنی دیر سے کلائمکس کا انتظار کرتا سیفی تو معیذ احمد کو وہاں دیکھ کر ہی بوکھلا گیا۔
رباب نے کہا تھا کہ بس وہ سفیر کو یقین دلا دے کہ زارا سے اس کا پرانا افیئر تھا اور آج وہ اس سے آخری بار ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا۔
مگر پہلے ایہا مراد اور اب معیذ احمد... سیفی کا تو سر ہی چکرانے لگا۔
"تم... "معیذ کے سر پہ تو حیرت کا آسمان ٹوٹ پڑا سیفی کو وہاں دیکھ کر۔
"وہ... میں... غلطی سے شاید اس روم میں آگیا تھا۔" سیفی ہڑبڑایا اور واپس پلٹنے کو تھا' جب معیذ نے اسے دانت پیستے ہوئے کالر سے پکڑ کے کھینچ لیا۔
مسز احسن نے تیزی سے سارا واقعہ کہہ سنایا تو اس کے بعد معیذ نے سرد مہری سے کہا۔
"یہ بدبخت ہی ذلیل آدمی ہے آنٹی! جس نے ایہا کو کڈنیپ کیا تھا۔ بدمعاشی اور عیاشی کا اڈہ چلانے والا۔"
سفینہ بیگم کو جھٹکا سا لگا۔ وہیں رباب کی رنگت بھی سفید پڑ گئی۔ ایراز اور عمر بھی وہاں آپہنچے تھے۔

معیز نے طیش کے عالم میں سیفی کو اچھی خاصی لگادیں۔ رباب دیوار سے پشت لگائے پھٹی آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

"میں کوئی اڈہ نہیں چلا رہا۔۔۔ غلطی سے اس روم میں آگیا تھا۔"

وہ اپنی بات پہ ڈٹا ہوا تھا۔ رباب ادھ موئی ہوئی جارہی تھی۔۔۔ اگر اب وہ رباب کا نام لے لے تو۔۔۔

مگر شاید سیفی کو اب بھی یقین تھا کہ رباب کسی کی بات کا یقین نہیں کرے گی۔ اس لیے اس نے فی الحال تو مار کھا کے بھی رباب کا حوالہ نہیں دیا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن اور میری بیوی پہ الزام تراشی کرنے کی۔"

معیز کا غصہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ عمر نے اسے سنبھالا۔

"میں اور ایراز اسے دیکھ لیتے ہیں۔ تم سفیر کو لے کے باہر جاؤ۔ مہمان بھرے پڑے ہیں۔ سو طرح کی باتیں بنیں گی۔"

سیکورٹی گارڈ کو بلوا کر ایراز اور عمر نکلنے کو تھے' جب عون بھی پریشان سا وہاں چلا آیا۔ سیفی کو وہاں دیکھ کر اس کو بھی حیرت نے گھیر لیا۔ ایراز اسے تفصیل بتانے لگا۔

مسز احسن نے آگے بڑھ کے زارا کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ سسکنے لگی۔

سب سے بری حالت رباب اور سفینہ بیگم کی تھی۔

"دیکھ لوں گا میں تم سب کو۔۔۔" سیفی بکواس کرتا دھمکیاں دیتا ان کے ہمراہ گیا تھا۔

معیز نے زرد رنگت لیے خاموش کھڑی ایبہا کو جا کر بازو سے تھاما تو وہ اس کے شانے سے آلگی۔

معیز کو پتا تھا اتنی سی دیر میں اس پر کیا قیامت بیت گئی ہوگی۔۔۔ مگر نہیں۔

اصل قیامت جو آئی اور آکر گزر گئی۔ اس کا پتا صرف رباب 'سفینہ بیگم اور ایبہا کو تھا۔

"چلو بھئی۔۔۔ اب دیر مت کرو۔ میری بیٹی کو لے جا کر اسٹیج پر بٹھاؤ۔ یہاں تو سیکیورٹی کا انتظام ہی بہت ناقص ہے۔ اللہ کا شکر کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

مسز احسن نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ عون نے ثانیہ کو بھیجا تھا۔ وہ آکر ایبہا کی طرف بڑھی۔

"تم ٹھیک ہو ایبہا۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

مسز احسن اور ثانیہ زارا کو باہر لے گئیں۔ رباب میں تو اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ اپنی جگہ سے ہل سکتی۔ ماں کے کہنے پر بھی یوں ہی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی تو وہ اس کی بعد میں گوشمالی کرنے کا سوچ کر چلی گئیں۔

"ریلیکس ایبہا۔۔۔ پہلے تو وہ بچ گیا تھا مگر اب دیکھنا لمبی سزا دلواؤں گا۔ اس خبیث انسان کو۔۔۔ تاکہ آئندہ کسی لڑکی کی زندگی برباد نہ کرسکے۔"

معیز اس کا ہاتھ تھامے تسلی دے رہا تھا۔ پھر بازو پھیلا کر سفینہ بیگم کو بازو کے گھیرے میں لیا تو ان کا جی چاہا اونچی آواز میں رو دیں۔

اتنا بین کریں کہ اس کمرے کی دیواریں اور چھت ان پر آگریں اور وہ یہیں دب کر مر جائیں۔

"تم چلو۔۔۔ میں آرہی ہوں۔"

انہوں نے معیز سے نگاہ ملائے بغیر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے ایبہا کو لے کر باہر نکل گیا۔

سفینہ بیگم نے نفرت بھری نظروں سے رباب کو دیکھا۔

"آج تمہاری بدکرداری نے میری آنکھوں پہ بندھی پٹی اتار دی رباب! اور تمہاری بدکرداری نے ہی میری بہو کا کردار بھی مجھ پر عیاں کردیا۔"

ان کی آنکھوں میں یکایک آنسو بھر آئے۔

انہیں خیال آیا کس طرح ابیہا نے ان کی بیٹی کی بدنامی کو اپنے سر لینے کی کوشش کی تھی۔

"اور میں سوچتی رہی کہ ابیہا کو صرف گھر توڑنا ہی آتا ہے۔ گھر تو تم جیسی لڑکیاں بساتی ہیں.... مگر میں غلطی پر تھی... اور وہ بھی اتنی فاش غلطی...." وہ حقارت سے اسے دیکھتی باہر نکل گئی تھیں۔

رباب پھوٹ پھوٹ کر روتی وہیں دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھتی چلی گئی۔

قسمت نے آج کیسے اسے دو خاندانوں میں رسوا ہونے سے بچایا تھا... وہ لرز سی گئی۔

اور سیفی... معیز احمد کو ٹھوکر مار کر وہ سیفی کے ساتھ تفاخر سے رخصت ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی اور وہ کیا نکلا۔ لڑکیوں کی فروخت کا کاروبار کرنے والا۔

آج پھر ابیہا مراد فرسٹ پوزیشن لے گئی تھی۔ رباب نے حسرت سے سوچا۔ فی الوقت تو اس کا اپنا نقصان اتنا بڑا تھا کہ وہ کسی اور کے متعلق نفرت انگیز... انداز میں سوچ بھی نہیں پا رہی تھی۔ بعد میں شاید اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ اسی نہج پہ دشمنی پال لیتی مگر فی الحال تو جس قیامت سے بچی تھی اسی کا خیال اسے لرزا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

زارا خیر و عافیت سے اپنے گھر رخصت ہو گئی مگر جو قیامت ان کے گھرانے کو چھو کر گزری تھی۔ اس کی حقیقت سے سفینہ بیگم ہی واقف تھیں۔

ابیہا کے لیے کھودے گڑھے میں ان کی اپنی بیٹی گر گئی۔ اس پر مستزاد ہاتھ بڑھا کے نکالا بھی ابیہا نے ہی تھا۔

وہ ماں ہو کر بھی اس پل اپنی بچی پر سے وہ داغ اتار نہ سکتی تھیں جو ابیہا نے آرام سے اپنی ذات پر سجا لیا۔ فقط اس گھر کی عزت بچانے کے لیے۔

ساری رات وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہیں۔ اللہ سے معافی کی طلب گار رہیں۔

صبح تک وہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔

ابیہا سے بے بنیاد نفرت نے انہیں اتنا گھٹیا پن اپنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جسے ہر وقت بھگوڑی ماں کی گھٹیا تربیت کے طعنے دیتی رہتی تھیں اور رباب... ایک باعزت گھرانے اور بہترین ماحول میں پرورش پانے والی۔ سفیر احسن کی بہن... انسان کا کردار اس کی فطرت کی بنیاد پر بنتا ہے۔ اگر فطرت اچھی ہو تو ڈاکو کا بیٹا مولوی اور اگر فطرت بری ہو تو مولوی کا بیٹا ڈاکو بن سکتا ہے۔

مگر سفینہ بیگم کو کڑے تجربے کے بعد یہ علم حاصل ہوا تھا۔ شام کو زارا کے ولیمہ کا فنکشن تھا۔

ڈاکٹر گھر آ کے سفینہ بیگم کو چیک کر کے دوائیں دے کر گئی تھی۔

ایراز اور عمر کمرے میں تھے۔ ممانی جان ادھر ادھر کی باتوں سے ان کا دل بہلا رہی تھیں۔ معیز ابھی کمرے میں آیا تھا۔

"شام تک بالکل ٹھیک ہو جائیں آپ... زارا پریشان ہو جائے گی وہاں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ تو سفینہ... کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چار سالوں سے وہ معیز کے ہنسنے مسکرانے کی دعائیں مانگ رہی تھیں مگر جب اس نے مسکرانا سیکھا تو سفینہ

بیگم کو اچھا نہیں لگا۔ تف ہے مجھ پہ۔۔۔ وہ دل ہی دل میں کڑھیں۔
انہیں آزردہ دیکھ کر وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ یقیناً" وہ سیفی والے معاملے کو لے کر اتنی حساس ہو رہی تھیں۔
"ڈونٹ وری ماما! وہ صرف ایک ایکسیڈنٹ تھا۔ کمینہ انسان اب سالوں جیل میں سڑے گا۔ کافی کیس ڈلوائے ہیں اس پر۔۔۔"
"تم نے کہا تھا وہ گھر کو بنانے اور جوڑنے والی ہے۔۔۔ اور وہ اپنے ماں باپ سے بہت مختلف ہے۔"
وہ رندھے لہجے میں بولیں تو معیز حیران سا انہیں دیکھنے لگا۔ سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔
وہ یقیناً" ایہا کی بات کر رہی تھیں۔
"تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا معیز۔ کل اس نے ہمارے گھر کی عزت بچالی۔"
وہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔
"میری بیٹی پہ لگنے والا الزام اپنے سر لے لیا اس نے اور اس نے بتا دیا کہ شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں کیسی ہوتی ہیں۔"
انہوں نے روتے ہوئے کہا۔ تو معیز نے سنجیدگی سے کہا۔
"اس نے جو کیا وہ اس کا فرض تھا ماما۔ آپ دل پہ بوجھ مت رکھیں۔" معیز کا انداز ایسا ہی تھا جیسے انہیں ذہنی پریشانی سے بچانے کی خاطر بہلا رہا ہو۔
مگر سفینہ بیگم کا دل تو مستقل جیسے مٹھی میں آیا ہوا تھا۔ وہ جب بھی اپنے اور رباب کے بنائے گھٹیا منصوبے کی بابت سوچتیں تو ان کی تڑپ میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ زارا کی بخیر و عافیت رخصتی کے بعد سے انہوں نے ایک پل بھی چین نہ پایا تھا۔
"اے متکبر انسان۔۔۔! اے خاک اور نطفے سے پیدا ہونے والے متکبر انسان! اگر تو اپنی زندگی کی "بنیاد" پر ہی غور کرلے تو تیری ساری اکڑ عاجزی میں بدل جائے۔ مگر نہیں۔ ہم اکثر اپنی ان خوبیوں پر بڑا اتراتے ہیں جن کے ہونے میں ہمارا کوئی کمال ہی نہیں۔ جو سب اس رب ذوالجلال کی نوازی ہوئی ہیں تو بجائے اس کا شکر ادا کرنے کے ہم اس کی (نعوذ باللہ) خصوصیت اپنانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ تکبر صرف اس ذات کریمی کو زیب دیتا ہے جس نے اپنے جاہ و جلال پر اپنی رحمت کو حاوی کر رکھا ہے۔"
سفینہ بیگم کی آنکھیں بھی زوردار ٹھوکر کھانے کے بعد کھلی تھیں۔ انسان جس کے سامنے غرور و تکبر کے مظاہرے کرتا ہے اللہ اکثر اسی کے سامنے انسان کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ تو کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟
سفینہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ اللہ نے ان کی عزت اس کے ذریعے رکھی تھی جسے وہ عزت کے قابل سمجھتی ہی نہ تھیں۔ اللہ کو انسان سے ناک رگڑوانا آتا ہے۔ اپنے مقرر کردہ دائرے سے باہر نکلتی سفینہ اور رباب کو پلٹ کر دائرے میں پٹخا گیا تھا۔
"اسے بلاؤ معیز۔۔۔! اس کا بہت قرض ہے مجھ پر۔" وہ رو رو کر تھک سی گئیں۔
ممانی جان کے اشارے پر وہ جا کر کچن میں سوپ بناتی ایہا کے پاس کھڑا ہوا۔
"میں بس دو منٹ میں لا رہی تھی۔" وہ بہ عجلت باؤل اور چمچ صاف کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔ مہندی سے رچے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔
"آنٹی غصے میں تو نہیں۔۔؟" وہ ذرا جھجکی۔
"تم نذیراں سے کہتیں۔ خود کیوں بنانے کھڑی ہو گئیں۔" معیز نے اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو تھاما اور

الگ ہی بات کی تو وہ جھینپ کر مسکرادی۔
"یونہی۔ میں نے سوچا شاید آنٹی کو اچھا لگے۔"
"بہت اچھا لگے گا۔" معیذ زور دے کر بولا تو ایہما خفیف سا مسکرادی۔ اور اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ اور باؤل میں سوپ نکالنے لگی۔
"ماما تمہیں بلا رہی تھیں۔" ایہما ٹھٹکی۔ پھر ہاتھ روکا اور چہرہ موڑ کر معیذ کو دیکھا اس نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر شانے اچکا دیے۔
"وہاں سب ہوں گے ان کے پاس؟" ایہما نے جھجک کر پوچھا۔ (اکیلے میں بے عزتی برداشت ہو جاتی تھی مگر یوں سب کے سامنے عزت اتارنا۔) اسے جھرجھری سی آئی۔
معیذ کے پیچھے سوپ کا پیالہ لیے وہ ڈری سہمی سی کمرے میں آئی۔ تو سفینہ بیگم کے ذہن میں اس کی گم شدگی والا دن لہرا گیا۔ جب انہوں نے کھانے کے برتن اٹھا کے اسے دے مارے تھے۔ اور اسی رات زارا کے کہنے پر محض ان کے سکون کی خاطر وہ تن تنہا گھر سے نکل گئی تھی۔
شاید ایہما کے ذہن میں بھی کچھ ایسا ہی خیال ہو جب ہی وہ شکل ہی سے سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ادھر آؤ۔" سفینہ بیگم نے اس کے لیے اپنے پاس جگہ بنائی تو وہ سائیڈ ٹیبل پر سوپ کا پیالہ رکھتی ان کے پاس آبیٹھی۔
دل میں ایک وہم سا بد ستور موجود تھا۔ سفینہ بیگم کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ مگر یہ کیا۔؟ ایہما حیرت سے مرنے کو ہو گئی۔

انہوں نے دفعتاً" اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔
"مجھے معاف کر دو ایہما۔"
وہ ششدر تھی مگر ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے ان کے بندھے ہاتھ تھام کے کھول دیے۔
"مجھے گناہ گار مت کریں آنٹی۔!" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔
"گناہ گار تو میں ہوں۔ اب تلافی کا طریقہ تم بتادو۔" وہ رونے لگیں۔
کتنی کمینگی اور گھٹیا پن دکھا چکی تھیں وہ اس کامنی سی لڑکی کو۔ مگر اب غرور و تکبر کا بت پاش پاش ہو چکا تھا۔
ایہما نے ان کے ہاتھ تھامے ہوئے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھ کر سادگی سے کہا۔
"بس! مجھے اپنی بیٹی کہہ دیں۔ ماؤں کی ہر کوتاہی اپنے آپ معاف ہو جایا کرتی ہے۔"
روتی آنکھوں سنگ اس نے اتنی پیاری بات کی تھی کہ سفینہ نے کھینچ کر اسے گلے سے لگالیا۔ اور رونے لگیں۔ باقی سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔
صبر اور شکر۔ کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ ایہما بھی ان ہی دو ہدایتوں کو تھامے آج منزل پر شاداں و فرحاں پہنچ گئی تھی۔ غم و اندوہ کے سائے کہیں دور رہ گئے تھے۔
اور ایہما کو دیکھتے معیذ کا دل اپنے رب کے حضور سجدۂ شکر بجا لایا۔ ایہما اس کی زندگی میں قبول ہونے والی وہ مبارک دعا تھی جو اس نے مانگی ہی نہ تھی۔ مگر جانے کس نیکی کے صلے میں معیذ کی جھولی میں انعام کے طور پر ڈال دی تھی
سفینہ بیگم کے گلے لگی ایہما نے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ معیذ کو دیکھا تو وہ بھی خوش دلی سے مسکرادیا۔ کہ اب ان کی زندگی پر غم اور غلط فہمیوں کا سایہ تک نہ تھا۔

✡

نور فاطمہ

عہد

"صفر، چار، آٹھ، صفر، تین۔"

"اوکے اب پہنچ جانا واقعی پانچ منٹ میں۔"

"ہاں ہاں بس میں آئی۔" عالیہ نے اپنی طرف سے سائرہ کو پوری یقین دہانی کروائی مگر یہ الگ بات تھی اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ سائرہ کو ابھی ابھی عالیہ نے عجلت بھرے انداز میں اپنا ایمپلائی کوڈ، فون پر لکھوایا تھا تاکہ وہ اس کوڈ کو پنچ کردے۔ آٹھ بجے سے پہلے پہلے۔

یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ عالیہ کو دفتر پہنچنے میں دیر ہو رہی ہو یا کہ ہو گئی ہو۔ شادی کے بعد تو یہ تقریباً معمول ہی بن گیا تھا۔ آٹھ کے بجائے سوا آٹھ یا کبھی کبھی تو ساڑھے آٹھ بھی۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ دیر سے آنے والوں کی اس لسٹ میں عالیہ اکیلی نہیں تھی۔ کچھ اور بھی لوگ اس قسم کے مسائل کا شکار تھے، سو دفتر انتظامیہ نے اس سے نپٹنے کے لیے حال ہی میں "کمپیوٹرائزڈ اٹینڈنس" متعارف کروائی تھی اور ہر "ایمپلائی" کو ایک کوڈ جاری کر دیا گیا تھا، جسے دروازے میں داخل ہونے کے لیے اسے پنچ کرنا ہوتا تھا اور اس سے اس کی حاضری ریکارڈ کرلی جاتی تھی۔

جو ایمپلائی آٹھ بجے سے ایک منٹ بھی اوپر ہوتا تھا اس کا نام خود بخود دیر سے آنے والوں میں شامل ہو جاتا اور اس دن اس بے چارے کا "ہاف ڈے" گنا جاتا۔ اور تین ہاف ڈیز کا مطلب تھا ایک پورے دن کی لیو یعنی غیر حاضری۔

شروع شروع میں تو تمام لوگوں نے بہت شور کیا کہ یہ کیا بات ہوئی، دفتر بھی آؤ، کام بھی کرو اور چھٹی ظاہر ہو اور تنخواہ بھی کٹواؤ۔ لیکن آہستہ آہستہ انتظامیہ کا سخت رویہ دیکھ کر سب جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اور سب نے نئے زمانے کی نئی حاضری کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا۔ ہاں اس کی وجہ سے عالیہ اور اس جیسے چند اور لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ اور اس کا حل ان ہی میں سے کسی نے یوں نکالا کہ اپنے کسی دوست کو اپنا کوڈ بتا دیتے، جس دن "دیر" ہونے کا خطرہ ہوتا اور وہ مہربان دوست نوکری خطرے میں ڈال کر اسے پنچ کر دیتا اور یہ

"لیٹ کمر" پانچ منٹ یا سات منٹ میں حاضر ہو جاتا کیونکہ نظام نیا نیا تھا تو اس کی گنجائش تھی۔ احتیاط برتی جاتی کہ "لیٹ کمر" مزید "لیٹ" نہ ہو ورنہ۔

"شکر ہے۔" عالیہ نے بیگ کرسی پر رکھتے ہوئے رکا ہوا سانس خارج کیا اور ساتھ ہی سائرہ نے بھی۔ کیونکہ ٹھیک سوا آٹھ بجے منیجر صاحب راؤنڈ لیتے اور اگر عالیہ موجود نہ ہوتی تو اس کے ساتھ ساتھ سائرہ کی بھی۔ سوچتے ہی سائرہ کو جھرجھری آگئی۔

"بھئی عالیہ! دس از دا لاسٹ ٹائم، آئی ہیلپڈ یو۔" (یہ آخری دفعہ ہے کہ میں تمہاری مدد کر رہی ہوں)۔ قدرے ناراض سائرہ نے عالیہ سے آہستہ آواز میں کہا۔

"یار، سوسوری، آئندہ نہیں ہوگا۔" عالیہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

جانتی تھی کتنا مشکل ہے کسی کی آج کل ایسی مدد کرنا یہ تو شکر ہے کہ حاضری کوڈ کے ذریعے تھی بائیو میٹرک نہیں۔ ورنہ انگلی، انگوٹھا تو عالیہ دینے سے رہتی۔

"چلو اب سوچوں میں غرق نہ ہو جانا۔ یہ فائل کی انٹری مکمل کرو۔ دس بجے میل کرنی ہے۔" سائرہ نے عالیہ کی پریشانی دیکھ کر ماحول کو نارمل کرنے کے لیے اسے چھیڑا۔ عالیہ مسکرا کر جلدی جلدی اپنے کام پر جھک گئی۔

☼ ☼ ☼

ایسا نہ تھا کہ عالیہ وقت پر اٹھتی نہ تھی یا کام میں جان بوجھ کر دیر کرتی تھی۔ بلکہ عالیہ بے چاری تو صبح سب سے پہلے اٹھتی۔ جو کام اس کے ذمے ہوتے سب کرتی۔ ساس کی "بیڈٹی"۔ پھر ان کا ناشتا۔ عادل کے کپڑے تو وہ رات کو ہی استری کر دیتی اور اپنے بھی۔ پھر عادل کا ناشتا بنا کر اسے ڈھک کے رکھنے کے بعد خود تیار ہوتی۔ اگر ٹائم بچتا تو اپنا بھی ناشتا بنا لیتی اور کبھی کبھار گھر میں کھانے کی عیاشی بھی کر لیتی ورنہ زیادہ تر تو ناشتا بنانے کا وقت ہی نہ ہوتا یا پھر بن جاتا تو پیک ہو کر دفتر



کی بریک میں ہی کھایا جاتا۔ اور عالیہ کے ساتھ یہ مسئلہ صرف یہاں تک نہ تھا بلکہ دفتر سے گھر اور پھر گھر سے دفتر۔ سب ہی کچھ متاثر تھا۔ لگتا تھا کہ شاید ہی کوئی کام وقت پر ہو پاتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات تھی۔ عادل کا موڈ یکدم ہی چکن بریانی کھانے کا ہو گیا جبکہ عالیہ کے مینو میں چکن بریانی دو دن بعد شامل تھی۔ اور اس دن عالیہ کو سادہ دال چاول' سلاد کے ساتھ بنانے تھے۔ شوہر کی فرمائش بھی ٹالی نہیں جاسکتی تھی سو عالیہ نے دال کے ساتھ ساتھ چکن بھی پکنے کے لیے رکھ دی۔ لیکن فریز ہوا چکن اتنی جلدی تو پکنے سے رہا۔ عالیہ نے سوچا کہ پہلے عادل کو رشین سلاد دے دیتی ہوں تاکہ بھوک میں کچھ کمی واقع ہو اور ویسے بھی کل ہی اس نے ٹی۔ وی پر دیکھا تھا کہ سلاد بھوک بڑھانے کا کام کرتا ہے تو عالیہ نے سوچا کہ عادل کی بھوک بریانی کھانے کے لیے خوب چمک جائے گی۔ جلدی جلدی عالیہ نے رشین سلاد کے لیے آلو ابالنے رکھے اور اس کے لیے تھوڑی دیر کے لیے دال کو چولہے سے ہٹا دیا۔

دال بھی پکنی ضروری تھی کہ امی (ساس) پرہیزی کھانا کھاتی تھیں' مرچ برداشت نہیں کرسکتی تھیں اور عادل چیٹ پٹا کھانا کھائے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ سو وہ دال میں تو گرم مسالا چھڑک کر بگھار سے کچھ اور سجا کر عادل کو دے دیتی اور امی کو سادہ دال۔

اب عالیہ نے بھیگے ہوئے چاول دیکھے اور سوچا کہ بریانی کے لیے نئے چاول بھگو لے کیونکہ جب تک چکن گلتی ان چاولوں کو بھیگے بہت دیر ہو جاتی اور جب تک بریانی کے چاول کا دانہ دانہ الگ نہ دکھتا عادل کی پسند کے معیار پر پورا نہ اترتا۔ عالیہ لاکھ کہتی۔ چکھ کر دیکھیں۔ لیکن عادل کی ایک ہی بات "پہلے دیکھنے میں تو اچھے لگیں پھر اگلا مرحلہ"۔ اس کے لیے عادل کے پاس سو بہانے۔

"بھئی دیکھو! پہلے کوئی چیز آنکھوں کو بھلی لگتی ہے پھر اسے لینے کا سوچا جاتا ہے اور لے کر پرکھا جاتا ہے۔ اچھی لگے تو رکھا جاتا ہے ورنہ کئی چیزیں مجبوری میں بھی رکھی جاتی ہیں۔" آخری بات کہتے کہتے عادل کا لہجہ شرارتی ہو جاتا اور عالیہ صاف جان جاتی عادل اسے چھیڑ رہا ہے۔

یہ بات عادل اسے بارہا بتا چکا تھا کہ اسے عالیہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگ گئی تھی اور پھر اس کے بعد ہی اس نے امی کو مجبور کیا تھا کہ عالیہ کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔ عالیہ کو اس نے کسی دوست کی شادی کی تقریب میں دیکھا تھا اور اسے یہ معصوم اور قدرے جھجکی ہوئی لڑکی پہلی نظر میں ہی پسند آگئی تھی۔ عادل کی جاب اچھی تھی اور شکل و صورت بھی تو یوں عالیہ کے گھر والوں نے کچھ رسمی تکلف کے بعد یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔

ویسے عالیہ بھی ایک سلجھی ہوئی' بڑوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اور شادی کے چھ مہینے میں نہ تو اسے کسی شکایت کا سامنا تھا اور نہ ہی عادل اور اس کی امی کو۔ ہاں بس یہ تھا کہ کبھی کبھار عادل کو لگتا کہ عالیہ بہت سی چیزیں وقت پر نہیں کر پاتی کوشش کے باوجود۔

عادل خود ایک مصروف بندہ تھا۔ صبح نو بجے سے لے کر رات نو بجے تک اس کا کام تھا۔ کبھی کبھار اتوار والے دن بھی چھٹی نصیب نہ ہوتی تو اس کے پاس اتنا وقت کم ہی ہوتا کہ تفصیل سے عالیہ کی روٹین دیکھے۔

جاب کرنا عالیہ کا شوق کم اور مجبوری (خاص کر آج کل) زیادہ تھی۔ کیوں کہ عادل نے سوچ رکھا تھا کہ دونوں محنت کر کے دو سال تک اپنا کوئی پلاٹ وغیرہ لے لیں گے تاکہ بعد میں بچوں کے اخراجات کے ساتھ تھوڑی بہت بچت بھی ہو تاکہ مشکل نہ ہو۔ ساری عمر کرائے کے گھر پر گزارنے کے بعد اپنا گھر حاصل کرنا عادل کا ہمیشہ کا خواب تھا اور عالیہ اس سلسلے میں اس کا بھرپور ساتھ دینا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن تھا۔ عادل صبح دیر سے اٹھا تھا۔ عالیہ بھی امی کو بیڈ ٹی دے کر تھوڑی دیر کے لیے سو گئی تھی۔ ویسے بھی آج کل اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ دس

بجے اٹھ کر امی کو ناشتا دیا تھا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری اپنے ناشتے کے ساتھ شروع کردی تھی۔ امی کا اصول تھا دوپہر کو کھانا سادہ ہونا چاہیے چاہے چھٹی کا دن ہو لیکن آج عادل کا زبردست موڈ دیکھ کر امی نے بھی بریانی کی اجازت دے دی تھی۔ سو عالیہ دال چاول' بریانی' سلاد اور رشین سلاد سب کچھ بنانے کے چکر میں گھن چکر بنی ہوئی تھی۔

عادل تو چھٹی والے دن ناشتا کرتا ہی نہ تھا سو عالیہ کو کھانا پکانے کی جلدی ہوتی لیکن ساتھ میں وہ اپنا ناشتا بنا لیتی اور کھانا پکانے کے دوران ہی کھا بھی لیتی لیکن آج تو ناشتا کرنے کا وقت ہی نہ ملا تھا اور بے چارہ ناشتا پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

ایک بجنے کے قریب تھا اور کوئی چیز تیار نہ تھی۔ عالیہ نے چکن بھونتے بھونتے دال کا بگھار بھی اتارا اور جلدی جلدی ابلے ہوئے آلو کٹے ہوئے سیبوں کے ٹکڑوں میں ڈالنے لگی۔ ابھی مایونیز میں کالی مرچ ڈال کر پھینٹنے ہی لگی تھی کہ یاد آیا کہ بریانی کے لیے چاول تو بھگونا بھول ہی گئی اور اوپر سے ستم ظریفی کہ دال کے ساتھ کھانے کے لیے بھگوئے ہوئے چاول چولہے پر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ابھی تک نہ ابالے گئے تھے۔ جلدی جلدی رشین سلاد چھوڑ کر بریانی کے چاول بھگوئے۔ دال کو چولہے سے اتارا اور چاولوں کا پانی چڑھایا۔ چکن کو ایک فائنل بھونی لگا کر اتار کر سلیب (Slab) پر رکھا۔ اتنی سی دیر میں ایک بج گیا اور سوا ایک بجے ہر صورت امی کھانا کھاتی تھیں۔ عام دنوں میں تو عالیہ دفتر میں ہوتی مگر چھٹی والے دن کھانا عالیہ کی ہی ذمے داری تھی۔

اب عالیہ نے جلدی میں جو دو گھنٹے سے بھیگے ہوئے چاول ابالے تو چاول نرم ہو گئے بلکہ کچھ زیادہ ہی نرم ہو گئے۔ خیر امی عادل کی طرح کھانے سے انکار تو نہیں کرتی تھیں لیکن عالیہ کے لیے شرمندگی کی بات تھی کہ پورے ایک ہفتے کے بعد بھی وہ گھر والوں کو اچھا کھانا بھی نہ کھلا سکی۔ اسی خیال کے تحت عالیہ نے سوچا کہ وہ بریانی کے لیے جو چاول ابالے گی اس سے ہی کچھ علیحدہ نکال کر علیحدہ سے دم بھی دے دے گی اور یہ چاول "اف بھئی بعد میں دیکھ لوں گی۔" عالیہ نے خود کو تسلی دی۔

بریانی کے چاول کا پانی رکھا تو یاد آیا' رشین سلاد پورا نہیں بنا اور وہ اس لیے بنانا ضروری تھا کہ عادل کو بریانی پکنے کے دوران دے دیا جائے تاکہ وقتی بھوک کا علاج ہو سکے اور بریانی کے لیے بھوک چمک جائے مگر اس سب چکر میں وہ یہ مکمل طور پر بھول گئی تھی۔ جب تک عالیہ نے رشین سلاد بنا کر فریج میں رکھا تاکہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے اور امی کے لیے کھانا ٹرے میں سجایا تو ڈیڑھ بج چکا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ امی ظہر کی نماز شروع کر چکی ہیں۔ پھر بھی عالیہ نے سوچا کہ دیکھ لیا جائے اور ٹرے امی کے کمرے میں لے گئی۔

امی واقعی نماز شروع کر چکی تھیں۔ عالیہ نے خاموشی سے ٹرے اٹھائی اور واپس کچن میں ڈھک کر رکھ دی۔ بریانی کے چاول میں چکن کی تہ لگا کر دم پر رکھی اور فریج سے رشین سلاد نکالا۔ عادل کی عادت تھی چھٹی والے دن سارا دن کمرے میں گزارنا یہاں تک کہ کھانا پینا بھی۔ سو عالیہ نے بڑے گہرے پیالے میں سلاد ڈالا اور جیسے ہی کمرے کی طرف رخ کیا تو عادل کو چابی اٹھائے جانے کے لیے تیار شیار پایا۔

"یہ رشین سلاد" بمشکل عالیہ کے منہ سے الفاظ ادا ہوئے۔

"کھا لینا خود ہی۔" عادل کتنا غصے میں ہے یہ جاننے کے لیے عالیہ کو کسی خاص علم کی ضرورت نہیں تھی۔

"وہ... بس ذرا دیر ہو گئی۔ آپ یہ کھائیں' میں بس دس منٹ میں بریانی لا رہی ہوں۔" عالیہ نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"سوری عالیہ! صبح سے انتظار کر کر کے میری بھوک مر گئی ہے اور شہزاد کا فون آگیا ہے اور ہمارا باہر کھانے کا پروگرام بن گیا ہے۔"

"مگر وہ بریانی" عالیہ منمنائی۔

"وہ بھی خود کھا لینا۔" عادل سنگ دلی سے بولا۔

"مگر اتنی زیادہ..." عالیہ کی آواز رندھ گئی مگر عادل

تب تک جا چکا تھا۔

جلدی سے گلے میں آنسو دھکیل کر عالیہ امی کے کمرے میں گئی۔ امی نماز ختم کر چکی تھیں اور اب تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

"وہ امی... سوری' وہ کھانا..." بے ربطی سے عالیہ جملے ادا کرتی انگلیاں مروڑتی گویا ہوئی۔

"بیٹا... رات میں کھالوں گی' اب دیر ہو گئی ہے اور میں نے پھل وغیرہ کھالیے تھے۔" امی نے پھلوں کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرمی سے کہا تو عالیہ روہانسی ہو گئی۔

"سوری امی! آئندہ خیال رکھوں گی۔ بس وہ عادل نے بریانی... اور پھر میں نے سوچا کہ رشین سلاد... تو وہ سب..." بس اس سے آگے عالیہ سے بولا ہی نہ گیا۔

اپنی حالت' رات کے فاقے اور سب چیزوں کے الٹ پلٹ' کھانے کا لیٹ ہونا' عادل کی ناراضی اور کھانا نہ کھانا... سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ اوپر سے امی کی نرمی بھری آواز' عالیہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"سوری امی... وہ... سوری۔" بس اس سے آگے کچھ کہا ہی نہ جا رہا تھا۔

"اوہو۔ ادھر آؤ میری بچی! میں کوئی ناراض نہیں۔ تمہیں پتا ہے نا کہ میں ذرا وقت پر کھانا کھاتی ہوں۔ مریض بندہ ہوں بس اس لیے۔ تم پریشان نہ ہو۔ میں نے کہا نا کہ رات کو کھالوں گی۔" امی نے پچکارتے ہوئے عالیہ کو پیار کیا' لیکن عالیہ کے رونے میں اور شدت آگئی تھی۔

"امی! سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ہر کام لیٹ ہو جاتا ہے۔ سب کو خوش کرنا چاہتی ہوں' لیکن سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے دن میں چوبیس نہیں اڑتالیس گھنٹے ہونے چاہئیں۔" عالیہ کی آخری بات پر امی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"نہ میری بچی... پہلے تو تم یہ جان لو کہ تم مجھے اپنی بیٹی کی طرح پیاری ہو اور ہم سب تم سے بہت خوش ہیں۔ ہاں بس جہاں تک کام میں دیر کا سوال ہے تو اس کا کچھ سوچنا ہوگا۔ بیٹی! اگر دن میں چوبیس کے بجائے اڑتالیس بلکہ بہتر گھنٹے بھی ہوں نا تب بھی ایک چیز بہت ضروری ہے جسے کہتے ہیں "ٹائم مینجمنٹ" یعنی ہر کام وقت پر کرنے کی کوشش کرنا۔

میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم کوشش نہیں کرتیں بلکہ تم بہت زیادہ کوشش کرتی ہو بس اس میں ایک چیز شامل کر لو کہ ہر کام کرنے کا اندازہ مقرر کرنے کی کوشش کرو۔ اور اپنے آپ کو ٹارگٹ دو کہ وہ کام اس مقررہ کردہ وقت میں مکمل ہو۔ شروع میں تمہیں مشکل ہوگی' لیکن آہستہ آہستہ تم دیکھو گی کہ یہ اتنا ناممکن یا مشکل نہیں اور ہاں! ایک بات اور! اتنا ہی کام کا پھیلاوا رکھو جتنا سمیٹ سکو۔" امی نے عالیہ کے بال بچوں کی طرح سہلاتے ہوئے کہا۔

"چلو اب پہلے پلیٹ میں میرے اور اپنے لیے بریانی لاؤ۔ صبح سے تم نے کچھ کھایا نہیں۔" امی کی اس بات پر عالیہ نے چونک کر دیکھا۔ جانتی تھی امی پرہیزی کھانا لیتی ہیں۔

"بھئی کبھی کبھی بدپرہیزی جائز ہے۔" امی نے مسکرا کر کہا۔ "اور ہاں رشین سلاد بھی لانا۔"

عالیہ نے روتی آنکھوں سے مسکرا کر "اچھا جی" کہا اور کھانا لینے کے لیے اٹھنے لگی کہ اچانک پھر بیٹھ گئی۔ امی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر سمجھ گئیں۔

"فکر نہ کرو۔ عادل آیا تو اس کو سمجھا دوں گی۔ تمہاری حالت بھی ایسی ہے اور تمہیں پتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ناراض نہیں رہنے والا۔"

عالیہ نے شکر گزاری اور محبت کے ملے جلے تاثرات سے اپنی ساس کو دیکھا اور دل میں دو باتوں کا عہد کرتے ہوئے کھانا لینے چل پڑی۔ ایک تو امی کی نصیحت کے مطابق "ٹائم مینجمنٹ" کا خیال رکھنے اور دوسرا... دوسرا اپنی ماں جیسی نیک صفت ساس کی اور بھی دل سے قدر کرنے اور خیال کرنے کا...

ناولٹ

"تین اور یہ چار۔" اس نے چیکو کے درخت کی شاخوں کو نگاہوں سے مزید ٹٹولا پھر حریم کو چار کا اشارہ کیا۔ وہ مسکرادی۔

"آپو! گھونسلے ختم' اب بال کھیلیں۔" زین جو اس کے ساتھ گھونسلے کھوج رہا تھا' اکتاکر بولا' اس نے جھک کر دونوں کو پیار کیا' پھر زیب سے گیند لے کر ان کے ساتھ دھیرے دھیرے کھیلنے لگی۔ نانو' مما' فرح مامی جانے کون سی خاندانی باتوں میں مگن تھیں۔ نشاط ممانی بھی قریب ہی بیٹھی تھیں' مگر خاموشی سے چائے پی رہی تھیں۔ چھوٹے سے لان میں موتیا کی خوشبو

"یار! ہم بھی ساتھ کھیلتے ہیں' بلکہ پارٹنر بن جاتے ہیں۔" وہ اسے اچھالتے ہوئے بولا۔

"اوہ میری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" بریرہ تیزی سے کرسیوں کی طرف بڑھی تو اس نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی' پھر دونوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔

وہ آکر تھرماس سے چائے نکالنے لگی۔

"مغرب ہونے والی ہے۔ درختوں کے نیچے سر ڈھانپ کر رکھا کرو۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ نشاط ممانی کے چہرے پر تناؤ تھا' اس نے جلدی سے اپنا دوپٹا سر پر ڈالا۔ حریم بھی کچھ چپ سی ہوگئی۔ عمارہ نے

ملیحہ صدیقی

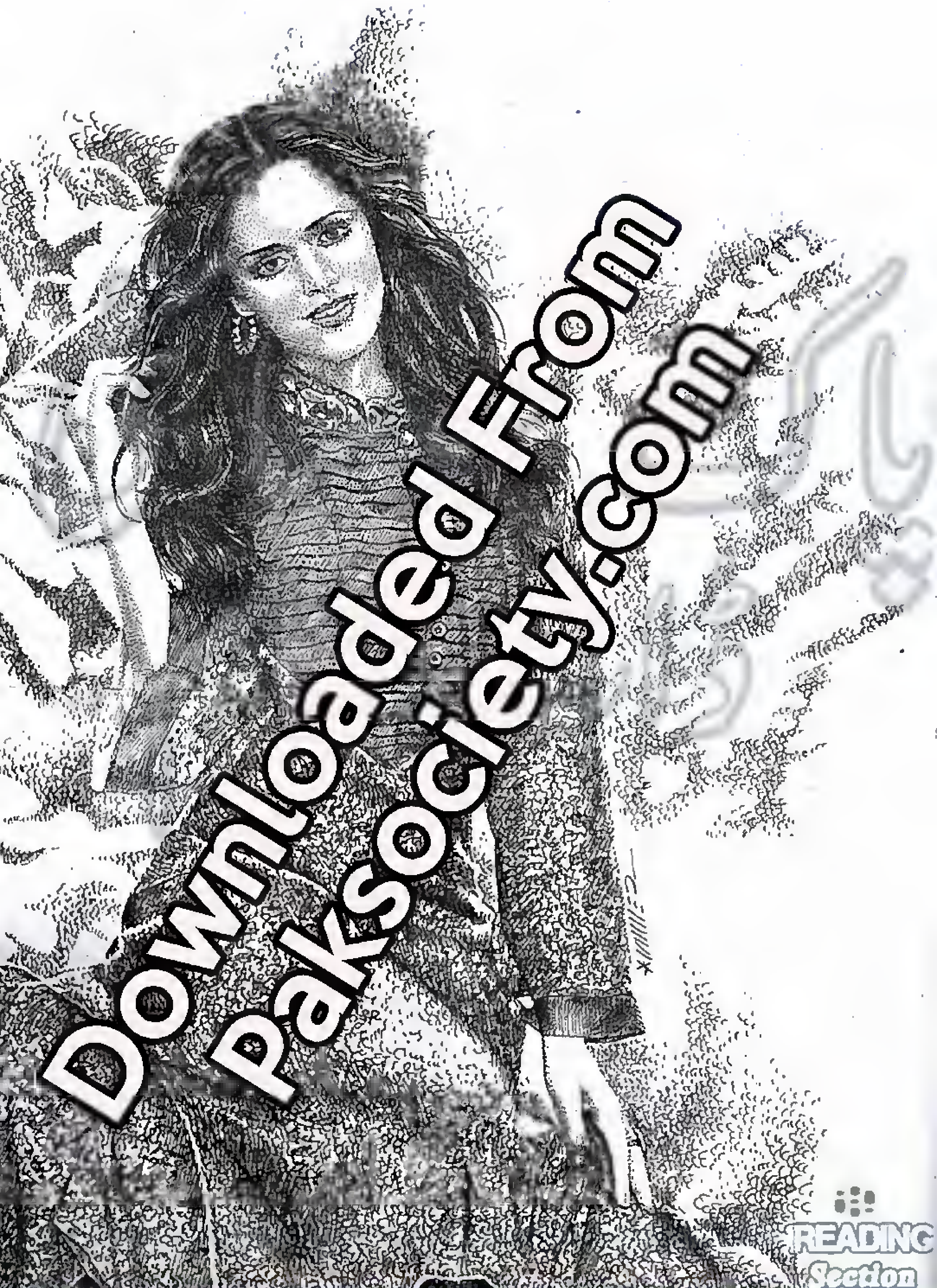
پھیلی ہوئی تھی۔

لان کے کونے پر دو بڑے چیکو اور نیم کے درخت تھے۔ ان کے نیچے بچے اور بریرہ مگن تھے۔ اس سے تھوڑی ہی دور سب سفید میز' کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ درختوں کے ساتھ روش کے بعد رہائشی حصہ تھا۔ نشاط ممانی تو ان درختوں کو کٹوانا چاہ رہی تھیں' مگر نانو نے منع کردیا تھا۔ اس پر وہ کافی دن خفا بھی رہیں' مگر اس بات پر نانو بھی ڈٹ گئی تھیں۔ یہ ان کے مرحوم شوہر نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے اور لان کی رونق بھی ان ہی کے دم سے تھی۔ اسی وقت عمار گھر کے اندرونی حصے سے باہر آیا۔ آتے ہی اس نے زین کو گود میں اٹھالیا۔

ایک نظر بھاوج کو دیکھا' پھر نظرانداز کردیا۔ فرح مامی اور نانو بدستور مگن تھیں۔ کچھ دیر بعد عمار بھی زیب کو گود میں اٹھائے آستینیں فولڈ کرتا وہیں آگیا۔

"بھئی' مجھے تو کوئی چائے پوچھ ہی نہیں رہا۔" اس نے شور مچایا۔

"تم آکر بیٹھتے تو دیتی نا۔" نشاط ممانی کی آنکھوں میں بیٹے کی محبت جھلکنے لگی۔ نیلی جینز اور سیاہ شرٹ' ہلکی سی بڑھی شیو کے ساتھ اس کے دراز قد پر جچ رہی تھی۔ جب سے جنید نے لندن میں شادی کی تھی۔ ان کے دل میں عجیب سے خوف اگنے لگے تھے۔ ایک بیٹے نے تو اپنی صورت کو ترسادیا تھا۔ اب عمار ہی ان کے دل کی ٹھنڈک تھا۔ انہوں نے چائے دی تو وہ آہستہ



آہستہ بہنے لگا۔ بریرہ اور حریم باتوں میں مگن تھیں۔
اسی وقت گیٹ پر ہارن کی آواز آئی۔ پھر گیٹ کھلا اور عشبہ، دانیال کے ساتھ گاڑی سے اتری۔

"ارے عشبہ آئی ہے۔" نشاط ممانی کا چہرہ کھل اٹھا۔ انس بھاگتا ہوا آیا اور عمار سے لپٹ گیا۔

"ماموں کی جان۔" اس نے بھی بھینچ کے پیار کیا۔ تین سالہ گول مٹول انس میں پورے ننھیال کی ہی جان تھی۔ باقی سب بھی کھڑے ہوگئے۔ ایک خوش گوار ہنگامہ برپا ہوگیا تھا، مگر اس کا دھیان اس کاسنی آنچل پر ہی سرسراتا رہا۔

☼ ☼ ☼

عالم صاحب کے انتقال کے بعد ان کی چھوٹی سی فیملی بکھر سی گئی تھی۔ عمارہ کے لیے تو اپنے محبوب شوہر سے دائمی جدائی کا تصور ہی سوہان روح تھا، مگر بریرہ اور حریم کے لیے انہوں نے خود کو بہت جلد سنبھال لیا۔ اپنی بیٹیوں کو انہوں نے بہت چاؤ سے پالا تھا۔ انہیں باہر کے مسئلے مسائل کا کچھ پتا ہی نہ تھا۔

"تم لوگ میرے ساتھ جاؤ گے۔" چالیسویں کے بعد احتشام ماموں کی بات سن کر بریرہ متوحش ہوگئی۔ اپنے گھر سے جانا کوئی آسان کام ہے بھلا۔ اپنا گھر تو اپنا گھر ہی ہوتا ہے۔

"نہیں بھائی! اس گھر میں عالم ہیں، میں نہیں جاسکتی۔" عمارہ کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

"عمارہ! بات کو سمجھو، تمہارا گھر ہم سے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ دو جوان بچیوں کا ساتھ ہے۔ تم باہر کے مسئلے مسائل ہینڈل نہیں کرسکوگی۔ نیچے کے پورشن میں تین چار کمرے فالتو پڑے ہیں۔ آرام سے ہمارے ساتھ رہنا۔ اماں بی بھی تمہیں یاد کرتی رہتی ہیں۔" احتشام ماموں نے بھاؤ سے سمجھایا، پھر سب کے بے حد اصرار پر عمارہ راضی ہوئیں، مگر گھر کو جوں کا توں رہنے دیا۔ صرف ضروری سامان ساتھ لیا۔ ویسے بھی ان کے کمرے فرنیچر کے ساتھ سیٹ تھے۔ احتشام اور بابر ماموں کا بزنس اسٹیبلش تھا۔ روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہ تھا، مگر عمارہ نے آنے کی شرط ہی یہ رکھی کہ ان کے اخراجات عالم صاحب کے ملنے والے واجبات اور پنشن سے ہی پورے ہوں گے جو کہ خاصے معقول تھے۔ احتشام ماموں نے یہ بات مان لی تھی۔ مگر ہر مہینے حریم اور بریرہ کو اتنی پاکٹ منی دے دیتے کہ ان کی فیسیں بھی باآسانی جمع ہوجاتیں۔ ان کو شاپنگ کرواتے۔ عمارہ کچھ بولتیں تو کہتے، "میں نے تمہاری بات مان لی۔ اب میرے معاملے میں تم بھی نہ بولو۔" پھر وہ کیا کہتیں۔ نشاط ممانی یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتیں۔ عمارہ سے عمر بھر ان کی نہ بنی تھی۔ اب تو برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ ان کے برعکس ہنس مکھ سی فرح مامی ان لوگوں کے آنے سے بہت خوش ہوئی تھیں۔ ان کا پورشن نیچے تھا۔

احتشام ماموں کی فیملی اوپر پورشن میں تھی۔ صرف شام کی چائے ساتھ پی جاتی تھی۔ نانو کو اتوار کو احتشام ماموں زبردستی اوپر لے جاتے تھے۔ بابر ماموں احتجاج کرتے، مگر وہ کسی کی نہ سنتے۔ احتشام ماموں سب سے بڑے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا تو ایم کام کے بعد لندن گیا اور وہیں کا ہوگیا۔ عمار نے آئی ٹی کی فیلڈ چنی اور ایم سی ایس کے بعد ایک فرم میں جاب کرلی۔ احتشام ماموں کو اپنے بیٹوں سے شکوہ تھا کہ ان کا بزنس کون سنبھالے گا۔ عمار ہنس کر تسلی دیتا کہ بابا جب جاب سے دل بھر جائے گا۔ جوائن کرلوں گا۔

"تو اپنا لیپ ٹاپ چھوڑ ہی نہیں سکتا۔" احتشام ماموں ماننے سے انکار کردیتے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ بچپن سے ہی کمپیوٹر کا دیوانہ ہے۔ اس لیے فیلڈ بھی یہ ہی چنی۔ وہ ہنس دیتا۔

ان سے چھوٹی فارحہ پھر عمارہ تھیں۔ ان کے بعد بابر ماموں تھے جو کہ جنید سے آٹھ سال ہی بڑے تھے۔ ان کے دو جڑواں بیٹے پانچ سالہ زیب اور زین گھر بھر کی رونق تھے۔ نانو بیٹی کے آجانے سے بہت خوش ہوئی تھیں۔

عمارہ بھی کافی سنبھل گئی تھیں۔ وہ کسی بھی غلط بات پر چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لیے نشاط ممانی سے شروع سے ہی تکرار ہوتی رہتی تھی، مگر اب انہوں نے خود کو الگ تھلگ کرلیا تھا۔ انہیں محسوس تو ہوا تھا کہ نشاط ممانی کو ان کا آنا ناگوار گزرا ہے، مگر باقی سب کو دیکھ کر انہوں نے یہ بات نظر انداز کردی اور عمار تو ان کا بہت لاڈلا رہا تھا۔ اس کا نام بھی انہوں نے اپنے نام پر رکھا تھا۔ جس پر نشاط ممانی کو بہت دن تک غصہ رہا، مگر احتشام ماموں کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

☆ ☆ ☆

بریرہ اپنے کپڑے تہ کر رہی تھی۔ حریم حسب معمول تاریخ کی کسی کتاب میں سر دیے بیٹھی تھی۔

"یہاں دل تو لگ گیا ہے، مگر اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔ ہے نا ریٹا۔" وہ کچھ اداسی سے بولی۔ حریم نے اسے دیکھا۔ پھر عینک اتار کر سائیڈ پر رکھی۔ کتاب بھی ایک طرف رکھ دی۔ ان دونوں نے ایک ہی کمرہ لیا تھا۔ عمارہ، اماں بی کے ساتھ شفٹ ہوگئی تھیں۔

"ہاں یار..... یاد تو مجھے بھی بہت آتا ہے۔" وہ بھی اداس ہوگئی۔ ان کو یہاں آئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے، مگر نشاط ممانی کی وجہ سے غیریت سی لگتی تھی۔

بریرہ بی کام کے فائنل ایر میں تھی۔ جبکہ حریم سیکنڈ ایر میں تھی۔ مگر اسے تاریخ جنون کی حد تک پسند تھی۔ تاریخ کا مضمون تو رکھا، لیکن لائبریری سے کتابیں لے کر بھی چاٹتی رہتی اور اسی میں ہی ماسٹرز کا ارادہ تھا۔ دونوں بہترین اسٹوڈنٹس تھیں، مگر یہاں آکر ڈسٹرب سی ہوگئی تھیں۔ شاید کچھ وقت اور چاہیے تھا۔ بریرہ کی الجھن کی وجہ تو کچھ اور بھی تھی۔ وہ پہلے بھی عمار کی وجہ سے کتراتی تھی۔ مگر اب تو کوئی راہ فرار ہی نہ تھی۔ اب تو اس کی آنکھوں میں ہیرے سی چمک ٹھہر گئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ یہ چھلکتے جذبے سب پر عیاں ہوجائیں گے اور نشاط ممانی تو شاید بیٹے کا چہرہ پڑھ بھی چکی تھیں۔ ان کا گریز وہ جانتی تھی اور اسے یہ سب منظور نہ تھا۔ اس کے امی ابو کی پسند کی شادی تھی۔ جبکہ دادی اپنی بھانجی کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش پوری نہ ہوئی تو انہوں نے زندگی بھر بہو کو سکون کا سانس نہ لینے دیا۔ بریرہ جب دس سال کی تھی۔ تب ان کا انتقال ہوا، مگر وہ سب اس کے معصوم ذہن پر جم سا گیا تھا۔ پوتیاں بھی ان کے زیر عتاب رہتی تھیں۔ پوتا نہ ہونے کا انہیں شکوہ ہی رہا۔ بریرہ نے یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی کہ اب یہ غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ حریم نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اداسی چھلک رہی تھی۔ غلافی آنکھوں پر بے حد مڑی گھنی پلکیں، مومی رنگت، بے حد نازک سراپا اور گھنے بالوں کا حصار۔ وہ سب بھول کر مسکرا دی۔

"تم امی، بابا کا بے حد حسین کنٹراسٹ ہو۔" اس غیر متوقع بات پر بریرہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ پھر کتاب اٹھا کر اسے دے ماری۔

"میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم کیا جواب دے رہی ہو۔" وہ خفگی سے بولی۔

"یہ بھی تو دیکھو ناڈیر! یہاں آنے سے بعض لوگ بہت خوش بھی ہوئے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرادی۔

"جس طرح تم کو پیاری لگتی ہوں اسی طرح ہر ایک کو لگتی ہوں گی اور کوئی میری خوب صورتی دیکھ کر بڑھے تو کیا فائدہ۔" وہ بھی اس کی معنی خیز باتوں سے تنگ آگئی تھی۔ اس لیے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔

"اور یہ مت بھولو کہ بچپن میں جب تم سوکھی سڑی سی تھیں اور تمہاری ناک بہتی رہتی تھی اور بوائے کٹ بال تھے۔ تب بھی کوئی تمہارا ہی سایہ بنا رہتا تھا۔" حریم بھی اس کی بہن تھی۔ حساب بے باق کر ڈالا۔

"تم کچھ بھی کہو، مجھے منظور نہیں۔" وہ متاثر ہوئے بغیر باہر نکل گئی اور حریم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

عمارہ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد لاؤنج میں نانو کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کا وظیفہ ابھی جاری تھا۔ عمار قریب ہی بیٹھا نیوز چینلز سرچ کر رہا تھا۔

"اوہو عمار بھائی' آج نیچے کیسے نظر آ رہے ہیں؟" حریم اپنی تاریخ کی کتاب اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

"کریلے گوشت کے خلاف دھرنا دے کر چکن بریانی پاس کروائی ہے۔" وہ مسکرایا۔ نانو نے وظیفہ ختم کرکے ایک لمبی پھونک اس پر ماری۔

"نانو! ناٹ فیئر۔" حریم احتجاجاً بولی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا' پھر ایک پھونک اس اس پر بھی مار دی۔

"جی جی۔ آپ بھی لیں۔ اس عمر میں دادو کی کاربن ڈائی آکسائیڈ ختم کروادیں۔" وہ والیوم بڑھاتے ہوئے بولا۔ حریم ہنس دی۔

"تیرے تو کان کھینچنے پڑیں گے۔" نانو نے ہنستے ہوئے اس کا کان پکڑا' عمارہ محظوظ ہوتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔

"ارے یہ بریرہ ابھی تک نہیں آئی۔" فرح مامی کچن سے کفگیر لیے برآمد ہوئیں۔ اسی وقت بریرہ' بابر ماموں کے ساتھ اندر آئی۔

"چچی! ہمیں پتا ہے اصل انتظار چچا جی کا ہوتا ہے' مس بریرہ کا تو بس بہانا ہے۔" عمار انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ بریرہ کا دل اسے بیٹھا دیکھ کر دھڑک اٹھا۔ پھر وہ اسی انداز میں سلام کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بابر ماموں' عمار کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ اسی وقت نشاط ممانی کریلے گوشت کا ڈونگا لیے نیچے اتر آئیں۔

"بھئی میں نے سوچا' رات کا کھانا ساتھ ہی کھالیں' ہم دو افراد ہی تو باقی رہ گئے۔" بیٹا نظروں سے اوجھل ہو' انہیں کہاں گوارا تھا۔

"مما جانی! کیا کریلے گوشت میرا پیچھا کر رہے ہیں؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے میرے خواب میں بھی نہ آجائیں۔" عمار بڑی بے چارگی سے بولا تو وہ ہنس پڑیں۔

"بے فکر رہو' تمہیں نہیں کھلاؤں گی۔" انہوں نے پیار سے بیٹے کو گھورا۔ اسی وقت فارحہ خالہ خرم کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

"لو باتوں میں کسی نے گاڑی کی آواز ہی نہیں سنی۔" نانو بلند آواز میں بولیں۔ سب اولادوں کی موجودگی نے ان کو پرجوش کردیا تھا۔ فارحہ خالہ سب سے ملنے لگیں۔ بریرہ بھی سب کے درمیان آکر بیٹھ گئی تھی اور اب زیب کو ین رہی تھی جو اپنے اسکول کا حال سنانے کو بے تاب تھی۔ زین' بابر ماموں کی گود میں تھا۔

"زیب جانو! ہمیں بتادو کیا بتارہی ہو۔" خرم ادھر ہی آکر بیٹھ گیا۔ لمبا' دبلا سا خرم گوری رنگت پر حسب معمول نئے ہیر اسٹائل کے ساتھ تھا۔ بریرہ نے جب پچھلی دفعہ اسے دیکھا تب وہ مونچھوں میں تھا' مگر اب کے کلین شیو تھا۔ وہ مسکرادی۔

"آج کل کیا کررہے ہیں خرم بھائی اور پھر ایک نیا چینج؟" وہ زیب کو فرنچ فرائز کھلاتے ہوئے بولی۔ جو فرح مامی اسے پکڑا کر گئی تھیں۔ حریم ان کے ساتھ ہی کچن میں تھی۔

"بس مجھے چینج پسند ہے۔" وہ کندھے اچکا کر مسکرایا۔ "اور ایم بی اے کررہا ہوں۔" پھر اس نے قدرے غور سے اسے دیکھا۔ سادہ سے گلابی سوٹ میں بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سرہلا کر رہ گئی۔ پھر یوں ہی اس کی نظر بابر ماموں سے عمار کی طرف اٹھ گئی۔ وہ یک ٹک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سلگتی نظریں' وہ گھبرا کر اٹھی اور کچن کی طرف قدم بڑھا دیے' تپش اس کے ساتھ تھی۔

☼ ☼ ☼

"چاکلیٹ کیک اگلے ہفتے سے پہلے نہیں بنے گا۔" نشاط ممانی نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے

آئینے میں اسے دیکھ کر کہا۔

"او مما! کیا آپ نے مجھے ابھی تک بچہ سمجھ رکھا ہے۔" عمار جو کافی دیر سے گومگو کی حالت میں بیٹھا تھا۔ جھنجلا گیا۔

"اچھا..." نشاط ممانی مڑتے ہوئے مسکرائیں۔

"میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے۔" وہ جز بز ہوا۔

"اب بول بھی چکو' پھر مجھے ٹیلر کی طرف جانا ہے۔" وہ کچھ الجھیں۔

"وہ مما! مجھے... وہ مجھے بریرہ سے... منگنی کرنی ہے۔" اٹکتے ہوئے اس نے سانس روک کر جلدی سے بول دیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"عمار! یہ فیصلہ تمہارے کرنے کا نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"مما زندگی میری ہے۔" اب کے وہ مضبوطی سے بولا۔

"جس دن سے وہ ماں' بیٹی آئی ہیں' مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔" وہ پھٹ پڑیں۔

"مما پلیز! بریرہ کو تو معلوم بھی نہیں ہے۔ پلیز مما! یہ ہی میری خوشی ہے۔" اس کا ملتجی لہجہ انہیں نرم نہ کر سکا۔

"عمار! اب تم مجھ سے یہ بات مت کرنا۔ ورنہ... ورنہ میرا مرا منہ دیکھو گے۔" انہوں نے سفاکی سے بات مکمل کی۔ عمار ساکت رہ گیا۔

"ٹھیک ہے مما۔" اس نے اپنا شکست خوردہ لہجہ سنا۔

"مگر پھر آپ مجھے شادی کے لیے فورس نہیں کریں گی۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

"ہونہہ! سب وقتی ابال ہوتا ہے۔" نشاط ممانی نے سر جھٹکا۔

☼ ☼ ☼

"بریرہ!" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جی عمار بھائی!" وہ زیب کی کلرنگ بک میں کلر بھروا رہی تھی کہ عمار اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ اس سے چار سال بڑا تھا۔ بچپن سے ہی نام لینے کی عادت تھی' مگر اب وہ عادت بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لان میں ابھی شام پوری طرح اتری نہیں تھی۔ گھر کے مکین ابھی اندر ہی تھے۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عمار کو یہ موقع بہت مشکل سے ملا تھا۔

"بریرہ پلیز' میری بات سنجیدگی سے سننا اور سمجھنا۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"جی بولیے۔" وہ اسے دیکھنے لگی۔

"بریرہ میں... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں شاید تمہیں اندازہ ہو' میں نے مما سے بات کی تھی' مگر وہ راضی نہیں ہیں' مگر بریرہ! میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دو۔ میں انہیں منالوں گا۔" اس نے ایک بار بات شروع کی تو پھر بلا جھجک بولتا چلا گیا۔ بریرہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ وہ اب منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس نے خود پر قابو پایا' مگر جب بولی تو آواز مضبوط تھی۔

"میں ہرگز آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔" وہ چپ چاپ اس کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا' مگر یاد رکھنا' تم نہیں تو کوئی نہیں۔" اس کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔ بریرہ خالی ذہن کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ دھوپ بے حد زرد ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

عمارہ آہستہ سے ماں کے قریب آ بیٹھیں۔ وہ ٹاک شو دیکھ رہی تھیں۔

"پڑوس کے ہمدانی صاحب کی بیٹی کی شادی کا کارڈ آیا ہے' اتوار کو تیار رہنا۔" انہوں نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

"اماں! آپ لوگ چلے جایئے گا۔ اتنے لوگ جائیں اچھا نہیں لگتا۔" وہ مدھم لہجے میں بولیں۔

"یہ کیا کہہ دیا۔ لو بھلا تم ہم سے الگ ہو۔" انہوں نے گھر کا' مگر وہ کسی اور سوچ میں ہی گم تھیں۔

''اماں! میں بھی دونوں بیٹیوں کے فرض سے جلد فارغ ہونا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے ان کی طرف دیکھا۔

''یہ تو اچھی بات ہے' مگر فی الحال بریرہ کا سوچو اور اتنی جلدی بھی نہ کرو' ہم لوگ ابھی بیٹھے ہیں۔'' انہوں نے سبھاؤ سے کہا۔

''اماں! آپ کی بات ٹھیک' مگر عالم کے بعد مجھے بہت خوف آیا ہے۔'' عمارہ بے چارگی سے بولیں۔

''اللہ پر توکل رکھو عمارہ۔'' انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

''اچھا۔ ہم بریرہ کے لیے سوچتے ہیں۔'' ساتھ تسلی بھی دی۔ اسی وقت بریرہ' بابر ماموں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ زیب اور زین گاڑی کی آواز سن چکے تھے۔ اچھلتے کودتے آکر باپ سے لپٹ گئے۔ بریرہ مسکراتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ فرح مامی پانی کا گلاس لے کر آئیں۔ بابر ماموں بیٹھ کر آہستہ آہستہ پانی پینے لگے۔

''آپ کو پتا ہے' آج زیب نے کیا کیا؟'' زین نے دونوں ہاتھ پھیلا کر آنکھیں بھی پھیلائیں۔ بابر ماموں مسکرا دیے۔ یہ اس کا مخصوص شکایتی انداز تھا۔

''ہماری زیب کچھ گندا کر ہی نہیں سکتی۔'' بریرہ آتے ہی زیب کو گود میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

''آپو! آج اس نے اتنے سارے چوٹے (چیونٹے) مارے۔'' اس نے گویا اس کا بھانڈا پھوڑا۔

''ارے زیب کیوں؟ اگر وہ آپ کو کاٹ لیتے تو۔۔۔؟'' وہ بے اختیار اس کی نازک انگلیاں دیکھنے لگی۔

''آپو! پہلے زین نے بھی مارے تھے۔'' زیب نے اپنی پونی کستے ہوئے لب کشائی کی۔

''لڑکے زیادہ شریر ہوتے ہیں۔'' عمارہ بے اختیار ہنس پڑیں۔ عمار سیڑھیاں اترتا نیچے ہی آرہا تھا۔

''یہ اپنا عمار بھی بچپن میں کتنا شرارتی تھا۔'' وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

''جی تین بار میرا چشمہ توڑ دیا تھا۔ البتہ بریرہ کو کبھی تنگ نہیں کیا۔'' حریم نے کبابوں کی پلیٹ لا کر سب کے بیچ رکھی۔ بریرہ نے اسے گھورا۔ عمار لاتعلق سا بابر ماموں کے ساتھ سلام دعا کر رہا تھا۔ فرح مامی نے چائے لا کر رکھی۔ وہ باہر جانے لگا۔

''عمار چائے پی کر جاؤ۔'' فرح مامی نے اسے روکا۔

''موڈ نہیں ہو رہا چچی۔'' وہ آہستہ سے کہہ کر نکل گیا۔ لاؤنج کے شور میں بریرہ کی نظروں نے اس کا خاموشی سے پیچھا کیا۔

☆ ☆ ☆

دن خاموشی سے گزر رہے تھے۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی یوں ہی بے دلی سے چینل سرچ کر رہی تھی۔ وہی لوگ' وہی باتیں' وہی خبریں' اکتا کر ٹی وی بند کرتے کرتے اس کی نظر نیوز چینل کے کونے پر پڑی۔ ''او نو آج دو اگست ہے' یعنی کل حریم کی سالگرہ ہے۔'' وہ جلدی سے ٹی وی بند کر کے اپنے کمرے میں گئی۔ بابر ماموں کو کال ملائی۔ انہیں سب معاملہ بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

''بیٹا! میری تو ایک ضروری میٹنگ ہے۔ یہ خرم سامنے بیٹھا ہے' اسے بھیجتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ چلی جانا۔ اوکے ڈونٹ وری۔''

''لیکن ماموں۔'' وہ فون بند کر چکے تھے۔ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے جا کر عمارہ کو بتایا۔ انہوں نے تو اجازت دے دی' مگر اسے الجھن ہو رہی تھی۔ جلد ہی خرم بھی آگیا۔ وہ پرس سنبھالتی کار میں آبیٹھی۔

''کس سلسلے کی شاپنگ ہے؟'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا بولا۔

''حریم کی برتھ ڈے کا گفٹ لینا ہے۔'' وہ ذرا سا مسکرا کر بولی۔

''او گڈ گڈ۔۔۔'' اس نے سر ہلایا۔ گاڑی کو گھماتے ہوئے وہ انگلش میوزک آن کر چکا تھا۔ جلد ہی وہ گفٹ سینٹر کے اندر کھڑے تھے۔

''مے آئی ہیلپ یو؟'' وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ

ڈالے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"جی بتادیں؟" وہ اخلاقاً" بولی۔
"وس از آگڈ چوائس۔" اس نے ایک کرسٹل ڈول کپل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پیس بے حد نفاست سے ترشا ہوا چمک رہا تھا۔ مگر ڈانس کرتے کپل کا پوز اس قدر بے باک تھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں، مگر خرم یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔
"نو۔" وہ رکھائی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ وہ کندھے اچکاتا اس کے پیچھے چل دیا۔ آگے لپ گلوس اور بلش اون کا گفٹ پیک رکھا تھا۔
"حریم کو تو لپ گلوس کا کریز ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے وہ اٹھالیا۔ وہ اب جلد ہی گھر جانا چاہتی تھی۔ خرم نے گھر کے باہر گاڑی روکی۔
"اوکے بریرہ! میں چلتا ہوں۔" وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
"تھینکس۔" وہ کہتی ہوئی اتر گئی۔ اسی وقت عمار کی کار آکر رکی۔ بریرہ نظریں چراتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔
"رکو بریرہ!" اس نے لان میں قدم رکھا ہی تھا کہ عمار کی آواز پر رکنا پڑا۔
"جی۔" اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ بلیک کوٹ ہاتھ پر ڈالے۔ وہ کافی تھکا تھکا محسوس ہوتا تھا۔
"تم اب خرم کے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی۔" وہ بولا تو غصہ دھیمی آواز میں نمایاں تھا۔
"یہ آپ مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہیں۔" بریرہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔
"مجھے پتا ہے اس کی کمپنی کیسی ہے۔ گھر والوں سے جتنا بھی چھپالے، مگر میں اسے جانتا ہوں۔ اس کے افیئرز کی کوئی گنتی نہیں۔" وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔
"میرا اس سب سے کیا تعلق۔" وہ چیخی۔
"میری بات سنو۔" اس نے یک دم اس کا بازو پکڑا
"اور دھیان سے سنو۔ تم اب اس کے ساتھ کبھی کہیں نہیں جاؤ گی۔" وہ غرایا۔
"چھوڑیں۔" اس نے جھٹکا دیا۔ مگر بازو نہ چھڑا سکی۔ "آپ مجھے آرڈر نہیں دے سکتے۔ آپ کو اس بات کا کوئی حق نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ عمار یک دم چپ ہو گیا۔ وہ بازو چھڑاتی اندر چلی گئی۔ اس نے مٹھیاں بھینچیں، پھر کرسی کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

بہت دنوں بعد موتیا کی خوشبو اپنے جوبن پر تھی۔ ہوا کا ہاتھ پکڑے کبھی یہاں کھڑی ہوتی، کبھی وہاں۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کا میل سب کو ہی بھلا لگ رہا تھا۔ سبزے کی تازگی رات میں بھی نمایاں تھی۔ آدھا چاند درختوں کی اوٹ میں تھا۔ وہ لوگ درختوں سے ہٹ کر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ زیب اور زین بار بار لپک کر درخت تک جاتے اور چیکو گننے لگتے۔ فرح مامی انہیں آوازیں دیتیں، پھر کھینچ کر لاتیں۔ بابر ماموں کا ذوق سخن آج عروج پر تھا۔ انہوں نے محفل جما کر بیگم کو بھی شریک کرلیا۔ مگر بچوں کو ذوق سے کیا مطلب۔ بریرہ اور حریم ان کا بیت بازی میں برابر ساتھ دے رہی تھیں۔ حریم کو اشعار یاد نہیں ہوتے تھے، مگر بریرہ کالج میں بیت بازی کے مقابلے میں ضرور حصہ لیتی تھی۔ حریم کا ٹوٹا پھوٹا شعر سن کر فرح مامی نے قہقہہ لگایا۔
"کوئی بات نہیں، آپ تو یہ بھی نہیں سنا رہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔
"مگر میں چیٹنگ بھی نہیں کر رہی کہ خود شاعرہ بن جاؤں۔" انہوں نے دوسرا قہقہہ لگایا تو بریرہ بھی بے ساختہ ہنسنے لگی۔ بابر ماموں بھی مسکرانے لگے۔ حریم نے ان سب کو دیکھا پھر خود ہی ہنس پڑی۔ آج کتنے دنوں بعد اس نے بریرہ کو یوں ہنستے دیکھا تھا۔ اطمینان کی ایک لہر اس کے اندر سرایت کر گئی۔
"تو بھئی اب محفل جمے گی۔" بابر ماموں کے کہنے پر اس نے سامنے دیکھا تو خرم آتا دکھائی دیا۔

"اف!" بریرہ کے وجود پر کوفت چھانے لگی۔

"تھوڑا بریک لے لیا کرو برخوردار! یہ نہ ہو کسی دن ہم کہیں کہ کون ہو تم؟ اندر کیسے آ گئے۔" وہ اٹھ کر شگفتگی سے اس سے ملتے ہوئے بولے۔ اب کے اس نے بال بالکل چھوٹے کروا لیے تھے اور فرنچ کٹ داڑھی رکھ لی تھی۔

"سویٹ ماموں! یہ ظلم نہ کیجئے گا۔ اس بھانجے کے لیے دل کی آنکھیں استعمال کیجئے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"عجیب ہی لگ رہے ہیں۔" حریم نے بریرہ سے سرگوشی کی۔

"واٹس اپ؟ اور کزنز کبھی ہمارے گھر بھی آ جایا کرو۔" وہ بولا دونوں سے تھا مگر نظریں بریرہ پر ہی بھٹک رہی تھیں۔

"میں کافی بھجواتی ہوں اور ان کو بھی سلا کر آتی ہوں۔" فرح مامی اٹھیں اور زین اور زیب کو پکڑ کر اندر لے گئیں۔ بریرہ نے اپنا ڈھلکتا دوپٹا سر کے اوپر تک کھینچ لیا۔ یک دم اٹھ کر جانا اسے مناسب نہ لگا۔

"بیت بازی کی محفل جمی ہے۔" بابر ماموں کے جتانے پر وہ سر ہلانے لگا۔

"چند شعر میں نے بھی پڑھ رکھے ہیں۔" وہ بولا۔

اسی وقت عمار اندر سے آتا دکھائی دیا۔ بریرہ تھوڑی نروس ہو گئی۔ اس دن کے بعد سے اب ان کا یوں سامنا ہو رہا تھا۔

"چاچو! آپ بلا رہے تھے۔" خرم سے سلام دعا کے بعد وہ بولا۔

"ہاں بھئی! ہمیں جوائن کرو۔" انہوں نے کہا تو وہ سنجیدہ سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں شروع کرتا ہوں۔" وہ بولے۔ "اور جملہ حاضرین کی آسانی کے لیے بتا دوں کہ وہ جو چاہیں سنا دیں "آزاد نظم"، رباعی، غزل، شعر بس شاعری ہونی چاہیے۔" وہ مسکرائے۔

"ویری گڈ۔" حریم خوش ہو گئی۔ "اب کچھ بھی گھڑ دوں گی۔" اس نے بریرہ سے سرگوشی کی۔

"غالب کا شعر ہے۔"

کی وفا ہم نے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

انہوں نے شعر سنایا۔ "مجھے ن سے ایک شعر آتا ہے۔" خرم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ آخری حرف سے شروع کرنے کی شرط بھی میں نے ہٹا دی تھی کیونکہ بریرہ کے علاوہ ماشاء اللہ مجھے آپ سب کے ذوق کی بلندی کا پتا ہے مگر تم سناؤ۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو حریم مسکراہٹ دبانے لگی۔

نہ کر کرنوں پر اتنا غرور سورج
کسی کی زلفوں سے کہوں تو رات ہو جائے

خرم نے مسکراتے ہوئے شعر سنایا اور آخر میں بریرہ کو نظروں کی گرفت میں لے لیا۔ عمار کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹ ابھری' بریرہ لاتعلق سی تھی۔

"بیٹا جی! آپ نے صرف ٹانگ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بے چارا شعر پورا اپاہج ہو چکا ہے میں تصحیح کرتا ہوں۔"

نہ کر شعاعوں پہ اتنا غرور اے خورشید
کسی کی زلف ہے کہہ دوں تو شام ہو جائے

بابر ماموں نے بہت آرام سے سمجھایا۔ حریم کی ہنسی کا فوارہ چھوٹا۔ بریرہ بھی مسکرانے لگی۔ عمار نے سر جھٹکا۔

"جی جی ماموں! مطلب تو وہی ہے۔" خرم جھینپتے ہوئے بولا۔

ڈھانپ دیتے ہیں ہوس کو عشق کی پوشاک میں
لوگ سارے شہر میں بدنام ہو جانے کے بعد

حریم نے اپنے تئیں شعر خرم کو سنایا۔ اسے وہ ذرا پسند نہ تھا مگر وہ مسکرا مسکرا کر سنتا رہا۔ اس کی جان ہی تو جل گئی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر بریرہ کو دیکھا جس کی نظریں درختوں کے پار چاند پر بھٹک رہی تھیں۔ اب اس کی باری تھی۔

دور گگن پر ہنسنے والے نرمل کومل چاند
بے کل من کہتا ہے آ ہاتھ لگائیں تمہیں

کچھ دیر بعد اس نے دھیمے سے شعر پڑھا۔

"واہ کلاسک پوئٹری۔" بابر ماموں نے بے ساختہ داد دی۔

"فنٹاسٹک بریرہ۔" خرم تو جھوم اٹھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔ بابر ماموں عمار کو دیکھنے لگے جو گھاس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"ہاں بھئی عمار۔" وہ بولے، عمار نے ذرا سر اٹھایا پھر دوبارہ زمین پر نظریں جما دیں۔

کب تک رہو گے آخر یوں دور دور ہم سے
ملنا پڑے گا تم کو اک دن ضرور ہم سے

اس کی بھاری گھمبیر آواز۔ حریم نے بے ساختہ بریرہ کو دیکھا۔ اس نے پہلو بدلا۔

دامن بچانے والے یہ بے رخی ہے کیسی؟
کہہ دو اگر ہوا ہے کوئی قصور ہم سے
ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے اپنا غرور ہم سے

بریرہ کا ضبط ختم ہو گیا۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آواز کا فسوں بکھرا ہوا تھا مگر وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"وہ۔ کافی مامی کو دیکھتی ہوں میں۔" دھیمے بے ربط انداز میں کہتی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ مبہم سا مسکرایا۔

"زبردست یار۔" بابر ماموں اسے سراہ رہے تھے۔

حریم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

نانو زیب کو تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ فرح مامی زین کو ہوم ورک کروا رہی تھیں۔ عمارہ بھی قریب بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ نشاط ممانی بھی اسی وقت آکر بیٹھی تھیں۔ چائے کا وقت ہونے والا تھا۔ ٹھنڈی شام اترنے ہی لگی تھی۔

اسی وقت فارحہ خالہ اندر داخل ہوئیں۔

"خرم چھوڑ کر گیا ہے۔" وہ سب سے ملتے ہوئے بتانے لگیں۔ سب کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی تھی۔ فرح مامی مسکراتے ہوئے چائے بنانے چلی گئیں جہاں

حریم کٹلس بنا رہی تھی۔ فارحہ آرام سے بیٹھ گئیں پھر محبت سے بہن کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"کیسی ہو عمارہ؟ کتنے دن ہو گئے ہم نے بہت ساری باتیں نہیں کیں؟"

"ٹھیک ہوں آپا! بس عالم کے بعد دل نہیں لگتا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"عمارہ! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اور آج تو تم سے ایک خاص بات کرنے آئی ہوں۔" فارحہ خالہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نشاط ممانی نے الجھن سے انہیں دیکھا۔

"جی بولیے آپا۔"

عمارہ بھی انہیں دیکھنے لگیں۔

"میں اپنے خرم کا رشتہ بریرہ کے لیے مانگنے آئی ہوں۔ بچپن سے ہی میرا دل تھا بریرہ کے لیے۔" انہوں نے مان بھرے لہجے میں کہا۔ کچن میں کام کرتی حریم کے ہاتھ سے چھری چھوٹ گئی۔ فرح مامی بھی باہر دیکھنے لگیں۔

"ایم بی اے کا رزلٹ آتے ہی اس کی جاب بھی ہو جائے گی' کل اسلام آباد سے نورعین کا فون آیا تھا' کہنے لگی کہ امی دیر کیوں کر رہی ہیں ابھی بات پکی کر دیں' اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں شادی رکھ لیجیے گا' میں آرام سے بچوں کے ساتھ آجاؤں گی' ان کے ابو کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ تو خوش ہیں کہ گھر کی دیکھی بھالی بچی ہے۔" وہ خوش خوش بولے جا رہی تھیں۔

"مگر آپا! اتنی جلدی کیسے؟ کچھ سوچنے کا موقع تو دیں۔" عمارہ بوکھلا گئیں۔

"ارے گھر کا بچہ ہے' وہ بھی بہن کا بیٹا۔ اب کیا سوچنا ہے۔" نشاط ممانی جلدی سے بولیں۔ ان کی تو دل کی بات پوری ہو رہی تھی۔

"تم بریرہ کے لیے پریشان ہو رہی تھیں' دیکھو جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔" نانو بھی اطمینان بھرے لہجے میں بولیں۔ عمارہ نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر مسکرا کے چپ ہو گئیں۔

"زین بیٹا! یہ کچن میں ماما کو دے کر آؤ ان سے کہنا کہ پلیٹ میں نکال کے لائیں۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے مٹھائی کا ڈبا نکال کر زین کو دیا۔ وہ بھاگ کر کچن میں چلا گیا۔ اسی وقت بریرہ کمرے سے نکلی۔

"لو میری بیٹی بھی آگئی۔" فارحہ خالہ بولیں تو وہ مسکرا کے سلام کرنے آگے بڑھی مگر انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ کچھ حیران حیران سی الگ ہوئی۔ فرح مامی چائے لے آئی تھیں۔ حریم ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ لیے سنجیدہ سی کھڑی تھی۔

"ارے ادھر لاؤ۔" فارحہ خالہ نے ایک گلاب جامن لے کر بریرہ کو تھوڑی سی کھلائی۔ اس نے حریم کو دیکھا' وہ کچھ فکرمند سی لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سب مسکرا رہے تھے۔ فارحہ خالہ نے اپنی سب سے چھوٹی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتاری پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے اس کی بیچ کی انگلی میں ڈال دی۔ اس نے حیران نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دیں۔

"مبارک ہو بھئی۔" نشاط ممانی سب سے پہلے بولیں۔

"خیر مبارک۔" فارحہ خالہ نے ایک بار پھر اسے گلے لگایا۔

"اب یہ میری امانت ہے۔" انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ بات اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے شاک زدہ حالت میں حریم کو دیکھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ فارحہ خالہ اب عمارہ کو ساتھ لگا چکی تھیں' جو اپنے شوہر کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ فرح مامی' عمارہ کو مٹھائی کھلاتے ہوئے انہیں تسلی بھی دے رہی تھیں۔ نانو ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ زین اور زیب مبارک مبارک کہتے اچھل رہے تھے۔ نشاط ممانی مسکراتے ہوئے انہیں بٹھا رہی تھیں' بریرہ خاموشی سے اٹھی اور اس منظر سے اوجھل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ سب کیا ہو گیا بریرہ؟" حریم کمرے میں آتے ہی بے حد پریشانی سے بولی تھی۔

"پتا نہیں۔" وہ عجیب کھوئی کھوئی حالت میں بیڈ پر بیٹھی انگوٹھی بار بار اتار کر پہن رہی تھی۔

"اب تم میرے سامنے تو مت بنو۔ مجھے سب پتا ہے۔ ویسے بھی خرم بھائی بالکل الگ خیالات کے ہیں۔ تم جیسی لڑکی کا خیال نہیں کر پائیں گے۔" وہ فکرمندی سے اسے لتاڑنے لگی۔

"تو کیا کروں؟ میں کیا کروں حریم؟ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھ میں بغاوت کی ہمت نہیں۔ ویسے بھی بغاوت کروں بھی تو کس بل بوتے پر۔" وہ پھٹ پڑی پھر انگوٹھی پھینک کر رونے لگی۔ حریم افسوس سے اسے روتا دیکھنے لگی پھر آگے بڑھ کر اسے چپ کروانے لگی۔

"شاید یہی میری قسمت ہے حریم۔" وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولی۔ حریم دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

احتشام ماموں کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔

"بہت اچھا ہو گیا۔ بہنوں کا رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔" نشاط ممانی ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے بولیں۔

"ہاں مجھے تو دلی خوشی ہوئی' یہ بچیاں میری ہی تو ذمہ داری ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

نشاط ممانی نے برا سا منہ بنایا اور کھڑکی کا پردہ سرکانے لگیں۔ ان کی نظر عمار پر پڑی جو لان میں بیٹھا تھا۔ یہ لڑکا اس وقت وہاں جا کے کیوں بیٹھ گیا؟ انہیں غصہ آیا۔ وہ ذرا آگے ہو کر دیکھنے لگیں۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا مگر اس کے ہاتھ میں جلتی سگریٹ انہیں دور سے ہی نظر آئی۔ انہیں سخت شاک لگا۔ عمار کب سے سگریٹ پینے لگا۔ انہوں نے سخت بے یقینی سے سوچا پھر بے یقینی دکھ میں ڈھل گئی۔ وہ شوہر کے برابر میں چپ چاپ بیٹھ گئیں۔

سگریٹ ہاتھ جلانے لگی تھی۔ عمار نے اسے پھینک کر سلیپر سے مسل دیا اور دوسری سگریٹ سلگائی۔ لاؤنج کی رونق میں بریرہ کو گھٹن ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکلی مگر وہیں رک گئی۔ لان میں عمار بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ نہیں پایا تھا مگر وہ اس کے ہاتھ میں جلتی سگریٹ اچھی طرح دیکھ چکی تھی۔ اذیت کی اک لہر اس کے اندر سرایت کر گئی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ حریم سب کے ساتھ لاؤنج میں تھی ورنہ اس کے لیے مشکل ہو جاتی۔ وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ بڑے فیصلہ کر چکے تھے۔ مطمئن تھے۔ نشاط ممانی کا رویہ سامنے تھا مگر اس دل کو کون سمجھاتا۔ اس نے چادر مٹھیوں میں بھینچ لی۔ عمار بھی اسے ہی قصوروار سمجھتا ہو گا۔ وہ خود اذیت میں تھی۔ مگر وہ اذیت میں ہے' اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سر تھام لیا۔ موبائل بج رہا تھا مگر اس کا دیکھنے کو بھی دل نہ چاہا متواتر بیل پر اس کا سر پھٹنے لگا۔ آخر اس نے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو؟" وہ بمشکل بولی۔

"کیسی ہو ڈیر فیانسی۔" دوسری طرف خرم تھا۔ اس کی بے زاری حد سے سوا ہو گئی۔

"جی ٹھیک۔" وہ مختصراً بولی۔

"میں تو اس رشتے سے بہت خوش ہوں۔ میں نے سوچا تم سے پوچھ لوں۔" وہ اپنی ہی رو میں تھا۔

"ویل۔ میرے جیسا فیانسی ملنے پر تو ہر لڑکی ہی خوش ہو گی مگر اب تم ٹیپیکل ایسٹرن لڑکیوں کی طرح شرمانا مت شروع کر دو پلیز۔" وہ بولے جا رہا تھا۔

"مجھے شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"اور ہاں! مہینے میں ایک دو بار میرے ساتھ آؤٹنگ پر چلنا تاکہ تم تھوڑا میرا مزاج انڈراسٹینڈ کر سکو اور تم اپنا ایسٹرن لک بھی تھوڑا چینج کرو تاکہ میں تمہیں دیکھ سکوں' فیل کر سکوں۔" اس کا لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ بریرہ کا

چہرہ تپ گیا۔
"مجھے کہیں نہیں جانا، میری اسٹڈیز بہت ٹف جارہی ہیں اب آپ مجھے فون مت کیجیے گا۔" اس نے کھولتے ذہن کے ساتھ فون کاٹ دیا۔
"فولش گرل۔" خرم نے سر جھٹک کر موبائل بیڈ پر پھینکا اور نیٹ آن کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

دن اپنی رفتار سے گزرتے جارہے تھے۔ دوپہر میں سب کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے جب عشبہ، انس کے ساتھ چلی آئی۔ سب خوش ہوگئے۔ زین اور زیب انس کو پکڑ کے بیٹھ گئے۔
"تم ہمارے ساتھ کھیلو گے؟" زیب اس کا ہاتھ پکڑے پوچھ رہی تھی۔ وہ اپنی گول مٹول گردن ہلانے لگا۔ زین اسے اپنی ٹرین دکھانے لگا۔ نشاط ممانی بھی عشبہ کو دیکھ کر پیچھے ہی چلی آئیں۔
"کھانا لگواتی ہوں" نانو بولنے لگیں۔
"ارے نہیں دادو! کھانا کھا کر آئی ہوں۔ بس آج دل چاہا آپ سب سے ملنے کے لیے۔ دانیال لنچ کرنے آئے تھے، واپسی میں مجھے یہاں چھوڑتے ہوئے گئے ہیں۔" وہ کچھ چپ چپ سی لگ رہی تھی۔
"کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔" عمارہ اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔
"ہاں پھوپھو! بہت تھکن ہورہی ہے۔ کچھ دیر سو جاتی ہوں۔" وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ نشاط ممانی نے اسے غور سے دیکھا۔ حریم اور فرح مامی بھی اچنبھے سے دیکھنے لگیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی، نشاط ممانی بھی اس کے پیچھے چلی گئیں۔
"اسے کیا ہوا؟" عمارہ کچھ فکر مندی سے بولیں۔
"بیٹیاں میکے آکر ہی تھکن اتارتی ہیں اور تکلفات تو سسرال کی مجبوری ہیں بس۔" نانو سنجیدگی سے بولیں۔
"ترین چلی ترین چلی۔" انس، زین کی چلتی ہوئی ٹرین دیکھ کر کھلکھلاتے ہوئے اسے پکڑنے کے لیے ہمکنے لگا۔ حریم ہنستے ہوئے اسے سنبھالنے لگی سب ہی مسکراتے ہوئے بچوں کی شرارتوں کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ فروٹ ٹرائفل لے کر اوپر کے فلور پر آئی تھی۔ رات ہوگئی تھی، عشبہ آئی ہوئی تھی اس لیے فرح مامی نے اس کا فیورٹ فروٹ ٹرائفل بھجوایا تھا۔ اسے کوئی نظر نہ آیا تو ٹرائفل کچن میں رکھ کر وہ نشاط ممانی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اسی وقت عمار سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا۔ آج کتنے دنوں بعد نظر آیا تھا۔
"سنیں۔" وہ بے ساختہ پکار بیٹھی۔ وہ اسے سگریٹ پر ٹوکنا چاہتی تھی، مگر اسی وقت نشاط ممانی کے کمرے سے عشبہ کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس نے کچھ بوکھلا کر عمار کی طرف دیکھا، وہ بھی فکر مند سا دروازے کو دیکھ رہا تھا۔
"مما! آپ کو نہیں پتا، وہ کتنا کمینہ ہے۔ پانچ لاکھ مانگ رہا ہے، میں کہاں سے دوں گی۔" وہ پھر رونے لگی۔
"ارے پہلے مجھے پوری بات تو بتاؤ بیٹا۔" نشاط ممانی کی پریشان آواز آئی۔ بریرہ ہکا بکا سی بے اختیار کھڑی رہ گئی۔
"مما! میں نے دانیال سے پوچھے بغیر اپنا سیل فون ایک موبائل شاپ پر ٹھیک کرنے کو دیا تھا، مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ سیل میں میری کچھ... بولڈ تصویریں ہیں، کچھ تصویروں میں... دانیال بھی ساتھ تھے بس انہوں نے یونہی... یونہی شوق میں لی تھیں۔" وہ جھینپتے ہوئے اٹک اٹک کر بتا رہی تھی۔
"شاپ پر چار لڑکے تھے، مجھے نہیں پتا کون مجھے دھمکی دے رہا ہے... وہ کہہ رہا ہے کہ ایک ہفتے میں پیسے نہ دیے تو سب تصویریں نیٹ پر ڈال دے گا۔" وہ پھر رونے لگی۔
"تم لوگوں کو اس بے شرمی کی کیا ضرورت تھی، اب کیا ہوگا۔" نشاط ممانی اسے لتاڑنے لگیں۔

"دانیال کو پتا چلا تو بہت برا ہو گا مما۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ بریرہ عمار کے سامنے اس بے باک گفتگو پر سٹپٹا گئی۔

"میری بات غور سے سنو۔" اسے عمار کی دھیمی آواز سنائی دی۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ پیشانی کی رگیں تن گئی تھیں۔ وہ بے حد ضبط سے بول رہا تھا۔

"اندر جاکے ان سے کہو کہ تم نے سب سن لیا ہے۔ تمہاری دوست کا بھی یہ مسئلہ تھا اور اس کے بھائی نے سولو کیا تھا۔ بھائیوں کو یہ باتیں کبھی نہیں بتائی جاتیں' مجھے بھی نہیں بتایا جائے گا۔ اس لیے تم یہ سب معلومات لاکر مجھے دوگی۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔" بریرہ نے تذبذب کے عالم میں اسے دیکھا۔

"پلیز بریرہ۔" وہ بھاری لہجے میں بولا۔ اس نے ایک لمحے سوچا پھر ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر چلی گئی۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ عشبہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"عشبہ آپی! آئی ایم سوری' مگر میں آپ کی باتیں سن چکی ہوں اور میں یہ مسئلہ حل کر سکتی ہوں۔" وہ جلدی جلدی بولی۔

"تم نے ہماری باتیں سن لیں۔" نشاط ممانی کو بے حد غصہ آیا۔

"تم کیا کر سکتی ہو بریرہ؟" عشبہ ماں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"میری فرینڈ کے ساتھ بھی ایسا ہی مسئلہ ہوا تھا' وہ اپنے بھائی سے بہت کلوز تھی اس نے بھائی کو مسئلہ بتایا' اس کے بھائی کا ڈی ایس پی سے لنک ہے' اس نے چٹکی بجاتے یہ مسئلہ حل کر دیا۔" وہ دل میں لفظ ترتیب دیتی بولتی جا رہی تھی۔

"پھر تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" عشبہ نے امید بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ اب چپ بیٹھی تھیں۔

"جی ان شاء اللہ۔" بریرہ جلدی سے بولی۔

"بس آپ مجھے ساری باتیں بتائیں' وہ نمبر دیں جس سے تنگ کیا جا رہا ہے' وکان کا ایڈریس وغیرہ۔" عشبہ اپنے ہینڈ بیگ سے سیل اور مختلف کارڈز نکالتے اسے تفصیل بتانے لگی تھی۔ وہ توجہ سے سننے لگی۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں صرف وہ عمار کی رازدار تھی۔ اس نے کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ عمار نے اس پر اعتماد کیا تھا تو اتنا کرنا تو اس کا فرض تھا۔ وہ ایک ہفتہ بہت پریشانی میں گزرا۔ وہ بہت بے چینی سے مسئلہ حل ہونے کی منتظر تھی۔ عشبہ روز اسے فون کر کے پوچھتی۔ نشاط ممانی الگ فکر مند تھیں۔ عمار راتوں کو دیر سے گھر آتا۔ کھانا برائے نام کھاتا۔ ایک ہفتے بعد اس نے عشبہ کو خوش خبری سنائی۔ اس کو دھمکانے والے لڑکے کو رات بھر لاک اپ میں مہمان بنایا گیا تو اس کی عقل ٹھکانے آ گئی تھی۔ وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا ویسے بھی اسے عدالت تک نہیں لے جانا تھا' اس لیے معاملہ دبا دیا گیا تھا۔ عمار نے اسے سب بتاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اپنوں کے لیے کس قدر حساس تھا۔ وہ اسے پہلے سے بڑھ کے اچھا لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نماز فجر کے بعد لان میں آ گئی تھی۔ ہر شے تازہ سی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ پرندوں کی چہکار نے ماحول کو دلکش کر دیا تھا۔ سبزے کی ٹھنڈک ہر طرف پھیلی تھی۔ وہ موتیا کے پودوں کے پاس کھڑی ہو کر ان کی کلیوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔

"بریرہ!" نشاط ممانی کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔

"ارے ممانی آپ اتنی صبح؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں بس آنکھ کھل گئی تھی پھر نیند نہیں آئی۔" وہ مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی ان کے انداز پر حیران ہوتے ہوئے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا جس طرح تم نے عشبہ کو اس مسئلے سے نکالا' رازداری برتی۔ کسی کو علم بھی نہ ہوا اور ہم اتنے بڑے مسئلے سے نکل گئے ورنہ

جانے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔" انہوں نے اسے نرمی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ممانی! آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟ عشبہ آپی میری بہنوں کی طرح ہیں جب میں یہ مسئلہ حل کرسکتی تھی تو کیوں نہ کرتی؟ یہ توان کا حق تھا۔" وہ ان کے بدلے رویے پر حیرت زدہ بولتی چلی گئی۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں پھر اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ ایسا ہوتا ہے ناکہ جب کوئی ازلی بدگمان شخص مہربان ہوجائے' نیکی کی خوشبو بکھرے تو دل وجان میں ایک سرخوشی سی پھیل جاتی ہے' وہ بھی اس نیکی کی خوشبو محسوس کررہی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہینے دبے پاؤں گزرتے جارہے تھے۔ سردیوں کا زور پوری طرح جمنے لگا تھا۔ بریرہ کے امتحان ختم ہوچکے تھے۔ حریم اسے زبردستی لاؤنج میں لے آئی۔ اس نے اخروٹ اور چلغوزوں سے بھری پلیٹ سینٹر ٹیبل پر رکھی اور ٹی وی کی آواز تیز کی۔

"یار! میرا موڈ نہیں ہورہا اور ویسے بھی مجھے ہارر مووز نہیں پسند۔" وہ ٹی وی پر چلتی " MAMA " کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"مگر مجھے تو پسند ہیں نا۔" حریم نے اسے کھینچ کر بٹھایا اور اس کے منہ میں چلغوزے ڈال دیے 'اسی وقت خرم فرح مامی کے ہمراہ اندر آتا دکھائی دیا۔

"یہ اس وقت کہاں سے آگئے؟" حریم بڑبڑائی پھر والیوم کم کرنے لگی۔ بریرہ سپاٹ چہرہ لیے انہیں دیکھتی رہی۔

"بھئی' آپا نے تم لوگوں کے لیے کچھ بھجوایا ہے۔ دیکھ لو۔" فرح مامی بتاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ اسی وقت عمار اپنے کمرے سے نکل کر نیچے پورشن کی طرف بڑھا مگر انہیں دیکھ کر رک گیا پھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے سگریٹ سلگائی تھی۔

بریرہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نظریں جھکالیں۔

"ممی نے کچھ شالیں دی ہیں۔" اس نے چار پانچ شالیں سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بریرہ کو دیکھا۔ حریم شالیں دیکھنے لگی۔ وہ مختلف رنگوں میں تھیں۔

"بریرہ! تم کون سی لوگی؟" وہ خوامخواہ اس سے مخاطب ہوا۔

"کوئی بھی۔" دھیان عمار کے ہاتھ میں موجود سگریٹ پر ہی بھٹک رہا تھا۔

"تم یہ ریڈ والی لو۔ تم پر ریڈ کلر بہت سوٹ کرتا ہے۔" خرم نے اس کا ہاتھ تھاما اور ریڈ شال ہاتھ پر رکھ دی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ کھینچا۔ نظر بے اختیار اوپر اٹھی۔ عمار یک ٹک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جلتی سگریٹ اب اس کی مٹھی میں بند تھی۔ بریرہ کے لبوں سے سسکی نکلی' پھر اس نے ہاتھ جھٹکا اور واپس مڑ گیا۔ حریم ہکابکا سی خرم کی حرکت ہی دیکھ رہی تھی۔

"مجھے یہ سب پسند نہیں' آئندہ خیال رکھیے گا۔" وہ سختی سے کہتی اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خرم ایک لمحے کو حیران ہوا پھر توہین کا احساس غالب آگیا۔

"سک ایسٹرن مینٹلیٹی۔" وہ چبا چبا کر بولتا اٹھا اور جھٹکے سے باہر نکل گیا تھا۔ حریم کبھی کمرے کی طرف دیکھتی تو کبھی جاتے ہوئے خرم کو۔

☆ ☆ ☆

شمال سے سیاہ گھنگھور گھٹائیں اٹھ رہی تھیں' پھر ہر سو چھانے لگیں۔ تین سفید کبوتر ان کی طرف اڑتے سیاہ بادلوں میں یوں دلربائی سے واضح ہوئے کہ وہ ان کو دیکھتی چلی گئی۔ ہوا کا خنک جھونکا ٹکرایا تو اس نے جھرجھری لے کر کھڑکی بند کی ہر طرف خاموشی اور بوجھل پن کا راج تھا۔ سب فارحہ خالہ کی طرف گئے ہوئے تھے۔ صرف فرح مامی اور بابر ماموں اپنے کمرے میں تھے' وہ کمبل لپیٹ کر خاموشی سے بیٹھ گئی نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی پھر باہر نکلی۔ لاؤنج میں مدھم سی روشنی تھی۔ کچن میں جاکر وہ چائے بنانے لگی۔

بادل اور بوجھل ہوئے پھر زمین ان کا بوجھ بانٹنے لگی۔ ہلکی پھوار برسنے لگی۔ گیلی سی باس چار سو پھیل گئی۔ چائے بنا کر وہ یونہی لاؤنج کے دروازے پر آگئی۔ سبزہ بھیگ رہا تھا۔ وہ تھوڑا اور آگے آئی۔ بوندیں اب تیز ہونے لگی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ لان میں اسے کوئی بیٹھا نظر آیا۔

"عمار!" وہ بے آواز بڑبڑائی پھر کپ رکھ کر چادر سر پہ سلے کر بھاگتی ہوئی وہاں گئی۔ وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آسمان کی طرف رخ کیے بے خبر سا آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا۔ بوندیں اس کے چہرے پر پھسل رہی تھیں۔ وہ کافی حد تک بھیگ چکا تھا۔ بریرہ کو بے ساختہ جھرجھری آگئی۔

"بارش ہو رہی ہے' اندر چلیں۔" وہ تیز آواز میں بولی۔ عمار نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر آنکھیں بند کرلیں۔

"تم اندر جاؤ۔" لہجے میں رکھائی تھی۔

"آپ بھی چلیں' بہت ٹھنڈ ہے۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو۔ جاؤ۔" وہ آنکھیں کھولتے ہوئے سختی سے بولا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے عمار۔" اس نے جھنجلا کر بے ساختہ اس کا بازو پکڑا۔

"ہاں پاگل ہو رہا ہوں میں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تم۔" وہ جھٹکے سے کھڑا ہوا اور اس کی طرف مڑ کر برہمی سے بولا۔

"ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" وہ بے چارگی سے بولی۔

"تمہیں نہیں پتا؟" اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا اور اپنی سرخ آنکھیں اس پر جما کے بوجھل سا بولا۔

"بولو بریرہ! تمہیں نہیں پتا؟ یہ سب جو مجھ پر گزر رہی ہے۔ تم نہیں جانتیں؟ میری جسمانی تکلیف کی تمہیں فکر ہے اور جو زخم میری روح پر لگے ہیں؟" اس نے اسے جھنجوڑا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔ وہ جنون کے عالم میں تھا۔

"تم نے میرا ساتھ نہیں دیا' تم میرا عشق ہو۔ میری بچپن کی محبت۔ تم صرف میری ہو۔ یہ میرا یقین ہے۔ میں تمہیں یوں کسی اور کا نہیں ہونے دوں گا۔ سنا تم نے۔" ایسی وحشت' ایسی دیوانگی۔ وہ بہکا بہکا سا لگتا تھا۔ بریرہ نے خوف زدہ ہو کر اپنا آپ چھڑایا اور پلٹ کر بھاگتی چلی گئی۔

"آج سن لو تم۔ سننا پڑے گا تمہیں۔" عمار پکار رہا تھا' مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ کمرے میں آکر اس نے چکراتے سر کو تھاما پھر بیڈ پر گر کے رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

نشاط ممانی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اماں! آپ پوچھیں یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ مجھے دکھ دے کر کیا ملتا ہے؟" انہوں نے عمار کے سرہانے بیٹھی نانو کو مخاطب کیا۔ دوسری طرف عمارہ فکر مندسی بیٹھی تھیں۔ احتشام ماموں فکر مندی سے ٹہل رہے تھے' صبح نشاط ممانی اسے اٹھانے آئیں تو وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ گیلے کپڑے صوفے پر ہی پڑے تھے۔ وہ سارا ماجرا سمجھ گئیں۔ ڈاکٹر ابھی چیک کر کے گیا تھا اور کافی سخت ہدایات دی تھیں۔ وہ یک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر نشاط ممانی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ عمار نے ایک نظر بریرہ کو دیکھا پھر آنکھیں بند کرلیں۔

"یہ کیا ایڈونچر تھا عمار؟ کچھ بتاؤ گے؟" احتشام ماموں کو بھی اس پر غصہ تھا۔

"بھائی! آپ اس کی حالت دیکھیں۔ بعد میں ڈانٹ لیجیے گا۔" عمارہ فوراً" اپنے لاڈلے بھتیجے کی حمایت میں میدان میں آئیں۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔ نشاط ممانی اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ فرح ماسی ناشتے کی ٹرے لے کر اندر آئیں۔ حریم بھی ساتھ ہی تھی۔

"لو بھئی عمار۔ فٹافٹ اٹھ جاؤ' تمہاری پسند کا چکن کارن سوپ بھی ہے۔" وہ ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"ارے بریرہ! تمہاری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟ فلو ہے تو تم بھی سوپ لے لو۔" انہوں نے بریرہ کو دیکھا تو چونک گئیں۔ حریم نے جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی۔۔۔ وہ میں چائے کے ساتھ ٹیبلیٹ لے لوں گی۔" وہ خود پر سب کی توجہ ہوتے دیکھ کر نروس ہو گئی۔

"چل بیٹا! اٹھ جا۔ سب کتنے پریشان ہیں۔" نانو اس پر ایک لمبی پھونک مارنے کے بعد بولیں۔ وہ بدقت اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ بریرہ نے سکون کی سانس لی۔

☼ ☼ ☼

دو دن گزر چکے تھے اس کی طبیعت بہتر تھی۔ وہ واش روم سے باہر آیا تو نشاط ممانی ٹرے میں اس کا پرہیزی کھانا لیے بیٹھی تھیں۔

"میں کل سے آفس جوائن کرلوں گا۔" وہ تولیے سے ہاتھ خشک کرتا ہوا بولا۔

"پاگل ہوئے ہو؟ اتنی سی شکل نکل آئی ہے۔ کم از کم دو دن اور آرام کرو۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"مما! کام بہت جمع ہو گیا ہے۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"بھابھی! آپ کے مہمان آئے ہیں۔" بابر ماموں اونچی آواز میں بولتے ادھر ہی آرہے تھے۔

"یہ اب کون آگیا۔" وہ حیرت اور بے زاری کے ملے جلے تاثرات لیے دوپٹا سنبھالتے کمرے سے نکلیں۔ ان کے ساتھ فرح مامی بھی تھیں۔ نانو بھی مسکراتی ہوئی ساتھ تھیں اور لوگ بھی آرہے تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر بابر ماموں کے پیچھے دیکھا اور پھر ساکت ہو گئیں۔ سامنے جنید کھڑا تھا' وہ چار سال بعد وطن آیا تھا' ان کی پہلی لاڈلی اولاد۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھ کر ان سے لپٹا۔ ان کے آنسو بہنے لگے تھے۔

"ارے مما! میں آگیا ہوں۔" وہ ان کے آنسو صاف کرتا ہوا بولا۔

"اب ماں کا خیال آیا ہے۔" وہ شکایت بھرے لہجے میں بولیں۔

"مما! بھائی کو بیٹھنے تو دیں۔" عمار بھی مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور جنید کے گلے لگ گیا۔

"مما! دعا خود تو نہیں آسکی' مگر اس نے سب کے لیے بہت ساری چیزیں بھیجی ہیں۔" جنید مسکراتے ہوئے بولا۔ اس نے وہیں مسلم فیملی میں شادی کی تھی۔ دعا اس کی بیوی تھی۔

"اچھا۔" نشاط ممانی دھیمے سے مسکرائی تھیں۔ باتوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ چلتا ہی جا رہا تھا۔

"باقی باتیں بعد میں۔ جنید بھائی! چلیں پہلے سب دوپہر کا کھانا کھائیں۔ آج اتفاق سے فرح مامی نے آپ کے فیورٹ شامی کباب بنائے ہیں اور ابھی گاجر کا حلوہ بھی بنا لیا ہے اور جناب میں نے بنایا ہے چائنیز پلاؤ۔" حریم اعلان کرنے والے انداز میں آکر شروع ہو گئی تھی۔

"واہ بھئی! کزن اور چچی ہوں تو آپ دونوں جیسی۔" جنید کے کہنے پر دونوں مسکرانے لگیں۔

"بریرہ تو بریانی بنا رہی تھی' مگر میں نے زبردستی اس سے چارج چھین لیا۔ مجھے پتا تھا' اتنی جلدی آپ کو دیسی کھانے ہضم نہیں ہوں گے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"نہیں لٹل گرل! وہاں بھی میں دیسی کھانوں کو پریفر کرتا تھا۔" وہ اسے چپت لگاتا مسکرانے لگا۔

"ہاں چلو۔ میں نے بھی کوفتے بنائے تھے' سے بھی سرو کر دو۔" نشاط ممانی حریم سے کہنے لگیں۔

"گریٹ مما۔" جنید نے انہیں ساتھ لگایا سب کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ بریرہ خاموشی سے عمار کو دھیما دھیما مسکراتے دیکھتی رہی۔

کھانے کے بعد تحفے تحائف کا دور چلا تھا۔

"اور تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟" وہ عمار سے مخاطب ہوا تھا۔

"اچھی جا رہی ہے بھائی۔" وہ دھیمے سے بولا تھا۔

"کبھی آف لے کر لندن آؤ۔ مل کے انجوائے کریں گے۔ مما پپا سے کہتے تو میں تھک گیا ہوں۔" وہ

اس کے کندھے پر ہاتھ مارتا بولا۔

"میں تو مستقل آپ کے پاس آنے کا سوچ رہا ہوں یا پھر آسٹریلیا جہاں سے اچھی آفر آئے۔" اس نے آہستہ سے چائے کا کپ رکھتے ہوئے دھماکا کیا۔ نشاط ممانی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ حریم نے بریرہ کو دیکھا۔ وہ دکھ سے عمار کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہے جا رہا ہے یہ لڑکا۔ یہاں کیا برائی ہے؟" نانو بولنے لگیں۔

"تم دونوں کو باپ کی فکر نہیں ہے۔" احتشام ماموں اسے گھور کر بولے تھے۔

"یہ مجھے سزا دے رہا ہے۔ آپ لوگ سمجھائیں اسے۔" نشاط ممانی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔

"مما پلیز! میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" وہ سختی سے بولتا اٹھ گیا تھا۔ سب حیران پریشان رہ گئے تھے۔ فرح مامی نشاط ممانی کو تسلی دینے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"چائے پیو نشاط! ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" انہوں نے سوچوں سے ابھر کر ساس کو دیکھا پھر چائے اٹھالی۔ عمارہ بھی ساتھ بیٹھی انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

"بریرہ گھر کی بچی تھی۔ دیکھی بھالی۔ خوامخواہ بیر باندھا میں نے۔" سامنے سے آتی بریرہ کو دیکھ کر ان کے پچھتاوے میں اضافہ ہوا۔

"وہ نند بھاوج کا بیر تو ماضی کا قصہ ہو گیا تھا۔ عمارہ شوہر کے انتقال کے بعد بالکل بدل گئی ہے۔" انہوں نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ وہ ماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ لان میں خوش گوار ٹھنڈی ہوا کا راج تھا۔ پودوں میں ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ چیکو اور نیم کے درخت تھوڑی تھوڑی دیر بعد سرسراتے تھے۔ بریرہ آکر بیٹھ گئی تھی۔ زیب ساتھ تھی۔ وہ یونہی اسے دیکھے گئیں۔ اسی وقت فارحہ خالہ کی اپنے شوہر کے ہمراہ آمد ہوئی تھی۔

"ارے آج تو شفیع بھائی بھی آئے ہیں۔" عمارہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ بریرہ نے سر ڈھانپا تھا۔ سلام دعا کے بعد سب وہیں بیٹھ گئے تھے۔

فارحہ خالہ جیسے زبردستی مسکرائی تھیں۔ خالو بھی سر جھکائے بیٹھے تھے' وہ کچھ حیران ہوتی چائے لانے کا کہہ کر اٹھ گئی۔ اندر آکے حریم کے ساتھ سینڈوچ کو فائنل ٹچ دینے لگی۔ چائے بنا رہی تھی' زیب نے پھر لان میں جانے کی ضد پکڑلی۔

"تم جاؤ۔ سب تیار ہے۔ میں لے کر آتی ہوں۔" حریم بولی۔ فرح مامی کپ نکال رہی تھیں۔ ساتھ ہی اسٹرابری کیک کے پیس کر رہی تھیں۔ وہ سر ہلا کر باہر آگئی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو فارحہ؟" نانو کی غصے بھری آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ عمارہ فق چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔

"اگر اسے یہ سب کرنا تھا تو منگنی کیوں کی؟" نشاط ممانی تیز آواز میں بولی تھیں۔

"ناخلف اولاد ہمیشہ ماں باپ کو شرمندہ کرواتی ہے۔" خالو شرمندہ لہجے میں بولے تھے۔ عمارہ تیز تیز سانس لینے لگی تھیں۔ ان کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی ماں کے پاس آئی۔

"امی! امی! کیا ہوا ہے آپ کو۔" وہ انہیں سنبھالے بولے جا رہی تھی۔ سب پریشان ہو کر ان کے گرد جمع ہوئے تھے۔

"حریم! ماموں کو فون کرو جلدی۔ امی کو اسپتال لے جانا ہے۔" اس نے حریم کو آتا دیکھ کر چیخ کے کہا۔ وہ الٹے قدموں بھاگی تھی۔

☼ ☼ ☼

خرم امریکا جا چکا تھا۔ پہلے تو فارحہ خالہ نے اسے بلانے کی بہت کوشش کی مگر فوراً" ہی اس نے اپنی دوست جکولین سے اپنی شادی کی خبر سنا کر سب راستے بند کر دیے۔ جکولین اس کی نیٹ فرینڈ تھی۔ معاملات بہت تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ مغربی طرز زندگی سے متاثر رہا تھا۔ یہ اس کے لیے

سنہری موقع تھا۔ بریرہ کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ اسے اتنی دقیانوسی لڑکیاں پسند نہیں اور بریرہ بھی اسے پسند نہیں کرتی' اس لیے یہ سب یہیں ختم کردیں' مگر رشتے ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ان سے امیدیں جڑی ہوتی ہیں۔ تعلقات بندھے ہوتے ہیں' اسی لیے عمارہ یہ سب سہ نہ پائی تھیں۔ انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ بریرہ اور حریم نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ سب انہیں تسلی دے دے کر تھک چکے تھے۔ عمار اور بابر ماموں تو مسلسل اسپتال میں ہی تھے۔ اب ان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ سب ان کے بیڈ کے گرد جمع تھے۔ جب فارحہ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ عمارہ نے دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ فارحہ خالہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"عمارہ! وہ بہن ہے اس نے تو سب اچھا چاہا تھا۔" نشاط ممانی ان کے ہاتھ پکڑ کر دھیرے سے سمجھانے لگیں۔

"ہاں بیٹا! اولادوں کے پیچھے رشتے کیوں توڑو۔ اس نے تو ہمیشہ بریرہ کو اپنی بیٹی سمجھا ہے۔" نانو نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے فارحہ خالہ کو دیکھا پھر دونوں گلے مل کر رونے لگیں۔

"ارے نہیں نہیں۔" حریم لپک کر آئی۔

"کوئی جذباتی سین نہیں ہوگا۔ امی آپ اپنی طبیعت دیکھیں۔" وہ فوراً" ان سے لگ کر بیٹھ گئی تو دونوں بہنیں مسکراتے ہوئے خود کو سنبھالنے لگیں۔

"بریرہ تو اتنی اچھی بیٹی ہے ماشاء اللہ جس گھر میں جائے گی وہاں کی مشکلات ختم کردے گی۔" نشاط ممانی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں۔" فارحہ خالہ نے اس کا ماتھا چوما۔

"میری اولاد قدر نہ کرسکی۔" وہ دکھی لہجے میں بولیں۔ بریرہ کا دل چاہا' وہ کہیں دور چلی جائے جہاں یہ سب باتیں نہ ہوں۔ وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھئی عمارہ! تم انجان لوگوں سے گھبرا رہی ہو نا اب مطمئن ہوجاؤ۔ یہ تمہاری نظروں کے سامنے ہی رہے گی میرے عمار کی دلہن بن کر۔" انہوں نے یوں اطمینان سے کہا جیسے روزمرہ کی باتیں کررہی ہوں۔ دوائی کا شاپر اندر لاتا عمار وہیں جم گیا۔ بریرہ کے ہاتھ ٹھنڈے پڑگئے۔ حریم کا منہ کھلا رہ گیا۔ نانو کی تسبیح رک گئی۔ عمارہ انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ احتشام ماموں بھی حیرت سے زوجہ کا وہ روپ دیکھ رہے تھے جس کی ہمیشہ حسرت رہی تھی۔ بریرہ اور عمار کی نگاہ بے ساختہ ملی پھر بریرہ کی نظر جھک گئی۔

"چپ کیوں ہوگئیں عمارہ؟ عمار تو تمہارا سب سے لاڈلا بھتیجا ہے کہیں بھاوج کے روایتی سمدھن بن جانے کا تو خوف نہیں؟" وہ چہک رہی تھیں۔ عمارہ مسکرانے لگی تھیں۔

"دونوں ہی ہمیں بہت عزیز ہیں۔ اس سے اچھا کیا ہوگا بھلا۔" نانو خوش گوار لہجے میں بولی تھیں۔

"احتشام بھائی! فوراً" مٹھائی لے آئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ سسٹر دوبارہ آجائے کمرہ خالی کرنے کا آرڈر لے کر۔" فارحہ خالہ کے لہجے سے بھی خوشی پھوٹ رہی تھی۔ حریم نے بریرہ کو کہنی ماری۔ وہ اسے گھورتی ہوئی ہٹ کر بیٹھ گئی۔ عمار خاموش بیٹھا تھا' مگر اس کے وجود سے اٹھتا اطمینان ہر کسی کو محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بھینی خوشبو سے بوجھل لان میں خوش گوار ہوا کے سنگ خوشیاں تتلیوں کی طرح ادھر ادھر لہرا رہی تھیں۔ تیز روشنیوں میں بہت عمدہ انتظام تھا۔ زین' زیب اور انس بھاگتے پھر رہے تھے۔ کچھ تیار ہوگئے تھے۔ کچھ باقی تھے۔ بریرہ کو عشبہ کی بیوٹیشن دوست تیار کررہی تھی۔ سب اتنی جلدی ہوا تھا کہ اسے اب تک یقین نہ آتا تھا۔ وہ بار بار اپنے رب کا شکر ادا کرتی۔ لائٹ سے میک اپ کا فائنل ٹچ دیکھ کر وہ مسکرائی۔ عشبہ نے ایمرجنسی میں اپنی کام والا لائٹ پرپل لانگ فراک اسے دے دی تھی' جو وہ ایک ہفتہ پہلے ہی طارق روڈ سے لائی تھی۔

"تم جیسی بھابھی کو تو جتنا دوں کم ہے۔" وہ اس کے کان کے پاس کھلکھلائی تھی فرح مامی نے اپنا نازک

ساچاندی کا سیٹ اسے پہنادیا تھا۔

"ذبھئی عمارہ! چند دن تو دیتیں۔ میں اپنی بہو کے لیے شاندار سی ہر چیز لاتی۔" نشاط ممانی نے شکوہ کیا۔

"بہت ہے بھابھی۔ آپ اپنے ارمان شادی پر نکال لیجیے گا۔ ایک مہینہ تو ہے۔" عمارہ مسکرائیں۔ عمارہ کے دل میں جانے کیسا خوف بیٹھا تھا کہ انہوں نے فورا" نکاح کی فرمائش کی تھی اور یوں ان کے گھر آنے کے دوسری ہی شام گھر پر ان کا نکاح ہو رہا تھا۔ شادی جنید کی فرمائش پر ایک مہینے بعد رکھی گئی تھی۔ یوں وہ بھی شرکت کرکے جاتا۔ کچھ دیر میں نکاح بھی ہو گیا تھا۔

"کتنی پیاری لگ رہی ہو بریرہ۔" عشبہ اسے لینے آئی تو بے ساختہ بولی۔ نکاح کے بعد اب اس کی چادر اتاری گئی تھی۔

"ماشاءاللہ۔" فرح مامی مسکرائیں۔ حریم اور عشبہ اسے لے کر باہر آگئیں اور عمار کے پہلو میں بٹھانے لگیں۔ عمار نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ کلائیوں میں ڈھیروں چوڑیاں ڈالے موتیا کے گھنے گجرے پہنے وہ صرف اس کی تھی' یہ اس کا یقین تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ اس کی نظر محسوس کرکے سمٹ سی گئی۔ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اسے حجاب نے آگھیرا۔ اب اس کے وجود پر اس کا حق تھا۔ اس احساس سے ہی اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس کے وجود سے اٹھتی خوشبو حواس پر چھانے لگی تھی۔ وہ بے ساختہ نروس ہو کر اپنی ننھی سی بندیا کو چھونے لگی۔ پھر ناک کی بالی کو چھوا۔

"سب ٹھیک ہے محترمہ! تصویریں بن رہی ہیں۔ سامنے دیکھو۔" حریم دبی آواز میں شوخی سے بولی تو اسے اردگرد کا احساس ہوا۔ جنید کیمرا لیے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں ڈنر ہونے والا تھا۔ باربی کیو' حلوہ پوری' فروٹ ٹرائفل اور گلاب جامن کا انتظام کیا گیا تھا۔ عمار کو ایک طرف کرکے جنید اور بابر ماموں نے ساری بھاگ دوڑ کی تھی۔

"اچھا صاحبزادے! اب جناب کے وہ باہر جانے کے ارادے کیا ہوئے؟" بابر ماموں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے تو وہ مسکرانے لگا۔ بریرہ نے سر جھکالیا۔

"تو یہ بات تھی جناب۔" فرح مامی نے بھی بیٹھتے ہوئے اسے گھورا۔ وہ سر کھجانے لگا۔ جنید اور حریم تو زور سے ہنس پڑے۔ اسے پتا تھا' اب سب نے بہت ریکارڈ لگانا تھا۔

"تمہارا یہ چھوٹا بھائی تو شروع سے بڑا پکا ہے۔" عشبہ بھی پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔

"اب تم بھی ایسا کرو گی۔" اس نے اسے گھورا۔

"ارے عمار بھائی جان! آپ کو کیا پتا کہ سالیاں کیا چیز ہوتی ہیں! اور ہم نے طے کیا ہے کہ شادی میں عشبہ آپی بھی سالی کا رول ادا کریں گی۔" حریم نے شرارت سے آکر اسے تھوڑی سی مٹھائی کھلائی۔

"جی! اور یہ سزا ہے کیوں کہ آپ نے مجھ سے کچھ شیئر نہیں کیا تھا۔" عشبہ منہ پھلا کر بولی۔

"اوکے بابا! منظور ہے منظور ہے۔ تم دونوں طرف سے نیگ گھسیٹنا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ سب ہنس پڑے۔

"ارے بچو! ہٹو چلو کچھ رسمیں کرنی ہیں۔" نانو اسٹیج پر آتے ہوئے بولیں۔ وہ سب نیچے اتر آئے۔ عمارہ' فارحہ خالہ اور نشاط ممانی بھی اسٹیج پر آگئی تھیں۔ احتشام ماموں بھی ساتھ تھے۔ سب مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگے۔ عمارہ نے بھتیجے کو گھڑی پہنائی تھی۔ نشاط ممانی نے بریرہ کو ساتھ لگاتے ہوئے سونے کی نازک سی پازیب تھمائی تھی۔ جنید نے فورا" یہ لمحہ کیمرے میں قید کیا۔ اپنوں کے سنگ یہ خوشیاں انمول تھیں۔ ہر سو گنگناتی خوشبوؤں کا راج تھا اور ہر دل دھنک رنگوں میں بھیگ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

دن بے حد خوب صورت ہو چکے تھے۔ گھر میں ایک خوش گوار سا ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ عشبہ اکثر یہیں پائی جاتی تھی۔ تقریبا" روز ہی شاپنگ پر جانا ہو رہا تھا۔ حریم نے ڈھولکی منگوالی تھی۔ جب عشبہ نہ ہوتی وہ

فرح مامی یا زیب اور زین کو پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ وہ بھی بھرپور ساتھ دیتے۔ جنید فارغ ہونے کے باعث اکثر اوقات ڈرائیور کے فرائض سرانجام دیتا اور خواتین کی لمبی شاپنگ پر خوب احتجاج کرتا۔ آج شام بھی سب شاپنگ پر گئے تھے۔ حریم کو شادی کے لیے اپنے ڈریس خریدنے تھے۔ عشبہ اور نشاط ممانی بری کی تیاری کررہی تھیں۔ فرح مامی کو زیب اور زین کے سوٹ لینے تھے۔ دو دن بعد وہ لوگ شادی کے ڈریسز کے لیے بریرہ کو بھی لے جانے والے تھے۔ ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔ اسے پچھلی بارش کا خیال آیا۔ عمار کی دیوانگی یاد آئی تو کافی بناتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرانے لگی۔ یہ احساس ہی سرشار کردیتا تھا کہ اب وہ اس کی منکوحہ ہے۔ بس اتنا تھا کہ وہ اسے نظرانداز کررہا تھا۔ اس کا چمچہ چلاتا ہاتھ رکا۔ ہاں وہ مجھ سے ناراض ہے۔ سیل فون پر بھی رابطہ نہیں کیا۔ اس نے سوچا پھر عمارہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"امی آپ کی دوا کا وقت ہورہا ہے۔" اس نے گھڑی دیکھی تو فوراً" بولی۔ عمارہ دوا کھانے کی چور تھیں۔

"ہاں یاد آیا' کل احتشام بھائی ٹیبلٹ لائے تھے۔ نشاط بھابھی نے ابھی فون کیا تھا کہ ان کی سائیڈ ٹیبل میں ہے۔ وہ دینا بھول گئیں اب تم جاکر لے آؤ۔"

عمارہ نے اس سے کہا وہ جھجک گئی۔ عمار اوپر ہی تھا۔ عمارہ آنکھیں بند کرکے لیٹ چکی تھیں۔ چاروناچار وہ اٹھی' اپنے کمرے میں ہوگا۔ خود کو تسلی دیتی وہ اوپر چلی آئی۔ دراز سے ٹیبلٹ نکالتے وہ ٹھٹکی آگے بڑھ کر دیکھا۔ عمار ٹیرس پر کھڑا تھا۔ چائے کا کپ سائیڈ میں رکھا تھا۔

"عمار۔" ہمت کرکے اس نے پکارا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔

"کہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"آ... آپ مجھ سے ناراض... تو نہیں۔" وہ اس کے دیکھنے پر تھوڑا گڑبڑا گئی تھی۔ باہر بوندیں شور مچا رہی تھیں اور اندر اس کا دل۔ وہ پلٹا اور پھر ٹیرس کی طرف جاکر کھڑا ہوگیا۔ بھیگے لان کا منظر واضح تھا۔ سب پھول پتے دھل کر نکھرے چلے جارہے تھے۔ بارش کی خوشبو ہر سو پھیلی تھی۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا تھا۔

"آپ زیادہ ناراض ہیں؟" وہ افسردگی سے بولی۔ وہ پلٹا پھر اس کے قریب آکر رک گیا۔ وہ گھبرا کر تھوڑا سا ہٹی۔

"ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی۔"

اس کی لٹ کو چھوا تو وہ ہلکا سا ہنسا۔

"جانتی بھی ہو' کتنی تکلیف میں رہا ہوں۔ کتنا تنہا تھا۔ بہت دعاؤں سے تم کو پایا ہے۔ تمہیں کیا پتا۔" وہ سرگوشی کرتا بوجھل لہجے میں بولا۔

"آپ اس تکلیف میں اکیلے نہیں تھے۔" پلکیں جھکائے وہ بدقت بولی۔

"جانتا ہوں۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔

"میری زندگی میں آنے کے لیے شکریہ بریرہ۔"

عمار نے ہاتھ تھاما۔

"آپ کا یقین کامل تھا۔" وہ دھیمے سے مسکرائی پھر نرمی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے پلٹنے لگی۔

"اگلی بارش میں یوں نہیں جاسکوگی۔" وہ مدھم آواز میں شرارت سے بولا۔ وہ شرمگیں سا ہنسی پھر تیز قدموں سے واپس مڑ گئی۔ وہ مسکراتا ہوا پلٹ کر برستی بارش کو دیکھنے لگا۔ پانی کی رم جھم تیز ہوتی جارہی تھی جیسے خوشیاں تیز تر ہوگئی ہوں۔ فضا خوشبو سے بوجھل ہوئی جارہی تھی۔ ساری کلیاں کھل چکی تھیں۔ اب زندگی حسین تھی۔

امتل عزیز شہزاد

ستارۂ آشوب

ایک ڈھلتی عمر کی عورت سڑک پار کرتے ہوئے ایک لڑکی کو دیکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ماڈرن عورت ہے۔ وہ اسے چلا کر رکنے کے لیے کہتی ہے لیکن وہ دونوں سڑک پار کر کے گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔

وقار صاحب کے دو بچے ہیں۔ اجیہ اور سائر..... وہ سائر کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی بیوی اس دنیا میں نہیں ہے۔ ان کی سالی مہ پارہ خاص طور پر لندن سے اس شادی میں شرکت کرنے آئی ہیں' اجیہ وقار صاحب کو بتاتی ہے کہ سائر اس شادی سے ناخوش نظر آتا ہے۔ وقار صاحب یہ سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اجیہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ دو ماہ کی تھی جب اس کی ماں چلی گئی۔ وہ اپنی خالہ مہ پارہ سے پوچھتی ہے' اس کی ماں کیسی تھیں۔ مہ پارہ بتاتی ہیں کہ اس کی ماں بہت خوب صورت تھی بالکل کانچ سے بنی مورت۔ وقار صاحب کی بہنیں بھی انہیں احساس دلاتی ہیں کہ سائر اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ تب وقار صاحب سائر سے براہ راست بات کرتے ہیں کہ سائر کہیں اور انٹرسٹڈ تو نہیں ہے۔ تب سائر کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور وہ اپنے باپ کی کوئی بھی خواہش رد نہیں کر سکتا۔

سائر کی شادی میرب سے ہو رہی ہے۔ میرب دو سال کی تھی جب ان کی ماں بھی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ ان کے پڑوسی اور دوست احمد سعید اور ان کی بیگم نے میرب کا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھا سعید صاحب کی بیٹی ماریہ کی میرب سے گہری دوستی ہے ان کا ایک بیٹا عاشر ہے۔ جو اجیہ کو پسند کرتا ہے شادی کی

مکمل ناول





تقریبات میں سائر کا رویہ بہت اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ شادی کی رات بھی وہ میرب سے بہت رکھائی سے پیش آتا ہے وہ میرب سے کہتا ہے کہ وہ اس سے صرف وفاداری کی توقع رکھتا ہے اور اسے اپنی بہن اور والد کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔
اجیہ کی دوست شبنا بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کا بھائی آغا شایان اجیہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اجیہ بھی اس کی طرف مائل ہے۔ جبکہ میرب کا بھائی سعد، اجیہ کو پسند کرتا ہے۔
سائر کا رویہ میرب کے ساتھ بہت عجیب ہے۔ وہ معمولی باتوں پر شدید رد عمل ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کسی بھی لڑکے سے بات نہ کرے۔
وہ عورت جس نے سڑک پر مہ پارہ کو دیکھا تھا۔ ایک خستہ فلیٹ میں رہتی ہے۔ وہاں سے کوئی پرانا پتا نکال کر مہ پارہ کے گھر جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ مہ پارہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ لیکن وہاں کے مکین اسے وقار صاحب کے گھر کا پتا دے دیتے ہیں۔
تب وہ کہتی ہے وقار آج سے سالوں پہلے تم نے جو اذیت مجھے پہنچائی تھی، اس کے بدلے کا وقت آپہنچا ہے۔"
شیخ عبدالحمید کریانہ فروش ہیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں 'نازو' چندا اور مانو۔ چندا کا مزاج اور صورت سب سے الگ ہے۔ وہ بے حد حسین ہے اور پڑھائی کے بجائے دوسری رنگا رنگ سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی ہے۔ شیخ صاحب کی لاڈلی ہے۔ کالج میں ایک ڈرامے میں قلوپطرہ کا کردار کرتی ہے تو آصف شیرازی اسے ٹی وی پر اداکاری کی آفر کرتا ہے۔ وہ ایک ڈائریکٹر شکیل ملک کا ملازم ہے۔ اس آفر پر چندا بہت خوش ہوتی ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اس کے گھر والے کبھی اسے ٹی وی پر کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور شادی کر کے رخصت کر دیں گے۔ وہ آصف شیرازی سے کہتی ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو یہ اصلی شادی نہیں صرف ایک معاہدہ ہوگا۔ میں گھر والوں کے چنگل سے نکل آؤں گی۔ آصف مان جاتا ہے۔
میرب سائر کے رویے سے بہت پریشان ہے۔ وہ عاشر سے بات کرنے کو منع کرتا ہے۔
اجیہ کا تعلق آغا سے بہت بڑھ چکا ہے۔ دونوں ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ ادھیڑ عمر عورت اجیہ کو فون کر کے بتاتی ہے کہ اس کی ماں زندہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اجیہ کی ماں سے ملاقات بھی کرا سکتی ہے۔

تیسری قسط

"مگر آغا۔ اگر وہ جھوٹ بھی بول رہی ہے تب بھی اسے چیک تو کرنا چاہیے نا کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔
"ہاں۔ یہ بات تمہاری البتہ مناسب ہے۔" وہ متفق انداز میں گردن ہلا کر بولا۔
"اسے چیک کس طرح کروں؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔
"تم نے اپنی امی کی فوٹو تو دیکھ رکھی ہوگی؟" اس کے کہنے پر یاد آیا کہ اس کے گھر میں کہیں بھی ان کی تصویر نہیں تھی۔
"شاید اسٹور میں ہو۔" اس نے سوچا۔
"پھر؟"
"بس اس سے شکل تو کنفرم ہو ہی سکتی ہے اور اگر وہ کوئی اور نکلی اور پلاسٹک سرجری وغیرہ کی کہانی بنانے بیٹھ گئی تب تم سمجھ جانا کہ یہ محترمہ کوئی ٹھگ ہیں۔" وہ اسے مشورے دینے لگا۔
"کیسی عجیب بے وقوفانہ باتیں کر رہے ہو۔ بنا اس کی سچائی کی تصدیق کے لیے اس سے ملنے چلی جاؤں اور اگر واقعی وہاں کوئی ٹریپ ہوا پھر؟" وہ ذرا غصے سے بولی۔
"ارے یار۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم کسی بہانے سے اسے دیکھو۔"
"ہاں' یہ ہو سکتا ہے۔" وہ کچھ اطمینان سے بولی۔
"تم دو گے میرا ساتھ۔" اس نے آغا کو گہری

نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"یار! معاملہ ذرا سیریس ہے، بہتر ہو گا کہ تم اپنے گھر والوں کو اعتماد میں لے کر یہ قدم اٹھاؤ۔" وہ دامن بچانے لگا۔

"دو دن میں ساتھ نبھانے کے وعدے پھیکے پڑ گئے۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"یہ کیا بات کی تم نے۔" وہ خفگی سے بولا۔ "وہ ایک مختلف معاملہ ہے یہ بالکل الگ۔ ساتھ نبھانے کا مطلب ہوتا ہے کہ اگر تم پر کوئی آزمائش آپڑے تو تمہارا ساتھ دوں' ایسے بے وقوفانہ ایڈونچر زمیں میرا ساتھ دینا ضروری نہیں۔"

یہ آزمائش ہی ہے آغا۔ اس نے دل میں سوچا مگر بولی نہیں۔

"گھر چلنا ہے یا بیٹھنا ہے سارا وقت برباد کیا ہے تم نے اس بے کار کے ٹاپک پر بات کر کر کے۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔

"نہیں... گھر چلتے ہیں۔ بیٹھ کر کیا کروں گی۔" وہ مزید کچھ کہے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے زاری سے سر جھٹک کر آغا بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

ظہر کی اذان بلند ہو رہی تھی جب لالی نے میرب کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ میرب نے بے زاری سے دستک کی آواز سنی اور بال سمیٹتی اٹھ بیٹھی۔ گزشتہ رات کے واقعات ایک مرتبہ پھر فلم کی مانند اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ سائر کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اس کے کانوں میں اترے تھے۔ ایک عجیب سے اضمحلال نے اس کے وجود کو جکڑ رکھا تھا۔ نہ اٹھنے کا دل چاہتا تھا نہ ہی کچھ کرنے کا۔ سو وہ صبح سے بنا کچھ کھائے پیئے یونہی پڑی تھی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

"کون' آجاؤ۔" وہ نقاہت سے بولی۔

"بڑی بی بی... وہ جی آپ کی دوست کا فون ہے۔ صبح سے دوبار کر چکی ہیں۔ آپ ان سے بات کر لیں۔" وہ اطلاع دے کر پلٹ گئی۔

وہ اپنے منتشر وجود کو سمیٹ کر اٹھی اور آہستگی سے چلتی ہوئی لاؤنج کے کارنر پر رکھے فون کا کریڈل جو ہولڈ تھا' اٹھایا۔

"ہیلو..." دھیمے سے کہا۔

"ہیلو... جی بیگم صاحبہ' آپ زندہ ہیں یا گزر گئیں؟" وہاں سے ماریہ چھوٹتے ہی طنز آمیز لہجے میں بولی۔

"پتا نہیں زندہ ہوں یا محض جی رہی ہوں۔" وہ پرملال لہجے میں بولی تو دوسری طرف ماریہ بری طرح ٹھٹک گئی۔

"کیا ہوا میرو... سب خیریت تو ہے۔ طبیعت کیسی ہے؟ سائر بھائی نے کچھ کہا۔" وہ تابڑ توڑ سوال کیے گئی۔

"پتا نہیں کیا بات ہے ماریہ... دل عجیب طرح سے گھبراہٹ کا شکار ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھ کر جیسے بے بسی سے بولی۔

"ایک تو تم اپنا فون بھی نہیں ریسیو کرتی ہو' کیا مذاق ہے یار... کیا شادی کا مطلب اپنے پچھلے رشتوں سے کٹ جانا ہوتا ہے۔" وہ بے حد خفا لہجے میں بولی۔

"کسی کا مجھے نہیں پتا' مگر میرے لیے شاید شادی کا یہی مفہوم ہے۔" وہ دل گرفتہ تھی۔

"کوئی جھگڑا ہوا ہے سائر بھائی اور تمہارے بیچ؟" اس نے محتاط اندازہ لگایا۔

"جھگڑا...؟ جھگڑا تو نہیں ہوا۔ جھگڑے تو برابری کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ حاکم اور محکوم کے درمیان کیسا جھگڑا۔" اس نے زخمی مسکراہٹ سے کہا۔

"بہت اپ سیٹ ہو میرو..." وہ تاسف سے بولی۔

"کچھ روز کے لیے یہاں آجاؤ۔"

"بالکل نہیں..." وہ یک لخت ٹھوس لہجے میں بولی۔ "میں نہیں آسکتی۔"

"کیوں نہیں آسکتیں' بالکل آسکتی ہو۔ ایسا کرو تم تیاری کرو' شام تک امی اور سعد تمہیں لینے آجائیں

گے۔"

"نہیں ماریہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بار بار اپنا گھر چھوڑ کر وہاں نہیں آسکتی۔" اب کی بار وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

"چلو ٹھیک ہے' مرضی تمہاری' مگر یار! اپنی خیریت کی اطلاع تو دے دیا کرو جانتی ہو امی کو پریشانی ہونے لگتی ہے۔"

"ہاں۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔ گھر میں سب کیسے ہیں!" اس نے بات پلٹنے کو پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔"

"چلو اچھا' میں فون رکھتی ہوں بعد میں بات کروں گی۔"

"اوکے۔" فون پکڑے وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔

"کیا ہوا میرب بیٹی۔۔۔ سب خیریت تو ہے؟" وقار صاحب جو اسٹڈی سے نکل رہے تھے' اسے یوں ریسیور پکڑے گم صم بیٹھا دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگے۔

"جی ابو۔۔۔ السلام علیکم!" اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال کر انہیں سلام کیا۔

"کیا ہوا بیٹی۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ اسے یوں بجھا بجھا سا دیکھ کر پریشان ہو اٹھے۔

"جی۔" وہ مختصراً" بولی۔

"آج ہماری بیٹی نے ہمیں صبح کا ناشتا بھی نہیں دیا' کیا بات ہے کوئی ناراضی ہے کیا۔" وہ شگفتگی سے پوچھنے لگے۔

"نہیں تو بابا۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"طبیعت کچھ بوجھل سی تھی بس اسی لیے۔" وہ اٹھ کر ان کے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

"کچھ کھایا تم نے۔۔۔ دیکھو تو چہرہ کیسا پیلا پڑ رہا ہے۔" انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا پھر لالی کو آواز دی۔

"لالی' میرب بیٹی کے لیے اچھا سا ناشتا تو لے کر آؤ۔"

"رہنے دیں بابا! یہ تو لنچ کا وقت ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم برنچ کرلو۔" وہ مسکرائے۔ پھر پوچھنے لگے۔

"باپ بھائی یاد آرہے ہیں؟ اپنی سعدیہ آنٹی کے گھر جانا ہو تو رہ آؤ ان کے ہاں کچھ روز۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔" وہ اس طرح گھبرا کر بولی کہ وہ تعجب میں پڑ گئے۔

"اچھا بابا' جب تک لالی ناشتا لگاتی ہے میں فریش ہو کر آتی ہوں۔" وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ ان کے پرشفقت انداز پر شرمندگی سی محسوس کررہی تھی۔ وقار پرسوچ کھوجی نگاہوں سے اس کی پشت تکنے لگے۔

"السلام علیکم بابا جان۔" اپنے روم سے نہائی دھوئی سی اجیہ برآمد ہوئی۔ وہ ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے محبت سے پر لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیا۔

"بھابھی کہاں ہیں وہ آج اٹھیں نہیں ابھی تک؟" اس نے صوفے پر بیٹھ کر آج کا اخبار یونہی اٹھایا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں اس کی۔ اب وہ ہمارے گھر کی فرد ہے' ذرا اس کا حال احوال پوچھتی رہا کرو۔ اس کے پاس بیٹھا کرو۔ اس کی دل جوئی کرو۔" وہ اسے سمجھانے لگے کہ دیکھ رہے تھے اجیہ گھر کے معاملات سے مزید لاتعلق ہوگئی تھی۔

"کیوں۔۔۔ ایسا کیا ہوگیا انہیں؟" اس نے اخبار پر نظریں جمارکھی تھیں۔

"کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ تمام گھر والوں کو مل جل کر باہم محبت و رواداری سے رہنا چاہیے۔" وہ اس کے اس طرح کہہ دینے پر کچھ برہمی سے بولے۔

اب کی بار اجیہ کچھ نہیں بولی۔ وقار بھی کتاب ٹیبل پر رکھ کر ٹی وی پر نیوز لگا کر بیٹھ گئے۔

"بابا! امی کا انتقال کیسے ہوا تھا؟" کچھ دیر بعد اجیہ نے بظاہر اخبار پر نگاہیں ڈالتے ہوئے سرسری انداز

میں پوچھا گروقار بری طرح چونکے۔
"وہ... اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" انہوں نے آواز بند کر کے جواب دیا۔
"ان کی تدفین کہاں ہوئی ہے۔ یہیں یا لاہور میں؟" اب کی بار اس نے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا۔
"آں... یہیں' لاہور سے تو ہم کافی عرصہ پہلے کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔" انہوں نے بتایا۔
"تب تو ان کی میت میں کوئی بھی نہیں آیا ہو گا۔ کیونکہ ہمارے زیادہ تر رشتے دار وہیں رہتے ہیں۔" اجیہ نے نکتہ پکڑا۔
"اچھا کہاں ہے ان کی قبر... آپ کو کبھی جاتے نہیں دیکھا۔" وہ پوری طرح ان کے چہرے پر ابھرتے ڈوبتے تاثرات کی جانب متوجہ تھی۔

"یہیں ڈیفنس کے قبرستان میں تھی۔ میں جاتا رہا ہوں' شاید تمہیں دھیان نہیں۔" وہ بڑی حیرانی میں گھرے تھے اس کے سوالات سن کر۔
"کیا آپ مجھے لے کر جائیں گے وہاں۔" وہ اب پوری سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
"کیسی باتیں کر رہی ہو اجیہ... لڑکیاں قبرستان نہیں جاتیں۔" وہ عاجز لہجے میں بولے۔
ان کے جوابات کا بے زار انداز' لہجے کا کھوکھلا پن' اجیہ کو نیزے کی انی کی طرح چبھا تھا۔
"کہیں تو کچھ غلط ہوا ہے۔ کیا؟ یہ نہیں معلوم مگر میں بہت جلد معلوم کرلوں گی بابا۔" وہ چمکتی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
تب ہی لالی نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ اور وہ کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ کھانے کے بعد میرب واپس اپنے روم میں اور وقار قیلولہ کرنے چل دیے۔ اجیہ اسی کی منتظر تھی۔ اسے دھندلا سا یاد تھا کہ کچھ تصاویر تھیں ایک چری کالے بیگ میں ' سے وہ بیگ اسٹور میں ڈھونڈنا تھا۔ اس نے بڑی آسانی سے ڈھونڈ بھی لیا۔ وہ اسٹور میں ایک الماری کے نچلے خانے میں دیگر کاٹھ کباڑ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بیگ جھاڑا۔ اور کھانستے ہوئے اس کی زنگ آلود زپ کھولی۔ اندر چند تصاویر تھیں۔ جن کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ نمی سے آپس میں وہ کچھ جڑ بھی گئی تھیں۔ اس نے ایک تصویر احتیاط سے علیحدہ کی۔ اور عجیب سے محسوسات میں گھر کر تصویر دیکھے گئی۔ ایک دو تصاویر نکال کر اس نے باقی چیزیں بیگ میں یوں ہی ٹھونس دیں اور بیگ پھینک کر اسٹور سے باہر نکل آئی۔ اسے اب ایک ضروری کال کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

لمحہ لمحہ اس پر بہت گراں گزر رہا تھا۔
"اگر یوں ہو گیا۔" کہیں ویسا ہو گیا۔ جیسے سوالات اس کے من میں اٹھ کر اس کے صبح شام بے چین کیے ہوئے تھے۔ وہ اپنی چال چل چکی تھی۔ اب منتظر تھی کہ بازی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ کبھی جی میں آتا کہ ایک مرتبہ پھر کال ملائے۔ مگر بدقت تمام وہ اپنے آپ کو روک رہی تھی۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سامنے سے کیا ردعمل آتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے بوسیدہ سے بیڈ پر بیٹھی ممکنات اور ناممکنات کے متعلق اندازے لگانے میں مصروف تھی تب ہی اس کا فون تھرتھرانے لگا۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ پھر فون پر نگاہ پڑتے ہی اس نے بڑی عجلت میں فون ریسیو کیا۔
"ہیلو۔ میں اجیہ بات کر رہی ہوں۔ اجیہ فاروقی۔" مکمل طور پر جذبات سے عاری لہجے میں کہا گیا۔
"ہاں۔ بولو۔" اس نے دانستہ لہجہ بے پروا بنایا۔
"آپ اس روز جو کچھ کہہ رہی تھیں کیا وہ سچ ہے؟"
"اب بھی شک ہے تمہیں؟ میرا خیال ہے کہ ان دو تین دنوں میں تم نے یہ بات جاننے کی کوشش تو ضرور کی ہوگی۔" وہ یقین سے بولی۔ اس کا یقین غلط نہیں تھا۔
اجیہ کو اس کا پُریقین انداز کچھ اچھا نہیں لگا۔ "میں نے کیا جاننے کی کوشش کی یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کا "سچ" جانچنا ہے۔ تو پھر آپ کب ملوا رہی

ہیں مجھے "میری ماں سے" وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔

"جب تم چاہو۔ جہاں تم چاہو۔" اس نے جیسے مکمل طور پر اسے بے بس کر دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ویمنز کالج کے سامنے جو پارک ہے اس پارک میں موجود جھیل پر وہ مجھ سے مل سکتی ہیں۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

"کب اور کس وقت؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"کل صبح دس بجے شارپ۔ میں انتظار کروں گی۔"

"اکیلی آؤ گی؟"

"ہاں کیوں؟" اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"بڑی بہادر ہو جو اتنی آسانی سے میری باتوں پر یقین کر کے اپنی ماں سے ملنے اکیلی آرہی ہو۔" توصیفی انداز میں اسے سراہا گیا۔

"بعض معاملات میں بہادری دکھانا پڑتی ہے اور آپ پر یقین کرنے یا نہ کرنے کا سوال قبل از وقت ہے۔ اس بات کا فیصلہ تو کل ہو ہی جائے گا۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"خوب۔ تمہارا انداز مجھے اچھا لگا۔"

"خدا حافظ 'یاد رہے کل۔ دس بجے شارپ۔"

اس نے اس بات پر کوئی تبصرہ کیے بنا فون رکھ دیا۔

"شروعات تو اچھی ہے۔ تم ایک مرتبہ ملو تو سہی۔ ملاقات کا انجام بھی میں اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کر ہی لوں گی۔" اس کی آنکھوں کی چمک لحہ بہ لحہ گہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس چبھتی روشنی نے پورا کمرہ بھر دیا۔

☼ ☼ ☼

اگر آپ بدقسمت ہیں تو یہ بدقسمتی تاعمر آپ کا تعاقب کرتی ہے۔ وہ کون لوگ ہیں 'جو کہتے ہیں کہ انسان اپنی قسمت خود لکھتا ہے۔ لکھتا ہے بالکل لکھتا ہے مگر جو اپنی قسمت خود لکھتا ہے وہ بھی تو خوش قسمت ہی ہوتا ہے۔ بدقسمت انسان اپنی تقدیر کہاں بدل پاتا ہے۔ اور میں بھی شاید ان ہی لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش ضرور کی مگر آج بھی کبھی کبھی لگتا ہے کہ وہ بدنصیبی جو میرا مقدر رہی ہے میرے بچوں کے تعاقب میں ہے۔ میں نے اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے کیسی کیسی کٹھنائیاں جھیلی ہیں یہ میرا دل جانتا ہے۔

مگر یہ آج اجیہ۔ میری گڑیا سی بیٹی کو کیا ہوا؟

وہ کیوں اتنے اجنبی لہجے میں مجھ سے سوالات کر رہی تھی؟ کیا اس کا یقین مجھ پر سے اٹھ گیا ہے۔ نہیں نہیں ایسا تو ممکن نہیں۔ میں دودھ کا جلا ہوں نا اس لیے۔ ہر واقعے کو اسی پس منظر میں دیکھنے کا عادی ہوں۔ شاید یہ میرے اندر چھپا خوف ہے۔ جو مجھے ہر لحہ کھائے جاتا ہے۔ سارے سچ ایک جھوٹ کے آگے اپنی حیثیت نہ کھو دیں 'یہ دھڑکا مجھے ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ زندگی نے کبھی بھی مجھے آپشنز نہیں دیے ایک راہ منتخب کر دی اور حکم ملا کہ اس پر چلتے جاؤ میں چلتا گیا' چلتا گیا مگر اب سوچتا ہوں کہ کیا کوئی راستہ اس کے علاوہ بھی تھا؟ وقار ماضی کے دھندلکوں میں کھو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اک چال چندا چل رہی تھی تو دوسری چال اس کی قسمت۔

اس سے قبل کہ وہ گھر والوں کو اپنی پسند سے آگاہ کرتی۔ قاسم کے دوست کے توسط سے اس کے لیے ایک رشتہ آگیا۔ لڑکا خوش شکل تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ ذاتی گھر و کاروبار تھا اور پھر نہ ماں نہ باپ' بہنیں اپنے گھر بار والی' ہاں اک چھوٹا بھائی تھا جو عنقریب پڑھنے کے لیے باہر جانے والا تھا۔ بی بی رقیہ کو تو یہ رشتہ نعمت غیر مترقبہ ہی محسوس ہوا۔ وہ تو اس کی تنک مزاجی سے ہمہ وقت ہولا کرتی تھیں کہ اس لڑکی کا سسرال میں گزارا کیسے ہوگا۔

"واہ رے مولا تیرے کام۔ گھر بیٹھے ایسا اچھا رشتہ دلوا دیا' لو بیٹا مانو۔ بہن کو لڑکے کی تصویر دکھا دو۔ اچھا ہے دیکھ لے ویسے ہی بڑی نخریلی ہے۔" آج بی بی کے

لبوں پر اس کے لیے خیر ہی خیر کے کلمات رکھے تھے۔
مانو جو پہلے ہی لڑکے کی تصویر دیکھ کر او کے کر چکی تھی، خوشی خوشی تصویر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

"دیکھا نیک بخت! میں نہ کہتا تھا' میری چندا قسمت کی دھنی ہے دھنی۔ ان شاء اللہ وہاں راج کرے گی میری بیٹی۔" شیخ صاحب حقہ گڑگڑا کر بھری طمانیت سے بولے کہ وہ اور قاسم لڑکے کا گھر بار دیکھ آئے تھے۔ چال چلن کے متعلق بھی تصدیق کروالی تھی۔ خاندان کے حوالے سے بھی تسلی بخش چھان بین ہو چکی تھی۔ لڑکے کی بہنیں دور' دور شہروں میں بیاہی گئی تھیں۔ انہیں شادی پر ہی آنا تھا۔ سارے معاملات قاسم کے دوست کے توسط سے طے ہوئے تھے۔ چندا کی تصویر بھی اسی نے لڑکے کو دے دی تھی۔ اس نے او کے کیا تب ہی یہ لوگ اسے دیکھنے گئے تھے۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ جو ابھی ابھی ریڈیو پر اپنی پسند کا نغمہ سن کر فارغ ہو کر بیٹھی تھی' مانو کی بات پر اٹھ بیٹھی۔

"اور کیا۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہوں' رشتہ پکا ہو گیا ہے تمہارا۔ یہ رہی لڑکے کی تصویر' مانو نے خوشی سے ملفوف' تصویر اس کے ہاتھ میں دی۔ چندا بھنا کر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے بھیڑ بکری سمجھ رکھا ہے کیا۔" وہ حلق کے بل اتنی زور سے چیخی کہ باورچی خانے سے گھبرا کر نازو دوڑی آئی۔ مانو اس کے رد عمل پر ہکا بکا ہی کھڑی تھی۔

"کیا بات ہو گئی' کیوں اتنی زور سے چلا رہی ہو۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"چیخوں گی اور زور سے چیخوں گی۔ وہ دیوانگی سے بولی ان لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی میرا رشتہ یہاں طے کرنے کی۔" وہ مارے طیش کے کپکپا رہی تھی۔

"آہستہ چندا! ابا گھر پر ہیں۔" نازو نے گھبرا کر اسے کنٹرول کرنے کی سعی کی۔ بی بی بھی یہ چیخ پکار سن کر افتاں و خیزاں دوڑی چلی آئیں۔

"ہیں تو ہوا کریں۔ سب کو اچھی طرح سمجھا دو' مجھے نہیں کرنی وہاں شادی' جہاں یہ لوگ طے کیے بیٹھے ہیں۔"

بی بی حق دق سی اس کی بکواس سنے گئیں۔

"پھر کہاں کرنی ہے۔ وہ جگہ بتا دو۔" اس ٹھہری ہوئی سنجیدہ آواز پر بی بی' مانو اور نازو کو لگا جیسے ان کے بدن کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

"ہاں۔ ہے ایک لڑکا' اسی سے شادی کروں گی میں۔" وہ قاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا خوف و خطر بولی۔

"بے غیرت۔ تیری ہڈی پسلی ایک کردوں گا میں۔ تیری اتنی ہمت۔" بس لمحوں کا کھیل تھا۔ قاسم کے منہ سے کف اڑنے لگا اور وہ بری طرح اس پر پل پڑے۔

ہراساں سی نازو ہی اسے بچانے کو آگے بڑھی۔ بی بی تو ششدر کھڑی تھیں اور مانو بری طرح روتے ہوئے انہیں تھامے کھڑی تھی۔

"چھوڑو قاسم۔" وہ اسے چھڑانے لگیں۔

"سمجھا دو اس بے حیا کو اچھی طرح۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" ان کا تنفس بری طرح زیر و زبر تھا۔

"اے۔" وہ جو زمین پر اوندھی پڑی ہوئی تھی ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ "جو کرنا ہے کر لو۔ شادی تو میں اسی سے کروں گی' اور اگر مجھ سے زبردستی کی کوشش کی تو میں بھاگ جاؤں گی یاد رکھنا۔" اک لمحہ کے لیے تو سب ہی کو لگا جیسے انہیں سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اتنی بڑی بات وہ کتنی آسانی سے کہہ گئی۔ مگر نہیں۔ انہیں سننے میں نہیں اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ بہت بڑی غلطی۔

"بے شرم۔ تجھے میں آج ہی مار کر تیرا قصہ تمام کرتا ہوں۔" وہ جو باہر نکل رہے تھے بپھر کر پلٹے۔

"اس کی ضرورت نہیں قاسم۔" ایک خفیف و تھکی

تھکی سی آواز گونجی۔ "جب نقیب گھر میں موجود ہوں تو اونچی فصیلیں بھی ریت کا ڈھیر ثابت ہوتی ہیں۔ میری رہی سہی عزت کا تماشا لگوانے سے بہتر ہے کہ اس لڑکے کے متعلق معلوم کرواؤ۔ مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی اسے اس گھر سے دفع کرنا ہے۔"

شیخ صاحب کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور آواز میں ڈوبنے والوں جیسی آہیں تھیں۔

مانو کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ برآمد ہوئی۔ نازو نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ بی بی تیورا کر زمین پر گری تھیں۔

☼ ☼ ☼

دور دور تک خشک' مٹیالے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ نجانے وہ یہاں کیسے پہنچا تھا۔ آج بھی وہ ننگے پاؤں تھا۔ کنکر' پتھر' خشک خاردار جھاڑیاں اس کے پیروں کو زخم زخم کرچکی تھیں۔ سورج غائب تھا مگر بادل بھی نہیں تھے' نجانے یہ کون سا موسم تھا۔ حبس' شدید قہر' اور ماحول مٹیالا سا تھا۔ اور وہ دوڑ رہا تھا۔ نجانے اس پر کیا جنون طاری تھا۔ تب ہی اس کے کانوں نے مانوس سی آواز سنی۔۔۔ بے حد مہین و ناتواں سی آواز۔

"اجیہ۔ اجیہ۔" وہ وحشت ناک انداز میں چلایا۔

"میری بہن' کہاں ہو؟" وہ دردانگیز لہجے میں اسے دیوانہ وار پکارے گیا۔

"یہاں ہے آؤ اسے لو۔" شوخ سی آواز پر وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تب ہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر اس کو وہی گلابی آنچل دکھائی دیا جس نے اس کی زندگی اجیرن کررکھی تھی۔ اس کے سڈول بازوؤں نے اک چھوٹی سی بچی کو تھام رکھا تھا۔

"آجاؤ۔ اسے بچالو' دیکھو منحوس رو رہی ہے۔ میں اسے نیچے پھینکنے لگی ہوں آجاؤ۔" بڑے دل آواز انداز میں وہ اسے پچکار کر بلا رہی تھی۔

"مت پھینکنا اسے۔۔۔ میں آرہا ہوں۔" وہ متوحش سا چیخا۔

"دیکھو' وہ دیکھو گئی نیچے۔۔۔ ہاہاہا۔" وہ ہذیانی قہقہے لگانے لگی۔

"اجیہ۔ میری بہن۔" اس کی آخری چیخ بڑی بے بس تھی کیونکہ گلابی آنچل والی نے اس کی بہن کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک دیا تھا۔

"اجیہ" اس کی گھبرا کر آنکھ کھلی تھی۔ اس نے کچھ دیر تک یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا کر ایک سانس میں خالی کردیا۔ پھر اٹھا اور اضطراری انداز میں سگریٹ سلگا کر کچھ لمحوں تک کمرے میں یہاں وہاں ٹہلتا رہا۔ پھر رائٹنگ ٹیبل تک آیا۔ وہاں کا لیمپ روشن کیا۔ بے آواز انداز میں مقفل دراز کھولی اور اس میں سے گرین جلد والی ڈائری کھول کر کچھ لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے کبھی کبھی وہ رک کر لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ میرب نے آنکھوں پر رکھے بازوؤں کی اوٹ سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھ سائر کے چیخ کراٹھنے سے کھل گئی تھی تاہم اس نے اپنے آپ کو سوتا ہی ظاہر کیا۔ ماحول میں اترا سناٹا بتا رہا تھا کہ رات بہت بیت چکی ہے۔ مگر وہ اس بیتی رات میں آخر کیا لکھ رہا تھا۔

میرب پریشانی و تجسس کی ملی جلی سی کیفیت میں گھری سوچے گئی۔

☼ ☼ ☼

یہ صبح اجیہ کی زندگی کی سب سے عجیب صبح تھی۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوگئی اور ڈرائیور کے ساتھ کالج آگئی۔ ڈرائیور کے جانے تک وہ یوں ہی رخ موڑے کھڑی رہی۔ پھر اس نے اک میسج سینڈ کیا۔ بوتل کے جن کی طرح آغا حاضر تھا۔ وہ اس کے ساتھ آج بھی سمندر کنارے چلی آئی۔

"اور اگر وہاں وہ موجود ہوئیں تو۔" وہ مضطرب سی ہوکر پوچھنے لگی۔

"تو کیا' جاکر بات کرلینا۔ پتا تو چلے آخر کیا راز ہے۔" وہ مزے سے بولا۔

"تمہارے لیے یہ کہہ دینا آسان ہے آغا۔ میں

جس مینٹل کنڈیشن سے گزر رہی ہوں اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔" وہ اس کے لاپروا انداز پر برہم ہوئی۔

"بھئی کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔ "کیوں بات بات پر ناراض ہونے لگی ہو۔ میں تمہیں بالکل ٹھیک مشورہ دے رہا ہوں۔ اگر وہاں تمہاری جگہ میں ہوتا تو جا کر ان سے بات کر لیتا۔ نہیں تو صرف دیکھ کر کیا کرنا ہے۔ اچار ڈالنا ہے۔" وہ اس سے بولا تو اجیہ اسے گھورنے لگی۔

"مسئلہ تو سارا یہی ہے۔ میرے لیے بچپن سے وہ مر چکی ہیں۔ اب اچانک وہ زندہ ہو کر میرے سامنے آئیں گی تو کیا تم میرے جذبات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ کیا ہوں گے؟" وہ اسے اپنا موقف بتانے لگی۔

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے لگے گا تو تمہیں عجیب ہی۔ مگر یہ کیا سسپنس ہے یار۔ تم نے اپنے گھر میں کسی سے ذکر کیا۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" اجیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "سچ جاننے کے لیے یہ ضروری تھا۔"

"تو گویا تمہیں اس عورت کی باتوں پر کچھ نہ کچھ یقین ضرور ہے؟"

"ہاں۔ نجانے کیوں میں اس کی باتوں کو رد نہیں کر سکی۔" اس نے اعتراف کیا۔ "مگر میں بے حد کنفیوژ ہوں۔"

"ہاں وہ تو لگ ہی رہی ہو' یہ لو پیو۔" اس نے جوس کا ٹن اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ جو اس نے بے دلی سے پرے کر کے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسی اثناء میں پونے دس ہو گئے تب وہ اٹھ گئے۔

"وش یو بیسٹ آف لک۔" آغا نے اس کے گاڑی سے اترنے کے بعد اسے انگوٹھا دکھایا۔

"ہوں۔" وہ ناچار مسکرائی اور پارک میں قدم رکھ دیے۔ اندر موجود اکا دکا افراد نے اسے معنی خیزی سے دیکھا۔ وہ نظر انداز کرتے ہوئے۔ جھیل تک آئی اور وہاں لگے بے شمار درختوں میں سے اک موٹے تنے والے برگد کے درخت کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے تابی سے گھڑی دیکھی سوا دس ہو رہے تھے۔

تب ہی کالی چادر کی بکل مارے کوئی عورت یہاں وہاں مشکوک انداز سے دیکھتی ہوئی وہاں نصب بنچوں کی اور بڑھتی دکھائی دی۔ پھر ایک بینچ منتخب کر کے وہ بیٹھ گئی۔ اس نے چادر سے اپنا آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ وہ محتاط انداز سے ارد گرد دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اس نے منہ سے چادر ہٹا کر رومال سے شاید پسینہ پونچھا تھا۔ اور تب ہی اجیہ نے دیکھا۔ کھنڈرات بتا رہے تھے کہ عمارت وہی تھی جو اس نے شادی کی تصاویر میں اپنے باپ کے پہلو میں دیکھی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ آنسو تھے کہ بے وجہ ہی گالوں پر پھسل آئے اور اس کے قدم میکانکی انداز میں اس کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی وہ اس بنچ کے نزدیک پہنچ بھی نہیں پائی تھی کہ وہ عورت لپک کر اس تک پہنچی۔

"میری بچی۔ میری اجیہ۔" اس نے والہانہ انداز میں اسے خود سے لپٹا لیا۔ "کتنی تڑپی ہوں۔ کتنا روئی ہوں میں تمہارے لیے۔" وہ اسے بے تحاشا چوم کر بولی۔ اجیہ سن سی کھڑی تھی۔

"کیسا اندھیر ہے میرے مولا۔ اک بے بس ماں اپنی نوزائیدہ بچی کے لیے تڑپتی رہی مگر کسی کو ترس نہ آیا۔" اس کی آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔

"آ۔ آپ نے مجھے کیسے پہچانا۔" اجیہ کے منہ سے تحیر آمیز سرسراتی آواز نکلی۔

"ماں ہوں تمہاری میرے بچے! تمہارے وجود کی خوشبو نے تمہارا پتا بتا دیا۔" وہ اسے یوں چھو چھو کر دیکھ رہی تھی گویا اس کے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہو۔

"چلو' چلو میرے گھر' باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ ابھی تو مجھے اپنی بچی سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بے قراری سے بولی۔

"آج نہیں پھر کبھی۔" وہ شدید ذہنی دھچکے میں

تھی۔

"نہیں۔ نہیں آج ہی۔ ابھی تو میری ممتا کو قرار بھی نہیں ملا تمہیں دیکھ کر۔" وہ جذباتیت سے بولی۔ تو وہ پسپا ہو کر اس کے ساتھ چل دی۔ زندگی کا یہ موڑ اسے کس سمت لے جانے والا تھا اگر جان جاتی تو یہیں ٹھہر جاتی۔

☆ ☆ ☆

گھر میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ گھر کے سب ہی نفوس ایک دوسرے سے دانستہ نگاہیں چرائے پھر رہے تھے۔ نہ کسی کو ڈھنگ سے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ کسی اور بات کا۔ ایسے میں بی بی کی آواز کبھی کبھی ماحول کا سناٹا چیر دیتی۔

"ہائے میرے مولا۔ میرے مالک! یہ سیاہ دن دکھانے سے پہلے تو نے مجھے مٹی میں کیوں نہ ملا دیا۔" وہ کرلا رہی تھیں۔ اور شیخ صاحب تو دو ہی دنوں میں اپنے بستر سے لگ گئے تھے۔ انہوں نے ایک گہری چپ اوڑھ رکھی تھی مگر بی بی جانتی تھیں کہ وہ اندر سے قطرہ قطرہ پگھل رہے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ہواؤں کی طرح ہلکا پھلکا تھا تو وہ صرف چندا تھی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ جیسے گھر میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ گھر میں وہ کچھ بیت چکا تھا کہ جس کا مداوا نہ تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔ آج پھر دوپہر میں روٹی بنالی۔ تم جانتی ہو' مجھے دوپہر میں چاول کھانے کی عادت ہے' مجھے نہیں کھانی روٹی۔ جاؤ میرے لیے چاول بناؤ۔" چندا نے دیکھ کر حسب معمول وعادت اعتراض جڑا۔

مانو خاموشی سے بنا کچھ کہے اٹھنے لگی۔ نازو جو چندا کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اس نے یکدم ہی اس کا ہاتھ پکڑا۔

"تم بیٹھ کر کھانا کھاؤ اور تم" اس نے نفرت سے اسے دیکھا' روٹی کھانی ہے تو کھاؤ۔ نہیں تو خود ہاتھ پیر ہلالو۔ یہاں کوئی تمہارا نوکر نہیں ہے جو تمہارے احکامات بجا لائے۔" وہ کہہ کر کھانے کی جانب متوجہ ہو گئی۔

دو منٹ تک تو چندا اسے خون آشام نگاہوں سے گھورتی رہی۔ پھر جھٹکے سے اٹھی اور صحن میں نکل گئی۔

"ابا سے شکایت لگانے گئی ہے۔" مانو نے بے ساختہ کہا پھر یک دم ہی جیسے بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"وہ یہ حق کھو چکی ہے مانو۔ جنہیں ہم نے اپنے دل میں بہت اونچے مقام پر بٹھا رکھا ہو۔ وہ جب اس مقام سے گرتے ہیں تو اتنے نیچے چلے جاتے ہیں کہ جھک کر دیکھنے پر بھی دکھائی نہیں دیتے۔" وہ کھانا کھا کر برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔ تب ہی وہ واپس لوٹی الٹے ہاتھ سے اپنی سیدھی کلائی تھامے۔ "برنال کہاں ہے" وہ تکلیف دہ انداز میں بولی۔ شاید اس نے چاول بنانے کے چکر میں اپنا ہاتھ جلا لیا تھا۔

"اماں کے پاس رکھی ہوئی ہے۔" جواب مانو نے دیا تھا۔ نازو برتن سمیٹ کر بنا اس کی طرف دیکھے کمرہ عبور کر گئی تھی۔

"لا کے دو فوراً" وہ اپنی کلائی پر پھونکیں مارتی ہوئی بولی۔ مانو اٹھی اور اماں کے کمرے میں جا کر آہستگی سے بولی۔

"برنال چاہیے۔ چندا نے اپنا ہاتھ جلا لیا ہے۔"

اور بی بی نے آج اس کے پھوہڑپن پر بالکل غصہ نہیں کیا۔ چپ چاپ اپنے سرہانے بنے طاق میں سجی انواع و اقسام کی چیزوں میں سے برنال برآمد کر کے اسے تھمادی۔ مانو اسے تھام کر باہر چل دی۔ بی بی بلا ارادہ ہی وہ واقعہ سوچ گئیں کہ جب ایک مرتبہ انہوں نے چندا کے ذمے سبزی کاٹنے کا کام لگایا تھا۔ پیاز کاٹتے کاٹتے یک دم ہی تیز دھار چھری اس کے انگوٹھے پر پھر گئی تھی۔ زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا' محض اوپر کی کھال چھلی تھی مگر اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ پھر شیخ صاحب نے بی بی کے وہ لتے لیے تھے کہ خدا کی پناہ۔ اور یوں آئندہ اس سے سبزی کٹوانے پر بی بی نے توبہ کر لی تھی۔

"شیخ صاحب! کھانا کھالیں۔" بی بی نے گھبرا کر

انہیں آواز دی۔

"دل نہیں چاہ رہا نیک بی بی۔" وہ ہنوز کروٹ لیے لیٹے تھے۔ مگر ان کی نم آواز گواہ تھی کہ وہ رو رہے تھے۔

بی بی تڑپ کر ان کے تخت پر آکر بیٹھیں۔

"شیخ صاحب! آپ رو رہے ہیں؟" خود ان کی آواز بھی بھیگ گئی تھی۔

"نہیں بی بی۔ یہ تو میرے دل میں پکتا ناسور ہے جو آنکھوں کے راستے بہہ رہا ہے۔" وہ نحیف آواز میں بولے۔

"کیوں ہلکان کر رہے ہیں خود کو۔" وہ ان کا کندھا دبانے لگیں۔

بعض اوقات درد اتنا سوا ہوتا ہے کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بھی اس وقت درد کی اسی کیفیت سے گزر رہے تھے۔

"پانی پلاؤں؟"

"پلادو۔" اور بی بی اٹھیں اور ان کی مخصوص صراحی میں سے صاف ٹھنڈا پانی نکال کر انہیں دیا۔ وہ اٹھے۔ انہوں نے گلاس تھاما۔ گلاس تین گھونٹ میں خالی کر کے انہیں دوبارہ تھمادیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی چلنے کی اسٹک تھامی۔

"کہاں چلے۔ کھانا تو کھالیں؟" بی بی نے پریشانی سے کہا۔

"بھوک نہیں۔ گھر میں دم گھٹ رہا ہے۔ ذرا باہر سے ہو کر آتا ہوں۔" انہوں نے قدم بڑھائے۔

"مگر ابھی تو بہت دھوپ ہے باہر۔ ذرا دن ٹھنڈا پڑنے دیں۔"

"میرے اندر اتنی آگ دہک رہی ہے بی بی کہ باہر کی گرمی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مت روکو مجھے' نکلنے دو باہر۔" وہ بے بسی سے بولے اور یہ کہہ کر باہر چل دیے۔ بی بی ایک مرتبہ پھر گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگیں۔

"ہائے میرے اللہ۔ کیا اسی دن کے لیے اماں باوا اپنے بچوں کے لاڈ اٹھاتے ہیں کہ یہ یوں اپنی من مانی کر کے اپنے ماں باپ کے منہ پر کالک تھوپیں۔"

ادھر چندا ان ساری باتوں سے بے نیاز چادر منہ تک تانے چھوٹے سے ریڈیو پہ کہیں سے آتا کوئی ڈرامہ بغور سننے میں مشغول تھی۔

دو تین دن قبل آصف شیرازی کو فون پر وہ تمام تفصیلات بتا کر سمجھا چکی تھی۔ اس جمعہ کو وہ اس کا رشتہ لے کر آرہا تھا۔ یہ محاذ وہ اتنی جلدی فتح کرلے گی۔ اس کا تو خود اسے بھی اندازہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرے ابا جی مرحوم غریب آدمی تھے۔ کچھ قرضہ لے رکھا تھا انہوں نے تمہارے باپ سے۔ وہ قرضہ اتار نہیں سکے۔ الٹا میرا رشتہ تمہارے باپ کے ساتھ طے کردیا۔ میں نے اس وقت انیسویں سن میں قدم رکھا تھا تمہارا باپ مجھ سے دوگنی عمر کا تھا۔ مگر میں باپ اور بھائیوں کی عزت کو سنبھالے ہوئے اس کے گھر بیاہ کر چلی آئی۔ بڑی عمر کا مرد یوں بھی شکی ہی ہوتا ہے اور اگر اس کی بیوی ذرا اچھی شکل و صورت کی ہو تب تو اس کے شکوک و شبہات سوا نیزے پر پہنچ جاتے ہیں۔ میرے کہیں آنے جانے پر پابندی تھی۔ غیر تو غیر رشتے داروں تک سے یہ مجھے ملنے نہیں دیتا تھا۔ میرا میکا جانا اسے پسند نہیں تھا۔ زندگی مجھ پر ہر طرح سے تنگ کر رکھی تھی اس آدمی نے۔

ایک روز میں ذرا دیر کو تنہائی سے گھبرا کر کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔ اس نے دیکھ لیا۔ مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی میرے ماں باپ فوت ہوچکے تھے۔ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ چند روپوں کی خاطر کس جنم میں بیٹی کو اٹھا پھینکا تھا۔ بھائی اپنی دنیا میں مگن' بہنیں بیاہ کر دور دیس جابسی تھیں۔ ایسے میں کون تھا جو تمہارے باپ سے اس کے ناروا سلوک کے متعلق بازپرس کرتا' اس لیے وہ اور شیر ہوتا گیا۔ میں اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کرتی کہ اسے کوئی شکایت نہ ہو مگر قسمت کی خرابی انسان درست نہیں کرسکتا۔

یہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر جاتا تھا۔ ان دنوں یہ اپنے ایک خاص کارندے کو میری نگرانی پر مامور کر جاتا۔ یہ تمہاری پیدائش کے بعد کا قصہ ہے، یہ حسب معمول اپنے کسی کام سے دوسرے شہر جارہا تھا۔ اس روز بہت موسم خراب تھا۔ بارش نے طوفان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ یہ مغرب کے بعد ایئرپورٹ کے لیے نکل گیا۔ تمہاری پیدائش کے بعد میں بہت بیمار ہوگئی تھی۔ مارے نقاہت کے مجھ سے اٹھا بھی نہ جاتا تھا۔

اس کو گئے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اس کا ہی کوئی دوست ایک اٹیچی کیس اٹھائے اس سے ملنے چلا آیا۔ اس زمانے میں موبائل تو تھے نہیں۔ گھر کا فون ڈیڈ پڑا تھا۔ اس نے اطلاع دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر بوجوہ نہ دے سکا۔ خیر اس کی آمد کا مجھے بشیرن ملازمہ نے بتایا۔ خرابی موسم کی وجہ سے سڑکیں بند تھیں۔ سواری ملنا بھی مشکل۔ میں نے کہا مہمان خانہ کھلوادو وہیں پڑ جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری نیکی اگلے ہی لمحے میرے گلے پڑ جائے گی۔

طوفانی بارشوں کی وجہ سے فلائٹ کینسل ہوگئی اور تمہارا باپ واپس گھر چلا آیا۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں سو رہی تھی جب اس کے بری طرح چیخنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں دہشت زدہ سی ہو کر لاؤنج کی طرف بھاگی۔ وہ اپنے دوست کو بری طرح زدوکوب کررہا تھا۔ دوست اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کرتو رہا تھا مگر اس پر تو گویا دیوانگی طاری ہوچلی تھی۔ جیسے ہی میں لاؤنج میں داخل ہوئی اس کے غصے کا رُخ میری طرف ہوگیا۔ اس نے مجھے بہت مارا، مغلظات بکیں، الزام تراشی کی، بہتان باندھا۔ میں ہاتھ جوڑے گڑگڑاتی رہی مگر تمہارے شکی مزاج باپ کو ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس نے دھکے مار کر مجھے اس بُری بارش میں اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ تمہیں بھی دیکھنے نہ دیا۔"

اس کا پورا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا اور وہ بری طرح رو رہی تھی۔

اجیہ بنا پلک جھپکائے بہتی آنکھوں میں بے یقینی سموئے یہ داستان سنتی رہی۔

"پھر اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟" اس کے منہ سے سرسراہٹ نما آواز نکلی۔

"کیا کرتی؟ خود کشی ہی کرنے جارہی تھی کہ تمہارے باپ کے دوست ہی نے سمجھایا کہ اپنے گھر والوں سے بات کرو۔ میں ان سے بات کرتی اس سے قبل ہی وہ میرے گھر والوں کو میری بے حیائی اور گھر چھوڑ جانے کے قصے سنا چکا تھا۔ انہوں نے صاف لفظوں میں مجھے قبولنے سے انکار کردیا۔" اس نے آہستگی سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے دل گرفتہ انداز میں بتایا۔

"بہت ظلم ہوا ہے آپ کے ساتھ۔" اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ "پھر آپ نے زندگی دوبارہ شروع کیسے کی؟ کیا شادی کرلی؟"

"پہلی شادی ہی اتنا بھیانک تجربہ تھی کہ آئندہ کرکے کیا کرنا تھا۔ تعلیم میری اتنی نہیں تھی، شروع میں چھوٹی موٹی نوکریاں کرکے گزارا کرتی رہی۔ قسمت میڈم کے پارلر لے گئی۔ آج تک وہیں جاب کررہی ہوں۔" وہ یاسیت سے مسکرائی۔

"آپ نے اپنے حق کے لیے آواز کیوں نہیں اٹھائی۔" وہ ایک دم مشتعل ہو کر بولی۔

"میں مفلس، غریب، خالی جیب میری بھلا کون سنتا؟" اس نے اپنا مذاق خود اڑایا۔

"مجھے آپ کے بھائی بہنوں پر حیرت ہے انہوں نے کیوں آپ کی بات نہیں سنی؟" وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

"اپنے گلے میں گھنٹی کون باندھتا ہے۔" وہ رنجیدہ سی بولی۔ "میرے سچ کو تسلیم کرلیتے تو اخلاقاً یا دنیا داری ہی کو مجھے چھت کا تحفظ بھی فراہم کرنا پڑتا۔"

"زندگی نے بہت غلط کیا ہے آپ کے ساتھ۔" اس کے آنسو پھر بہنے لگے۔ وہ بستر سے اٹھی اور اس

کے نزدیک آکر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مضبوط لہجے میں بولی۔

"کوئی آپ کا ساتھ دے یا نہ دے' میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ آپ کو وہ سارے حق دلاؤں گی جن سے آپ کو محروم رکھا گیا ہے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" اس نے ایک عزم سے کہہ کر اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیے۔

"میری بچی۔ مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔ سدا خوش رہے تو۔" اس نے بھی جواباً" اجیہ کا ماتھا چوم کر کہا۔

"ای! مجھے جانا ہے۔ نہیں تو دیر ہو جائے گی۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ٹکاتی ہوئی بولی۔

"ایسے کیسے۔ تو پہلی بار گھر آئی اور یوں ہی سوکھے منہ چلی جائے گی۔" وہ گڑبڑا کر اٹھی۔

"رہنے دیں۔ اب تو آتی ہی رہوں گی۔ فی الحال مجھے ٹیکسی تک چھوڑ دیں۔" وہ اداسی سے مسکرا کر بولی۔

زندگی میں انسان پر ناقابل یقین وقت بھی آتا ہے۔ یہ اجیہ کی زندگی کا ناقابل یقین وقت تھا۔ مگر اس نے بہت جلد ہی اس پر یقین کر لیا تھا۔

واپسی کے سفر میں ۔۔۔ وہ سارا وقت روتی رہی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ سر میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں پورا بدن جلتا انگارہ بن گیا تھا۔

جس دم وہ ٹیکسی سے اپنے گھر کے گیٹ پر اتری۔ اس کے قدم اندر بڑھنے سے انکاری ہو گئے۔ وسیع و عریض گیٹ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے تنگ و تاریک سیڑھیاں جو اس کی ماں کے فلیٹ تک جاتی تھیں' گھوم گئیں۔ اسے دیکھ کر چوکیدار نے مستعدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی سرسبز لان تھا۔ کھلے پھولوں کی خوشبو پر بوسیدہ فلیٹ کی ہیں متعفن راہداریاں حاوی ہو گئیں۔ گھر کے داخلی حصے میں داخل ہوئی تو فرش کی چمک ۔۔۔ نے دھیان فلیٹ کے اکھڑے ٹوٹے فرش میں اٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اس نے آخری منظر جو دیکھا' وہ یہ تھا کہ وقار صاحب تیزی سے اس کے نزدیک آرہے تھے۔ انہیں پوری قوت سے دھکیلنے کی خواہش لیے وہ زمین پر گرتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

آج جمعہ تھا۔

آنے والے مہمان ناپسندیدہ ہی سہی مگر بہرحال آتو رہے تھے اور ان کی خاطر داری بھی کرنی ہی تھی۔ بے دلی ہی سے بی مانو نے گھر کی صفائی ستھرائی کر دی تھی۔ نازو نے شامی کباب' چنا چاٹ اور دہی بڑے بھی بنا دیے تھے۔ چندا سب کی کیفیات سے بے پروا اپنی رگڑائی' دھلائی میں مصروف تھی۔ شیخ صاحب نجانے کون کون سی فکرات کو حقّے کے دھوئیں میں اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بی بی بھی تفکرات میں گھری بے دلی سے رات کی سبزی بنا رہی تھیں۔ قاسم بالکل خاموش سا تھا جبکہ ہاشم تو کسی گنتی ہی میں نہیں تھا۔

سہ پہر سے شام ہوئی۔ شام سے مغرب۔ پہلے دبی دبی سی بے چینی پھیلی۔ پھر جھنجھلاہٹ تیز ہو گئی۔ سجی سنوری سی چندا پہلے تو اتراتی پھر رہی تھی۔ پھر وہ کچھ جھنجھلائی' آخر میں فکر مند ہو کر آصف کو آفس کے نمبر پر فون کیا۔

"شیرازی تو صبح کی فلائٹ سے دبئی روانہ ہو گئے ہیں۔ انہیں ملک صاحب نے نوکری سے برخاست کر دیا ہے۔ کوئی کیس چل رہا تھا ان پر۔ سب کچھ ان کی اپنی وجہ سے ہوا ہے۔" آپریٹر نے جو اطلاع دی' وہ چندا کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اسے لگا اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے ہوں۔

"وہاں کا کوئی کانٹیکٹ نمبر۔" اس نے تھوک نگل کر پوچھا۔

"جی ہمیں کیا معلوم۔ بلکہ یہ بات بھی مشکوک ہی ہے کہ وہ دبئی ہی گئے ہیں یا۔" وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر چندا کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے لہٰذا

دوسری جانب سے آتی آواز سن نہ سکے۔

☆ ☆ ☆

اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ تب ہی اس نے مندی مندی سی آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

"ارے اجیہ! کیا ہوا' کچھ چاہیے کیا؟" اس کے سرہانے رکھی کرسی پر براجمان میرب نے اسے اٹھتے دیکھ کر سرعت سے پوچھا۔

"پانی۔" وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پیٹھ میں ایک درد کی لہر اٹھی اس کی کراہ نکل گئی۔

"آرام سے بیٹھو بھئی اور یہ لو پانی۔" وہ اسے پانی تھما کر واپس کرسی پر ٹک گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" اس نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر رکھا۔

"مجھے کیا ہوا ہے۔" وہ ناسمجھی سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"واہ بھئی۔ یہاں ہم سب کی جان تمہارے لیے آدھی رہ گئی اور تمہیں یہ ہی نہیں معلوم کہ تمہیں ہوا کیا ہے۔؟" وہ شوخی سے بولی۔

"بھابھی پلیز۔ میں سنجیدہ ہوں۔" وہ واقعی مکمل سنجیدگی سے بولی۔

"اس روز تم کالج سے آنے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھیں۔ تمہیں بہت تیز بخار تھا' غالباً" اسی لیے اس دن تم کالج سے ٹیکسی پر آئی ہوگی۔ طبیعت خراب تھی تو گھر کال کر کے ڈرائیور کو بلوالیتیں۔" میرب نے رسان سے بتایا۔

"آں۔ ہاں" وہ چونکی اس کے ذہن میں اس دن گزرے واقعات در آئے۔

"فون بزی تھا گھر کا۔ ان فیکٹ میرے پاس بیلنس بھی نہیں تھا۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"خیر۔ پھر تمہیں بابا نے اٹھایا اور روم تک لائے۔ ڈاکٹر انصاری کو فون کیا۔ انہوں نے تمہارا چیک اپ وغیرہ کر کے تمہیں انجکشن دیے۔ ذہنی دباؤ کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھیں تم۔" میرب نے مفصل بتایا۔

"تم پورے تین دن بعد مکمل ہوش و حواس میں ہو آج۔ ہوش میں تو خیر تم کچھ دیر بعد ہی آگئی تھیں مگر بخار کی شدت کی وجہ سے غنودگی میں تھیں پھر مسکن دواؤں کے زیر اثر تم سوتی بھی رہیں۔"

"او نو۔ مجھے تین دن ہو گئے اس کنڈیشن میں۔" وہ حیرت سے بولی۔

"جی بالکل۔ بابا تو مسلسل روتے رہے ہیں۔ وہ تو تمہارے سرہانے سے ہٹ ہی نہیں رہے تھے۔ انہیں بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اپنے روم میں بھیجا ہے' ایسے تو وہ خود اپنی طبیعت خراب کر لیں گے۔" اس نے بتایا۔ مگر نجانے کیوں وقار صاحب کے تذکرے پر اجیہ کے چہرے کے عضلات تن سے گئے۔

"سائر بھی دن رات چکر لگا رہے ہیں تمہارے کمرے کے۔ اجیہ! تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارا خیال رکھنے والے تم سے پیار کرنے والے لوگ تمہارے نزدیک ہیں۔" میرب بولی۔

"کون جانے۔ خوش نصیب ہوں یا بد نصیب۔ دنیا کی سب سے سچی اور بے لوث محبت سے دور کرنے کے بعد یہ میرے لیے اب اتنے فکر مند کیوں ہیں۔ اب تو میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں' ان کی فکر مندی اور احساس اس وقت کہاں تھے جب یہ اک شیر خوار کو اس کی ماں سے علیحدہ کر رہے تھے' ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک دے کر وقار صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

"میری بیٹی جاگ گئی۔" وہ خوشی سے اس کی جانب بڑھے۔

"جی بابا! جاگ گئی۔ اب تو ریلیکس ہو جائیں آپ۔" میرب خوش دلی سے بولی۔ اجیہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"کچھ کھائے گی میری بیٹی۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر اپنا بازو اس کے گرد پھیلا کر بولے۔

(جنہیں سے زہر لادیں۔ ہواؤں اذیت سے تو چھٹکارا ملے) وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"کیا بات ہے ہمارا بیٹا ہم سے ناراض ہے کیا؟" انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر پوچھا۔ اس نے محبت کے اس مظاہرے کو بہ وقت تمام برداشت کیا پھر بے تاثر لہجے میں بولی۔

"آپ جا کر آرام کریں۔ مجھے کچھ درکار ہوگا تو بھابھی سے کہہ دوں گی۔"

"اچھا۔ اچھا جیسے تمہیں اچھا لگے۔ اوہ بیٹی میرب! انہیں یک دم جیسے کچھ یاد آیا' تمہاری سہیلی کا فون ہے' جا کر سن لو اور ایک بات تو بتاؤ۔ یہ تمہارا موبائل کیوں ہر وقت آف رہتا ہے۔ تمہارے میکے سے جب کوئی فون کرتا ہے' یہی شکایت کرتا ہے۔ دھیان رکھا کرو۔" وہ ذرا خفگی سے بولے۔

"کچھ روز پہلے فون پر ان نون نمبر سے کالیں آ رہی تھیں۔ اس لیے سائر کہہ رہے تھے کہ فون آف رکھو' ویسے بھی گھر کا فون ہے تو مجھے پرسنل فون رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بتانے لگی۔

"رانگ کالز تو گھر کے نمبر پر بھی آجاتی ہیں۔ فون بند کر دینا تو اس مسئلے کا حل نہ ہوا۔ تم کرو آن اپنا فون۔ ابراہیم بھی کیا سوچتا ہوگا ایسے فون بند کر کے بیٹھ جانا کوئی تک ہے۔"

"سائر نہیں مانیں گے بابا۔ پلیز آپ مجھے مجبور مت کریں۔" وہ پریشانی سے بے ساختہ بولی۔ وقار صاحب تفکر میں پڑ گئے۔ میرب مڑ کر کمرہ عبور کر گئی۔

اجیہ کے چہرے پر مسکراہٹ زہر کی طرح پھیلی تھی۔

"گویا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔" اس نے سوچا۔

☼ ☼

"دیکھ لیا من مانی کا نتیجہ۔ جس کی خاطر باپ بھائی کی نظر میں خود کو ارزاں کیا وہ چپ چپاتے کہیں اور نکل گیا۔ اگر اسے اتنا ہی تمہاری عزت کا خیال ہوتا تو لاکھ رکاوٹیں آتیں مگر وہ اپنی زبان سے نہ پھرتا۔ جس آدمی کی زبان ہی ایک نہیں اس کا کیا اعتبار۔ اگر ماں باپ کے فیصلے کے آگے سر جھکاتیں تو آج یہ سر شرمندگی سے نہیں جھکا ہوا ہوتا۔" نازو کی لتاڑ۔

"اب بھی وقت ہے شریف بیبیوں کی طرح باپ کے فیصلے کے آگے سر جھکا دے۔ آگے سارے راستے آسان ملیں گے۔ ارے جو تجھے بیچ راستے میں چھوڑ گیا۔ اب اس کے لیے جوگ لے لی کیا۔" بی بی کی نصیحتیں۔

"مجھے اب اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں' جتنا ذلیل وہ ہمیں کروا سکتی تھی کروا چکی۔ وہ ٹی وی پر کام کرنے والا تو سرباز اچھا ہوا خود ہی بھاگ گیا۔ گھر تک آتا تو سہی ٹانگیں نہ توڑ دیتا اس کی تو قاسم نام نہیں۔" دن رات قاسم کے دعوے۔

شیخ صاحب البتہ کچھ نہ بولے' گھر کی فضا مکدر تھی۔ اس کی وجہ سے مانو کو بھی کالج سے اٹھا لیا تھا۔ وہ بیٹھی الگ کلستی رہتی۔ کچھ روز میں نازو کی تاریخ لینے اس کے سسرال والوں کو آنا تھا۔ بی بی اس سے پہلے ہی یہ اونٹ کسی کروٹ بٹھا دینا چاہتی تھیں۔

اور وہ چپ چاپ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑے ہوئے تھی۔ زندگی میں سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں ملتا اور اپنے خوابوں کی تعبیر تو بالکل بھی نہیں۔ یہ بات تو وہ جانتی تھی کہ راستے میں کٹھنائیاں' دشواریاں آئیں گی مگر وہ اس بات سے ناواقف تھی کہ اس کے راستے ہی مسدود ہو جائیں گے۔ وہ دن رات سوچوں میں غلطاں رہتی۔ شہزادی کو دو تین بار مزید فون کرنے پر بھی آپریٹر نے سابقہ جواب ہی دیا تھا۔ گھر پر فون نہیں تھا۔ اور اس کے گھر کا پتا بھی لاپتا تھا۔ ایسے میں وہ کوئی روزن تلاش کر رہی تھی جو اسے اس قید سے نجات دلائے اور پھر اک روز اس نے فیصلہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے سوچا تم ملنے آؤ گی نہیں سو اسی لیے کل تمہیں فون کیا اور آج خود ہی ملنے چلی آئی۔" ماریہ نے فروٹ چاٹ کھاتے ہوئے کہا۔ وہ اور میرب اس وقت میرب کے روم ٹیرس پر رکھی کین کی چیئرز پر براجمان تھیں۔ لنچ کے بعد وہ ٹیرس پر چلی آئی تھیں۔ موسم ابر آلود تھا اس لیے سہ پہر میں بھی شام کا گمان ہو رہا تھا۔ سرمئی بادل' ٹھنڈی مست ہوا' فضا میں تیرتے خوش رنگ طائر اور سہ پہر کا مخصوص سناٹا۔

یہ موسم میرب اور ماریہ دونوں کا پسندیدہ تھا۔

"اچھا کیا یار۔ میرا خود تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔"

"اجیہ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہتر ہے۔" اس نے بتایا۔

"اور تمہاری؟ مجھے تو تمہاری طبیعت بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ اسکن دیکھو کتنی رف ہو رہی ہے اور آنکھوں کے نیچے حلقے' ہونٹ خشک اور پپڑی زدہ' میرب! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ چند ہی ماہ میں۔" ماریہ ازحد تشویش سے بولی۔ اور خالی پیالی سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔ میرب پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"کچھ نہیں۔ بس گھر کے بکھیڑوں میں وقت ہی نہیں ملتا خود پر دھیان دینے کا۔"

"آدھ درجن تو نوکر ہیں تمہارے ہاں۔ کیا تم ہل جوتتی ہو؟" وہ تپ گئی۔

"شادی شدہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے ماریہ۔" وہ سنجیدگی اور رنجیدگی سے بولی۔

"تمہیں دیکھ کر تو مجھے شادی سے چڑ ہونے لگی ہے۔"

"خدا نہ کرے جو تمہیں میری طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے۔" وہ بے ساختگی سے بول کر پشیمان دکھائی دینے لگی۔ محسوس تو ماریہ نے بہت کچھ کیا تھا اور اس سے بارہا استفسار بھی کیا تھا۔ مگر اس نے کبھی میرب کے حالات کی کرید نہیں کی تھی۔

"کن مسائل کا شکار ہو میرو۔ تم کچھ شیئر کیوں نہیں کرتیں' شاید بہتری کے آثار پیدا ہو جائیں۔" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولی۔

میرب کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"کیوں جھیل رہی ہو تنہا اپنی ذات پر' کچھ بتاؤ گی نہیں تو مسئلہ حل کیسے ہو گا؟" اس کے ہاتھ کا لمس تھا یا کیا تھا' میرب کے آنسو بہتے چلے گئے۔

"سائر کسی اور میں انٹرسٹڈ تھے۔" وہ بولی۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" وہ اس کے ہاتھ پر سے ہاتھ ہٹا کر پوچھنے لگی۔

"میں نے ان کی پرسنل ڈائری میں اس کا فوٹو دیکھا تھا۔"

"صرف تصویر دیکھ کر تم نے یہ قیاس کر لیا۔ یہ تو بڑی بے وقوفی ہوئی۔" اس نے جھاڑا۔ "اور محض تصویر دیکھ کر ہی تم نے اپنا یہ حال کر لیا؟" وہ ناپسندیدگی سے بولی۔

"یہ بات نہیں ہے' میرا ہر عمل ان کی نگاہ میں مشکوک ہے۔ میری ہر بات کو وہ بڑی کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ سائر بھائی شکی مزاج شوہر ہیں' اس میں دوسری لڑکی میں انٹرسٹڈ ہونے والی بات کہاں سے آ گئی۔ اگر بالفرض وہ کہیں انٹرسٹڈ تھے بھی تو وہ تو ماضی کا قصہ ہوا نا۔ اب تو تم ان کی بیوی ہو۔ ایک زندہ مسلّم حقیقت۔ تم کس لیے یوں ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ گئی ہو۔" اس نے لتاڑا۔

"نہیں مجھ پر یقین ہی نہیں تو میری محبت پر کیسے ہو گا۔" وہ ناخن کترنے لگی۔ ماریہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"کیا کہتے ہیں وہ؟"

"وہ... انہیں لگتا ہے کہ میں۔ میں کردار کی کچی ہوں۔" اس کے آنسو پھر چہرہ بھگونے لگے۔

"واٹ؟" ماریہ ناگواری سے بولی "پاگل تو نہیں ہو گئے وہ' ان کے ذہن میں یہ خناس سمایا کیسے؟"

"مجھے کیا معلوم' میں تو اسی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ

شاید وہ کسی کو پسند کرتے تھے۔ اس نے انہیں دھوکہ دے دیا۔ اب وہ ہر لڑکی کے کردار پر شک کرتے ہیں۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ ان کے رحم و کرم پر ہوں۔ مجھے تو جو چاہے کہہ سکتے ہیں۔" وہ افسردگی سے بتاتی چلی گئی۔

"ہاں۔ بات تو تمہاری معقول ہے۔ یہ وجہ ہو سکتی ہے مگر میرو پھر تو یہ بہت تشویشناک بات ہے۔ وہ تو تمہاری زندگی عذاب بنا دیں گے۔" وہ کہہ نہیں سکی کہ عذاب ہی تو بنا رکھی ہے زندگی۔

"تم انہیں کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھاؤ۔" اس نے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے ماریہ۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"یوں گھٹ گھٹ کر جینا آسان ہے تمہارے لیے۔" وہ ناراضی سے پوچھنے لگی۔

"تو پھر میں کیا کروں۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ماریہ گہری افسردگی سے اسے دیکھتی رہی۔

"رو مت میرو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔" اس نے اس کا کندھا تھپک کر کہا۔

"پلیز ماریہ۔ کسی سے ذکر مت کرنا ان باتوں کا' میں اپنے بابا کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔" وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

"ہاں میں سمجھتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔" اس نے تسلی آمیز انداز اختیار کیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا حال ہے تمہارا جانم۔ کہاں ہو' کیسی ہو تم؟" اس کی آواز سنتے ہی آغا حسب توقع بے قراری سے گویا ہوا۔ آج اس کی طبیعت بہتر تھی سو اس نے فون جو بیٹری ختم ہو جانے کی وجہ سے بند پڑا تھا' آن کیا۔ مسڈ کال نوٹیفکیشن سے معلوم ہوا کہ آغا کل سے لاتعداد کالز کر چکا ہے۔ اس کے تشویش ظاہر کرتے میسجز بھی تھے۔ تب ہی اس نے آغا کو کال ملائی۔

"اب بہتر ہوں۔" اس نے کھڑکی کے پردے سمیٹتے ہوئے بتایا۔

"قسم سے یار! جب سے تائی سے تمہاری حالت کا سنا ہے تب سے سخت بے چین ہوں۔ میرا بس چلتا تو کب کا تمہیں دیکھنے آچکا ہوتا۔"

"جانتی ہوں۔"

"اس روز کیا ہوا تھا؟ ایلیں تمہاری مام" اس نے فطری تجسس میں گھر کر پوچھا۔

"میں اس کے متعلق فی الحال بات کرنا نہیں چاہ رہی۔" اس نے واقعی بڑی مشکل سے اپنا ذہن ہٹایا تھا۔

"کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اتنا رومانٹک موسم ہے' سنو! ملنے آجاؤ۔" وہ جان کھینچ لینے والے لہجے میں ملتجی ہوا۔

"آغا۔ میں نہیں آسکوں گی فی الحال۔" اس نے اس کی التجا سے صرف نظر کرتے ہوا کہا۔ آغا نے اک طویل ٹھنڈی سانس لی۔

"کبھی کبھی تو پوری ہٹلر بن جاتی ہو تم' خیر جلدی ٹھیک ہو جاؤ یار۔ میں مس کر رہا ہوں تمہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"چلو رکھتی ہوں بعد میں بات ہو گی۔"

"او کے۔" اس نے فون کان سے ہٹایا۔ تب ہی سرمئی آسمان پہ بادلوں کی گرج گونجی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔ وہ چپ چاپ گرل سے سر ٹکائے گارڈن پر برستی بارش کا منظر دیکھے گئی۔ اس کے احساسات اس وقت عجیب تر ہو رہے تھے۔ درد اتنا تھا کہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی رگ رگ میں محشر برپا ہے اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہے۔

زندگی کبھی کبھی انسان کو بے بسی کے کس مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ بچپن ہی سے جس کی جدائی کا دکھ ساتھ لے کر جوان ہوئی۔ کتنی بار شدت سے سوچا کہ کاش میری ماں زندہ ہوتی اور آج یہ دعا قبول ہوئی بھی تو کس رنگ میں۔

جی تو چاہ رہا ہے کہ جا کر ان ظالموں کا گریبان پکڑ کر ایک بار تو ضرور ہی پوچھوں کہ جیتے جی کسی کے بیچ جدائی ڈالنے والے خداؤں۔ کیا کبھی تمہیں میری محرومی پر ترس نہیں آیا۔ اس لاچار عورت کو تہی داماں کرتے وقت تمہارے ہاتھ کیوں نہ کانپے۔ کس بیدردی سے اٹھا کر اسے کسی کوڑے کی طرح اپنی زندگیوں سے نکال پھینکا۔ پوچھوں تو سہی کہ کیا اس کا قصور اتنا ہی بڑا تھا کہ اس پر زندگی کا ہر دروازہ بند کر دیا جاتا مگر بے بس ہوں۔ مجبور ہوں میں۔ وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ہماری ملاقات کا علم ہو گیا تو ایک مرتبہ پھر وہ خالی ہاتھ رہ جائیں گی۔ اور یہ ہی میں نہیں چاہتی۔

گرم گرم پگھلتا لاوا اس کا چہرہ بھگونے لگا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھے۔ اور خود کو کمپوز کیا۔

"اجیہ۔ کیسی طبیعت ہے؟" آنے والی میرب تھی۔

"جی بھابھی بہتر ہوں۔" اس نے مڑتے ہوئے جواب دیا۔

"جانتی ہو! یہ موسم مجھے دیوانہ کر دیتا ہے۔" وہ بچوں کی سی خوشی اور معصومیت سے گویا ہوئی۔

"اچھا۔ تو آپ انجوائے کریں۔" وہ برش اپنے بالوں پر پھیرتی ہوئی بولی۔

"اکیلے کیا خاک مزہ آئے گا۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"تو سارب بھائی تو اس وقت آفس میں ہوں گے۔ آپ انہیں کال کریں۔" وہ برش رکھ کر پلٹی۔

"اُفوہ" وہ جھینپ گئی' میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ اصل میں اپنے گھر میں 'میں اور ماریہ بارش میں بھیگ کر گرم گرم پکوڑے' چپس کھا کر اور کافی پی کر اس موسم کو انجوائے کرتے تھے۔"

"تو چلیں' میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔" اجیہ یوں بھی اپنے اندر کی تنہائی سے اکتائی ہوئی تھی۔

"ارے۔ یہ ہوئی نا بات" وہ بے ساختہ خوش دلی سے بولی۔ "مگر کہیں بھیگنے سے تمہاری طبیعت واپس نہ بگڑ جائے۔" اسے خدشہ ہوا۔

"نہیں برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھوں گی' بھیگ آپ لیجئے گا پھر کافی ساتھ ہی پی لیں گے۔" وہ مسکرائی۔ جبری مسکراہٹ کہ اس وقت کچھ بھی کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"بس تو پھر آ جاؤ۔" پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلیں۔

"ارے کہاں چلیں تم؟ اندر بیٹھو' ابھی تو بیماری سے اٹھی ہو۔" نیوز دیکھتے وقار اجیہ کو لان میں نکلتا دیکھ کر فکرمندی سے بولے۔

"فکر مت کریں اتنی آسانی سے نہیں مروں گی۔" وہ خشونت آمیز لہجے میں کہہ کر باہر نکلتی چلی گئی۔ میرب کو بارش کی پڑی تھی اس لیے اس کا کڑوا لہجہ و انداز محسوس نہ کر سکی۔ اس کی بات پر وقار کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔

"تمہیں بارش میں نہانا کیسا لگتا ہے؟" میرب نے برستی بوندیں ہتھیلیوں پر جمع کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دم بے کار۔" اجیہ نے منہ بنا کر بتایا۔

"ارے۔ مگر اکثر لڑکیاں تو بارش کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔"

"آپ مجھے تو اس اکثریت سے خارج تصور کریں۔" وہ ٹھوڑی سیدھے ہاتھ پر ٹکائے سنجیدہ نگاہوں سے بارش کا رقص دیکھ رہی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ میں بارش کی طرح رم جھم ناچوں۔" میرب کی آواز بہت مدھم تھی اور وہ بہت کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"بارش میرے اندر ڈھیروں اداسی سی بھر دیتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بارش ہمیں ہماری زندگی کے خالی پن کا احساس دلانے آتی ہے۔" اجیہ کی نگاہیں دور کہیں بھٹکیں۔

"بارش کی آواز مجھے بہت سکون بخشتی ہے۔"

"مجھے اس کی آواز سے وحشت ہوتی ہے۔"

"اپنا اپنا نظریہ ہے۔ مجھے تو یہ موسم دیوانہ کر دیتا ہے۔" وہ مست انداز میں گول گھومی۔ اجیہ اس مرتبہ خاموش رہی۔ اک دھیمی سے مسکراہٹ نے اس کے

لبوں کا احاطہ کیا تھا اس کی بے خودی دیکھ کر۔ تب ہی اجیہ نے پورچ میں آکر رکتی سائر کی کار دیکھی۔ میرب آنکھیں بند کیے چہرہ اونچا کیے کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھی۔ اجیہ نے سائر کو لپک کر اس تک آتے دیکھا۔ اس نے یقیناً" بڑی زور سے میرب کا بازو دبوچا تھا۔ کہ تکلیف اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ چہرہ جو کچھ دیر پہلے گلاب کی مانند کھلا ہوا تھا سائر کو دیکھتے ہی سرسوں کے باسی پھول میں تبدیل ہو گیا۔

"اندر چلو۔" سائر کی آواز تھی یا غراہٹ۔ میرب تو میرب اجیہ کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ اسے وحشی جنگلیوں کی طرح اندر کھینچتا چلا گیا۔

اجیہ نے بے حد کرب سے یہ منظر دیکھا۔ اس کی آنکھیں لحظہ بھر کو حیرت میں ڈوبی تھیں مگر دوسرے ہی لمحے حیرت کی جگہ اشتعال نے لے لی۔

سائر بھائی۔ بابا کا پر تو ہیں' ویسے ہی شکی' تنگ نظر اور غصہ ور آپ نے ٹھیک کہا تھا امی۔ بابا یقیناً" ایک ظالم انسان رہے ہوں گے۔ وہ تنفر سے سوچے گئی۔

بارش اسی تواتر سے برس رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مرو ادھر۔" سائر نے ایک جھٹکے سے لاکر میرب کو بیڈ پر پھینکا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔

"آپ کیا گناہ سرزد ہو گیا مجھ سے۔" وہ چیخ ہی تو گئی۔

"زیادہ زبان درازی مجھے پسند نہیں' پہلے بھی تمہیں وارن کر چکا ہوں۔" وہ پرسکون انداز میں کف لنکس کھول رہا تھا۔

"مگر آپ کی ناراضی کی وجہ تو پوچھ سکتی ہوں نا۔" وہ سسک کر بولی۔

"بارش میں نہانے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنا شوق چھت پر جاکر پورا کرنا چاہیے تھا تمہیں۔ لان میں یوں بارش میں اچھل کود کر کے گھر کے نوکروں کو دعوت نظارہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ درشتی سے بولا۔

"وہاں کوئی نہیں تھا۔" وہ بولی۔

"مگر آتو سکتا تھا نا۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔

"اف خدایا یہ آدمی۔ نجانے کون کون سے ارمانوں کا گلا گھونٹے گا میرے۔" وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔

"یہ ہر وقت بے کار کا رونا دھونا مت شروع کر دیا کرو۔ جاؤ چینج کر کے میرے لیے کافی بنا کر لاؤ۔"

ناچار وہ اٹھی۔ شاور لے کر چینج کیا پھر کافی بنا کر واپس کمرے میں آئی تو وہ ٹیرس پہ تھا۔

"بیٹھو۔" وہ کافی رکھ کر پلٹنے لگی تو وہ یکدم بولا۔

"مجھے کام ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔ چہرے پر آنسوؤں کے مٹے مٹے نشانات تھے۔

"کچھ دیر بعد کر لینا۔" وہ بیٹھ گئی۔

"تم مجھے پاگل تو نہیں سمجھتیں۔" اس کے سوال پر بے ساختہ اس نے اپنا جھکا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسی کی جانب ہی متوجہ تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"دیکھو میرو! زندگی بہت مشکل ہے۔ اتنی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔" وہ اضطراری انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اٹھ کر اس کے برابر میں آ کھڑی ہوئی۔

"زندگی اتنی دشوار عموماً" ہوتی نہیں جتنا کہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اسے بنا ڈالتے ہیں۔" وہ بولی۔

"زندگی کا ایک ہی کاری وار سارے فلسفوں کو فیل کر دیتا ہے میرو۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"میں فلسفہ کیا جانوں سائر۔ یہ تو سامنے کی حقیقت ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ جب جینا مرنا اسی شخص کے ساتھ ہے تو پھر کیوں نہ بہادری سے سب کچھ فیس کیا جائے' اس نے سوچ لیا تھا۔

"حقیقت آزار میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"ہرگز نہیں حقائق کی روشنی میں زندگی زیادہ سہل طریقے سے آگے بڑھتی ہے۔"

"میرو۔ کیا بارش تمہیں خوفزدہ نہیں کرتی۔" اس نے گردن موڑ کر اس معصومیت سے اس سے استفسار کیا کہ یک لحظہ تو میرب کا جی چاہا اسے خود میں سمو کر اس شخص کے دل میں گڑے سارے کانٹے اپنی پوروں سے چن لے۔

"بارش سے کیا خوف۔" اس نے دانستہ بے پرواہ لہجے میں کہہ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"مجھے لگتا ہے یہ سب کچھ چھین لے گی مجھ سے۔" وہ آسمان کی جانب ناپسندیدگی سے دیکھتا ہوا بولا۔ بارش اب ہلکی پھوار میں تبدیل ہوگئی تھی۔

"یہ تو خود رب کے حکم کی محتاج ہے اس میں اتنی طاقت کہاں۔ سائر، آپ اپنے رب پر بھروسہ کرلیجیے ان شاء اللہ وہ آپ کے سارے اندیشے، فکریں اور خدشات سب دور کردے گا۔" وہ حوصلہ افزا انداز میں بولی۔ وہ چند ثانیے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر یکدم بولا۔

"تم مجھے چھوڑ تو نہیں دوگی میرو۔ تمہیں میرے ساتھ کسی کمی کا احساس تو نہیں ہوتا۔" اس کا انداز ڈرا ڈرا سا تھا۔ خدشات میں گھرا ہوا۔ کچھ دیر میرب پریشانی سے اس کی شکل دیکھے گئی۔

"آپ کو یہ وہم کیوں ستاتا ہے سائر۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔ ہمراز ہوں ہمراہی ہوں۔ اگر آپ کے دل میں کوئی بوجھ ہے تو مجھ سے بانٹ لیجیے۔" میرب کو لگا کہ یہ آسمانی لمحہ ہے جو اسے غیب سے فراہم کیا گیا ہے اگر اس نے اس موقع کا فائدہ نہ اٹھایا تو وہ بڑے نقصان میں رہے گی۔

"چلو کافی پیو۔ ٹھنڈی ہوگئی ہوگی۔" وہ معاً مڑا اور واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسرار اتنی جلدی کہاں کھلتے ہیں۔ میرب ایک ہوکا سا بھر کر کرسی پر آبیٹھی اور ٹھنڈی ہوتی تلخ کافی لبوں سے لگالی۔

☆ ☆ ☆

چندا نے قاسم کے لائے رشتے پر حامی بھرلی تھی۔ گھر بھر نے گویا سکون کی سانس لی تھی۔ جبکہ شیخ صاحب نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ٹھیک کہا تھا نازو نے دل کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھنے والے جب اپنے مقام سے گرجائیں تو وہ جھک کر دیکھنے پر بھی دکھائی نہیں دیتے، بی بی اس کی شادی نازو کے ساتھ نمٹانا چاہتی تھیں مگر قاسم کوئی رسک لینے پر تیار نہ تھا۔ سو اسی لیے وہ سب سے پہلے رخصت ہوئی اور یوں اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

کافی سوچ بچار کرکے کیا گیا یہ فیصلہ چندا کے حق میں بہت ہی بہتر ثابت ہوا۔ جمیل اس کا شوہر اس کی معصومیت اس کے حسن پر بے طرح مرمٹا تھا۔ اس کا صرف ایک چھوٹا بھائی ہی تھا اس کے ساتھ جو شادی کے محض پندرہ ہی دن بعد بغرض تعلیم انگلینڈ سدھارا۔ ساس سسر کا جھگڑا تو سرے سے تھا ہی نہیں۔ نندیں بھی دور دور شہروں میں تھیں۔ ایسے میں وہ تھی اور اس کا بے دام کا غلام اس کا شوہر جمیل۔

☆ ☆ ☆

"کیوں بند ہے مسلسل اس کا فون۔ کہیں اس جذباتی لڑکی نے سب کچھ گھر جاکر تو نہیں بتادیا۔" گل نے موبائل غصے سے پٹخا۔ وہ دو تین سے مسلسل اجیہ کو فون ملا رہی تھی اور مسلسل ہی اس کا فون بند جارہا تھا۔ خدشات اور واہموں نے اس کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔

"کیا گھر کے نمبر پر فون کرلوں؟" کتنی ہی بار وہ یہ سوچ کر رد کرچکی تھی۔ اپنی جاب پر بھی اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اٹھی اور اپنے نیم تاریک و بوسیدہ سے فلیٹ میں چکرانے لگی۔

"کیا کروں۔ کیا کیا ہے اس لڑکی نے کچھ معلوم تو پڑے۔" تب ہی اس کا فون بجا، وہ لپک کر آئی اور جلدی سے فون ریسیو کیا۔

"ہیلو۔" وہ بے تابانہ بولی۔

"ہیلو۔ السلام علیکم۔ میں اجیہ بات کررہی ہوں۔"

"میری بچی کہاں رہ گئی تھی تو۔ تیری یہ ماں کتنی پریشان رہی تیرے لیے۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔

"میں کل آتی ہوں آپ کی طرف۔ بس یہی بتانے کے لیے فی الحال فون کیا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں ضرور آؤ۔ میرا غریب خانہ تمہارے لائق تو نہیں مگر کیا کروں، میرا تو ٹھکانہ وہی ہے۔" وہ

یاسیت سے بولی تو اذیت کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔" اس نے بہ طور خاص پوچھا۔

"نہیں نہیں' بالکل نہیں۔ بس تم آجاؤ میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔"

"پھر کل ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔"

☼ ☼ ☼

"میری کالج فرینڈ ہے نا ماہا۔ اس کا بھائی سائیکاٹرسٹ ہے۔ P.E.C.H.S میں کلینک ہے ان کا۔ میں نے اس سے تمہارا مسئلہ ڈسکس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پوری ہسٹری معلوم ہو تب ہی کچھ مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ آئی مین ان کے بچپن کے واقعات' جوانی کے حالات وغیرہ وغیرہ۔" ماریہ نے کہا۔

"مگر وہ سب تو مجھے معلوم نہیں۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"یہی تو میرب معلوم کرونا' کھوج کرید وانہیں بلکہ کھوج اور کرید بھی رہنے دو' ان سے یوں ہی ان کے بچپن کے متعلق سوالات کرو' دوستوں کے بارے میں' پڑھائی کے بارے میں۔ تم بیوی ہو ان کی۔ شوہر اور بیوی کے پاس تو اتنا کچھ ہوتا ہے شیئر کرنے کے لیے۔"

"مگر کوئی شیئر کرنا چاہے تب نا۔" اصل مجبوری یہی تھی۔

"تو وقار انکل سے پوچھ لو یوں ہی نامحسوس انداز میں۔"

"پوچھ چکی ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں بتائی انہوں نے سوائے اس کے کہ سائر بچپن سے ہی بہت حساس' ذہین' پڑھاکو اور تنہائی پسند قسم کا بچہ تھا۔" میرب نے بتایا۔

"گویا نفسیاتی پن کی ساری علامات بچپن ہی سے موجود تھیں موصوف میں۔" ماریہ ٹھہر کر بولی۔

"ارے۔ ارے' میرب کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔

"ذرا ادب سے بات کرو بھئی۔"

"مجھے کیا کرنا ہے ان کا ادب کر کے تمہارا فرض ہے۔ تم جی بھر کر کرو بھی اور کراؤ بھی۔ یار میرو' تم نے بتایا تھا کہ تم نے ان کی پرسنل ڈائری سے تصویر نکالی تھی۔" ماریہ نے جیسے نکتہ پکڑا۔

"ہاں۔ مگر ڈائری وہ لاکڈ رکھتے ہیں۔" میرو بھی جیسے اس امکان پر غور کرنے لگی۔

"اُفوہ' ایک تو تم کھامڑ بہت ہو ارے بھئی لاک توڑا بھی تو جاسکتا ہے نا۔ ایک ایسا بندہ جو اندر سے بہت گہرا ہو' حساس ہو' جس کا کوئی دوست و ہمراز نہ ہو' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی پر یقین نہیں کرتا' آئی مین کسی انسان پر۔ مگر وہ ڈائری لکھتا ہے۔ بس یہی پوائنٹ ہے میرو۔ یقیناً" وہ اپنے خیالات' احساسات' ڈائری کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتے ہوں گے کہ ڈائری تو بے جان ہے اور بے جان چیزیں دھوکہ نہیں دیتیں۔" ماریہ مارے جذبات کے تیز تیز بولتی رہی۔

"میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔" وہ ناسمجھی سے بولی۔

"یار! ان کی ڈائری پڑھنے کی کوشش کرو' کیا پتا کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔" اس نے سمجھایا' ایسے تو یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ تمہیں تھوڑی ہمت دکھانی ہوگی۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر کیا انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا۔؟ اس کا اشارہ سائیکاٹرسٹ کی طرف تھا۔

"نہیں غیب کا علم تو ہے نہیں محترمہ۔ ہاں البتہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اکثر وہ بچے جن کی مائیں یا باپ بچپن میں بچھڑ جائیں تو ان کی پرسنالٹی عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے سائر بھائی کے ساتھ یہ مسئلہ ہو مگر فی الحال حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ابھی تو یہی ہے کہ تم انہیں پوری توجہ دو۔ پیار دو۔ ان کے شکوک و شبہات اپنے طرز عمل سے دور کرنے کی کوشش کرو۔" ماریہ نے کہا۔

"ہوں۔ چلو میں کوشش کرتی ہوں۔ تمہارا بہت شکریہ ماریہ، تم نہ ہوتیں تو نجانے میرا کیا ہوتا۔" میرب نے تشکر سے کہا۔

"ربش۔ چلو فون رکھو' اور یار کوشش کر کے یہاں کا چکر لگا لو' امی بہت یاد کر رہی ہیں تمہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں کر تو رہی ہوں۔ تم دعا کرو میرے لیے۔" وہ اپنی پیشانی سہلاتی ہوئی بولی۔

"ہاں وہ تو ہر نماز میں کرتی ہوں۔ او کے' خدا حافظ۔" ماریہ نے کہہ کر فون رکھ دیا۔ میرب کے ماتھے پر تفکرات کا جال پھیلا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ زندگی اس کے خوابوں جیسی تو بالکل نہیں تھی ہاں البتہ شیخ صاحب کے گھر میں گزاری جانے والی زندگی سے یہ پر تعیش زندگی لاکھ درجہ بہتر تھی۔ اپنی مرضی سے سوتی' اپنی مرضی سے جاگتی' جی چاہا تو گھر میں کھا لیا نہیں تو باہر سے منگوا لیتی۔ جمیل نے ایک کل وقتی ملازمہ بشریٰ اس کی خدمت پر مامور کر دی تھی۔ سو وہ ہاتھ پیر ہلانے سے بھی گئی۔ سارا سارا دن بیٹھی رنگین ٹی وی پر انڈین فلمیں' وی سی آر لگا کر دیکھا کرتی۔ جمیل اس پر ذرا روک ٹوک نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ اپنے میکے جانا چاہتی' نہ وہاں ہی سے کوئی چکر لگاتا۔ کبھی کبھار بی بی' جمیل کے آفس فون کر کے اسے میکے لانے کی کوششیں کیا کرتیں' ماں تھیں شیخ صاحب کی اس سے لگاوٹ و محبت ان کے اس ارمان کے ساتھ ہی اپنی موت آپ مر گئی تھی سو وہ اس کے گھر آنا چاہتی تھیں۔ مگر قاسم نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا کہ اچانک اسے قلم روکنا پڑا۔

☆ ☆ ☆

"بس اور نہیں...." اجیہ نے گل کا نوالہ بنا ہاتھ پیچھے کیا۔

"کیوں میری جان... کھاؤ نا اور دیکھ تو کتنے پیار سے میں نے یہ چکن پلاؤ بہ طور خاص تیرے لیے بنایا ہے۔ تو نے بتایا تھا نا کہ تجھے پسند ہے میں تو اور بھی بہت کچھ پکانا چاہ رہی تھی مگر کیا کروں مہینے کا آخر ہے نا' اس میں دال روٹی ہی مشکل سے چلا پاتی ہوں۔" وہ ہاتھ پیچھے کر کے گہرے رنج میں ڈوب گئی۔

"اچھا لائیں کھلائیں۔" اجیہ نے اس کا وہی ہاتھ پکڑ کر منہ میں ڈالا۔ وہ خوش ہو گئی۔ کھانے کے بعد وہ اسے لیے پلنگ پر چلی آئی۔

"اتنے دن تیرا فون بند رہا میں تو گھبرا ہی گئی کہ کہیں تو نے اپنے باپ کو کچھ بتا تو نہیں دیا اور کہیں اس نے تجھ پر مجھ سے ملنے کی پابندی تو عائد نہیں کر دی۔" وہ اسے تکیے پر لٹا کر پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھی۔

"بتایا تو' بیمار ہو گئی تھی میں' جیسے ہی صحت یاب ہوئی ہوں' سیدھی آپ سے ملنے چلی آئی اور ان سے فی الحال میں اس سے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" اس کے لہجے میں ناراضی صاف محسوس ہوتی تھی۔

"ہاں اچھا ہی ہے اجیہ۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تجھ پر پہرے نہ بٹھا دے۔" وہ خائف تھی۔

"ارے کیسے" وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی' نہیں کمزور نہیں ہوں امی۔ جو ان کی ہر جائز ناجائز برداشت کر لوں اور یوں بھی دنیا کی کوئی طاقت مجھے آپ سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ گل کی جانچتی نگاہوں میں ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔

"پھر بھی...."

"پھر بھی کچھ نہیں۔ آپ اپنے دل سے ہر قسم کا ڈر خوف نکال دیں۔ اب آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ ہے۔" وہ اس کے کندھے پیار سے دبا کر بولی۔

"سائر... کیا وہ مجھے کبھی یاد کرتا ہے؟" کچھ سوال انسان محض تصدیق کے لیے کرتا ہے حالانکہ جواب اسے معلوم ہوتا ہے پھر بھی...

"پتا نہیں... جب بابا نے آپ کو گھر سے بیدخل کیا' اس وقت وہ کہاں تھے۔ کیا عمر ہو گی ان کی؟" اجیہ نے پوچھا۔

"چھ۔ سات سال کا ہوگا اور شاید وہ اس وقت سورہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تمہارے باپ نے اسے کیا کہانی سنائی ہوگی؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے بابا پر۔ وہ بظاہر ایسے لگتے تو نہیں۔ مجھے تو ہمیشہ ہی وہ بہت نرم خو، مہربان اور شفیق ہی لگے ہیں۔ میرے لیے یہ یقین کرنا ازحد مشکل ہے۔" وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں گھری ہوئی تھی۔

"انسان کا ظاہر اس کے باطن سے میل کھائے' یہ ضروری تو نہیں۔ اور مردوں کے اصول تو ہمیشہ ہی سے اپنی اولاد کے لیے کچھ اور بیوی کے لیے کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔" وہ طنزیہ بولی۔

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔"

"اب زیادہ باتیں نہیں۔ تم آرام کرو۔" وہ پیار سے بولی۔

"سوؤں گی تو اٹھ نہیں پاؤں گی اور امی... اٹھارہ سال سے جمع ہیں باتیں' اتنی جلدی کہاں ختم ہوں گی۔" وہ ہنس کے بولی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا۔" اس نے سرہلایا۔

"میں کچھ دیر میں نکلوں گی۔ نہیں تو بہت دیر ہوجائے گی۔" وہ ٹائم دیکھ کر فکر مندی سے بولی۔ گھڑی دن کے پونے بارہ بجا رہی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سرہلا دیا۔ دراصل اس کا ذہن اس وقت کہانی کو نیا رخ دینے کی سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ دنوں سے وقار صاحب محسوس کررہے تھے کہ اجیہ ان سے کھنچی کھنچی سے رہنے لگی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اجیہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے دل کی بات اپنی حرکات و سکنات سے ظاہر کیے بنا نہیں رہ سکتے۔

ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ انہوں نے کئی بار خود کو سمجھایا۔ مگر ہر بار کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوجاتی جو وہ دوبارہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے۔ اس وقت بھی اجیہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی تب وہ اپنے اسٹڈی سے نکلے اور اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ پہلے وہ چونکی پھر وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔

"اجیہ بیٹے۔" انہوں نے حلاوت سے پکارا۔

"جی؟" وہ لٹھ مار انداز میں بولی اور رک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"یہاں آؤ... میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے اپنے نزدیک اشارہ کیا۔

"مجھے پڑھنا ہے۔" وہ روکھے لہجے میں بولی۔

"پڑھ لینا یار۔ کچھ دیر بیٹھ جاؤ باپ کے پاس۔" وہ محبت بھرے انداز میں بولے۔

"بولیں۔" وہ احسان کرنے والے انداز میں سامنے صوفے پر ٹک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا ہمارا بیٹا ہم سے ناراض ہے؟ کوئی غلطی ہوگئی ہم سے؟" انہوں نے پیار سے پوچھا۔

غلطی؟ جرم کیا ہے آپ نے۔ مجرم ہیں آپ۔ اس کا جی چاہا وہ چیخ کر کہہ دے مگر مصلحت کا تقاضا کچھ اور تھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"مگر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو؟" انہوں نے چشمے کی اوٹ سے بغور اس کے تاثرات جانچے۔

"غلط فہمی ہوگئی ہے آپ کو۔" وہ جھٹ سے بولی۔ تب ہی لالی نے چائے وہیں لاکر رکھ دی۔ میرب بھی وہیں لاؤنج میں چلی آئی۔

"کیا باتیں ہورہی ہیں؟" وہ خوش دلی سے بولی۔ وقار کچھ خاموش سے ہوگئے تھے' اسے دیکھ کر بولے۔

"سائرہ کی برتھ ڈے آنے والی ہے۔ تم اور اجیہ اس کے لیے تحفہ خرید لاؤ۔" وہ یقیناً "بات بدلنا چاہ رہے تھے۔

"گڈ" وہ خوش گواریت سے بولی "کب ہے ان کی برتھ ڈے۔"

"اس ماہ کی تین کو۔" انہوں نے کپ اٹھا کر لبوں

سے لگایا۔

"کیوں اجیہ چلوگی؟" میرب نے جواب طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میں تو چلی چلوں گی۔" وہ استہزائیہ بولی۔ "مگر آپ پہلے سائر بھائی سے تو پوچھ لیں' کہیں اس بات پر بھی آپ کو وہ گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں نہ لے جائیں۔"

یکدم ہی میرب کے مسکراتے لب بھینچے تھے۔ وقار نے اچنبھے سے میرب کی جانب دیکھا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"کیا کہہ رہی ہو اجیہ ۔۔۔ فضول گوئی مجھے پسند نہیں۔" وہ درشتی سے بولے۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ بھابھی سے پوچھیں۔۔۔ وہ نہ انہیں کہیں آنے جانے دیتے ہیں۔ نہ ہی پرسنل فون رکھنے دیتے ہیں۔ نہ ہی انہیں ان کا ہنسنا بولنا پسند ہے۔ وہ حد درجہ شکی مزاج ہیں بابا۔۔۔ بالکل آپ کی طرح۔" اس کا تنفس بری طرح پھولنے لگا۔ وقار نے حیرت و دکھ میں گھر کر اسے دیکھا۔

"میری طرح؟" میرب بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی بات پر چونک کر وقار کو دیکھنے لگی۔

"ہاں آپ کی طرح۔" وہ اٹھی اور لاؤنج عبور کر گئی۔ فضا میں اس کے الفاظ کی بازگشت رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن تھا۔ اوپر سے موسم کی دل فریبی' جمیل یوں تو خاصا خشک مزاج سا بندہ رہا تھا مگر چندا کو پا کر تو لگتا تھا۔ جیسے وہ سرتاپا تبدیل ہو گیا ہو۔ وہ اطمینان سے بیٹھی حسب عادت ٹی وی سے لطف اندوز ہو رہی تھی تب ہی جمیل نے اسے پکارا۔

"چندا۔۔۔ کہیں باہر چلیں؟" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"باہر کہاں؟ یورپ یا امریکا؟" اس نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اوہ یار۔۔۔ وہ کھسیا کر بولا۔ "کچھ وقت دو' وہاں بھی لے چلوں گا گھمانے' فی الحال تو گھر سے کہیں باہر لانگ ڈرائیو پر۔"

"مجھے صابن دانی" میں بیٹھ کر لانگ ڈرائیو پر جانے کا قطعی شوق نہیں۔" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی۔ جمیل کی چھوٹی کر کے FX کو وہ اسی نام سے پکارتی تھی۔

"ارے بھئی" وہ ذرا جھینپ کر ہنس دیا "کہا تو ہے تمہیں دو تین مہینے میں بڑی گاڑی لے لوں گا تمہارے پسندیدہ رنگ اور برانڈ کی۔" وہ اس کے نزدیک آبیٹھا اور پیار سے ایک کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر بیٹھ گیا۔ چندا نے ناگواری سے پرے کھسکنا چاہا مگر جمیل نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔

اپنے ارادے کی ناکامی پر وہ جھنجلا سی گئی۔ جمیل کو اس کی جھلاہٹ نے خاصا محظوظ کیا۔

"پھر چل رہی ہو یا زبردستی اٹھا کر لے چلوں؟" وہ پیار سے بولا۔

"مجھے تیار ہونے میں دیر لگے گی۔" وہ پسپا ہو کر روٹھے پن سے بولی۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں' تم آرام سے تیار ہو جاؤ۔" کہہ کر اس نے سگریٹ سلگائی اور اس کے پاس سے اٹھ کر سامنے جا بیٹھا اور میگزین کھول لیا۔

درحقیقت تو چندا خود بھی اس وقت باہر نکل کر گھومنا پھرنا چاہ رہی تھی مگر جمیل کی پرانی اور چھوٹی کار دیکھ کر اس کا موڈ بری طرح آف ہو جایا کرتا تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ اسے جمیل سے منتیں کروانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

پھر جس وقت وہ اپنی نئی آتشی گلابی ساڑی جو اس نے اک نئی فلم کی ہیروئن کو دیکھ کر سلوائی تھی میں ملفوف' خوشبوؤں میں بس کر سنور کر سامنے آئی۔ جمیل تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اب چلیں جی۔" وہ نزاکت سے بولی۔

"کیا کرنا ہے باہر جا کر چھوڑو۔۔۔ گھر ہی میں رہ کر موسم انجوائے کرتے ہیں۔" وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آیا اور پیار سے اس کی ٹھوڑی چھو کر جذبوں سے بھری آواز میں بولا۔

"نہیں بھی۔" اس نے کوفت زدہ سے انداز میں اس کا ہاتھ پرے کیا۔ "اگر باہر نہیں جانا تھا تو مجھے تیار کیوں کروایا۔" اس کے تیکھے نقوش تن گئے۔

"وہ یار... مذاق کر رہا تھا چلو۔" وہ کہہ کر مڑا اور ٹیبل پر سے گاڑی کی چابی اور سگریٹ اٹھانے لگا۔ اسی اثنا میں چندا سج سج قدم اٹھاتی روم سے باہر نکل گئی۔ جمیل اس کے پیچھے آرہا تھا تب ہی اس نے چندا کو گھر کے داخلی دروازے کے پاس لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔

"ارے... ارے۔" وہ متوحش سا دوڑا۔

"کتنی بار منع کیا ہے اتنی اونچی ایڑی کا سینڈل مت پہنا کرو، مگر تم ہو کہ..." اس نے اسے سیدھا کرتے ہوئے شدید ناراضی سے کہا، مگر اسے بے ہوش دیکھ کر چپ رہ گیا۔ پھر اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا اور قریبی صوفے پر لٹا کر بشیرن کو اسے دیکھنے کا کہہ کر افتاں و خیزاں گھر کے نزدیکی کلینک سے ڈاکٹر کو لینے دوڑا۔ جس وقت وہ ڈاکٹر شازیہ کو لے کر لوٹا۔ بشیرن اس کے تلوے سہلا کر شاید اسے ہوش میں لانے کی سعی کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا۔ اس دوران جمیل کھڑا بے حد پریشانی اور فکر مندی سے اسے دیکھتا رہا۔

"مبارک ہو جمیل صاحب... آپ کی بیگم ایکسپیکٹ کر رہی ہیں۔" چیک اپ کے بعد ڈاکٹر شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دراصل کمزوری کی وجہ سے یہ بے ہوش ہوئی ہیں۔ ویسے فکر مند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ یہ انجکشن آپ لے آئیں تو میں انہیں لگا دیتی ہوں۔"

"آ... آپ کو پورا یقین ہے نا۔" وہ بے یقینی میں گھرا خوشی سے کپکپاتی آواز میں ڈاکٹر سے پوچھ لیتے ہوئے بولا۔

"آف کورس جمیل صاحب..." وہ اس کی کیفیت بھانپ کر مسکرائی۔

"بشیرن ڈاکٹر صاحبہ کے لیے چائے لاؤ۔" وہ اسے ہدایت دیتا الٹے قدم باہر دوڑا۔ تب ہی چندا ذرا سا کسمسائی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر ذہن ذرا حاضر ہوا تو سامنے کرسی پر اخبار دیکھتی ڈاکٹر پہ نظر گئی۔

"بشیرن... جمیل۔" وہ بے ساختہ پریشانی سے چیخی۔

"ریلیکس... میں ڈاکٹر شازیہ ہوں۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟" ڈاکٹر شازیہ نے اخبار ایک طرف رکھ کر اسے مسکرا کر دیکھا۔ بشیرن اس کی پکار پر دوڑی چلی آئی تھی۔

"وہ بیگم جی، آپ ادھر دروازے کے پاس بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں جی۔ صاحب ڈاکٹر صاحبہ کو لے کر آئے تھے۔" بشیرن نے جلدی جلدی بتایا۔

"آپ ان کے لیے دودھ لے آئیے۔" ڈاکٹر نے بشیرن کو کہا۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ تب ہی جمیل انجکشن لے کر لوٹ آیا۔

"مجھے کیا ہوا ہے۔" وہ بوکھلا کر پوچھنے لگی۔

"آپ ماں بننے والی ہیں۔" ڈاکٹر نے جمیل کے ہاتھ سے انجکشن لے کر پُرمسرت انداز میں اسے اطلاع دی۔

"کیا؟" وہ بے یقینی سے جمیل کو دیکھ کر چیخی۔ جس کی نگاہوں کی چکاچوند بتا رہی تھی کہ اسے یہ خبر پہلے ہی مل چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

"مجھے کچھ خریداری کرنی ہے... میں اجیہ کے ساتھ شاپنگ سینٹر چلی جاؤں؟" میرب نے کافی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سائر سے استفسار کیا۔

"کیا خریدنا ہے مجھے بتادو۔ میں لا دوں گا۔ خواہ مخواہ وہاں جا کر ٹکریں کھاؤ گی۔" اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ پر تھیں۔ گو اس کا جواب حسب توقع تھا مگر میرب کی جان جل گئی۔

"میں کسی لنڈا بازار یا بولٹن مارکیٹ نہیں جا رہی، جہاں ہر کوئی گزرتی ہوئی عورت سے ٹکرانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ میں فورم یا پھر زمزمہ جاؤں گی جہاں محض ٹکرانے یا ٹکریں مارنے والی "تفریح" کوئی نہیں پسند

کرتا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔ سائر کے سنجیدہ چہرے پر مسکان چٹک گئی۔

"مارکیٹنگ کی نفسیات پر عبور حاصل کیا ہے کیا تم نے؟" اس نے کافی اٹھا کر لبوں سے لگائی اور اسے بغور دیکھتا ہوا بولا۔

"عبور نہ سہی اتنی معلومات تو بہر حال ہے ہی۔" وہ بال کھول کر برش کرنے لگی۔

"ویسے کیا خریدنا ہے؟" اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ وہ ستائشی انداز میں اس کے لچکیلے بال دیکھ رہا تھا۔

"ایسے ہی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں۔" دراصل اسے سائر ہی کے لیے تحفہ خریدنا تھا۔

"تمہارے بال بہت حسین ہیں۔" وہ یک دم بولا۔ وہ چونک کر حیرانی سے پلٹی، وہ مارے خجالت کے جلدی سے کپ رکھ کر سیدھا ہوا۔

"آپ نے کیا کہا؟" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

"تمہارے بالوں کی تعریف کی ہے۔ لگتا ہے بہت محنت کی ہے ان پر تم نے۔" وہ اب لیپ ٹاپ آف کر کے اسے سائیڈ پر کرتے ہوئے بولا۔

"اوں ہوں... بالکل نہیں۔ بابا بتاتے ہیں کہ میری امی کے بال بالکل ایسے ہی تھے۔ مجھے یہ وراثت میں ملے ہیں۔ میں ہو بہو اپنی امی کی کاپی ہوں۔" وہ فخر آمیز لہجے میں بولی۔ سائر اس کے بچکانہ انداز پر مسکراتا رہا۔ پھر وہ بال سمیٹ کر بیڈ پر چلی آئی۔

"ویسے آپ کس پر گئے ہیں؟ انکل کی طرح تو نہیں لگتے... کیا آپ بھی میری طرح اپنی امی جیسے ہیں؟" وہ بولتے بولتے معاً" زور سے چونکی "مگر آپ کی والدہ کی تو کوئی تصویر میں نے یہاں نہیں دیکھی۔ کیا وہ تصویریں نہیں کھنچواتی تھیں۔"

"ہمارے لاہور والے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ ساری تصویریں اس کے ساتھ ہی جل گئیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"اوہ، یہ تو بہت برا ہوا مگر کچھ رشتے تصویروں کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ آپ کے جسم میں لہو بن کر دوڑ رہے ہوتے ہیں۔ سینے میں دل بن کر دھڑکتے ہیں۔ اور یقیناً" ماں کا رشتہ ایسا ہی رشتہ ہے۔" وہ نجانے کیوں آج اتنا بول رہی تھی۔ سائر کا گندمی چہرہ دہکنے لگا۔

"رات کافی ہو گئی ہے۔ اب سو جاؤ۔" وہ بے تاثر انداز میں کہہ کر اٹھا اور سگریٹ اٹھا کر ٹیرس پر نکلنے لگا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" اسے باہر نکلتا دیکھ کر میرب کو اپنی بات یاد آئی۔

"جواب دے چکا ہوں۔" بے لچک لہجے میں وہ کہہ کر ٹیرس پر نکل گیا۔ میرب نے ٹھنڈی سانس لے کر کمبل خود پر تان لیا۔

ناحق کہہ کر بات گنوائی... اور یہ انہیں اچانک ہی نجانے کیا ہو جاتا ہے بیٹھے بٹھائے۔ ابھی اتنے مہربان ہیں گویا جان بھی نچھاور کر دیں گے اور پل ہی میں اتنے نامہربان کہ انسان بات کرنے سے قبل سو مرتبہ تو ضرور ہی سوچے، پتا نہیں یہ گنجلک سا شخص کب سلجھے گا۔ سوتے سوتے بھی وہ یہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی سوچ گئی۔ جبکہ باہر ٹیرس پر کھڑا سائر نجانے رات کے اس اندھیرے اور مہیب سناٹے میں کیا کھوج رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جانتی ہو کتنے دن بعد ملاقات کر رہی ہو؟" آغا ناراضی سے گویا ہوا۔ وہ دونوں اس صبح کے دلکش منظر سے سمندر کنارے بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"ہاں... کافی دن ہو گئے۔" وہ بے توجہی سے بولی۔ اس کی نگاہیں سمندر پر جمی تھیں۔

"اتنے دن بعد ملنے آئی ہو تب بھی منہ لٹکا ہوا ہی ہے تمہارا... اجیہ' میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ تم آخر نارمل کیوں نہیں ہو پا رہیں۔" اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ اس نے جیسے اس کے لہجے پر چونک کر اسے دیکھا۔

"میری زندگی میں اب کچھ بھی نارمل نہیں رہا آغا! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی ڈراؤنی فلم دیکھ

رہی ہوں۔"

"یہ تم نے بیٹھے بٹھائے کیا مسئلہ پال لیا ہے یار۔"
وہ سخت بے زاری سے بولا۔

"مسئلہ میں نے نہیں دوسروں نے کھڑا کیا ہے۔ میں تو صرف اس پرابلم کو Solve کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"کیسے؟ ان سے یوں چھپ چھپا کر ملاقاتیں کر کے؟" وہ استہزائیہ بولا۔

"فی الحال میرے بس میں یہی ہے۔" وہ جو بنچ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی ایک دم مضطرب ہو کر سیدھی ہوئی۔

"سیدھا سادا حل ہے اس بات کا' تم جا کر اپنے ڈیڈ سے جواب طلبی کرو۔ یقیناً" کچھ نہ کچھ تو اس طرف کی کہانی بھی ہو گی۔ اسے سنو پھر فیصلہ کرو' یوں بیچ میں لٹکنے سے کیا ملے گا۔ نہ تم مجھے توجہ دے پا رہی ہو نہ خود کو' یہ تو ٹھیک نہیں ہے ناجیہ۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"ڈیڈ سے کیا بات کروں؟" وہ طنزیہ بولی" ان کے نزدیک تو وہ مر چکی ہیں۔ مار چکے ہیں وہ انہیں کئی برس پہلے۔ اس بارے میں وہ کیا بات کریں گے؟"

"بھئی میں یہی تو کہہ رہا ہوں' آخر ایسا کیوں کیا انہوں نے کچھ معلوم تو پڑے اور پھر تمہارا تو اتنا بڑا خاندان ہے' کیا کوئی بھی اس کے متعلق نہیں جانتا؟"

"اتنا بڑا خاندان کہاں ہے ہمارا۔ کوئی بھی تو نہیں ہے یہاں اس شہر میں' اک خالہ جانی رہتی تھیں وہ بھی بہت سال پہلے آسٹریلیا شفٹ کر گئی تھیں۔" وہ کنفیوژن سے انگلیاں مروڑنے لگی۔

"مگر مجھے تو یہ بات کسی طور ہضم نہیں ہو رہی' خاندان والوں سے نہ سہی اپنے بھائی ہی سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرو۔"

"ہاں۔۔۔ ان سے میں پوچھنے کی کوشش تو کر ہی سکتی ہوں مگر کیا معلوم وہ بھی لاعلم ہوں؟" وہ سوچتے لہجے میں بولی۔

"یہ تو ان سے پوچھنے ہی پر پتا چلے گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"مگر تمہیں نہیں معلوم آغا۔۔۔ وہ بابا کے مکمل انڈر میں ہیں' اگر انہوں نے بجائے مجھے جواب دینے کے بابا کو کچھ بتا دیا تو؟" وہ خائف لہجے میں بولی۔

"اتنا ڈر کیوں رہی ہو یار۔۔۔ بات تو کرو۔"

"نہیں آغا۔۔۔ ابھی نہیں' جو بھی ہے جیسا بھی ہے' فی الحال ایسا ہی چلنے دو۔ تم نہیں جانتے آغا میں کس لذت سے آشنا ہوئی ہوں۔ مدتوں میرے اندر محبت کا خانہ خالی رہا ہے۔۔۔ یہ کسی کی محبت سے کبھی بھرا ہی نہیں مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اندر کی پیاس تو صرف ماں کی محبت ہی بجھاتی ہے۔ باقی سارے رشتے غرض کے رشتے ہیں۔ فقط ماں ہی ہے جو آپ سے بے لوث محبت کرتی ہے اور میں نے اس کا ذائقہ چکھ لیا ہے آغا۔ مجھے فی الحال کسی اور چیز کی کچھ تمنا نہیں۔" وہ الوہی جذبے کے تحت جذب سے کہتی چلی گئی۔

"تم بہت جذباتی ہو رہی ہو ناجیہ۔۔۔ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ بگڑے لہجے میں بولا۔

"وہ ہیں ہی ایسی آغا۔۔۔ کسی دن ملواؤں گی انہیں تم سے۔ تمہیں بھی ان سے انسیت نہ ہو گئی تو کہنا۔" وہ بفاخر سے بولی۔

"دیکھیں گے۔" وہ کوفت زدہ لہجے میں بولا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں بھئی کیا رپورٹ ہے؟" ماریہ نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ میرب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کیوں ہنس رہی ہو؟"

"تمہارے انداز پر۔۔۔ بالکل جاسوسوں کی طرح سوال پوچھا ہے۔"

"ویری فنی" وہ چڑی" اب ہنس چکی ہو تو بتا بھی چکو۔" میرب ذرا سنبھلی پھر بولی۔

"بہت مشکل ہے ماریہ۔۔۔ سارا ان لوگوں میں سے ہیں جو خود سے بات کریں تو کریں ورنہ لاکھ سوال کرتے رہو جواب ہوں ہاں سے زیادہ نہیں ملتا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"ڈائری پڑھنے کی کوشش کی تم نے؟"

"دراز لاک ہوتی ہے۔"

"تم ذرا حاضر دماغی سے کام نہیں لے سکتیں؟ کیوں بونگی بنی ہوئی ہو۔" اس نے سلگ کر کہا۔

"حاضر دماغی کا مظاہرہ کر کے کیا کروں۔ لاک توڑ دوں یا چابی چرالوں؟" وہ اس سے زیادہ تپ کر بولی۔

"یہ ہوئی نا بات۔۔۔ اڑالو چابی۔۔۔ مگر ہشیاری سے۔ آخر پتا تو چلے اس دراز میں ہے کیا۔" وہ خوش ہوئی۔

"مجھے پتا ہے اس میں ان کی پرسنل ڈائریز ہیں۔"

"اور ان پرسنل ڈائریز میں کیا لکھا ہے؟" اس نے طنز کیا۔

"ہاں۔۔۔ یہ نہیں معلوم۔" وہ خجالت سے بولی۔

"تو یہی معلوم کرونا۔۔۔" اس نے جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا۔

"ہاں کرتی ہوں کچھ۔۔۔ فی الحال تو تم سے کام ہے۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"ہاں۔۔۔ بولو۔ کچھ دن میں احمد کے گھر والوں کو تاریخ لینے آنا ہے۔ بجائے اس کے کہ تم اس وقت میرا کام بٹاؤ۔۔۔ الٹا مجھ ہی سے سارے کام کروالو۔" وہ خفگی سے بولی۔

"تم جانتی ہو میری مجبوری، پھر بھی ایسے کہہ رہی ہو۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "رہنے دو۔۔۔ میں خود کرلوں گی۔" وہ اس کی بات سے اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ اس کے "ارے۔۔۔ ارے" کرنے کے باوجود فون رکھ دیا۔ فون پھر بجنے لگا۔ اسی کا نمبر تھا۔ وہ ریسیور کریڈل سے ہٹا کر اجیہ کے کمرے کی جانب چلی آئی۔ وہ کالج سے آنے کے بعد سے ابھی تک اپنے روم سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ویسے اس نے آج کل باہر آکر سب کے درمیان بیٹھنا تقریباً" ترک ہی کر دیا تھا۔ وہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سیدھی ہوئی۔

"آیئے بھابھی۔ خیریت؟"

"ہاں۔۔۔ کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔" وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" وہ مختصراً" بولی۔

"مجھے تم سے کچھ کام تھا۔" وہ جھجک کر بولی۔ اس دن کے واقعے کے بعد سے میرب اس کے سامنے عجیب سی شرمندگی محسوس کرتی تھی۔

"کہیے؟" وہ استعجاب سے اسے دیکھ کر بولی۔

"دراصل سائر کی برتھ ڈے ہے پرسوں۔۔۔ مجھے ان کے لیے تحفہ خریدنا ہے۔" میرب نے تمہید باندھی۔

"تو کیا کرنا ہے میں ساتھ چلوں؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"نہیں۔۔۔ تم لادو۔ اپنی پسند سے کوئی اچھا سا پرفیوم۔"

"آپ کو جانے سے بھائی نے منع کر دیا ہوگا؟" اجیہ نے زہر خند لہجے میں قیاس آرائی کی۔

"ہاں۔۔۔ وہ انہیں پسند نہیں۔" وہ گڑبڑا کر اسی قدر بول سکی۔

"ٹھیک ہے میں لادوں گی۔" وہ کہہ کر پھر سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"تم شاپنگ پر کیسے جاتی ہو، میرا مطلب ہے کہ کس کے ساتھ؟"

"کبھی بھائی لے جاتے ہیں، کبھی ڈرائیور کے ساتھ، کسی فرینڈ کو پک کر کے۔"

"اوکے۔۔۔" وہ کہہ کر نکلنے لگی، مگر اسے اک عجیب سا احساس ہوا۔ اس پر اتنی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں سائر نے اور بہن کے معاملے میں نسبتاً" لاپروائی۔۔۔ اس کا ذہن مخمصے میں پڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

"اسے اچھی طرح سے سمجھادیں خالہ۔۔۔ یہ کوئی بچی تو نہیں جو اس بات کی نزاکت اور سنگینی سے ناواقف ہو۔ میں اس کی ہر ضد مانتا آیا ہوں تو کیا مطلب ہے اس بات کا، یہ مجھے بے وقوف سمجھنے لگی ہے؟ محبت کرتا ہوں اس سے اس لیے اس کی اس مکروہ بات پر خاموش ہوں ورنہ تو۔۔۔ خیر، آج کی رات یہ آپ کے ساتھ ہی رہے گی۔ اچھی طرح سمجھادیں اسے میں بار بار اس کا یہ بے ہودہ مطالبہ برداشت

نہیں کروں گا۔" جمیل کی اونچی غراتی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ اب سے کچھ ہی دیر قبل چندا، جمیل کے ساتھ بی بی کے پاس آئی تھی بلکہ جمیل ہی اسے لے کر آیا تھا۔ الجھے بکھرے بال، ملگجی حلیہ، سوجی آنکھیں۔ بی بی تو اس کا حلیہ دیکھ کر دہل سی گئی تھیں۔ نازو چائے تیار کرنے باورچی خانے میں جا چکی تھیں، مانو بھی ان کی مددگار تھی۔ بی بی کے کمرے سے اٹھتے شور نے ان دونوں ہی کو شعوری طور پر متوجہ کر رکھا تھا۔

"بیٹا... ذرا تحمل سے کام لو، میری بچی نا سمجھ ہے، نادان ہے، مگر نیت کی بری نہیں۔ میں سمجھاؤں گی بے وقوف کو، تم بیٹھو تو سہی۔" بی بی لجاجت سے بولیں۔

"نہ میں بے وقوف ہوں نہ نادان۔ پوری عقل مندی سے یہ بات کر رہی ہوں۔ آخر میری عمر ہی کیا ہے ابھی جوان بکھیڑوں میں پڑ جاؤں۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

"دیکھی... دیکھی آپ نے اس کی ضد، عاجز آ چکا ہوں میں اسے سمجھا سمجھا کر۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولا۔

"تم خاموش رہو۔" بی بی نے اسے بری طرح جھڑکا۔ "جمیل میاں! آپ چائے پئیں آرام سے۔ دیکھتی ہوں میں یہ کیسے نہیں مانے گی۔" وہ جلال میں آ گئیں۔ ان کا انداز دیکھ کر جمیل کو کچھ اطمینان ہوا، تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلتا ہوں، مجھے کام ہے ذرا اور تم اپنا خیال رکھنا۔" وہ اسے دیکھ کر بولا۔

"مجھے نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ تڑخ کر بولی۔ وہ ضبط کر گیا۔

"بیٹا چائے تو پیتے جاؤ۔" بی بی داماد کو یوں سوکھے منہ جاتا دیکھ کر بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔

"نہیں خالہ پھر کبھی سہی۔" وہ بہ عجلت کہہ کر دروازہ اور پھر صحن عبور کر گیا۔

"ری... یہ کیا بچپنا لگا رکھا ہے تو نے۔" وہ ہانپتی کانپتی واپس بیٹھ گئیں۔ "تجھے ذرا شرم لحاظ ہے کہ نہیں، کیوں ہماری جان کا روگ بنی ہوئی ہے۔ آخر کیا چاہتی ہے تو؟" بی بی سر تھام کر رونے لگیں۔ چندا نے کوفت سے انہیں دیکھا۔

"آخر ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟ پریگننٹ میں ہوں، مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ بات ختم۔ آخر اس میں اتنا واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے آپ لوگوں کو۔" وہ کٹھور لہجے میں بولی۔

"خدا سے ڈر چندا، لوگ تو منتیں مانگتے ہیں یہ دن دیکھنے کے لیے، تجھے خدا نے کسی آزمائش میں ڈالے بنا ہی اس نعمت سے نواز دیا ہے تو کیوں ناشکری کر رہی ہے۔" وہ سخت برانگیختگی سے بولیں۔

"مجھے نہیں چاہیے اولاد تو آخر وہ مجھ پر زبردستی کیوں کر رہا ہے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"اولاد اس کی بھی ہے۔ اس کے متعلق فیصلہ کرنے میں اسے بھی اختیار ہے۔" بی بی دو ٹوک لہجے میں بولیں۔

"عمر اس کی نکلی جا رہی ہے، میری نہیں، جو میں بچہ پیدا کرنے کو زندگی موت کا مسئلہ بنا دوں۔" وہ پاگلوں کی طرح چیخی۔

"کیا بکواس کر رہی ہے تو۔ کیا باؤلی ہو گئی ہے لڑکی۔ کہاں نکل رہی ہے اس کی عمر، جوان جہان آدمی ہے۔" وہ زچ ہو گئیں۔

"مجھ سے دگنی عمر کا ہے۔ مجھے بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا۔ ذرا خیال نہیں کیا میرا۔" وہ اونچا اونچا رونے لگی۔ مانو اور نازو بھی کمرے میں کھڑی سنجیدگی سے یہ ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں سارے قصور اماں باوا کے ہیں۔ اکٹھا ہی جان سے کیوں نہیں مار دیتی تو ہمیں۔" بی بی پھر رونے لگیں۔

"خدا کے لیے آپ دونوں چپ ہو جائیں، کیا نحوست پھیلا رکھی ہے۔" نازو نے تنگ کر ہاتھ جوڑے۔

"جاؤ مانو بی بی کو پانی دو۔"

"ماں ہوں اس کی۔ بھلے کو سمجھا رہی ہوں۔ ارے سر پر تاج کی طرح سجا رکھا ہے جمیل میاں نے۔ کیوں بے جا ضد کر کے اپنا مقام کھو رہی ہے۔" وہ روتے

ہوئے کہنے لگیں۔

"اس کی تو عادت ہے اپنے خیر خواہوں کو زک پہنچانے کی۔" تازو کرختی سے بولیں۔

"تم بکواس بند کرو" وہ بدتمیزی سے اس پر چلائی۔

"تم اپنا یہ ڈرامہ بند کرو اور سکون سے جینے دو ہمیں آخر کب تک الٹے سیدھے فیصلے کرکے اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی جہنم بناتی رہوگی۔ تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے ابا میاں بستر سے لگ گئے ہیں۔ اگر تم نے اور کوئی مسئلہ کھڑا کیا تو قاسم بھائی تمہیں جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔" وہ اتنے برفیلے لہجے میں بولیں کہ چندا رونا دھونا بھول کر اسے فکر و دیکھنے لگی۔

"کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو ہاشم تو تمہیں گھر میں بھی گھسنے نہیں دیں گے' اچھا ہے یا برا ہے وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہیں اسی کے ساتھ جینا مرنا ہے جبکہ یہاں تو تمہیں تن تنہا ہی کرنا پڑے گا لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم عقل مندی کا مظاہرہ کرو اور اپنی تقدیر پر راضی رہنا سیکھو۔ بی بی آجائیں' چائے میں نے صحن میں تخت پر لگادی ہے۔ قاسم اور ابا بھی دکان سے آتے ہی ہوں گے۔" وہ سکون سے اپنی بات مکمل کرکے کمرے سے چلی گئیں۔ چندا سمجھی یا نہ سمجھی۔ بی بی البتہ کچھ مطمئن ہوکراب صحن میں جارہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ آپ مجھے کہاں لائی ہیں؟" اجیہ نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے سامنے بنی عمارت کو دیکھ کر حیرت سے استفسار کیا۔

"یہاں میں جاب کرتی ہوں۔" اس نے کہہ کر قدم آگے بڑھائے۔

"مجھے یہاں لانے کی وجہ؟" وہ اس کی معیت میں قدم بڑھاتی ہوئی بولی۔

"تمہیں سب سے ملوانا چاہتی ہوں۔" اس نے پرجوش سے انداز میں کہا۔ اس کے انداز پر اجیہ مسکرا کر خاموش ہوگئی اور دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

یہ ڈیفنس میں بنا دو منزلہ گھر تھا۔ جس کے نچلے فلور پر میڈم نشی کا ویل ایکوپڈ' ویل فرنشڈ پارلر پلس بیوٹی کلینک جبکہ سیکنڈ فلور پر ان کی رہائش تھی۔

"ہیلو۔" پورچ سے اندر داخل ہوکر گل نے خوش دلی سے سب ہی کو مشترکہ ہیلو سے نوازا۔

"کسے لے آئیں؟" کئی ایک نے اجیہ پر توصیفی و ستائشی نگاہ ڈال کر سوال کیا۔

"میری بیٹی ہے؟" وہ تفاخر آمیز بے نیازی سے بولی۔

"اوہو۔"

"اچھا۔"

"واہ بھئی۔" سب کا ملا جلا ردعمل دیکھنے کو ملا۔ وہ ہنوز مسکراتی ہوئی میڈم نشی کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

"میرے پاس فی الحال جو کچھ تھا تمہیں دکھا چکی ہوں۔ اب تمہیں کچھ پسند ہی نہیں آرہا تو میں کیا کروں؟" میڈم نشی ڈیپ ریڈ گہرے گلے کے ٹاپ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس گہری سرخ چیری رنگ کی لپ اسٹک لگائے ٹیبل کی دوسری طرف چیئر پر جلوہ افروز تھیں۔ وہ ایک خوش شکل۔ سرخ و سپید رنگت کی حامل' اخروٹی رنگ کے بالوں والی ڈھلتی عمر کی' مگر پرکشش عورت تھیں۔ لب و لہجے سے بناوٹی پن جھلکتا تھا۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟" گل نے بھاری براؤن گلاس کا دروازہ دھکیل کر اجازت طلب کی۔

"ہاں آؤ۔" انہوں نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

"ہیلو میم۔ کیسی ہیں آپ۔" اس نے ان کی مزاج پرسی کی۔ میڈم جو بغور اجیہ کا جائزہ عمیق نگاہوں سے لے رہی تھیں بولیں۔

"ہاں۔ ٹھیک ٹھاک۔ تم بیٹھو۔" انہوں نے سامنے رکھی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اجیہ بائیں ہاتھ پر رکھے صوفوں پر بیٹھ گئی۔

"ہاں بھئی۔ ان سے ملو یہ نیازی صاحب ہیں۔

اپنے ایاز ہمدانی ہیں نا' انہوں نے بھیجا ہے۔ کوئی میگزین شوٹ ہے اس کے لیے نئے چہرے کی تلاش ہے انہیں۔" میڈم نشی نے گل سے ان کا تعارف کروایا۔

"اوہ۔ اچھا۔" گل چونک گئی۔

"اور تم سناؤ۔ کیسے چلی آئی ہو۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ مسکراہٹ ان چہرے پر بھدی لگتی تھی۔

"میری بیٹی ہے اجیہ۔ آپ سے تذکرہ کیا تو تھا۔ شاید آپ کے ذہن سے نکل گیا۔" گل جلدی سے بولی۔

"اوہو اچھا۔ اچھا تمہاری بیٹی ہے۔" انہوں نے اب اجیہ میں مزید دلچسپی لی۔

"کیا کرتی ہو بیٹا؟" انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے صرف اپنی چیئر گھما کر پوچھا۔

"پڑھتی ہوں سیکنڈ ایئر میں۔" اس نے جواب دیا۔ اسے نامعلوم سی الجھن ہو رہی تھی۔

"ہوں۔ گڈ' آپ بہت چارمنگ ہو۔ کسی نے بتایا آپ کو۔" ان کے لہجے پر اجیہ نے کچھ جھینپ کر گل کو دیکھا جو آنکھوں میں فاتحانہ چمک لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"جی۔ آئی نو۔" اس نے کچھ اس سادگی سے کہا کہ وہاں بیٹھے وہ دونوں نفوس بشمول گل کے قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ ان کے ہنسنے نے اسے کنفیوژ کر دیا۔

"بہت انوسینٹ ہے۔ از نٹ اٹ؟" انہوں نے سامنے بیٹھے نیازی صاحب سے تائید چاہی۔

"اوہ۔ یس۔" انہوں نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے بس اسی طرح کا چہرہ درکار ہے اپنے پروڈکٹ کے لیے۔" انہوں نے یک دم کہا اور گل کا جی چاہا کہ وہ خوشی سے دھمال ڈالے۔ اسے اجیہ کے اوپر پورا بھروسہ تھا مگر اس کی قسمت پر نہیں مگر اب شاید وہ اس کی قسمت پر بھی بھروسہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اجیہ نے بڑی حیرت سے اس کی بات سنی مگر کچھ بولی نہیں۔

"مگر اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔" گل نے بڑی بے ساختہ قسم کی پریشانی میں گھر کر کہا۔

"تو ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں' بڑی بڑی اناڑی یہاں سے ہنڈرڈ پرسینٹ گروم کر کے بھیجی ہیں۔ اسے بھی کریں گے۔" میڈم نشی کا انداز چیلنج قبول کرنے والا تھا۔ گل نے گہری طمانیت بھری سانس لی۔

"مگر جلدی میڈم نشی۔ اگلے مہینے پراڈکٹ کی لانچنگ ہے۔" وہ بے چینی سے بولے۔

"فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔" انہوں نے خالص کاروباری انداز میں انہیں تسلی دی۔

"اوکے پھر میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اوکے۔ میں بتاتی ہوں پھر آپ کو۔" میڈم نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی ادھر آؤ۔" میڈم نے اجیہ جو بے زار بیٹھی اپنے فون میں کچھ کر رہی تھی کو پکارا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا' وہ بھی اسے وہاں آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ وہ اٹھ کر میڈم نشی کے سامنے والی خالی ہوئی نشست پر بیٹھ گئی۔

"کیا خیال ہے؟ تمہیں تھوڑا تراش خراش دیں؟" انہوں نے اپنی چیئر کی بیک سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کر کے پوچھا۔ اجیہ کے تاثرات نافہم سے ہو گئے۔

"کیا مطلب؟"

"ارے بھئی۔" انہوں نے وانستہ لہجہ سرسری بنایا۔ "اب اتنی پیاری صورت ہے تمہاری' مگر تم پر تھوڑی توجہ دی جائے تو تم چودہویں کے چاند کی طرح چمکو۔ بال بھی تمہارے ویسے ہی پیارے ہیں' آگے سے تھوڑے سیٹ کرنے پڑیں گے۔" وہ جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"سچ بالکل کترینہ کیف لگو گی۔" انہوں نے اس میں ہوا بھرنی چاہی۔ وہ ہنس دی۔

"آنٹی۔ آپ مذاق کر رہی ہیں؟ امی تو مجھے آپ لوگوں سے ملوانے لائی ہیں' میں جیسی ہوں۔ ٹھیک ہوں۔ گروم ہو کر کیا کروں گی؟" اس کی بات پر میڈم

نے چونک کر گل کی جانب دیکھا۔ اس نے آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔

"ہوں یہ بھی ہے... مگر کیا تم نہیں چاہتیں کہ لوگ تمہیں لائک کریں؟" انہوں نے اس کی فطری جبلت پر ہاتھ ڈالا۔

"مجھے لوگوں کی کچھ پروا نہیں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"کروالو بیٹا۔ آنٹی اتنے پیار سے آفر کر رہی ہیں تو۔" گل کو بالآخر مداخلت کرنی پڑی۔

"مگر امی..."

"ارے مگر چھوڑو... چلو آؤ میں تمہیں دکھاؤں میں کہاں کام کرتی ہوں۔" گل نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔

"ہاں... ہاں جاؤ... تم اسے دکھا لاؤ پھر تمہاری بیٹی کو چائے پلواتے ہیں۔" میڈم نشی نے آفس کا فون اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

✲ ✲ ✲

آج صبح ہی سے میرب بہت مصروف تھی۔ پہلے اس نے بہ طور خاص سائر کے پسندیدہ پکوان تیار کیے پھر کیک بیک کر کے سجا کر فریج میں رکھا۔ ان ہی سب تیاریوں میں کب دوپہر ڈھلی پتا ہی نہیں چلا۔

"واہ بھئی واہ... آج تو کچن سے بڑی مزیدار خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔" وقار صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

"جی بابا... سائر کی برتھ ڈے کی تیاری ہے۔" میرب جو اپنے کمرے میں جا رہی تھی انہیں دیکھ کر ٹھہر گئی۔

"مگر اس کی سالگرہ تو کل ہے؟"

"جی... مگر آج رات بارہ بجے ہی کیک کٹوالیں گے۔" میرب نے مسکرا کر بتایا۔

"ہاں... یہ بھی اچھا ہے... تم نے اپنے گھر والوں کو انوائٹ کیا؟" ان کے تذکرے پر میرب کچھ افسردہ سی ہو گئی۔

"نہیں... ہم گھر کے لوگ ہی کافی ہیں۔"

"تمہارے بابا کو بھی نجانے بیٹے کے ساتھ جانے کی کیا سوجھی۔ ایک ہی تو دوست تھا میرا... بے دید نے میرا خیال بھی نہیں کیا۔ یہیں رہتا تو اچھا تھا نا، وہاں وہ خود بھی بیٹھا بور ہی ہو رہا ہے۔" وقار صاحب سے بھی کبھی کبھار ان کی اسکائپ یا فون پر بات چیت ہو جاتی تھی۔

"جی بس... کیا کہوں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"ارے میں بھی کیا ہوں۔" انہوں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "خواہ مخواہ میں یہ تذکرہ چھیڑ کر تمہیں اداس کر دیا، تم جاؤ، اپنی تیاری کرو... بلکہ کچھ چاہیے ہو تو مجھے بتاؤ۔" وہ اپنی بے عقلی پر تف بھیجتے ہوئے بولے۔

"نہیں بس سب کچھ ہو چکا ہے... صرف آپ نے یہ کرنا ہے کہ آج رات انہیں اپنے کمرے میں کسی نہ کسی طرح بارہ بجے تک مصروف رکھنا ہے تاکہ انہیں سرپرائز دیا جا سکے۔"

"ٹھیک ہے بھئی... یہ تو میں کر ہی سکتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولے۔ وہ مسکراتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ تو وہ لالی کو چائے کے لیے آواز دینے لگے۔

✲ ✲ ✲

"اچھا...! تو آج تم اپنا میک اوور کروا کر آئی ہو؟ بہت خوب صورت لگ رہی ہو گی؟" آغا نے دلچسپی سے استفسار کیا۔

"اس میں کیا شک ہے؟" اجیہ نے الٹا اسی سے سوال کیا۔ وہ تتلی بنی اپنے آپ کو آئینے میں بار بار خوشی و حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ ذرا سی محنت نے اس کے چہرے کو... کیسی تابناکی بخش دی تھی۔

"شک تو خیر کوئی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ اس روئے زمین پر تم سا حسین کوئی نہ ہو گا۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ ماورائی حسن کی مالک میری محبوبہ ہے۔" وہ دھیمے سروں میں اس کے کان میں گنگنایا۔ اس کے عارض گلابی تو ہو ہی رہے تھے دہکنے لگے۔

"تمہیں باتیں بہت بنانی آتی ہیں۔" وہ لجا کر بولی۔
"تمہاری غلط فہمی ہے جان تمنا۔ میں صرف باتیں ہی نہیں بناتا۔" وہ معنی خیزی سے ہنسا۔
"آغا' میری امی اتنی خوش ہوئی ہیں مجھے یوں دیکھ کر کہ مجھے لگا میں نے ان کی بات مان کر ٹھیک ہی کیا۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟" آغا اس رومانٹک گفتگو کے بیچ میں ایک خالص ان رومینٹک ہستی کا ذکر سن کر بری طرح بے مزہ ہوا۔
"بھئی۔۔۔ ان ہی کے اصرار پر تو میں نے یہ سب کروانے کی ہامی بھری تھی۔ پھر جب اپنا آپ دیکھا تو مجھے لگا کہ میں نے امی کی بات مان کر بالکل درست کیا ہے۔ پھر امی بھی خوش ہو گئیں بہت۔" وہ بتانے لگی۔
"اچھا ٹھیک ہے' یار اب مجھ سے یوں دور نہیں رہا جا رہا۔۔۔ میں تم سے ملاقات کر کے کچھ سنجیدہ معاملات ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔" وہ مکمل سنجیدگی سے بولا۔
"کون سے سنجیدہ معاملات بھئی؟" اجیہ نے یوں ہی پوچھا۔ اس کا سارا دھیان اپنی چمکتی اسکن' ترشی ہوئی کماندار بھنوؤں اور ماتھے پر گری نفیس لٹوں کی جانب تھا۔
"کیا تم مجھ سے سنجیدہ ہو؟" اس نے یکلخت پوچھا۔
"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" وہ نا سمجھی سے بولی۔
"یار۔۔۔" وہ جھنجلا کر بولا۔ "میرا مطلب ہے شہزادی صاحبہ کہ کیا آپ بندۂ ناچیز کے ہمراہ زندگی گزارنے کے لیے واقعی سنجیدہ ہیں؟"
"آف کورس۔" وہ قطعی لہجے میں بولی۔ اب وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔
"تو پھر شادی کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی میں کچھ روز میں واپس اسٹیٹس جا رہا ہوں۔"
"آغا۔۔۔ تم جا رہے ہو؟" اس کا دل ڈوب گیا۔
"جانا تو ہے یار۔۔۔ ڈیڈ مسلسل مجھ پر خفا ہو رہے ہیں۔ وہاں کام کا حرج ہو رہا ہے' مگر میں تمہارے چکر میں یہاں اٹکا ہوا ہوں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"مگر میں کیا کروں گی تمہارے بغیر۔" اس کی آواز رندھ گئی۔
"یار پلیز میچور ہو جاؤ۔" وہ چڑ گیا اس کے انداز پر۔ "اسی لیے تو کہتا ہوں کہ شادی کر لیتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی چلیں گے۔" اس کے پاس مسئلے کا حل موجود تھا۔
"مگر ایک دم یوں۔۔۔" وہ گھبرا گئی۔ "میرے گھر والوں نے کوئی پرابلم کری ایٹ کرنے کی کوشش کی تو؟" اس کے انداز میں اندیشے تھے' خدشے تھے۔
"محبت تم نے کی ہے۔ فائٹ بھی تمہیں کرنی ہو گی۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "اور یوں بھی کیوں مسئلہ کھڑا کریں گے وہ؟ کیا میں ڈیشنگ نہیں ہوں' امیر نہیں ہوں؟" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔
"مگر ان کے نزدیک شاید یہ باتیں قابل اعتنا نہ ہوں۔" وہ شدید ٹینشن میں گھر کر پھر سے کمرے میں چکرانے لگی۔
"وہاٹ؟ آج کل تو لوگ یہی کچھ تو دیکھتے ہیں۔۔۔ عجیب ہیں تمہارے گھر والے' بلکہ دقیانوسی زیادہ مناسب لفظ ہے۔" وہ ہلکے سے غصے سے بولا۔
"نہ صرف دقیانوسی بلکہ اپنے نظریات میں انتہا پسند بھی۔ پتا ہے امی بتا رہی تھیں کہ ایک مرتبہ۔۔۔"
"یار تم یہ "امی نامہ" پلیز آج تو بند کر دو۔ میں واقعی پریشان ہوں۔ مجھے تمہیں لے کے جانا ہے اپنے ساتھ۔" وہ بولا۔ اجیہ کو بے حد بری لگی اس کی بات تاہم اس کی پریشانی بھی بجا تھی۔
"اچھا۔۔۔ کچھ سوچتی ہوں میں تم اتنے ٹینس مت ہو۔" اس نے اسے مقدور بھر تسلی دی۔
"ذرا جلدی سوچ لو۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ میں کرتی ہوں کچھ۔۔۔ تم۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وردانہ ناک کر کے میرب اندر داخل ہو رہی تھی۔
"چلو میں بعد میں بات کرتی ہوں۔" اجیہ نے بعجلت کہہ کر فون کاٹ دیا اور قدرے ناگواری سے میرب کو دیکھنے لگی۔
"وہ۔۔۔ اصل میں مجھے پوچھنا تھا کہ تم نے گفت

"خرید لیا۔" وہ اس کی ناگواری بھانپ کر قدرے شرمندگی سے پوچھنے لگی۔

"جی۔۔۔ یہ لیں۔" اس نے اپنے تاثرات چھپا کر ایک ہلکے نیلے لائنوں والے ریپر میں ملفوف پرفیوم اسے سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر دیا۔

"شکریہ تمہارا بہت بہت۔ سائر کی برتھ ڈے رات میں سیلی بریٹ کرنے کا ارادہ ہے میرا۔" اس نے گفٹ تھام کر اسے بتانا ضروری سمجھا۔

"اچھا تو پھر۔۔۔؟" اس کے اجنبی لہجے پر وہ گڑبڑا گئی۔

"ہم۔۔۔ بابا اور صرف میں ہوں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ گویا کہہ رہی ہو "اب دفع ہو جاؤ۔" اس لیے وہ مزید کچھ کہے بنا خاموشی سے دفع ہو بھی گئی۔ اپنے عقب میں اس نے ٹھک سے دروازہ لاک ہونے کی آواز سنی۔

"پتا نہیں کون سے مسئلے کمرہ بند کر کے سلجھاتی رہتی ہے یہ لڑکی۔" وہ بڑبڑائی۔

☆ ☆ ☆

"نہ وہ منحوس انسان شیرازی میری زندگی میں آتا نہ مجھے اس کی وجہ سے یہ دن دیکھنے پڑتے۔ خواہ مخواہ ہی میں اس کے چکر میں پڑی۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی مگر وہ زندگی بھی اچھی بھلی کہاں تھی؟ کم از کم اس گھر میں مجھے نسبتاً "سہولیات تو میسر ہیں۔ وہاں زندگی جی نہیں بس گزاری جا سکتی تھی، مگر کم از کم یہ جھنجھٹ تو نہیں تھا۔" وہ بیڈ پر چت لیٹی یک ٹک چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

"پتا نہیں عین موقع پر کہاں جا مرا۔ اگر اسی سے شادی ہو جاتی تو ٹھیک تھا، مگر جب قسمت ہی میں گھن لگا ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔" اسے رہ رہ کر آصف شیرازی کا خیال آ رہا تھا۔ نہ وہ اس کی زندگی میں آتا، اسے خواب دکھاتا اور نہ ہی یہ سب کچھ جو ہو گیا تھا ہوتا۔ اس کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں تھی۔ اپنے میکے سے آئے ہوئے بھی اسے مہینہ بھر سے زائد ہو چلا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا مطالبہ منظور نہیں ہو گا۔ پھر پہلی بار اس حالت سے گزر رہی تھی۔ نہیں تو اپنے طور پر ہی کوئی ٹونا ٹوٹکا کر کے اس "جھنجھٹ" سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کر لیتی۔ ایک مرتبہ بشیرن سے کچھ جاننے کی کوشش بھی کی مگر وہ تو کانوں کو ہاتھ لگا کر یوں بدکی گویا کسی قتل کی منصوبہ بندی میں اسے شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ تھک ہار کر وہ قسمت پر سب چھوڑے بیٹھی تھی۔ پھر جمیل نے بھی بہت سے وعدے وعید کیے تھے کہ یہ دلائے گا وہ دلائے گا اور اس "یہ" "وہ" میں "گاڑی" "سونے کے کنگن" اور "ملک سے باہر" گھمانے لے جانے کا اضافہ چند انے کر لیا تھا سو اب دل کی جلن کچھ کم تھی مگر انسان کا دل بھی عجیب شے ہے۔ جو میسر ہے۔ اس پر راضی نہیں ہوتا۔ جس کو چاہتا ہے۔ وہ میسر نہیں۔ اور کبھی بھی تو اس کی چاہت، مراد بر آ جائے تب اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور کہیں تو قدر کرتے کرتے اکتانے لگتا ہے۔ اور اکتا کر پھر کسی نئی چاہت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرار اسے دراصل پھر بھی نہیں ملتا۔

☆ ☆ ☆

من پسند ڈنر کرنے کے بعد سائرا اپنے کمرے میں جا رہا تھا تب ہی وقار صاحب نے اسے پکار لیا اور اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے۔ میرب چپکے چپکے مسکرانے لگی۔ اجیہ کا ذہن اپنی پریشانیوں میں لگا ہوا تھا۔ لالی سے برتن وغیرہ سمیٹنے اور سائرا اور وقار صاحب کو چائے کافی پہنچانے کا کہہ کر وہ تیار ہونے کمرے میں چلی آئی۔ ابھی ساڑھے دس بجے تھے۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ کچھ وقت یونہی گزار کر وہ تیار ہونے لگی۔ آج کے دن میرب نے ڈل گولڈن اور مہندی کلر کی خوب صورت چنری کی بنگالی ساڑھی باندھنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ساڑی سائر انگلینڈ سے اس کے لیے لایا تھا۔ ساڑی باندھ کر اس نے ہلکا پھلکا میک اپ کیا۔ بالوں کو یونہی کھلا چھوڑ کر صرف آگے سے بال لے کر سنہرے کیچر میں جکڑ لیے۔ زمرد کا لاکٹ سیٹ پہنا۔

ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنے وہ بہت خوب صورت‘ بہت مکمل لگ رہی تھی۔ اپنے اوپر پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد اس نے ٹائم دیکھا پونے بارہ ہو رہے تھے۔ وہ گفٹ اٹھائے باہر چلی آئی۔ شریف سے کہہ کر منگوایا سرخ گلابوں کا بوکے اس نے اسٹڈی سے اٹھایا اور لاؤنج کی سینٹر ٹیبل پر دونوں چیزیں لا کر رکھ دیں۔ پھر کیک نکال کر لائی اور خوب صورت ربن لگی چھری اس کے برابر میں رکھ کر اجیہ کو بلانے گئی۔ اجیہ معمول کے حلیے میں تھی۔ اس نے اپنے کٹے بال پنوں لگا کر چھپا رکھے تھے کہ مبادا کوئی پوچھ گچھ کرنے بیٹھ جائے۔ اس کا چہرہ تو خیر پہلے ہی کھلا پھول تھا۔ اس لیے چہرے کی رگڑائی وگڑائی سے کچھ خاص قابل توجہ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ بے دلی سے ایک گفٹ شاپر پکڑے ہوئے تھی۔ جوں ہی بارہ بجے‘ میرب نے لاؤنج کی ساری بتیاں بجھا دیں اور لالی کو حکم دیا کہ جب سائر لاؤنج میں آئے تب وہ لاؤنج روشن کردے۔ اسٹڈی میں سجے قدیم طرز کے گھڑیال نے بارہ بجائے۔ دو ایک منٹ کا انتظار کرنے کے بعد وقار صاحب سائر کو لیے لاؤنج میں چلے آئے۔

”یہ اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے لاؤنج میں۔“ سائر کی سنجیدہ آواز اندھیرے میں ابھری۔

”حیرت ہے بھئی۔“ وقار مصنوعی پن سے بولے۔ تب ہی ایک کھٹکے سے لاؤنج روشنی میں نہا گیا۔

”ہیپی برتھ ڈے ٹو یو....“ میرب گنگنائی۔ اجیہ نے احسان کرنے والے انداز میں ساتھ دیا۔ وقار مسکرانے لگے۔ انہوں نے سائر کو گلے لگالیا۔

”سالگرہ مبارک ہو بیٹے‘ اللہ پاک تمہیں دونوں جہاں کی لاتعداد خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔“ انہوں نے اس کا روشن ماتھا چوم کر نم آنکھوں سے دعا دی۔

”چلو آؤ کیک کاٹو.... تمہاری بیوی نے بڑی محبت سے بنایا ہے۔“ وہ اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر اسے لیے ٹیبل تک آئے۔ اس نے اک نگاہ اٹھا کر میرب کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ میرب کی آنکھوں میں قندیل روشن تھی مگر سائر کی آنکھیں انگارہ بن گئیں۔

ان تینوں کی تالیوں میں سائر نے کیک کاٹا۔

”یہ لیں بھائی آپ کا گفٹ۔“ اجیہ نے سائر کو شاپر تھمایا اور کیک چکھے بنا ہی گویا تقریب بھگتا کر اندر بھاگی۔ وہ آج کل وقار کا سامنا کرنے سے گریز کرتی تھی۔ وقار نے بھی خوب صورت رسٹ واچ اسے دی۔ تھوڑا سا کیک چکھا اور واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لالی اپنا حصہ وصول کرنے کے بعد سامان سمیٹنے لگی۔ سائر اٹھا‘ بنا کچھ کہے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میرب نے بکے اٹھایا‘ گفٹ سنبھالا اور اس کے پیچھے چل دی۔ وہ بڑے خوش کن خیالات میں گھری ہوئی تھی۔ لبوں پر دھیمی دھیمی مسکان سجائے وہ سج سج قدم اٹھا رہی تھی۔ جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے اڑاتا سائر دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹا تھا۔

میرب کی دہشت کے مارے چیخ نکل گئی۔ اس نے سرخ گلابوں کو نوچ کر پھینک دیا۔ گفٹ جھپٹ کر دیوار پر دے مارا۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صدف آصف

آرزوئے محبت

"آنٹی.... مما نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگائی ہے، میں نے بہت ناک کیا مگر وہ کوئی جواب ہی نہیں دے رہیں۔" ننھی سی اجالا نے پریشان ہو کر فرح کا دامن تھام کر کہا۔

"ارے بیٹا اچانک کیا ہو گیا سب خیر تو ہے؟" فرح نے پریشان ہو کر اپنی بلڈنگ میں رہنے والی اس پیاری سی بچی سے پوچھا۔



"مجھے... نہیں... پتا... وہ سامنے والی نوشابہ آنٹی ہیں نا' غصے میں ہمارے گھر آئیں' پتا نہیں کس بات پر ان کی مما سے لڑائی ہوئی۔ ان کے جاتے ہی مما نے خود کو کمرے میں بند کرلیا۔" اجالا نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"اچھا... چلو... میں چل کر دیکھتی ہوں۔" فرح نے حیرانی سے کہا اور پھولے گالوں اور سرخ ہونٹوں والی پیاری سی بچی کو تھپکا۔

"جی۔ چلیں۔ سنی بھیا کرکٹ کھیل کر واپس آئے... تو وہ بھی بہت دیر تک دروازہ ناک کرتے رہے' مگر مما کوئی جواب ہی نہیں دے رہیں' بھیا نے ہی پریشان ہو کر مجھے آپ کے پاس بھیجا۔" اجالا یہ سب بتاتے ہوئے رو دی' فرح کو اس روتی بچی پر ترس آیا' فوراً" چپٹا لیا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ مسئلہ کیا ہے؟" فرح سوچتی ہوئی اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کرکے اس کے ساتھ باہر نکل گئی

سیکنڈ فلور کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ پریشان ہوتی رہی۔ اوپر پہنچی تو زنیرا کے فلیٹ کے باہر سنی کو دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا پایا۔ فرح ان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ زنیرا کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی' مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے کان لگا کر سننا چاہا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دی' وہ اب کنفیوز ہونے لگی۔

"آخر زنیرا کے ساتھ ایسا کیا ہوا؟ نوشابہ تو اس کی کالج کے زمانے کی دوست ہے۔ دونوں کے اتنے اچھے تعلقات رہے ہیں' ان فیکٹ دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے یہاں ہر وقت کا آنا جانا تھا' پھر ایسا کیا ہوا جو نوبت لڑائی تک آ پہنچی۔" فرح نے خود کلامی کی۔

"آنٹی... پلیز... مما کو کہیں نا... وہ دروازہ کھول دیں۔" سنی نے اسے ہلایا تو وہ اپنی سوچوں سے باہر آئی۔

"اچھا... بیٹا... کچھ کرتے ہیں۔" فرح نے اسے تسلی دی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

وہ سنی کے ساتھ دوڑی دوڑی واپس اپنے گھر گئی اور سیل فون اٹھا لائی۔

"چلو... تمہاری مما کا نمبر ملاتے ہیں۔" اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا اور زنیرا کا نمبر ملایا۔

انہوں نے کمرے کے دروازے پر کان لگا دیے۔ اندر سے ہلکی ہلکی بیل جانے کی آواز آئی۔ دونوں بچے امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

"شکر ہے بیل تو جا رہی ہے۔" فرح کو تسلی ہوئی۔

"زونی... پلیز... فون... اٹھاؤ..." فرح نے خود کلامی کی۔ فون مسلسل بج رہا تھا' مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اس نے چار پانچ بار ٹرائی کیا' مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا' تھک ہار کر دونوں بچوں کو لے کر ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

"بیٹا... لگتا ہے کہ کسی کو بلوا کر تالا تڑوانا پڑے گا' یہ بتاؤ تمہارے پاپا کب تک آئیں گے؟" فرح نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ وہ کسی کے گھر میں اتنی مداخلت کرتے ہوئے ڈر رہی تھی' مگر یہاں مسئلہ ایک انسانی جان کا بھی تھا۔

"فرح آنٹی... پاپا تو ایک میٹنگ کے لیے آفس کی طرف سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔" اجالا نے ہونٹ لٹکا کر بڑی معصومیت سے بتایا۔ اچانک اس کا موبائل بج اٹھا' وہ سب چونک اٹھے۔

"ارے... یہ تو زنیرا کا فون ہے۔" اس نے جلدی سے کال ریسیو کی' بچے بے قراری سے اسے ماں سے بات کرتا دیکھ رہے تھے۔

"زونی... سنو ہاں... میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا' میں یہیں ہوں' پلیز دروازہ تو کھولو۔" فرح شاید اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی' بچے یوں سننے لگے جیسے بے جان مورت بن گئے ہوں۔

"دیکھو' جو بھی مسئلہ ہے بیٹھ کر بات چیت سے سلجھایا جاسکتا ہے' یوں بچوں کو پریشان کرکے تمہیں

کیا مل جائے گا۔" فرح نے اسے سمجھاتے ہوئے ڈانٹ پلائی۔ آخر اس پر فرح کی نرمی اور گرمی کا اثر ہوا۔

ٹھک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا' دونوں بچے بھاگ کر ماں سے لپٹ گئے' زاروقطار رونے لگے' زنیرا بھی گھٹنوں کے بل بیٹھی ان کو اپنے سے چمٹائے روئے جارہی تھی۔

فرح نے بڑی تگ ودو کے بعد ان سب کو الگ کیا۔ پانی پلایا' اجالا اور سنی کو ان کے کمرے میں بھیجا' خود زنیرا کے کچن میں جاکر دو کپ چائے بنائی اور اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی' وہ جانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی' اس کے برابر میں بیٹھنے پر بھی نہ چونکی۔

"زونی... کیا ہوا ہے؟" فرح نے ہمدردی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ایک دم اس کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرح کے ہاتھ پاؤں دوبارہ پھول گئے۔ آخر دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ تھوڑی نارمل ہوئی۔

"فرح بھابھی... آپ کو میرے رویے سے بڑی الجھن ہورہی ہے نا' آپ ساری بات جاننے کے لیے بے قرار ہوں گی؟" زنیرا نے چائے کا گھونٹ بھرا اور خلاؤں کو تکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... تم نے بالکل صحیح سمجھا گو کہ ایک ہی جگہ رہنے کی وجہ سے ہم میں خاصی بے تکلفی ہے' پر تم نے کبھی اپنے دل کی بات مجھ سے نہیں کی یہ اور بات ہے کہ میں نے ہمیشہ تمہاری ہنسی کے پیچھے چھپے دکھ کو پہچانا۔ اب اگر تمہاری منشا ہو تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکتی ہو۔" فرح نے اپنائیت سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو حیرت سے اچھل پڑی۔ زونی کی گوری گوری کلائیاں سرخ گلاب اور سفید موتیے کے گجروں سے سجی ہوئی تھیں۔

"یہ... یہ؟" فرح نے پوچھا تو وہ اذیت سے گلاب کی پتیاں نوچتے ہوئے مسکرادی۔ "یہ ہی تو میری ذلت کی وجہ بنے' معصوم سی خواہش پوری کرنے کی تگ ودو میں اپنے اوپر خطاکار کا لیبل لگوالیا' غلطی بھی میری تھی۔" زنیرا نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ فرح کا ذہن اب کافی منتشر ہوچکا تھا۔ وہ جلد از جلد یہ عقدہ حل کرنا چاہتی تھی۔

"زونی... مجھے کچھ سمجھتی ہو تو... مجھ سے وہ ساری باتیں شیئر کرو' جن کی وجہ سے تمہارے اور نوشابہ کے بیچ جھگڑا ہوا۔" فرح نے زچ ہو کر کہا۔

"ہاں... مجھے بھی آج ایک ہمدرد کی ضرورت ہے جس سے میں اپنے دل کی باتیں کہہ سکوں' میری برداشت بھی جواب دے چکی ہے۔" زنیرا نے اپنے سنہری بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی' فرح نے اسے بغور دیکھا' وہ اس بلڈنگ کی سب سے خوب صورت عورت تھی گلابی رنگت پر بڑی بڑی سرمئی آنکھیں' جن پر چھائی اداسی ہر ایک کو اپنی طرف راغب کرتی' متناسب خدوخال' وہ بلا کی پرکشش تھی۔

"پہلے... تو یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آپ کو کمرے میں کیوں بند کیا؟" فرح نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

"نوشابہ نے اجالا کے سامنے مجھ پر جو الزامات لگائے' اس کے بعد میرا حوصلہ ہی نہیں ہوا کہ اپنی بیٹی سے نگاہیں ملا سکوں' بچوں کا سامنا کرسکوں' یہ تو آپ کی بروقت آمد ہوئی تو بڑی مشکل سے خود کو باہر آنے کے لیے قائل کیا۔" زنیرا پھر کھونے لگی۔

"کیا مطلب نوشابہ نے تم پر الزامات لگائے؟ وہ تو تمہاری اچھی دوست تھی' پھر جھگڑا کیوں ہوا؟ آخر ایسی بھی کیا بات ہوگئی جو... یوں...؟" فرح کے اندر کے تجسس نے اسے چین نہیں لینے دیا۔ جلدی جلدی سوال کی بھرمار کردی۔

"اچھا... تو سنیں' میرے شوہر عمران اوصاف کی زندگی میں ایک اور عورت ہے۔" وہ اذیت سے آنکھیں میچ کر بولی' اس کے انکشاف پر فرح نے اسے

دہل کر دیکھا۔ اتنے سال ساتھ رہنے کے باوجود ان لوگوں کو اس بات کا پتا نہیں چل سکا۔

"ک... کیا... مطلب، تم عمران بھائی کی دوسری بیوی ہو؟" وہ ہکلائی۔

"نہیں... میں ان کی پہلی اور اکلوتی بیوی ہوں، مگر رشنا ان کی محبت ہے... جس کے پاس وہ اسلام آباد دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔" زنیرا نم آنکھوں کے گوشوں کو انگلی سے پونچھنے لگی۔

"مگر... وہ اجالا تو کہہ رہی تھی کہ... پاپا... آفس کے کام سے گئے ہوئے ہیں۔" فرح کو یقین نہیں آیا تو تصدیق چاہی۔

"جی... بچوں سے یہ بات چھپائی گئی ہے... کیا کروں... سچ بتا کر ان کے دماغ میں ابھی سے باپ کے خلاف گرہ ڈال دوں؟ میں اپنے بچوں کی شخصیت کو بٹا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔" زنیرا کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"یہ... رشنا... کون ہے؟" فرح نے دانت کچکچا کر رشنا کہا اسے زونی پر بہت ترس آیا۔

"رشنا... عمران کی کزن ہے، مجھ سے شادی سے قبل ان کی انگیجمنٹ ہوئی تھی، وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے، اچانک دونوں کی فیملی میں زمین کے تنازعہ پر جینا مرنا ختم ہوگیا۔ یوں عمران کے گھر والوں نے رشنا سے رشتہ بھی ختم کر دیا۔ وہ بہت روئے پیٹے مگر ان کو خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر خاموش کرا دیا گیا۔

میری مرحومہ ساس نے جلد ہی عمران کے لیے لڑکی تلاش کرنے کی مہم شروع کر دی۔ میں اور میری منجھلی نند شازیہ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ آنٹی ایک دن کسی کام سے وہاں آئیں تو مجھ سے ملاقات ہوئی، انہیں میری خوب صورتی نے بہت متاثر کیا۔ رشتہ لے کر ہمارے گھر پہنچ گئیں۔ عمران سب کو پسند آگئے، تھوڑی چھان بین کے بعد ہاں کر دی گئی۔ یوں میری ان سے شادی طے ہوگئی۔ عمران کی پروجاہت شخصیت اور میری سہیلیوں کی گدگداتی باتوں نے میرے دل کی دنیا بدل دی۔ آنکھوں میں پیا ملن کے خواب سجائے میں عمران کی زندگی میں شامل ہوئی۔"

"اچھا تو... عمران بھائی کیسے نکلے؟" فرح کا تجسس عروج پر تھا۔

"ویسے تو شادی کے بعد میں نے ان میں کوئی کمی نہیں پائی سوائے محبت کے، وہ اس معاملے میں عجیب خشک مزاج آدمی ثابت ہوئے، انتہا سے زیادہ خشک مزاج، میرے ساتھ ان کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا رہا، مگر ایک چیز بڑی امیزنگ لگی۔" زنیرا نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور فرح کو دیکھا۔

"اچھا... وہ کیا؟" فرح کی محویت ٹوٹی۔

"عمران کی اپنی ذات سے محبت..." وہ ایک دم بے چینی سے بولی۔

"اپنی ذات سے محبت... کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟" فرح نے کنفیوز ہو کر اس سے سوال کیا۔

"شادی کے چند دنوں بعد میں ڈریسنگ ٹیبل پر اپنی کاسمیٹکس سجانے لگی تو وہاں پہلے ہی کافی ساری مردانہ کریموں کو رکھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "یہ کون استعمال کرتا ہے؟" میں نے چھوٹی نند سامیہ سے پوچھا۔

"ہمارے عمران بھائی... بھابھی! ایک بات یاد رکھیے گا، وہ اپنی اسکن کے بارے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی کوئی بھی چیز یہاں سے نہیں ہٹائیے گا۔" اس نے بڑے فخر سے بتاتے ہوئے مجھے تنبیہہ کی تو میں نے گھبرا کر اپنی چیزیں واپس لے جا کر دراز میں رکھ دیں۔

"اچھا... ایک بات اور بھائی صفائی کے معاملے میں بھی بہت کانشس ہیں۔ اگر کوئی ان کا تولیہ استعمال کرلے تو وہ بری طرح سے چڑ جاتے ہیں۔" سامیہ نے باہر جاتے ہوئے پلٹ کر کہا تو میں نے گھبرا کر وہ تولیہ رکھ دیا، جس سے ہاتھ پونچھنے والی تھی۔ شروع میں ہی ایسی باتیں سن کر مجھ پر ایک رعب طاری ہوگیا۔ میں ایک دم الرٹ پوزیشن میں رہنے لگی۔ خیر زندگی معمول کی طرف بڑھنے لگی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ انہیں مجھ سے ذرا سا

بھی لگاؤ یا محبت نہیں' بلکہ وہ مجھے بے عزت کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔

"زنیرا... زنیرا... یہ میرے تکیے پر دھبہ کیسا ہے؟" عمران نے سفید غلاف کو چٹکی سے پکڑ کر میرے سامنے لہرایا' چیخ کر بولے۔ ان کا منہ اس وقت غصے سے لال ہو رہا تھا۔

"جی... وہ بالوں میں تیل لگایا تھا' غلطی سے سر کے نیچے آپ کا تکیہ رکھ لیا۔" میں نے بالوں میں ڈھیر سارا تیل لگا کر مساج کیا تھا' بے خیالی میں ان کا تکیہ رکھ کر ہی لیٹ گئی۔

"اٹھو..." میں جو بستر پر سونے کے لیے لیٹ چکی تھی' سنی ان سنی کر رہی تھی۔

"سنا نہیں میں نے کیا کہا... اٹھو۔" میں ان کے انداز پر ڈر کر بستر سے باہر نکل آئی۔

"جاؤ... اس کو ابھی دھو کر ڈالو' آئندہ خیال رکھنا۔" ان کے انداز میں اتنی حقارت تھی کہ میرا دل ہی ٹوٹ گیا۔ واش روم میں تکیہ کا غلاف دھوتے ہوئے میرے آنسو بہہ نکلے۔ یہی بات آرام سے بھی بتائی جا سکتی تھی' مگر ان کے دل کا غبار صرف مجھ پر ہی نکلتا۔

اس طرح کے کئی واقعات آئے دن ہوتے رہتے' ان کی ہر بات میں طنز ہوتا۔ میں اپنے کمرے میں ہی ڈر ڈر کر رہتی کہ کوئی چیز خراب نہ ہو جائے' بستر گندہ نہ ہو جائے یا کسی چھوٹی سی بات پر عمران کا موڈ آف نہ ہو جائے' اس وقت تک مجھے یہ بات پتا نہیں تھی کہ وہ رشنا سے بچھڑنے کا بدلہ گھر والوں کی جگہ مجھ سے لے رہے ہیں۔

ذہن پر پڑنے والے ہر وقت کے پریشر کی وجہ سے میرے سر میں درد رہنے لگا۔ میری عقل حیران تھی کہ یہ کیسا شریک حیات ہے' جسے اپنی بیوی سے رتی بھر بھی لگاؤ نہیں' پر کسی سے کہتی بھی تو کیا؟ سننے والا یہ ہی کہتا کہ نہ تمہارا شوہر مارتا پیٹتا ہے' روپیہ پیسہ کی تنگی ہے' تو پھر کیسی شکایت؟" زنیرا نے ٹھنڈی سانس بھری' تو فرح نے نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"او... اچھا... افسوس کی بات ہے' ویسے بظاہر عمران بھائی ایسے لگتے تو نہیں؟" زنیرا کی کتھا سن کر فرح کو افسوس ہوا' پڑوسی ہونے کی وجہ سے اس کا عمران سے اکثر ٹکراؤ ہو جاتا تھا' وہ تو خود اس کی پر اثر شخصیت سے متاثر رہتی' بظاہر تو وہ اسے نرم طبیعت کا ہی لگا' مگر حقیقت کچھ اور نکلی۔

"ہمارے دونوں بچوں کی آمد سے بھی ان کے مزاج پر کوئی فرق نہیں پڑا... اچانک سسر کا انتقال ہو گیا' یہ ایسا موقع تھا کہ سارا خاندان امڈ پڑا اس وقت پہلی بار مجھے رشنا کے بارے میں پتا چلا۔ جب میں نے اپنے شوہر کو اس کے آگے پیچھے ہوتے دیکھا۔

"بھابھی۔ اس رشنا سے عمران بھائی کو بچا کر رکھنا... یہ ان کے پیچھے پاگل ہے۔ اتنی عمر ہو گئی شادی بھی نہیں کی۔ اب دوسروں کا گھر خراب کرے گی۔" میری نند شازیہ نے سارا ملبہ رشنا پر گرایا اور بکتی جھکتی وہاں سے چلی گئی۔

دونوں خاندانوں کا میل ملاپ کیا ہوا' عمران کی پرانی محبت جاگ اٹھی۔ اب وہ بزنس کا بہانہ بنا کر مہینے دو مہینے میں ایک دو دن کے لیے اسلام آباد کے چکر لگانے لگے۔ میں پوچھتی تو وہ ٹال جاتے۔"

"تم نے ان سے اس مسئلے پر بات نہیں کی۔" فرح نے پوچھا۔

"مجھے آپ کا یوں دوڑ دوڑ کر اسلام آباد جانا اچھا نہیں لگتا ہے۔" میں نے ایک دن تنگ آکر کہا۔ ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

"پلیز... زنیرا۔ میں نے صرف بچوں کی وجہ سے تمہیں رکھا ہوا ہے' ورنہ تین بول بولنا کوئی مشکل بات نہیں۔" عمران کا غرور بھرا لہجہ' میرے دل کو شدید ٹھیس پہنچی۔

اس رات پہلی بار۔ میں نے رشنا کو خوب برا بھلا کہا۔ انہیں یہ بات بہت بری لگی۔ ایک ہفتہ منہ پھلائے رکھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک عجیب روٹین بنالی' آفس سے / ان کی واپسی رات گئے ہوتی'

اکثر تو میں انتظار کرتے کرتے سو جاتی۔ میں نے کیا پہنا' کیسی لگ رہی ہوں' کیسا پکایا' ان کو ایسی باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا' میرے معاملے میں وہ جیسے پتھر بن گئے۔" زنیرا ایک دم گلوگیر لہجے میں بولی۔ فرح کا دل بھی دکھ گیا۔ وہ اس کو تسلی دینے لگی۔

"اوہ... یہ تو بہت غلط بات ہے۔" فرح نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں انہیں رشنا کے چنگل سے نکالنا چاہتی تھی' خود پر خصوصی توجہ دینے لگی' عمران کے ارد گرد گھومتی' بہت برداشت سے کام لیتی' پر سب بے کار' عمران کی زندگی میں صرف ایک عورت تھی' رشنا۔ دونوں گھنٹوں فون پر باتوں میں مشغول رہتے۔ میں تھک ہار کر خاموش رہنے لگی۔"

"یہ تو بڑا ظلم ہے۔" فرح نے اظہار افسوس کیا۔

"آپ بھی ایک عورت ہیں' جانتی ہوں گی کہ عورت کے لیے شوہر کی محبت اور توجہ کیا معنی رکھتی ہے مگر وہ..." اس کی خوب صورت سرمئی آنکھیں گلابی ہو کر اور دلکش لگنے لگیں۔ رخساروں پر بہتے آنسو' فرح کو عمران کی بد قسمتی پر افسوس ہونے لگا' جو اتنی اچھی بیوی کو اپنے پیار سے محروم رکھے ہوئے تھا۔

"عمران بھائی کو رشنا اتنی عزیز تھی تو اس سے شادی... میرا مطلب ہے۔ ایسے صرف دوستی رکھنا؟" فرح نے بڑی مشکل سے یہ سوال کیا۔

"شادی نہ کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کتنے خود پرست ہیں۔ ان کو جو محبت کا چارم اور خصوصی توجہ مل رہی تھی' وہ ختم ہو جاتی' دوسرے اس بات کا ابھی خاندان کے چند لوگوں کو ہی اندازہ ہے۔ عمران میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بعد اپنی برادری والوں کو فیس کر سکتے۔" زنیرا نے وجہ بتائی۔

"چلو... چھوڑو... ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی... جنہیں اچھی چیزوں کی قدر نہیں ہوتی۔" فرح نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"کبھی میں سوچتی ہوں کہ بھلے عمران مجھے مارتے پیٹتے' مگر اپنے ہاتھوں سے میرے زخموں پر پیار سے مرہم لگاتے تو میں خوشی خوشی ان کے ہاتھوں پٹ بھی جاتی؟" اس نے اتنی معصومیت اور مظلومیت سے کہا کہ فرح کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ان کی بے رخی' عدم توجہی مجھے اندر ہی اندر کاٹے جا رہی تھی۔ خاص طور پر جب وہ بچوں سے بھی کھنچے کھنچے رہتے تو مجھے بہت برا لگتا۔ ہم ایک ابنارمل زندگی گزار رہے تھے' مجھے اپنے ہی بچوں پر ترس آنے لگتا۔ اسی وجہ سے جب بھی کسی ڈرامے' فلم یا رشتہ داروں کے گھر جاتی اور پوری فیملی کو یکجا ہنستا کھیلتا دیکھتی تو میرا ڈپریشن بڑھ جاتا' سوچ سوچ کر میں اس معاملے میں جنونی ہونے لگتی ہوں۔ بچے بھی باپ سے کٹے کٹے رہتے ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بالکل روایتی نہیں تھا۔" زنیرا نے ماتھے پر انگلی رکھ کر کہا اور کچن کی طرف چل دی۔ فرح خاموشی سے اس کی حالت کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس دوران وہ ایک ایک کپ چائے اور بنا لائی۔

"ان ساری باتوں کا تمہارے کمرے میں بند ہونے اور نوشابہ سے ہونے والے جھگڑے سے کیا تعلق ہے؟" فرح نے گھڑی پر نظر ڈالی' ابھی اس کو رات کے کھانے کا بھی کچھ کرنا تھا' اسی لیے چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔

"اگر میں آپ کو پس منظر نہ بتاتی تو آپ بھی شاید مجھے ہی غلط سمجھتیں۔" زنیرا نے سادگی سے کہا تو فرح نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا جہاں ستیاناس' وہاں سوا ستیاناس اب تو پوری کہانی سن کر ہی جاؤں گی۔" فرح نے مسکرا کر کہا۔

"جب میں شادی کے پانچ سال بعد یہاں شفٹ ہوئی تو اتفاق سے میری ملاقات نوشابہ سے ہوئی۔ وہ میری کالج کی دوست تھی' اس کی شادی مجھ سے پہلے ہوئی تھی۔ ہماری کافی اچھی دوستی تھی اس لیے اس کی پوری فیملی مجھے پہچانتی تھی۔" وہ ماضی میں کھو گئی۔

"ہاں... میں جانتی ہوں۔" فرح نے جلدی سے حامی بھری۔

"بس... شاید نوشابہ کی پڑوسن بننے کے بعد میری تشنگی میں اضافہ ہوا۔ مجھے اپنی زندگی میں ایک بڑے خلا کا احساس زیادہ ہونے لگا۔" زنیرا نے ٹھنڈی سانس بھر کر بتایا۔

"پلیز... زنیرا... اب یہ سسپنس ختم کرو گی؟" اس کے انداز بیاں پر فرح نے جھڑکا اور سامنے لگی وال کلاک میں وقت دیکھا جو بھاگ رہا تھا۔

"جی... میرے ڈرائنگ روم کی کھڑکی اس طرح سے ہے کہ وہاں سے نوشابہ کے گھر کا ٹی وی لاؤنج کا کچھ حصہ نظر آتا ہے اکثر بے خیالی میں میری نگاہ بھٹکتی اور میں منیر بھائی کو نوشابہ کے ساتھ چونچلے کرتے دیکھتی، اکثر وہ آفس سے واپسی پر پھولوں کے گجرے خرید کر لاتے، چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کبھی کبھی اسے خود ہی پہنا دیتے۔ وہ اپنے بچوں کو گود میں بٹھاتے، پیار سے ان کی معصومانہ باتیں سنتے، چھٹی والے دن اکثر منیر بھائی اپنے بڑے بیٹے کی سائیکل چمکانے میں اس کی مدد کرتے تو میرا دل کرچی کرچی ہو جاتا۔ میں بچوں اور گھر کے بہتر ماحول کے لیے ایک بار پھر عمران کی جانب بڑھی، مگر وہ تو اپنی پرانی محبت کے ماتم میں مصروف تھے۔

"بات... سنیں... کیا آج آپ واپسی پر میرے لیے پھولوں کے گجرے لیتے آئیں گے؟" میں نے ایک دن ہمت کر کے عمران سے فرمائش کی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو... بڑھاپے میں یہ چونچلے۔" عمران نے اوپر سے نیچے تک تمسخر اڑاتی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اب میرے پاس عمران سے کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا، یہ بھی نہ کہہ سکی کہ تم کیوں اتنے جوان بن کر اسلام آباد دوڑے چلے جاتے ہو، جب کہ اب تو رشنا کی شادی بھی طے ہو گئی ہے۔"

"رشنا کی شادی!" فرح کو ایک اور جھٹکا لگا۔

"جی... اتنے سال سراب کے پیچھے بھاگنے کے بعد شاید ان لوگوں نے عقل کے ناخن لیے اور رشنا کا رشتہ طے کر دیا۔ عمران بڑے چڑچڑاتے ہوئے اسی میں شرکت کرنے گئے ہوئے ہیں۔ بلاوا تو ہم سب کا تھا، مگر میں نے صاف منع کر دیا۔ جس لڑکی کی وجہ سے میں اتنے سالوں دکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی رہی۔ میں اس کی خوشیوں میں کس دل سے شرکت کرتی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"اوہ... چلو سر سے بلا تو ٹلی۔" فرح نے سکون کا سانس لیا۔

"پتا ہے... میں برسوں سے ایسی زندگی کے خواب دیکھتی آ رہی تھی۔ جیسی منیر بھائی اور نوشابہ گزار رہے تھے۔"

"تم... ان لوگوں کو دیکھ دیکھ کر جلتی بھنتی رہتی تھیں۔" فرح کو اس کی کہانی کا یہ موڑ کچھ عجیب لگا۔ اس نے مجرموں کی طرح سر ہلایا۔

"یہ کوئی اچھی بات نہیں، پر ایک اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنا معمول بنا لیا تھا، جب بھی منیر بھائی آفس سے واپس آتے میں اس کھڑکی سے ان دونوں کو دیکھتی۔ آپ یقین مانیں میری کوئی بری نیت نہ تھی اور نہ ہی دل میں کبھی منیر بھائی کے حوالے سے کوئی برا خیال آیا، میں تو ان دونوں کا بہت احترام کرتی تھی، بس وہ مجھے دنیا کے سب سے پرکشش مرد دکھائی دیتے۔" زنیرا نے کھڑکی کی طرف بغور دیکھا جو اب بند تھی۔

"زونی... جو باتیں تم کر رہی ہو، وہ کوئی بھی سنے گا تو تمہیں غلط ہی سمجھے گا۔ کسی نامحرم کے لیے اتنی پسندیدگی، کوئی اچھے معنوں میں نہیں آتی۔" فرح نے اس کو ڈرایا۔

"میں بتا تو رہی ہوں۔ منیر بھائی کے لیے میرے جذبات پاکیزہ اور بے غرض تھے۔ جیسے کوئی اچھی چیز آپ کو بھاتی ہے، ویسے ہی وہ مجھے اچھے لگتے۔" زنیرا نے اپنے کٹاؤ دار ہونٹوں کو چباتے ہوئے صفائی دی، مگر فرح کو زور کا جھٹکا لگا۔

"کیا کہہ رہی ہو، زنیرا! منیر بھائی دنیا کے سب سے

"پرکشش مرد؟" فرح نے زنیرا کو یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر کوئی شبہ ہو۔

"یقین کیجیے گا' میرے دل میں کوئی برائی نہیں یا یوں کہہ سکتے ہیں' اپنے گھر والوں کے ساتھ ان کی محبت اور فکر مندی نے میری نگاہوں میں ان کا رتبہ بلند کردیا۔ کبھی جب میں کوئی اچھی چیز پکاتی تو لے کر جاتی' نوشابہ مجھے چائے پر روک لیتی' بچے بھی ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہم کافی وقت وہاں گزارنے لگے۔ ان لوگوں کو میرے ہاتھ کی پکی چیزیں بہت پسند آتیں' خوب تعریف کرتے۔ میں خوش ہوجاتی عمران جیسے خود پسند شخص نے تو آج تک کبھی مجھے نہیں سراہا۔ منیر بھائی کو بھی میرے پکائے ہوئے کھانے پسند آتے' میں تھوڑی سی تعریف پر خوش رہنے لگی' مزید جانفشانی سے کچھ پکا کران کے یہاں لے جاتی' مگر اب نوشابہ کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی' ہاں منیر بھائی کا رویہ ویسا ہی مشفقانہ سا تھا۔ مجھے نوشابہ کے انداز پر دکھ ہوا۔ اس لیے میں نے وہاں جانا کم کردیا۔" زنیرا نے ایک آہ بھری۔

"اچھا کیا... پھر جھگڑا کیوں ہوا؟" فرح نے بغور دیکھا' وہ انگلیاں مسل رہی تھی۔

"معاملات برسوں سے بگڑنا شروع ہوئے' میں نے گاجر کا حلوہ بنایا تو خیال آیا کہ نوشی کو پسند ہے بس ایک باؤل اس کے لیے لے گئی' منیر بھائی نے تو خوب واہ واہ کرکے کھایا۔ نوشی البتہ خاموش رہی۔ اگر مجھے اس وقت اندازہ ہوتا کہ اس کے دل میں کسی قسم کے شکوک پل رہے ہیں تو اپنا منہ بند رکھتی' مگر حلوہ کھاکر منیر بھائی نے خوب واہ واہ کی اور پوچھا کیا انعام لوگی؟"
زنیرا کی آنکھیں ایک دم بھر آئیں۔

"تم نے کیا کہا؟" فرح کو یقین تھا کہ یہیں کوئی بے وقوفی کی گئی ہے۔

رنے جارہی تھی' آنسو اس کے حسین رخساروں پر بہنے لگے۔

"ایسا کیا مانگ لیا... بتاؤنا' تم نے منیر بھائی سے کیا مانگا؟" فرح کو جواب سننے کی بے چینی ہونے لگی۔

"میں نے... ان سے کہا۔" زنیرا کچھ سوچ کر خاموش ہوگئی۔

"ہاں... کیا کہا' پلیز بتاؤنا۔" فرح بے تابی سے بولی۔

"میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے لیے بھی موتیا کے گجرے لے آئیں۔" زنیرا کے چہرے پر شرمندگی کی لالی چھاگئی' اس کی نظریں جھک گئیں' سرخ ہونٹ کپکپا اٹھے۔

"کیا... تم نے منیر بھائی سے یہ فرمائش کی؟" نہ چاہتے ہوئے بھی فرح کی چیخ نکل گئی۔

"جی... بس... پتا نہیں کیسے میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ منیر بھائی لمحے بھر کو چپ رہ گئے' البتہ نوشی کا موڈ سخت آف ہوگیا' اس نے جرح کرنا چاہی' مگر منیر بھائی نے بات ختم کردی' کیوں کہ وہ مجھے اپنی سالی سمجھتے ہوئے ہنسی مذاق میں بات کو اڑاتے وہاں سے چلے گئے۔ میں جب گھر واپس آنے لگی تو نوشی سخت خفا تھی۔" زنیرا ایک دم متوحش ہوکر بولی۔

"تمہاری اس بات پر کیا وہ خوشی سے جھومتی... زونی۔ تمہیں اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ اس معاملے میں ہر عورت کا مزاج یکساں ہوجاتا ہے۔" فرح نے اس سمجھانا چاہا۔

"جی... مجھے بھی لگا کہ میرے منہ سے نکلی بات غیر مناسب ہے' اسی لیے وہاں کبھی نہ جانے کا فیصلہ کیا' مگر غضب یہ ہوا کہ آج جب منیر بھائی نے میری فرمائش پوری کردی تو نوشی تن فن کرتی میرے گھر آئی' اس کے ہاتھ میں اخبار کا ٹکڑا تھا جس میں سے بھینی بھینی

گلاب اور موتیے کی خوشبو اٹھ رہی تھی' اس نے کاغذ سے وہ گجرے نکال کر میرے منہ پر دے مارے' اس کے بعد اس نے مجھے بدکردار عورت کا لقب دیا' ایسی عورت قرار دیا جو اس کے شوہر کو پھنسانے کی کوشش

"یقین کریں میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کہا نہ ہی کوئی غلط ارادہ تھا۔ بس پتا نہیں کیسے بے ارادہ ہی میرے منہ سے نکل گیا اور وہ ہی بات نوشی کے دل پر جا لگی۔" زنیرا مسلسل فرح کا ہاتھ تھامے ایک ہی بات

کررہی ہے' اس کے شوہر پر ڈورے ڈالنے والی ناگن کہا' میں نے بہت چاہا کہ اس کی غلط فہمی دور کردوں کہ مجھے اس کے میاں سے کوئی واسطہ نہیں۔ پر وہ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ ہوئی' اب آپ بتایئے میں کیا کرتی اپنے بچوں کا سامنا کیسے کرتی؟" زنیرا کے سوال پر فرح اسے دیکھ کر رہ گئی' وہ اسے ایک معصوم سی بچی لگی' بے ریا' بے غرض سی' شفاف آنکھوں والی بچی۔

فرح کا دل میں اندیشے جاگ اٹھے' اس کی محرومیاں آج اسے اس مقام پر لے آئی تھیں کہ وہ اب اپنا تماشا خود بنا رہی تھی۔ اپنے خیالات کی رو میں بہتی ہوئی جس راہ پر چل پڑی تھی' اس کی وجہ سے اس کی شادی شدہ زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

"دیکھو... زونی... میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی ہوں اس لیے بالکل صحیح مشورہ دوں گی' یہ ٹھیک ہے کہ قسمت نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا' مگر اپنی محرومیوں کے خاتمے کے لیے تم نے جو طریقہ اختیار کیا' اسے کسی طرح بھی ٹھیک نہیں کہا جاسکتا۔ بجائے اس کے کہ تم اپنی اولاد کی طرف راغب ہو کر ان کی محبت میں گم ہو جاتیں۔ تم دوسروں سے پیار اور توجہ کی طلب گار بن گئیں' میری مانو تو یہ پیار اور توجہ تم اپنے بچوں میں ڈھونڈنا شروع کرو' ان کے ساتھ شام کی چائے پیو' ان کو لے کر باہر گھوم پھر آؤ' رشتے داروں میں چلی جاؤ یا گھر میں ان کے دوست جمع کرکے' ان کی خوشیوں کا سامان کرو۔ اگر تمہیں شوہر کی توجہ نہیں مل پا رہی تو اس طرح کسی اور کی خوشیوں پر نظر رکھنا اخلاقیات کے خلاف ہے' دنیا میں ہی لوگوں کے ساتھ عجیب و غریب حادثے ہوتے ہیں' تم بھی اسے زندگی کا ایک حادثہ سمجھ کر نظر انداز کرو۔ اپنے جوان ہوتے بیٹے کو اپنا سہارا بناؤ... کیوں کہ تم جس راہ پر چل رہی ہو' وہ اپنے آپ کو دھوکا اور فریب دینے والی بات ہے۔" فرح نے بڑے پیار سے زنیرا کو سمجھایا' اس کے موٹی ہاتھوں میں پہنے گجرے نرمی سے اتارنے لگی۔ اس کی ساری پتیاں پہلے ہی جھڑ چکی تھیں۔

"دیکھو... زنیرا... یہ مانگے کی توجہ وقتی ہوتی ہے' جیسے شروع ہوتی ہے ویسے ہی ختم ہو جاتی ہے' دیرپا ثابت نہیں ہوتی' بالکل ان پھولوں کی طرح۔" فرح نے زمین پر پتی پتی ہو کر بکھر جانے والے گجروں کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں... میں خود بھی یوں بھاگتے بھاگتے بہت تھک گئی ہوں۔ اب خود کو مضبوط بناؤں گی' سراب کے پیچھے بھاگنے سے بہتر' حقیقتوں کا سامنا کرنا ہے' ویسے بھی اب میری زندگی تو ختم ہو ہی گئی ہے۔ میں اپنے بچوں کی تشنگی اور پیاس مٹانے والی ہستی بن جاؤں گی۔" زنیرا نے سر ہلا کر یقین دہانی کرائی۔

"ایک بات اور یاد رکھو... پرندہ دن بھر کتنا بھی آسمان کی وسعتوں میں اڑتا ہے' رات گئے لوٹ کر اپنے گھر ہی جاتا ہے۔ عمران بھائی کو بھی اس بات کا ادراک جلد ہی ہو جائے گا' وہ تم لوگوں کی طرف ضرور لوٹیں گے۔" فرح نے وہاں سے گھر جانے کے لیے اٹھتے ہوئے امید کی شمع روشن کرکے اس کے ہاتھ میں تھمادی' زنیرا اس کے گلے لگ گئی۔

فرح اس سے اجازت طلب کرکے اٹھی' سامنے سے منیر احمد بھی کہیں جانے کے لیے اپنے فلیٹ کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے' کالے بھجنگ' ناٹے سے قد اور گھنگھریالے بالوں والے منیر کو فرح نے نظر بھر کر دیکھا "ایسا کیا ہے' اس بد صورت آدمی میں جو زنیرا جیسی حسین موی گڑیا۔ ان سے اتنا متاثر ہے۔" فرح نے خود سے سوال کیا۔

"ارے... میرا بچہ... سیڑھیاں اترتے ہوئے تھک جائے گا' آجا... آجا... پاپا کی گود میں۔" چھوٹا سا راحیل باپ کی پکار پر لپک کر ان کی گود میں چڑھ گیا' منیر بھائی نے اس کا منہ چوم لیا۔ فرح نے بغور دیکھا' محبت کی ایسی پیاری چمک ان کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی کہ فرح کی آنکھیں بھی خیرہ ہونے لگیں۔ سچ تو ہے انسان کا کردار اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے اندر کی محبت' نرمی اور پیار نے منیر بھائی جیسے عام سے انسان کو خاص بنا دیا۔

مشورہ

شہر میں ہمارے ہے ہر طرح کی آزادی
جو بھی کام کرنا ہو روکتا نہیں کوئی
جس طرف بھی جانا ہو راستے کھلے ہیں سب
جو بھی بات کہنی ہو ٹوکتا نہیں کوئی

قول ہے بزرگوں کا "احتیاط اچھی ہے"
مصلحت ہو جس میں بھی بس وہ بات
اچھی ہے
اس جہانِ فانی میں چار دن تو رہنا ہے
مختصر سی مہلت یہ اور کم نہ ہو جائے
زندگی سی دولت یوں راہ میں نہ کھو جائے
سو یہی مناسب ہے

امن سے رہا جائے چین سے جیا جائے
جو بھی بات کہنی ہو، جو بھی کام کرنا ہو
سوچ کر کہی جائے، پوچھ کر کیا جائے!

امجد اسلام امجد

ابھی کچھ پل ہمارے ہاتھ میں ہیں
کون جانے
کون سا لمحہ ہمارے ہاتھ سے پھسلے، گرے
اور پاؤں کی زنجیر ہو جائے
ابھی یہ دن جو لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے
کے ساتھ
رہ سکتے ہیں پل دو پل
نجانے کب کہاں دیوار بن جائے
ابھی وہ چار سانسیں بچ رہی ہیں
یہ تو جھونکا ہیں
کسے معلوم کس آہستگی سے یوں گزر جائیں
کہ ہم دریاؤں کے دو مختلف ناآشنا گونگے
کناروں پر کھڑے
اک دوسرے کی شکل دیکھنے کو ترس جائیں
میری آواز تیری یاد میں زندہ ہو بس
اور میں تری تصویر آنکھوں میں لیے رونا
چھپاؤں شہر والوں سے
ابھی کچھ پل ہمارے ہاتھ میں ہیں
ہم جو چاہیں گے تو کچھ کم کم بھی مل لیں گے
مگر جانے کہاں
کب...؟
کون سا لمحہ؟

فرحت عباس شاہ

غمِ عاشقی سے کہہ دو راہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت میرے نام تک نہ پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

وہ نوائے مضمحل کیا نہ ہو جس میں دل کی دھڑکن
وہ صدائے اہلِ دل کیا جو عوام تک نہ پہنچے

انہیں اپنے دل کی خبریں میرے دل سے مل رہی ہیں
میں جو اُن سے روٹھ جاؤں تو پیام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

وہی اک خاموش نغمہ ہے شکیلؔ جانِ ہستی
جو زبان تک نہ آئے جو کلام تک نہ پہنچے

شکیل بدایونی

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں اور زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جُدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

بُرا سمجھوں انہیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبالؔ اپنے نکتہ چینوں میں

علامہ اقبال

شگفتہ حیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اس کو مصیبت سے دوچار کر دیتا ہے۔"
(بخاری)

انصاف،

امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی حالت یہ تھی کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کی سلطنت کے دور دراز کے علاقے میں ایک چرواہا بھاگتا ہوا آیا اور لوگوں سے چلا کر مخاطب ہوا۔
"اے لوگو! عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتقال فرما گئے ہیں۔"
لوگ بہت حیران ہوئے اور پوچھا "تم مدینے سے اتنی دور جنگل میں ہو، تمہیں کسی نے اطلاع دی ہے؟"
اس نے کہا۔ "نہیں، مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی۔"
لوگوں نے پوچھا "پھر تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟"
اس نے جواب دیا۔ "جب عمرؓ زندہ تھے تو میری بھیڑیں جنگل میں بے خوف پھرتی تھیں۔ کوئی ان کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ آج میری بھیڑ کے بچے بھیڑیا اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں نے بھیڑیے کی جرأت سے جان لیا کہ آج دنیا میں عمرؓ موجود نہیں ہیں۔"
لوگوں نے تحقیق کی پتا چلا، اسی روز حضرت عمرؓ کی شہادت ہوئی تھی۔
ثنا عبدالقیوم۔ بنکہ چیمہ

رزق،

"یقین کرلو رزق حرام ہی سے ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔"
(بانو قدسیہ۔ راجہ گدھ)
نوال افضل گھمن۔ لاہور

قابلیت،

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے صدر عام طور پر معمولی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے ملک سے باہر کی دنیا کے بارے میں ان کی ذاتی معلومات اکثر اوقات عام امریکیوں کی طرح انتہائی ناقص ہوتی ہیں۔ سو ہوا یوں کہ جارج بش کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ اگلے جہان پہنچا تو داخلی دروازے پر سینٹ پیٹر نے اسے روکا اور پوچھا۔
"تم کون ہو؟"
بش بہت جز بز ہوا اور بولا۔ "تم مجھے نہیں جانتے میں امریکہ کا صدر ہوں جارج بش۔"
اسے بتایا گیا کہ یہاں دنیاوی درجے اور تعارف نہیں چلتے اور ہر آنے والے کو اپنی شناخت کروانی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ عرصہ پہلے پکاسو آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ مصور ہے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے فن کے نمونے دکھائے سو اس نے ایک تصویر بنا کر دکھائی اور اسے داخلہ مل گیا۔ پھر آئن اسٹائن آیا اس نے کہا۔
"میں سائنس دان ہوں اور دنیا کو ایٹم کی تھیوری دی ہے۔ استفسار پر اس نے اپنی تھیوری کی وضاحت کی اور اس کی بات مان لی گئی۔"
بش نے کہا۔ "باقی بات بعد میں سنوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ پکاسو اور آئن اسٹائن کون لوگ ہیں؟"
سینٹ پیٹر نے چند لمحے سوچا اور پھر دروازہ کھول کر کہا۔

"تم اندر جا سکتے ہو۔ کیونکہ تمہاری معلومات سے ثابت ہو گیا ہے کہ تم واقعی امریکہ کے صدر ہو۔"

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

لہجہ،

الفاظ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ لہجے سے دل میں اتر جاتی ہے۔ جادو الفاظ میں نہیں لہجے میں ہوتا ہے۔ الف لیلوی خزانوں کا دروازہ ہر ایرے غیرے کے "کھل جا سم سم" کہنے سے نہیں کھلتا۔ وہ الہ دین کا لہجہ مانگتا ہے۔ دلوں کے قفل کی کلید بھی لفظ میں نہیں لہجے میں ہوتی ہے۔

(آب گم۔ مشتاق احمد یوسفی)

ہمزہ، اقرا۔ کراچی

اگر،

اقبال صدی کی تقریبات کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد کی آمد پر عطاء الحق قاسمی نے اپنے گھر میں ایک کھانے کا اہتمام کیا تو خاص طور پر سبزیاں اور دالیں پکوائیں تاکہ مہمان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ مہمان خصوصی ہونے کے حوالے سے جگن ناتھ کو سب سے پہلے کھانے کی دعوت دی گئی۔ وہ آکر میز کے سامنے کھڑے ہوئے ایک نظر مختلف سبزیوں اور دالوں پر ڈالی جو خاص طور پر ان کے لیے تیار کروائی گئی تھیں اور پھر مسکرا کر بولے۔

"یار۔! اگر تم لوگوں نے بھی یہی کچھ کھانا تھا تو پاکستان کیوں بنایا تھا؟"

(چلو جاپان چلتے ہیں۔ امجد اسلام امجد)

نخبہ اکرم۔ گاؤں گوبلکی

معصومیت،

راحیل نے اپنے نانا ابو سے کہا۔

"نانا ابو مجھے باجا لا دیں۔"

نانا ابو نے کہا۔ "بیٹا! باجا تو میں تمہیں لا دوں گا لیکن تم ہمیشہ اسے بجا بجا کر دوسروں کو تنگ کرو گے۔"

راحیل نے جواب دیا۔ "نانا ابو! میں وعدہ کرتا ہوں، باجا میں اس وقت بجاؤں گا جب سب سو رہے ہوں گے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

قرض،

قرض "نیکی" کی آواز کو "خوش آمدید" کہنے کا نام ہے۔

(ورڈز ورتھ)

حرا قریشی۔ ملتان

ایک شعر،

کس لیے دیکھتی ہو آئینہ
تم تو خود سے بھی خوبصورت ہو

(جون ایلیا)

خالدہ پروین۔ گاؤں ادکھ

محبت،

محبت اندھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عورت کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں۔ بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہے۔

(آب گم گشتہ۔ مشتاق احمد یوسفی)

قابل ستائش،

مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

حاصل،

ترک الفت سے
کیا ہوا حاصل۔۔۔؟
تب بھی مرتا تھا
اب بھی مرتا ہوں

(جون ایلیا)

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

جوگ،

جوگ کا پہلا قدم تب اُٹھے گا۔ جب غصّے کو ختم کرے گا۔ غرور و تکبّر راکھ بنا کر حکومت داؤ پر لگا دے گا۔ یہ رنگ اُتار پھینک پھر جوگ کی سوچنا۔

(اشفاق احمد۔ من چلے کا سودا)

عائشہ فاطمہ۔ لودھراں

دُکھ،

دُکھ بھی تو آدمی ہوتے ہیں۔ آ کے بستے ہوئے لوگوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ گھروں میں رہنے لگتے ہیں۔ دلوں میں آباد ہو جاتے ہیں اور رنگوں میں بھنگ ڈال دیتے ہیں۔ آنکھوں میں بسیرا کر کے زندگی سے سکون کو نکال دیتے ہیں۔

آمنہ اُجالا۔ ڈہرکی

چار نصیحتیں،

حاتم اصم سے ان کے ایک مرید نے عرض کی۔

"مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔"

حاتم اصم نے جواب میں کہا۔

"چار چیزوں سے بچو۔ اوّل یہ کہ کسی ایسے شخص کو ناراض نہ کرو جسے خوش کرنے کی آئندہ کبھی ضرورت پیش آئے۔

دوسرے یہ کہ اس عمارت کو نہ اجاڑو جس کی تعمیر کی آئندہ احتیاج ہو۔

تیسرے یہ کہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ کہو، جس کے لیے بعد کو معذرت کرنی پڑے۔

اور

چوتھی یہ کہ دُنیا کی روشنی میں کسی مسلمان کا دل نہ دکھاؤ تاکہ قبر کے اندھیرے سے تکلیف اٹھاؤ۔"

مدیحہ فہمید۔ کراچی

سبق،

نعمت خان ایک مشہور گویّا تھا۔ گویّا ہونے کے سوا اس میں کوئی اضافی قابلیت نہ تھی مگر جہاں دار شاہ نے اسے ملتان کا گورنر مقرر کر دیا اور تقرری کے کاغذات اپنے وزیر ذوالفقار خان کو بھیج دیے۔

وزیر نے کاغذات دبا لیے اور عمل درآمد میں تاخیر کی۔ نعمت خان نے اس سے ملاقات کر کے تاخیر کا سبب دریافت کیا۔

وزیر نے کہا۔" نعمت خان! شاید تمہیں میرے دفتر کا دستور معلوم نہیں ہے۔ میں کسی بھی تقرری کے کاغذات نقد رقم لیے بنا جاری نہیں کرتا۔ لیکن میں تم سے نقد رقم نہیں لوں گا۔ بس تم ایک ہزار سارنگیاں فراہم کر دو۔"

نعمت خان ایک ہفتے تک سارنگیاں جمع کرتا رہا۔ کُل دو سو سارنگیاں جمع ہوئیں۔ وہ انہیں لے کر وزیر کے پاس آیا۔

وزیر نے کہا۔" تقرری کے کاغذات ایک ہزار سارنگیوں کے عوض ملیں گے۔"

نعمت خان کے لیے ایک ہزار سارنگیاں فراہم کرنا مشکل تھا۔ اس لیے بادشاہ سے شکایت کر دی۔

جہاں دار شاہ نے وزیر کو طلب کیا اور پوچھا۔

"اس قدر سارنگیاں لے کر کیا کرو گے؟"

وزیر نے جواب دیا۔

"جہاں پناہ! چونکہ مطربوں کو صوبوں کی گورنری سونپی جا رہی ہے لہٰذا امرا اور سردار اپنا اسلحہ اتار پھینکیں گے۔ سارنگی بجانا سیکھیں گے اور سارنگی بجانا شروع کر دیں گے۔"

عینی۔ مانسہرہ

مرد،

٭ مرد اگر آج عورت کی کسی غلطی یا لاپروائی کو کوئی بات نہیں کہہ کر ٹال رہا ہے تو وہ کل کو اس کا طعنہ ضرور دے گا۔

٭ مرد کتنا بھی کوآپریٹو کیوں نہ ہو، مگر سمجھوتا کرنا اور جھکنا صرف عورت کو ہی پڑتا ہے۔

٭ مرد اپنی اہمیت اور عورت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو طول دے کر جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔

نمل تاج۔ کراچی

امتِ الصبور

خواتین کی ڈائری

حمدہ واجد کی ڈائری سے

وقت کے حوالے سے احساس زیاں اور رفاقتوں کی نسبت سے احساس محرومی شدید ہوتی ہے۔ فراق گورکھپوری کی اس چھوٹی بحر کی غزل میں وقت کے حوالے سے جو رنگ ابھرتا ہے اس میں افسوس اور تاثر نہیں ایک سرشاری ہے۔

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

ایک پیغامِ زندگانی بھی
عاشقی مرگِ ناگہانی بھی

اس ادا کا تری جواب نہیں
مہربانی بھی، سرگرانی بھی

دل کو اپنے بھی غم تھے دُنیا میں
کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی

دل کو آدابِ بندگی بھی نہ آئے
کر گئے لوگ حکمرانی بھی

زندگی عین دیدِ یار فراق
زندگی ہجر کی کہانی بھی

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سعد اللہ شاہ کی یہ نظم آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

اُداس موسم کے رتجگوں میں،

ہر ایک لمحہ بکھر گیا ہے
ہر ایک رستہ بدل گیا ہے
پھر ایسے موسم میں کون آئے

کوئی تو جائے ترے نگر کی مسافتوں کو سمیٹ لائے
تری گلی میں ہماری سوچیں بکھیر آئے
تجھے بتائے کہ کون کیسے اُچھالتا ہے وفا کے موتی
تمہاری جانب کوئی تو جائے...
مری زباں میں تجھے بلائے... تجھے منائے
ہماری حالت تجھے بتائے... تجھے رُلائے
تو اپنے دل کو بھی چین آئے

حرا قریشی کی ڈائری سے

اپنی ڈائری سے ایک خوبصورت غزل رگِ جاں کی نذر۔ (سچ کہتے ہیں، بہت یاد کیا تھا)

ابھی تم سا تھا کوئی روبرو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا
بڑی رس بھری تھی وہ گفتگو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا

وہی مست آنکھوں کی مستیاں، وہی چاند چہرے کی چاندنی
وہی عرضِ حال تھا ہو بہو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا

وہی ہونٹ تھے، وہی پھول تھے، وہی بے مثال اداسیاں
وہی خواب تھا، وہی آرزو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا

وہی آرزوئے وصل تھی جو، روز و شب کی مثال تھی
وہی دلکشی، وہی رنگ و بو، تمہیں یاد ہم نے بہت کیا

نوال افضل گھمن کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ دلفریب غزل عزیز از جان ماریہ اعجاز گھمن اور ناہید مزمل بٹ کے نام

کچھ دل سے کسی نے کہہ دیا پھر
وحشت کا چلے گا سلسلہ پھر

پھولوں پہ دھنک کی بارشیں ہیں
خوشبو سے ہوا ہے رابطہ پھر

بے نام رفاقتوں کا موسم
زخموں کا چمن کھلا گیا پھر

خوابوں سے ڈری ہوئی تھیں آنکھیں
ڈر ڈر کے کیا ہے حوصلہ پھر

پتھراؤ سے کب تلک بچیں گے
جو ٹوٹ گیا آئینہ پھر

اس شہر کے سارے داستان گو
دہرائیں گے ایک واقعہ پھر

گڑیا شاہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر اعتبار ساجد کی یہ غزل تمام قاری بہنوں کی نذر

ہم نے تو خیر تجھ سے شکایت کبھی نہ کی
ایسا نہیں کہ دل نے بغاوت کبھی نہ کی

کس حال میں ہیں تیرے ستائے ہوئے غریب
تو نے یہ پوچھنے کی زحمت کبھی نہ کی

محسوس کرے گا وہ اوروں کے درد کو
جس نے خود اپنے آپ سے الفت کبھی نہ کی

چاہا ہے میں نے جس کو بڑی شدتوں کے ساتھ
اس طرح سے اس نے مجھ سے محبت کبھی نہ کی

ہر داستان تیری بہت غور سے سنی
لیکن بیان اپنی حکایت کبھی نہ کی

اک خواب تھا کہ اپنی شبوں پر رہا محیط
کیا خواب تھا کسی سے وضاحت کبھی نہ کی

اک آگ تھی کہ جلتے رہے جس میں عمر بھر
اک درد تھا کہ جس میں خیانت کبھی نہ کی

مریم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

میری پلکوں پہ یہ کیسا بوجھ آ پڑا ہے
کہ جیسے میں نے خوابوں کا جال سا اوڑھا ہے

یہ میرا ہاتھ پکڑ کے تم کس جہاں میں لے آئے
ابھی تو میرے حصے کا سارا کام پڑا ہے

کسی جھیل کنارے بنتے بگڑتے دائروں کی صورت
چار سو یہ سب ویرانیوں کا جال بکھرا پڑا ہے

میں تمہیں فلسفہ زندگی کا سمجھاؤں کیسے
کہ جدھر دیکھو ہر شخص تو محبت کے پیچھے پڑا ہے

کس موڑ پہ لے آئی ہے یہ زندگی مجھے
یہاں تو زندگی کا ہی کال پڑا ہے

تم کیسے سمیٹو گے مجھے، ناممکن ہے یہ اب
کہ میرے وجود کا ذرہ ذرہ ریت کی صورت بکھرا پڑا ہے

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

نوال افضل گھمن ——— لاہور

منزلِ خواب ڈھونڈنے والو
اپنی آنکھیں نڈھال مت کرنا

نمرہ، اقرا ——— کراچی

یہ دشتِ ترکِ محبت یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تیری یاد سے گزر جاؤں
میں زندہ تھا کہ تیرا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں کہ مر جاؤں

عنبرہ علوی ——— لاہور

دکھ ہے، احساسِ جرم ہے، کیا ہے
کوئی اندر سے توڑتا ہے مجھے

نخبہ اکرم ——— گاؤں گوینکی

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

کوثر خالد ——— جڑانوالہ

کچھ دن تو بسو مری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا
اک وہم ہے یہ دنیا اس میں
کچھ کھوؤ تو کیا اور پاؤ تو کیا

خالدہ پروین ——— گاؤں اوکھ

تو ہو، تیرا خیال ہو یا خواب
کوئی بھی رات بھر نہیں رہتا
جس گھڑی چاہو، تم چلے آؤ
میں کوئی چاند پر نہیں رہتا

صبیحہ شوکت ——— لاہور

اندھیرا لاکھ ہو، مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے ڈرنے نہیں دیتی
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

عذرا ناصر ——— کراچی

بات بڑھنے کو تو بڑھ جاتی بہت لیکن نظیر
میں بھی کچھ کم گو تھا، چپ رہنے کی خو اس کی بھی تھی

عائشہ ——— کراچی

مری داستانِ حسرت وہ سنا سنا کر روئے
مرے آزمانے والے مجھے آزما کر روئے
تری بے وفائیوں پر، تری کج ادائیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے

فائزہ بھٹی ——— پتوکی

پیاسے لہجے میں بہت کرتا ہے میٹھی باتیں
ہو کر سیراب بدل جاتا ہے لہجہ اس کا

ایس کنول ——— فیصل آباد

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں سودا سچا کرتے ہیں
جو گجرا اک پھولوں جیسا ہو، ہم ان داموں بک جاتے ہیں
ہم شہرِ وفا کے لوگوں کا تم کو حال سنائیں گے
ہم زخم تو دل پہ کھاتے ہیں اور آنسو تک پی جاتے ہیں

سیدہ نوبا سجاد ——— کھروڑ پکا

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں
یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

اقصیٰ ناصر ——— کراچی

لوگ کہتے ہیں کہ مسکان ہے ہونٹوں پر میرے
کون جانے تصور میں ہنسایا کس نے

عائشہ شہزادی، فاطمہ شہزادی ——— بہاول نگر

مجھے حیرت ہے میرے پاس کچھ نہیں بچتا
میں اپنی ذات سے جب بھی تمہیں تفریق کرتا ہوں

شائستہ کنول جٹ ——— چیچہ وطنی

ہم پہ ختم تھا محبت کا تماشا گویا
روح کو درد نہ جسم سے جدا کرتے ہیں
زندگی ہم سے تیرے ناز اٹھائے نہ گئے
سانس لینے کی فقط رسم ادا کرتے ہیں

سدرہ اقبال ——— کراچی

مسافر تو بچھڑتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے
محبت زندہ رہتی ہے محبت کب بدلتی ہے
تم ہی کو چاہتے ہیں ہم تم ہی سے پیار کرتے ہیں
یہ ہی برسوں کی عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے

مناہل امین ——— عبدالحکیم

تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
کیسے رشتے تیری خاطر یونہی توڑ آیا
کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا
کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا

فرحت عباس ——— پیر جنگ

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑ پکا

آہٹ پہ میرے پاؤں کی دھیرے سے چونک کر
دیکھا ہے اس نے مڑ کے مجھے اس ادا کے ساتھ
پھیلی ہے جسم و جاں میں عجب ایک سرخوشی
خوشبو سی کوئی اڑنے لگی ہے ہوا کے ساتھ

گڑیا شاہ ——— کہروڑ پکا

اک فسانہ ہے زندگی لیکن
کتنے عنوان ہیں اس فسانے میں
پاک داماں کی خیر ہو یارب
ہاتھ گستاخ ہیں زمانے کے

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گرد و غبار، عہد ستم اور کتنی دیر
شام آ رہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

کائنات ——— ڈسکہ

گو سب حسرتیں جو خوں ہوتی ہیں تن کے مقتل میں
میرے قاتل حساب خوں بہا، ایسا نہیں ہوتا
ہر اک صبح ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روز جزا، ایسا نہیں ہوتا

شبنم شمشاد ——— بزمان

برف ایسی کہ پگھلتی نہیں پانی بن کر
پیاس ایسی کہ بجھاتے ہوئے تھک جاتا ہوں
اچھی لگتی نہیں اس درجہ شناسائی بھی
ہاتھ ہاتھوں سے ملاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

گڑیا شاہ ——— کہروڑ پکا

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

گیلانی سسٹرز ——— کہروڑ پکا

ان ہی لفظوں کے اشک بنتے ہیں
جینے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے

نمرہ، اقرا ——— کراچی

سانسوں کے سلسلے کو نہ دو زندگی کا نام
جینے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے

نسبت سعید ——— کہروڑ پکا

تو نے چھیڑا تو یہ کچھ اور بکھر جائے گی
زندگی زلف نہیں ہے کہ سنور جائے گی
تھک کے بیٹھا ہوں میں سایوں کے گھنے جنگل میں
سوچتا ہوں کہ ہر اک راہ کدھر جائے گی

صدف عمران ——— کراچی

اب دل کے دریچوں پہ دستک نہ کوئی ہوگی
آ تجھ سے کریں باتیں، اے موسم تنہائی

حورین زینب ——— کہروڑ پکا

کبھی سمندر سے جا الجھنا، کبھی ہواؤں سے بیر رکھنا
بنا ہے اپنا مزاج دنیا کے ناخداؤں سے بیر رکھنا
کبھی تمازت، کبھی تراوٹ، کبھی اجالا، کبھی اندھیرا
سکھا دیا ہے مجھے یہ کس نے کہ دھوپ چھاؤں سے بیر رکھنا



نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

روزینہ نعیم' یاسمین نعیم..... گوجرانوالہ

ٹائیٹل کی سلیم منیر کی ڈائمنڈ رنگ کافی اچھی تھی (بھلا رسالے کے ساتھ ہر قاری بن کو یہ بھی ایک Tcs کر دیتے۔ ٹھیک ہے نا....) انشاجی کی نظم بھی بہت بہت اچھی تھی "آب حیات" میں "عمیرہ احمد" نے سود کے متعلق ہماری معلومات میں کافی اضافہ کیا آسیہ مقصود کے ناول میں روحی کا کردار بہت اچھا لگا۔ افسانوں میں "تماشا" نمبر لے گیا۔ "میں ایک بیوی ہوں" ٹھیک تھا "محبتوں کا ہنر" ذہین ہاؤس کی لڑکیاں۔ توبہ اتنی ذہین دل عش عش کر اٹھا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ ہمارا خاندان بھی تعلیم یافتہ ہو مگر...

"شہر آشوب" میں سائر کا کردار ایک نفسیاتی مریض کا سا ہے لگتا ہے کہ ناز اس کی ماں ہوگی اور اب باری ہے ون اینڈ اونلی "نمل" کی واہ کیا بات ہے الفاظ نہیں ملتے تعریف کرنے کے لیے۔ اس کے علاوہ "آبدار" کا کریکٹر بھی اچھا ہے کیا اس کا جوڑ سعدی کے ساتھ ہے۔ "فارس اور زمر کی نوک جھونک بھی اچھی لگتی ہے پلیز زمر کو اینڈ میں مار نہ دیجیے گا۔ کہانی میں سعدی اور حنین کی شادی نہ کروایئے گا کیونکہ ان جیسا ہو تو کوئی سامنے آئے شیرو کی شادی ضرور کروایئے گا۔ شیرین سے ہاہاہا) اور گزارش ہے کہ پلیز نمرہ جی کو کہیے کہ وہ ایک سلسلہ شروع کریں جس میں وہ قرآن کی تفسیر کو ہم تک پہنچا سکیں۔ نمرہ جی کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی انٹرویو بھی شائع کردیں۔ اس کے علاوہ علی عباس سے ملاقات بھی اچھی لگی۔

ج "پیاری روزینہ! آپ نے کیسے اندازہ لگالیا کہ ڈائمنڈ رنگ تھی۔ آج کل تو ایسی آرٹیفشل جیولری بازار میں آ گئی ہے کہ اچھے اچھے جوہری دھوکا کھا جائیں۔ ہمیں تو آج تک اصلی اور نقلی ہیرے میں فرق محسوس نہیں ہوا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی نظم کے متعلق کیا کہیں۔ آپ خود سمجھ جائیں۔ خاندان ویل ایجوکیٹڈ نہیں ہے تو افسردہ نہ ہوں' بڑے بڑے اعلا تعلیم یافتہ لوگ' صحافت کے بڑے نام جو یہ دعوا کرتے ہیں کہ ان کے خاندان میں پشتوں سے تعلیم ہے جب ٹی وی پر تبصرہ کے نام پر منتخب وزیراعظم کے لیے اخلاق سے گری ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں۔ تو ان کی تعلیم کا پول کھل جاتا ہے (سمجھ تو گئی ہوں گی کہ ہمارا اشارہ کس طرف ہے)

اصل چیز تہذیب ہے۔ شرافت اور تربیت ہے تعلیم بھی ہو تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔

آپ نے نوٹ نہیں کیا کہ ذہین ہاؤس میں بھی کم پڑھی لکھی بہو نے گھر کو سنبھالا اور بچوں کو بہترین تربیت کی۔ پڑھی لکھی بہو تو چھوڑ کر چلی گئی۔

وردہ گل..... کوئٹہ

اکتوبر کے شمارے نے اتنا مزہ دیا کہ سوچا کیوں نہ کوئی خط لکھوں حسب عادت سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" پڑھا جسے پڑھ کر روحانی خوشی ملی۔ عمیرہ احمد کا "آب حیات" بھی بہت زبردست رہا جبکہ عفت سحر طاہر کے "بن مانگی دعا" کے تو کیا کہنے۔ نمرہ احمد تو بھی گریٹ ہیں ان کے "نمل" نے تو دل موہ لیا۔ "شہر آشوب" بھی بہت اچھا ہے سسپنس ہے۔ اس میں افسانے بھی زبردست

تھے۔

پیاری وردہ! شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

شیما' ماریہ اور طوبیٰ..... گلشن اقبال' کراچی

خواتین کی تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں جس میں تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاح بھی ہوتی ہے مگر ہماری موسٹ فیورٹ رائٹرز نمرہ احمد اور عمیرہ احمد ہیں۔ سائرہ رضا بھی حقیقت سے قریب تر لکھتی ہیں۔

اب بات کرتے ہیں اکتوبر کے شمارے کی تو سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر دوڑائی بس ٹھیک ہی لگا' ستمبر کا ٹائٹل زیادہ اچھا تھا اس کے بعد فوراً "بن مانگی دعا" پڑھی۔ ابھی جا رہی ہے مگر اب سفینہ بیگم کو سدھارنا ہو گا بہت ہو گئی۔ پھر دھک دھک کرتے دل کے ساتھ فیورٹ ناول "نمل" کو پڑھنا شروع کیا۔ اف کیا بتائیں "نمل" پڑھتے ہوئے ہمارے کیا احساسات ہوتے ہیں۔ "حنین" جو اسٹوری کا ایک زبردست کردار ہے اس کے ہیرو کے بارے میں ہم فرینڈز میں اختلاف ہے میرے (شیما) خیال میں حنین کا ہیرو ہاشم ہونا چاہیے اگرچہ وہ نیگٹو کردار ہے مگر میں نے شروع سے اسے حنین کے ہیرو کے طور پر سوچا ہے' بہرحال ماریہ اور طوبیٰ کے خیال میں اس کا ہیرو "احمر شفیع" ہو گا کیونکہ وہ اسی کی طرح اسمارٹ ہے لیکن اس کا فیصلہ تو نمرہ ہی کریں گی۔

اس کے بعد "آب حیات" پڑھنی شروع کی تو آخر میں پیٹرس ایباکا کی میت وصول کرتے ہوئے سالار کی بہادری نے دنگ کر دیا۔

باقی مکمل ناولز' ناولٹ اور افسانے بس ٹھیک ہی تھے۔ زیادہ خاص نہیں تھے جیسا کہ پہلے ہوا کرتے تھے البتہ خواتین کے سلسلے بہت زبردست ہیں مثلاً "آپ کا باورچی خانہ اور دیگر سلسلے۔

ج شیما! ماریہ اور طوبیٰ! حنین بہت اچھی لڑکی ہے' غلطی کرتی ہے لیکن سنبھل بھی جاتی ہے' اپنی غلطیوں پر نادم بھی ہوتی ہے' نفس پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ ہاشم جیسے کریٹ اور احمر جیسے چالاک لڑکے کے ساتھ اس کا [illegible] ہیں۔ اس کے لیے فارس یا سعدی جیسا اچھا انسان ہونا چاہیے آب حیات اور نمل کے علاوہ آپ کو کچھ بھی خاص نہیں لگا۔ چلیں شکر ہے کہ سلسلے تو اچھے لگے۔

آسیہ ارم وسیم خان..... ملیر کراچی

خواتین اور شعاع بہت بچپن کے ساتھی ہیں پتا ہی نہیں چلا کب بچپن لڑکپن میں بدلا اور لڑکپن جوانی میں اور اب بڑھاپے کی طرف گامزن ہیں مگر یہ ساتھی ہمیشہ ساتھ رہے۔ آج کل جو سلسلے چل رہے ہیں مثلاً "عمیرہ کا "آب حیات" صرف ایک کہانی نہیں ہے' یہ ایک معلومات کا خزانہ ہے۔ جیسے نمل کو لیں تو اس میں قرآن پاک کی تفسیر جس انداز میں بیان کی ہے یہ صرف نمرہ کا ہی کمال ہے عمیرہ اور نمرہ کو ایک ساتھ خواتین میں شامل کر کے خواتین کے چاند بڑھادیے گئے ہیں۔

میں عدنان کی الجھنیں اور خطوط بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس دفعہ ہماری ایک بہن (اخت حماد شفقت' تجر پور) نے لکھا ہے کہ اسلام نے صرف شوہر کی خدمت کے بارے میں کہا ہے کہ تو پلیز میری ان سے گزارش ہے کہ ہم لوگ صرف اپنے مطلب کا اسلام ہی کیوں پڑھتے ہیں کیا ہمیں دین اسلام نے حقوق العباد نہیں سکھائے اگر آپ غور کریں تو آپ پتا چلے گا کہ خدمت دراصل کہتے کسے ہیں۔ اپنی چار دیواری میں اگر ساس' نند' سسر' دیور کے لیے بھی ڈال لیتی ہیں تو کیا قباحت ہے۔ آپ یہ تو دیکھ رہی ہیں کہ آپ خدمت (معذرت میں اسے خدمت نہیں کہتی) کر رہی ہیں مگر آپ یہ بھی دیکھیں کہ بدلے میں آپ کیا پا رہی ہیں۔ میں اگر کام کرتی تھی تو میری ساس میرے بچوں کا خیال رکھتیں۔ بہت سی اچھی باتیں انہوں نے ہی سکھائی ہیں۔ آپ کا خط پڑھ کر آپ کی ذہنی سوچ کا پتا چلتا ہے جبکہ سائرہ نے واضح طور پر بتایا تھا کہ ماہا کو صرف ازین چاہیے تھا پیاری بہن! کبھی آپ بھی ماں ہوں گی۔ سوچیے آپ کا بیٹا بھی کسی کا شوہر اور باپ بنے گا تو اس کی دوری سے آپ پر کیا گزرے گی۔ میرا آپ کے خط پر تنقید کرنا بھی صرف اس لیے ضروری تھا کہ یہ رسالہ ہماری آج کی بچیاں بھی پڑھتی ہیں کہیں کوئی بھی آپ کی سوچ سے متاثر ہو گئی تو ایک فیملی تباہ ہو گی نند اور دیور تو آپ کی زندگی سے ایک وقت میں خود ہی الگ ہو جاتے ہیں مگر لڑکے کے والدین جب تک حیات ہوں اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں

اگر آپ اس کی نصف بہتر ہونے کی وجہ سے اس کی ذمہ داریوں میں اس کا ساتھ دیں گی تو سوچیے دنیا میں بھی سرخروئی اور آخرت میں بھی۔ اگر آپ کو میری تنقید بری لگی ہو تو معذرت۔

کرن کرن روشنی بھی بہت اچھا سلسلہ ہے اس دفعہ تصویروں کے متعلق بتا کر آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا ہے یہ ہمارے گھروں میں بہت عام ہے۔

آپ لوگوں نے یہ سلسلہ "حرف سادہ کو دیا" بڑے ہی مزے کا دیا ہے۔ ہمیں پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ مصنفین کے بارے میں جان کر خوشی ہوتی ہے۔ راشدہ رفعت' قانتہ رابعہ کی ڈائجسٹ کے لیے جو دعا ہے اس میں ہماری آمین بھی شامل کرلیں۔ ہمارے نام کے صفحات بڑھائیں۔ خط اور آپ کے جوابات پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔

میری اپنی رائٹر سے درخواست ہے کہ کہاں گئیں وہ کہانیاں جن کو پڑھنے کے لیے ہمیں گھر کے کونے کھدرے ڈھونڈنے پڑتے تھے کہ کوئی ہمیں پاگل نہ سمجھے کہ اکیلے میں قہقہے لگارہی ہیں۔

ج آسیہ بہن! پروردگار سے دعا ہے کہ وہ آپ کو طویل اور ایمان افروز زندگی عنایت فرمائے۔ آمین اللہ ہماری بہنوں اور بچیوں کو دین کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ اس سلسلے میں جو ہم سے بن پڑا وہ ہم نے کیا اور کرتے ہیں۔ اللہ ہماری کاوشوں کو قبول فرمائے۔ خطوط کا مسئلہ یہ ہے کہ تاخیر سے موصول ہونے والے خط شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ مگر وہ ہماری نظروں سے بچے بنا ڈسٹ بن میں جا ہی نہیں سکتے۔ آپ کا خط ستمبر کے بالکل آخر میں موصول ہوا ہے جب پرچا شائع ہونے جاچکا ہے۔ مگر دیکھیے اس نے اپنی جگہ کیسے بنالی۔ ہنستی مسکراتی کہانیاں تو ہمیں بھی بہت اچھی لگتی ہیں لیکن کیا کریں ہماری مصنفین زیادہ تر سنجیدہ کہانیاں ہی لکھ رہی ہیں۔

فائزہ شیخ..... قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ

ہر قاری کے خط لکھنے کے پیچھے کہانی کچھ بھی ہو مگر محبت ضرور ہوتی ہے جب میں میٹرک میں تھی تو اس وقت ایک مباحثہ میں بڑی دلچسپ بات ہوئی خواتین کی تعلیم سے متعلق اندرون سندھ سروے کیا گیا تو ایک عمر رسیدہ خاتون نے کچھ اس طرح جواب دیا کہ لڑکیوں کو پڑھانے کے فوائد کے متعلق تو میں کچھ نہیں جانتی' تاہم ایک خرابی اس میں یہ ہے کہ لڑکیوں کو اگر لکھنا پڑھنا آگیا تو وہ خط (محبت نامے) لکھنے کے قابل ہوجائیں گی' بہرحال یہ تو از راہ مذاق بات تھی۔

اب آتے ہیں اصل مدعا کی طرف' رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی مصروفیت کی وجہ سے اپنے مخصوص بک سٹال سے شمارہ نہ خریدا عید کے بعد جب شمارہ لینے گئے تو کیا خبر تھی کہ اس قدر صدمے سے دوچار ہوں گے۔ جی ہاں اسٹاک کم آیا تھا اس لیے شمارہ مارکیٹ سے غائب' ساری مارکیٹوں سے پتا کروایا۔ آس پڑوس اور دوستوں سے نہ مل سکا۔ ہماری تو دنیا ہی (خیالوں کی) اندھیر ہوگئی اوپر سے مانگے کی روشنی بھی نہ ملی دل بے چین کو قرار کہاں' تلاش مسلسل میں سرگرداں نکل پڑے گوجرانوالہ کے بک سٹالوں پر بھی نہیں مل سکا۔

سچ ہے محبت نری خواری ہے اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ یہ خواری ہم سب کو پیاری ہے۔

ہماری ہردل عزیز رائٹرز عمیرہ احمد' نمرہ احمد' تنزیلہ ریاض' سائرہ رضا' سمیرا حمید ان سب تحریروں کے پیچھے جو پیپرورک اور ریسرچ ورک اور جو محبت' محنت کارفرما ہوتی ہے اس کے بعد میں تو برملا یہ کہوں گی یہ صرف خواتین ڈائجسٹ نہیں بلکہ یہ خواتین اوپن یونیورسٹی ہے ویل ڈن۔

جون' جولائی' اگست' ستمبر کے خواتین ایک ساتھ پڑھنے کے بعد عمیرہ احمد اور تنزیلہ ریاض آپ کی تحریر کی تعریف میرے بس کی بات نہیں بس اتنا کہوں گی۔ "ہمیں آپ پر فخر ہے۔"

"ہاہاہا..... آپ کی مہم جوئی کا احوال پڑھ کر تو ہمارا ایک پاؤ خون بڑھ گیا۔ خواتین ڈائجسٹ کے عشاق کا کچھ یہی حال ہے۔ سچ پوچھیں تو خواتین سے اتنی محبت دیکھ کر کبھی کبھی ہمیں خود پر رشک آجاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بری نظر سے بچائے۔ آمین

ایک مشورہ دیں کہ آپ مصروفیت کے باعث پڑھ نہ بھی سکتی ہوں تو بھی خرید کر رکھ لیا ورنہ بعد میں ملنے میں واقعی بہت دشواری ہوتی۔

ہمیں بالکل احساس ہے کہ ہماری بہنیں کن کٹھنائیوں

سے گزر کر اسے حاصل کرتی ہیں اور پھر خط لکھنا اور اسے پوسٹ کروانا ایک اور ہی داستان ہے۔

یہ آپ لوگوں کی محبت ہی ہے جو ہمیں تازہ دم و توانا رکھتی ہے اور محنت پر اکساتی ہے۔ اللہ پاک ان محبتوں کے رشتوں کو ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین

ام طابہ..... کراچی

کچھ یاد نہیں پڑتا کہ شاید چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھی جب پہلی بار ڈائجسٹ پڑھا۔ پھر زندگی آگے بڑھتی رہی' تعلیمی مدارج طے ہوتے گئے زندگی کا نیا سفر شروع ہوا۔ میاں جی نے پہلے ہی ماہ سے پرچا لگوا دیا۔ آج شادی کو بھی 5 سال ہو گئے۔ دونوں بچے میرا ڈائجسٹ دیکھتے ہی کہتے ہیں "ممی کی بک آ گئی" نہ چھوٹا تو خواتین کا ساتھ نہ چھوٹا۔

آج جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہے نمرہ احمد کی نمل۔ نمرہ الفاظ کم پڑ گئے میرے پاس۔ کیا لکھا ہے اور خوب لکھا ہے اتنی عمدہ سوچ 'قرآن کا اتنا گہرا مطالعہ اور اتنی اعلا تفسیر بیان کرتی نظر آ رہی ہیں کہ واقعی لفظ نہیں ہیں تعریف کے لیے۔ کرداروں کا چناؤ 'کہانی کی بنت اور اس کا تسلسل بہترین ہے' خاص کر وہ کڑیاں جو ایک دوسرے سے جا کر ملتی ہیں اس کا جواب نہیں اب اگر تنزیلہ ریاض کی تعریف نہ کی تو یقیناً" زیادتی ہو گی۔ میں تھوڑا تاخیر کا شکار ہو گئی اس کے لیے معذرت۔ قاری ایک لمحے کو بھی کہانی کے سحر سے نہیں نکل پایا۔ نور محمد 'بل گرانٹ 'شہروز اور ٹیپو جیسے کردار راستہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ بہتر سے بھی بہترین ناول ہے جو مدتوں یاد رہے گا شکریہ تنزیلہ ہم تک اتنا عمدہ ناول پہنچانے کا 'بہت اعلیٰ لکھا آپ نے۔

ج پیاری ام طابہ! خواتین کی محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ لوگ خط کی طوالت اور تاخیر سے مت گھبرایا کریں۔ ہم تو آپ لوگوں کی آراء اور تجاویز کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ وہ شائع ہوں یا نہ ہوں۔ مگر ہم آپ لوگوں کے خطوط پڑھ کر آپ کی پسند 'نا پسند سے بھی آگاہ ہوتے ہیں اور پرچے کو مزید بہتر بنانے کے لیے کوشاں بھی۔ آپ کی ڈھیروں دعاؤں کا شکریہ اور ان قارئین بہنوں کا بھی جو مصروفیات یا بعض اوقات موقع نہ ملنے کے باعث خاموش ہی رہتی ہیں۔

کومل فاطمہ..... چک ڈھلو نمبر 1 'گجرات

آج لکھنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ آپی عمیرہ کے ناول "آب حیات"... اور نمرہ آپی کے نمل نے 'ان دونوں کے سحر سے نکلنا ناممکن سی بات ہے.... اس کے علاوہ مکمل ناول "محبتوں کا شہر" راشدہ رفعت بہت زبردست رہا افسانوں میں سمیہ یاسمین کا میں ایک بیوی ہوں۔" ہاہاہا بہت زبردست تھا۔

"فریدہ فرید" کا "ناشناس دھوپ" سیدھا من میں اتر گیا۔ فریدہ جی اللہ رب العزت آپ کو عزتوں محبتوں سے نوازے.... اس گاؤں کی پہلی لڑکی ہوں جو اس محفل میں شرکت کے لیے.... اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں۔ اردو ادب میں ماسٹر کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ایک پرائیویٹ ادارے میں جاب بھی کر رہی ہوں "ٹیچنگ" جیسے اہم فریضے کو ادا کرتے ہوئے.... بہت دفعہ مشکل کا شکار بھی ہوئی.... تو یہ میرے سنگی ساتھی شعاع.... اور خواتین ہر موقع پہ میری الجھنیں سلجھاتے رہے۔ میں جانتی ہوں خط طوالت کا شکار ہو رہا ہے۔ مگر کچھ باتیں بہت اہم ہیں۔ آج کل یہ جو ہر نیوز چینل پہ.... پرائیویٹ اسکول والوں کی زیادتیاں دکھائی جا رہی ہیں.... یہ بہت ہی گمبھیر مسئلہ ہے۔ کچھ لوگوں نے واقعی تعلیم کو بھی کاروبار بنا دیا ہے.... لیکن ان بڑے بڑے اداروں میں اپنے بچوں کو بھیجنے والے بھی اگر صرف تعلیم کو معیار سمجھیں تو آج بھی ایسے ادارے اور لوگ موجود ہیں۔ جو صرف اور صرف تعلیم اور بچے کو اہمیت دیتے ہیں۔ نا کہ روپے پیسے کو....

میں نے خود ایک پرائیویٹ ادارے سے پڑھا ہے.... اور ادھر ہی ٹیچنگ بھی کر رہی ہوں۔ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے.... اس کے باوجود کبھی فیس.... اور بے جا ٹیکسز کی پریشانی نہیں ہوئی.... پی ایچ ڈی.... اساتذہ میسر ہیں اور رزلٹ بھی شہر کے بڑے بڑے.... اداروں سے اچھا مگر.... اتنے سالوں میں 'میں نے کبھی کسی نیوز چینل.... اور اخبار کو اس طرح کے 'سچے انسانوں کی.... حوصلہ افزائی کرتے نہیں دیکھا۔

یہاں میں خاص طور پر اپنی ٹیچر اور کولیگ "میم مقدس" کا ذکر کرنا چاہوں گی.... میم آپ لوگوں کی دیوانی ہیں۔ ادارے کے سربراہ کی بیوی کی حیثیت سے وہ صرف رعب جمانے والی ہستی نہیں ہیں بلکہ ہر ہر بچے کے ساتھ ان کی

ذہنی اور قلبی اٹیچمینٹ ہے۔ کالی لمبا ہو گیا ہے۔ نمرہ بخاری کو صدا دی جائے اور نعمان اعجاز' سہیل سمیر اور جاوید چودھری کا انٹرویو جلد کیا جائے۔

ج : پیاری کومل! ہم آپ سے متفق ہیں۔ بہت سے تعلیمی ادارے ایسے ہیں جہاں بھاری فیس اور دیگر سرگرمیوں کے نام پر ہزاروں' لاکھوں وصول کیے جاتے ہیں اور وہاں پڑھائی برائے نام ہوتی ہے۔ نام بڑا اور درشن چھوٹے ایسے ہی اداروں کے لیے کہا گیا جبکہ بہت سے تعلیمی ادارے خاموشی سے خدمت کر رہے ہیں خصوصا" چھوٹے شہروں میں ایسے بہت سے ادارے ہیں جہاں بہت کم فیسوں کے باوجود تعلیمی معیار بہت اعلا ہے جہاں تک چینل والوں کا تعلق ہے تو انہیں سیاست دانوں کو برا بھلا کہنے اور گالیاں دینے سے فرصت ملے تو کچھ اور دکھائیں۔ سمیہ یاسمین کی یہ پہلی تحریر تھی اور واقعی بہت دلچسپ تھی۔ ہمیں بھی بہت اچھی لگی۔ فریدہ فرید بھی بہت اچھا اضافہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں الفاظ کا چناؤ اور انتخاب بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے کہانی پر توجہ دی تو یقینا" ان کا نام بھی بہت اچھی مصنفین کی فہرست میں شامل ہوگا۔

صائمہ بشیر..... گجرات

"نمل" میں وہ لمحہ آہی پہنچا جب زمر اور حنہ مل کر کام کریں گی۔ یعنی نمل ایک قافلہ بن ہی گیا۔ کیا اس قافلے میں شہرین بھی ہوگی؟ اس بات نے چونکنے پر مجبور کیا کہ کیا ہاشم کی کوئی بہن بھی تھی یا ہے؟ کیا آسٹریلیا سے بچ لینے والی کہانی بھی سچی ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بہت خوفناک حقیقت ہے۔ کیا واقعی ان کی وجہ سے اسلام آباد کا پانی کھارا ہو گیا؟ اف! برائے مہربانی آبدار کو سعدی کی ہیروئن مت بنایئے گا۔ کیونکہ سعدی تو ہم سب کا ہیرو ہے۔ خاص طور پر میرا۔ (ہاہاہا) اور اس کے علاوہ اس ناول کے بعد نمرہ کو روبرو میں ضرور لایئے گا۔ باقی ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسالہ 8 یا 10 تاریخ تک ملتا ہے۔

ج :۔ محترمہ صائمہ! یہ تو آپ ہم پر ظلم کرتی ہیں کہ ہم کو اپنے تبصرے سے محروم رکھتی ہیں پورا جریدہ پڑھ کر ہمیں اطمینان سے خط لکھا کریں' خط شائع ہو کہ نہ ہو۔ ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ ہو جائیں گے۔

شہناز اختر..... لاہور

آج بہت سی باتوں نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔

پہلے تو میں یہ بتاتی چلوں کہ میں جب میٹرک میں تھی اس وقت سے آپ کا جریدہ پڑھ رہی ہوں۔ یہ بات ہے 1973ء کی۔ اس سے پہلے میں حور۔ زیب النساء بچوں کی دنیا۔ کھلونا۔ تعلیم و تربیت پڑھتی تھی۔

میں نے رسالہ کوئی بھی ہو خاص طور پر خواتین 'شعاع سے بہت کچھ سیکھا۔ میں کتنی بھی پریشان ہوں۔ مطالعہ نہیں چھوڑا۔ مجھے زندگی میں بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے میں ہمیشہ مشکل میں اللہ یعنی نماز اس کے بعد خواتین ڈائجسٹ پڑھتی تھی اور اللہ تعالیٰ اس طرح میری مدد فرماتے تھے کہ میرے حالات سے ملتی جلتی کہانی سامنے ہوتی تھی اور اس میں میرے لیے سبق ہوتا تھا۔ اشارہ ہوتا تھا۔

اب میری عمر 60 سال ہے لیکن خواتین اور شعاع میرے سائیڈ ٹیبل پر ہوتے ہیں' صرف رسالے ہی نہیں باقی اسلامی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔

پہلے ناول' افسانے' ناولٹ بہت اچھے معیاری' مختلف ہوتے تھے اور ملک کے حالات کے مطابق کوئی نہ کوئی افسانہ یا ناول ضرور ہوتا تھا جیسے کھوٹہ کا واقعہ اس کا ذکر ایک ناولٹ میں تھا۔ سیاچین تو کارگل فوجیوں کی جرأت پر' فلسطین کے بارے میں رائٹرز لکھتی تھیں۔ بہت عرصے بعد ام ایمان نے واپسی افسانہ لکھا ہے۔

رائٹرز کے ڈراموں کی طرف جانے سے ہم قاری اچھی رائٹرز کی تحریروں سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ نئی لکھنے والیاں بہت اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن وہی ایک جیسی کہانیاں۔ سوتیلی ماں کے ظلم۔ ساس کے ظلم دوسری شادی وغیرہ۔

ایک بات اور لکھوں گی۔ سچی کہانی کے طور پر ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے یا پھر جو پروفیشن ہیں جیسے نرسنگ۔ ایر ہوسٹس ان کے مثبت کردار بھی ہیں۔ ان پر کسی رائٹر نے قلم نہیں اٹھایا۔

بہرحال بہت کام ہو رہا ہے۔ سب سلسلے بہت اچھے ہیں میں پہلے صفحے سے لے کر آخر تک پڑھتی ہوں اور رسالہ بہت احتیاط سے رکھتی ہوں۔ کیونکہ مجھے ان سے بہت پیار ہے۔ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ صبر' برداشت۔

اللہ سے محبت۔ بچوں کی تربیت گھر کا انتظام وانصرام.... اور بہت کچھ۔

ج: شہناز بہن! سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہمیں اتنا جامع اور مفصل خط تحریر کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم پورا خط شامل نہ کرسکے۔ بے شک ہماری تمام قارئین (چاہے وہ ہم سے مخاطب ہوں یا خاموش رہتی ہوں) کی محبت ہی ہمارے لیے سب سے بڑا اثاثہ ہے اور ہم ان کی پسند وناپسند کو مدنظر رکھ کر ہی شمارے کو ترتیب دیتے ہیں۔

جن موضوعات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے ان پر کوئی اچھی کہانی لکھی گئی تو ضرور شائع کریں گے۔ ہم آپ جیسے چاہنے والوں کے ذوق کو مدنظر رکھ کر ایسی کہانیوں کو بھی ضرور شمارے میں جگہ دیتے ہیں جو حالات حاضرہ سے متعلق ہوں۔ اب جہاں تک ٹی وی میں جانے والوں کی بات ہے تو سمجھ لیں کہ ہمارا ادارہ لکھنے والوں کے لیے نرسری کا کام دیتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو سامنے لانے اور انہیں پالش کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ ٹی وی کی وجہ سے ہم اچھی رائٹرز کی تحریروں سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ ہماری رائٹرز نے ٹی وی پر جانے کے بعد بھی ہمیں نہیں چھوڑا ہے۔ رخسانہ نگار عدنان، فائزہ افتخار، فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد ٹی وی کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی لکھ رہی ہیں۔

دعاؤں کے لیے شکریہ اور آپ کے لیے بھی دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت ساری خوشیاں دے آمین۔

علیزہ، عروہ..... رتبہ

زندگی میں یہ ہمارا پہلا خط ہے اس کی وجہ صرف "نمل" ہے میری عمر ابھی چودہ سال ہے لیکن امی مجھے منع نہیں کرتیں نمرہ کا ناول پڑھنے سے اور "نمل" میں میرا پسندیدہ کردار فارس ہے۔ امی اور میری خالہ کا سعدی، اس بار نمرہ نے قرآن کی اتنی اچھی طرح تفسیر لکھی ہے۔ ہم کبھی قرآن کی تفسیر پڑھی ہی نہیں تھی اب ہم شوق سے قرآن اور تفسیر پڑھتی ہیں اور نمل کے بعد نمرہ احمد کا انٹرویو ضرور شائع کرنا پلیز اور نمرہ باجی پلیز ہاشم کو تڑپا تڑپا کے زندہ رکھنا۔

ج: عروہ اور علیزہ اتنی کم عمری میں ماشاء اللہ آپ کی ذہانت قابل داد ہے کہ آپ نمرہ کی تحریروں میں چھپے پیغام کو سمجھ سکتی ہیں، قرآن فہمی کا شوق پیدا ہوگیا ہے اور قرآن پاک کی تفسیر پڑھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا ذوق وشوق قائم رکھے۔ کسی مصنف کی اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی تحریروں سے کسی کو اجالوں کا، روشنیوں کا راستہ ملے اور ہم پر بھی اللہ کا بڑا کرم ہے کہ ہم اس کا ذریعہ بنے۔

شبنم شمشاد..... یزمان

آج سے دو سال پہلے جب "شعاع کے ساتھ ساتھ" اور "میری خامشی کو بیاں ملے" میں شرکت کی تب بادولت بی ایس سی کے طالب علم تھے اور آج اللہ کے فضل سے ایم ایس سی میتھس کرچکی ہوں اور میتھس میں ایم فل کرنے کا ارادہ کررہی ہوں قصہ مختصر ان دو سالوں میں بہت کچھ ٹوٹ گیا، ختم ہوگیا۔ بہت سے خواب بہت سے لوگ پیچھے رہ گئے۔ ان بھاگتے دوڑتے دنوں میں اگر کچھ نہ چھوٹا تو وہ شعاع وخواتین کا ساتھ ہے کبھی کبھی کچھ ایسا شائع ہوجاتا ہے جو معیار سے میچ نہیں کرتا پر خیر! نمرہ! نمل میں اتنے زبردست کردار، مکالمے اور سب سے بڑھ کے ہم سب کا پیار اسعدی! ان فیکٹ میرے پاس اس ناول پہ تبصرہ کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں۔

ج: پیاری شبنم! خواب ضرور دیکھنے چاہئیں اور ان کی تعبیر بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن اگر وہ ٹوٹ جائیں تو غم نہ کریں، یقین رکھیں —— کہ بہتری اسی میں تھی، جو ہم نہیں جان سکتے۔ وہ رب جانتا ہے اور وہ ہم پر ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ خواتین آپ کے ساتھ ہے تو اس سے بڑھ کر دوست کون ہوسکتا ہے۔

مریم انصاری..... بہاول پور

رنگوں کی بہار لیے یہ گلدستے میرے ہاتھوں میں آتے ہیں تو میری غم نصیب زندگی میں چند دنوں کے لیے بڑی خوشگوار تبدیلی آجاتی ہے گویا انتہائی مخلص دوستوں کا ٹولہ میرے پاس آگیا ہے۔

عمیرہ احمد کا "آب حیات" آب حیات ہی ہے۔ سائرہ رضا کی تحریر میں پانی کی سی روانی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔

نمرہ احمد ہمارے اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ، فائقہ رابعہ ہماری دنیا وآخرت کی بھلائی چاہنے والی۔ میں کس کس پیاری رائٹر کا ذکر کروں۔ یہ شمارے انتہائی جامع

ہیں۔

ج :۔ پیاری مریم! شمارے تو جامع ہیں ہی' آپ کا خط بھی جامع ہے۔ غم نصیب اور مفلس تو وہ ہوتا ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو اور یاد رکھیں اللہ انسان کا سب سے بہترین دوست ہے۔ اور پھر آپ کو تو شعاع اور خواتین ڈائجسٹوں جیسی مخلص رفاقت بھی حاصل ہے تو پھر کیا غم۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کی زندگی کو بھی رنگوں اور خوشبوؤں سے بھر دے۔ (آمین)

اقراء شریف..... چونیاں' قصور

آج پہلی بار خط لکھنے کی جرأت کر رہی ہوں جس کی ایک ذاتی وجہ ہے۔ مجھے نمرہ احمد سے پوچھنا ہے کہ ہمارے دل میں وارد ہونے والے خیال 'شیطانی وحی' ہے یا رحمانی وحی یہ ہم کیسے جج کر سکتے ہیں۔ نمرہ احمد نے اکتوبر کی قسط نمل میں اس پہ بات کی ہے مگر تفصیل نہیں بتائی بلکہ لکھا ہے کہ شریعت کے مطابق جج کرے۔ میں نے بہت کھوج لگائی مگر ہر جگہ پہ وحی کی تفصیل محض انبیاء پہ نازل ہونے والی وحی کی صورت میں ملی۔ ایک عام انسان کے دل میں جو خدا کی طرف سے پختہ خیال آئے مگر وہ پورا نہ ہو تو وہ وحی شیطانی ہوگی یا کیا؟

آپ یقین کرے میری جان سولی پہ لٹکی ہوئی ہے۔ میں اپنے خدا سے بدظن ہو رہی تھی مگر یہ لائن پڑھنے کے بعد کہ وحی شیطانی بھی ہو سکتی ہے۔" میرے ایمان میں دوبارہ جان پڑی میں نے ہر جگہ وحی کی تفصیل پڑھی مگر جواب نہ پا سکی کہ شریعت کے وہ کون سے اصول ہیں جن کے ذریعے ہم اپنے دل میں آنے والی وحی کو جج کر سکیں کہ وہ شیطانی ہے یا رحمانی۔"

ج :۔ پیاری اقرا! جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں منع کیا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام نہ کرنے کی تاکید کی ہے اور وہ کام وہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے ایسا کام کرنے کا خیال کسی کے دل میں آئے تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ کسی کی طرف سے بدگمانی' کسی کا برا چاہنا' حسد' جلن' شیطان ایسے خیال میں ڈالتا ہے جبکہ کوئی اچھا کام کرنے کا خیال آئے تو یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

آپ نے پڑھا ہوگا' کچھ لوگ اپنے بچوں کو مار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ویسا کرنے کو کہا تھا تو یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ کسی کی طرف سے بدگمانی یا یہ سوچنا فلاں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے یہ بھی شیطانی وسوسے ہیں۔

رحمانی وحی یہ ہے کہ مصیبت پر صبر کرنا یہ سوچنا یہ اللہ کی طرف سے ہے' کسی کی مدد کرنا' کسی کے کام آنا یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

عفیفہ خیام..... کراچی

ڈھیروں دعاؤں اور پیار کے بعد ایک خوشی کی خبر سناتی ہوں کہ 13 اپریل 2015ء کو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوسرے بیٹے سے نوازکے اپنی رحمتوں سے مزید مالا مال کر دیا ہے۔

کل میں ایک شادی اٹینڈ کرنے گئی وہاں پر میری ایک کزن نے سلام دعا کے فوراً" بعد مجھے کہا کہ عفیفہ تم نے 12 ربیع الاول کے بارے میں جو خط لکھا تھا' اس کے بعد سے ان لوگوں نے تمہارے خطوط شائع کرنے پر پابندی لگا دی ہے۔ تو یہ سب سن کر میں حیرت میں مبتلا ہوگئی کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ جب آب حیات شروع ہوا تھا اس وقت پیر کامل کے حوالے سے میں نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا تھا جو شائع نہیں ہوا جب میں نے "پیر کامل" پڑھا تھا تو اس کا آخری صفحہ پڑھتے ہوئے میرے دل سے بے ساختہ دعا نکلی تھی کہ اے اللہ جس سے بھی میری شادی ہو' اس انسان نے یہ ناول ضرور پڑھا ہوا ہو اور آپ یقین مانیں' میرے میاں نے زندگی میں صرف ایک ناول پڑھا ہے اور وہ ہے پیر کامل اور نہ صرف پڑھا ہے بلکہ اپنا خریدا بھی ہوا تھا۔ میں نے تو قرآن و حدیث کے حوالے سے ایک مسئلہ پوچھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک بہن نے میرے اس خط پر تنقید بھی کی تھی جسے میں نے کھلے دل سے قبول کیا تھا کہ اس پرچے پر جتنا میرا حق ہے' اتنا ہی باقی قاری بہنوں کا حق ہے' تو مائنڈ کرنے کی تو تک ہی نہیں بنتی۔ ج :۔ محترمہ عفیفہ خیام! خاطر جمع رکھیں۔ ہم نے آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانا بلکہ اپنی کسی بھی قاری بہن کی کسی بھی بات کا برا نہیں مانتے۔ ان کی تنقید اور تجاویز کو کھلے دل سے سنتے ہیں اور قابل عمل ہوں تو عمل کرتے بھی ہیں۔ خط شائع نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ تاخیر سے موصول ہونا یا موصول نہ ہونا صفحات کی کمی آپ کی کزن نے یقیناً" آپ کو تنگ کرنے کے لیے ایسا کہا ہے ورنہ خود سوچیں جب آپ نے خط ہی نہیں لکھا تو شائع نہ کرنے کا کیا

سوال۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوچا نہ کریں اور اس بات کو ذہن میں رکھا کریں کہ یہ "دنیا ہے" "جب تجھ سے ناتا جوڑا" ہے شعاع کا سلسلہ ہے۔ اس کے لیے علیحدہ خط لکھیں۔

حذیفہ..... ہری پور

نمل کی قسط زبردست تھی۔ اس کے بعد بن مانگی دعا پڑھا شکر ہے معیز احمد بچ گیا اس کے بعد شہر آشوب پر نظر کرم کی 'اجیہ کی خوب صورتی نے متاثر کیا۔

ج حذیفہ! بہت شکریہ کہ آپ مصروفیت کے باوجود خواتین کے لیے ٹائم نکالتی ہیں۔ آپ نے سانحہ پشاور پر کہانی لکھی ہے۔ اس سانحہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے معذرت۔ کسی اور موضوع پر لکھیں۔

حمیرا طاہر..... کوٹ رادھا کشن قصور

خواتین ڈائجسٹ کھولتے ہی فہرست میں "میں ایک بیوی ہوں" سمیہ یاسمین میری تو حیرت کی انتہا ہو گئی۔ جلدی سے صفحہ 125 کھولا تصدیق کی تو پتا چلا۔ یہ تو سچ میں میری اس شفیق استاد کا افسانہ تھا جس نے میرے قلم کو بھی لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کالج کے دن یاد آئے کہ کیسے کالج میگزین کا مواد اکٹھا کرتی تھیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے سارے سلسلے بہت پیارے ہیں لیکن عمیرہ احمد کا ناول اس کی جان ہے۔ عمیرہ احمد میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔

ج :۔ حمیرا! آپ کی استاد کا افسانہ واقعی بہت دلچسپ تھا۔ ہمیں بھی بہت پسند آیا۔

عمیرہ تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

مریم..... ہجو گاؤں

آپ یقین جانیے کہ میری تربیت ہی ان ہی رسالوں نے کی ہے۔ آج میں جو بھی ہوں' مجھ میں جو خوبیاں ہیں طریقہ سلیقہ ہے۔ ادب و آداب مذہب سے لگاؤ۔ کردار کی مضبوطی ہے تو صرف اور صرف ان ہی سے ورنہ ہمیں کہاں احساس تھا کہ قرآن پاک کو اس طرح سے پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے جس طرح سے پیاری سی نمرہ جی نے ہمیں احساس دلایا۔ انہوں نے احساس دلایا کہ پردہ کرنا ضروری ہے کیوں ضروری ہے "کرن کرن روشنی" نے ہر مسئلہ سے آگاہی فراہم کی تو یادگار لمحوں نے سوچ کے نئے زاویے تلاش کرنے کا عزم دیا۔

زندگی کے کسی موڑ پر کوئی الجھن ہے تو کسی نہ کسی افسانے ناولٹ' مکمل ناول سے رہنمائی کے لیے استفادہ کیا۔

ج پیاری مریم تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود آپ کا خط اس لیے شامل کر رہے ہیں کہ آپ مطمئن ہو جائیں کہ ہمیں مل گیا ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ☆

قارئین متوجہ ہوں!

1۔ خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2۔ افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3۔ ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4۔ کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5۔ مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6۔ تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7۔ خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37-اردو بازار کراچی



ڈائجسٹ رائٹرز کے فنکار

گوہر رشید سے باتیں

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''

''گوہر رشید۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''گوہر۔''

3 ''تاریخ پیدائش/ شہر؟''

''2مئی/ لاہور۔''

4 ''اسٹار/ قد؟''

''ٹورس/ چھ فٹ۔''

5 ''بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟''

''ہم تین بہن بھائی ہیں/ میرا نمبر آخری ہے۔''

6 ''شادی؟''

''ابھی اسٹیبلش ہونا ہے۔ ابھی ارادہ نہیں ہے۔''

7 ''تعلیمی قابلیت؟''

''گریجویٹ ہوں اور میرے بنیادی مضامین فلم اینڈ ٹیلی ویژن اور جرنلزم تھے۔''

8 ''بچپن کا کیا خواب تھا تعلیمی میدان میں؟''

''بچپن کے تو بہت خواب ہوتے ہیں۔ بنتا انسان وہی ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔''

9 ''پہلی جاب؟''

''ہم ٹی وی اور میری یہ جاب مجھے میرٹ کی بنیاد پر ملی۔''

10 ''کون سا ڈراما وجہ شہرت بنا؟/ آن ایر ڈرامے؟''

''ڈائجسٹ رائٹر' آن ایر میں ''اعتراض' کھلونا' میرے جیون ساتھی۔''

11 ''آپ کی صبح کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟''

''صبح 10 بجے سے تقریباً''۔''

12 ''آنکھ کھلتے ہی پہلی خواہش؟''

''کہ آج کام پہ نہ جانا پڑے۔''

13 ''ملک کے کن لوگوں سے شکوہ ہے؟''

''قوانین بنانے والوں سے کہ انہیں اپنا کام ایمانداری سے کرنا چاہیے اور جو قوانین بنائیں ان پر عمل بھی کروائیں۔''

14 ''فیملی ساتھ ہو تو؟''

''ہر دن عید' ہر شب' شب برات لگتی ہے۔ انہی کے ساتھ تمام تہوار شوق سے مناتا ہوں' ہر خوشی شیئر کرتا ہوں۔''

15 ''جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔''

16 ''بھوک میں آپ کا مزاج؟''

''چڑچڑا ہو جاتا ہے۔''

17 ''ہفتے کا کون سا دن اچھا لگتا ہے؟''

''اتوار کا..... کیونکہ چھٹی ہوتی ہے۔''

18 "کام سے فارغ ہو کر کہاں جانے کو دل چاہتا ہے؟"
"کہیں نہیں صرف اور صرف گھر۔"
19 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"
"ہلا گلا کر کے۔"
20 "طبیعت میں کتنی ضد ہے؟"
"کچھ بھی نہیں۔"
21 "دماغ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب کوئی جھوٹ بولتا ہے اور غلط کام کرتا ہے۔"
22 "غصے میں اظہار کیفیت؟"
"کوشش ہوتی ہے کہ بات ہی نہ کروں 'گھر سے چلا جاؤں مگر جب کوئی اکساتا ہے تو پھر ٹھیک ٹھاک اظہار کر دیتا ہوں۔"
23 "خواتین کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ مخلص ہوتی ہیں۔"
24 "خواتین کی ایک بری بات؟"
"کہ بات کا بہت بتنگڑ بناتی ہیں۔"
25 "لڑکیاں آپ کو گھوریں تو؟"
"میں اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہوں۔"
26 "گھر میں ڈرتے ہیں؟"
"امی سے 'کیونکہ ان کا غصہ تیز ہے۔"
27 "کسی بھی قسم کی لاٹری لینے کا شوق ہے؟"
"نہیں..... کبھی پرائز بانڈ بھی نہیں لیے۔"
28 "کچھ وقت کے بعد ملا یا وقت پر؟"
"اللہ کا بڑا کرم ہے کہ جو کچھ ملا وقت پہ ملا۔ کسی چیز کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ محنت کرتا گیا صلہ ملتا گیا۔"
29 "جوائنٹ اکاؤنٹ پسند ہے یا سنگل؟"
"نہیں سنگل ہی ٹھیک ہے۔ اکاؤنٹ اپنا اپنا۔"
30 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
"لاہور کی فوڈ اسٹریٹ بہت پسند ہے۔"
31 "خرچ کرتے وقت جیب پہ نظر ہوتی ہے یا ہاتھ پہ؟"
"دونوں پہ..... فضول خرچ نہیں ہوں مگر کنجوس بھی نہیں ہوں 'جہاں خرچ کرنا ہوتا ہے کر دیتا ہوں۔"

32 "آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟"
"میرے خیال میں یہی کہ میں دوسروں کے کام آسکوں۔ دوسروں کا بھلا کر سکوں۔"
33 "برا وقت جو گزارہ ہو؟"
"جب پریکٹیکل لائف میں آیا اور پھر جب کراچی آیا تو کافی ٹف ٹائم دیکھا۔"
34 "کیا بات موڈ کو اچھا کر دیتی ہے؟"
"کوئی اچھی خبر۔"
35 "بہترین تحفہ؟"
"آپ کسی کے ساتھ سچائی اور ایمانداری سے پیش آئیں۔ یہ دوسروں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔"
36 "بستر سے اٹھنے میں کتنی دیر لگاتے ہیں؟"
"سوچتا رہتا ہوں کہ بس ابھی اٹھوں کہ نہ۔"
37 "مخلص کون ہوتے ہیں؟"
"اس کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب آزمائش کا وقت آتا ہے تب ہی پتا چلتا ہے کہ کون مخلص ہے کون نہیں۔"
38 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"
"فیملی کے ساتھ۔"
39 "لباس میں آپ کی پسند؟"
"شلوار قمیص۔"
40 "اپنی شخصیت کے لیے کوئی دو لفظ؟"
"کھرا اور سچا۔"
41 "لڑکی ذہین ہو یا حسین؟"
"ذہین۔"
42 "گھر میں کس کے پاس سکون ملتا ہے؟"
"امی کے پاس۔"
43 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"
"گھر والوں کے اور بہت ہی قریبی دوستوں کے۔"
44 "بوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟"
"کچھ پڑھ کر یعنی مطالعہ کر کے یا کوئی اچھی سی مووی دیکھ کر بوریت دور کرتا ہوں۔"
45 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں کئی بار۔"

46 "مہمانوں کی آمد؟"

"اچھی لگتی ہے۔"

47 "اگر پاور میں آجائیں تو؟"

"اس ملک میں جتنے بھی بے ایمان لوگ ہیں اور جو بھی پاکستان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں اور بڑی بڑی سیٹوں پہ بیٹھے ہوئے ہیں انہیں ملک بدر کردوں گا۔"

48 "کن چیزوں کا ذخیرہ ہے؟"

"یادوں کا اور ان یادوں کو مزید یادگار بنانے کے لیے میں نے اپنی فیملی کی اور اپنے بہت ہی مخلص لوگوں کی تصاویر کی البم بنائی ہوئی ہے تو ڈھیروں تصاویر ہیں میرے پاس۔"

49 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"جو بلاوجہ کی ہو۔"

50 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"

"جب وہ اپنا فیوچر بنانے کے لیے جدوجہد کر رہا ہوتا ہے۔"

51 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"

"کوشش کرتا ہوں۔"

52 "کن لوگوں پر خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"اپنے بھانجے بھانجیوں پر اور اپنے قریبی دوستوں پہ۔"

53 "کبھی کچھ اپنے لیے بھی خریدا؟"

"جی جی... لیپ ٹاپ خریدا۔"

54 "کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی، ڈائننگ ٹیبل یا اپنا بیڈ؟"

"زمین پہ بیٹھ کر کھانے کا مزہ آتا ہے۔"

55 "کھاتے وقت سنت پوری کرتے ہیں یا چھری کانٹے؟"

"میں ہاتھ سے کھاتا ہوں سنت پوری کرتا ہوں۔"

56 "ایک مخصوص جگہ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

"گھر، اس سے بہتر جگہ کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔"

57 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"پہلے تھی مگر اب اتنی زیادہ نہیں ہے۔"

58 "کب آپ کا دماغ ساتویں آسمان پہ ہوتا ہے؟"

"کبھی نہیں، کیونکہ اللہ کو غرور پسند نہیں ہے۔ تو میں کیسے مغرور ہو سکتا ہوں۔"

59 "ایک بات جو ہر وقت لبوں پہ رہتی ہے؟"

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

60 "دیسی کھانے پسند ہیں یا؟"

"دیسی، اپنے ملک کے کھانوں کی تو کیا ہی بات ہے۔"

61 "کون سا کھانا آپ بہت اچھا پکا لیتے ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

62 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"

"آج کل تو مرد ہوتے ہیں۔"

63 "بہترین کک؟"

"عورت۔"

64 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"

"کسی کو نہیں... بری بات۔"

65 "کس بات سے بہت ڈرتے ہیں؟"

"کسی غریب اور مفلس کا دل دکھانے سے اور غیبت سے۔"

66 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"جی بالکل اندھی ہوتی ہے۔"

67 "کن کیڑوں سے گھن آتی ہے؟"

"لال بیگ۔"

68 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"مہندی۔"

69 "تحفہ یا کیش؟"

"کیش دیں تاکہ وہ اس کو بہتر جگہ پہ لگا سکیں۔"

70 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"صرف اور صرف امی کے ہاتھ کا۔"

71 "ایک خواہش کہ؟"

"کہ قائداعظم سے ملوں اور بتاؤں کہ اپنے ملک کا حال

دیکھیں۔"

72 "کتنی بار فون نمبر تبدیل کیا؟"

"ایک بار بھی نہیں.... شروع سے ایک ہی ہے۔"

73 "آپ کو فوبیا ہے؟"

"جی بالکل ہے کہ کہیں میں اپنے قریبی لوگوں کو نہ کھودوں میں انہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

74 "کیا چیزیں لازمی ساتھ رکھتے ہیں؟"

"گاڑی کی چابی والٹ اور سیل فون۔"

75 "کارنامہ جو انجام دینا چاہتے ہیں؟"

"میں ایک بہت ہی اچھی فلم بنانا چاہتا ہوں۔"

76 "پہچان کر کیا کہتے ہیں؟"

"تعریف ہی کرتے ہیں۔ تنقید بھی بہت پیار سے کرتے ہیں۔"

77 "پاکستان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"

"یہ پوچھیں کہ کیا نہیں کر سکتا۔"

78 "اگر غلطی ہو جائے تو؟"

"تو اعتراف کر کے سوری کر لیتا ہوں۔"

79 "آپ کی کوئی اچھی عادت؟"

"یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں مگر میری ایک اچھی عادت ہے کہ اگر کسی سے دوستی کرتا ہوں تو پھر کبھی نہ توڑنے کے لیے.... دوستی کو قبر تک ساتھ لے جانے کا قائل ہوں۔"

80 "بری عادت آپ کی؟"

"بہت سی ایسی جگہوں پہ جہاں سچ نہیں بولنا چاہیے میں سچ بول دیتا ہوں۔"

81 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"

"جھوٹ ہی تو نہیں بولتا۔"

82 "غصے میں پہلا لفظ؟"

"میں خاموش رہتا ہوں اور گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔"

83 "دل سے سنتے ہیں یا دماغ کی؟"

"صرف دل کی سنتا ہوں۔"

84 "کبھی کھانے پہ غصہ نکلا؟"

"ہاں.... اکثر۔"

85 "مذہب سے لگاؤ؟"

"بہت زیادہ ہے۔"

86 "کروٹیں بدلتے ہیں؟"

"جب نیند نہیں آتی تب۔"

87 "سوتے وقت کیا چیزیں اپنے پاس لازمی رکھتا ہوں؟"

"پانی' ریموٹ اور دیگر ضروری چیزیں۔"

88 "اللہ کی حسین تخلیق؟"

"ہر چیز حسین بنائی ہے اللہ تعالیٰ نے۔"

89 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"میں پانی بہت پیتا ہوں۔ تو پانی نہ ہو تو کھانا نہیں کھا سکتا۔"

90 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"پیسہ کمانا اس دنیا میں مشکل نہیں ہے۔ میں محنت کرتا ہوں عزت کمانے کے لیے ... قسمت کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے۔"

91 "ڈاؤن ٹو ارتھ رہے یا؟"

"بہت محنت کی تب یہ مقام پایا ہے۔"

92 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"تو بہت برا ہوتا ہے اس کے ساتھ۔"

93 "اپنے گھر والوں سے کس چیز کا ایوارڈ لینا چاہتے ہیں؟"

"کسی چیز کا نہیں۔"

94 "کسی کا دل نہ دکھے اس کا خیال رکھنے کے لیے آپ کی حکمت عملی؟"

"تب میں جھوٹ بولتا ہوں۔ اس کو دکھ اور پریشانی سے بچانے کے لیے... اور تسلیاں بھی دیتا ہوں۔"

95 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں.... میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہوں اور بہت اچھا بنایا ہے میرے رب نے مجھے۔"

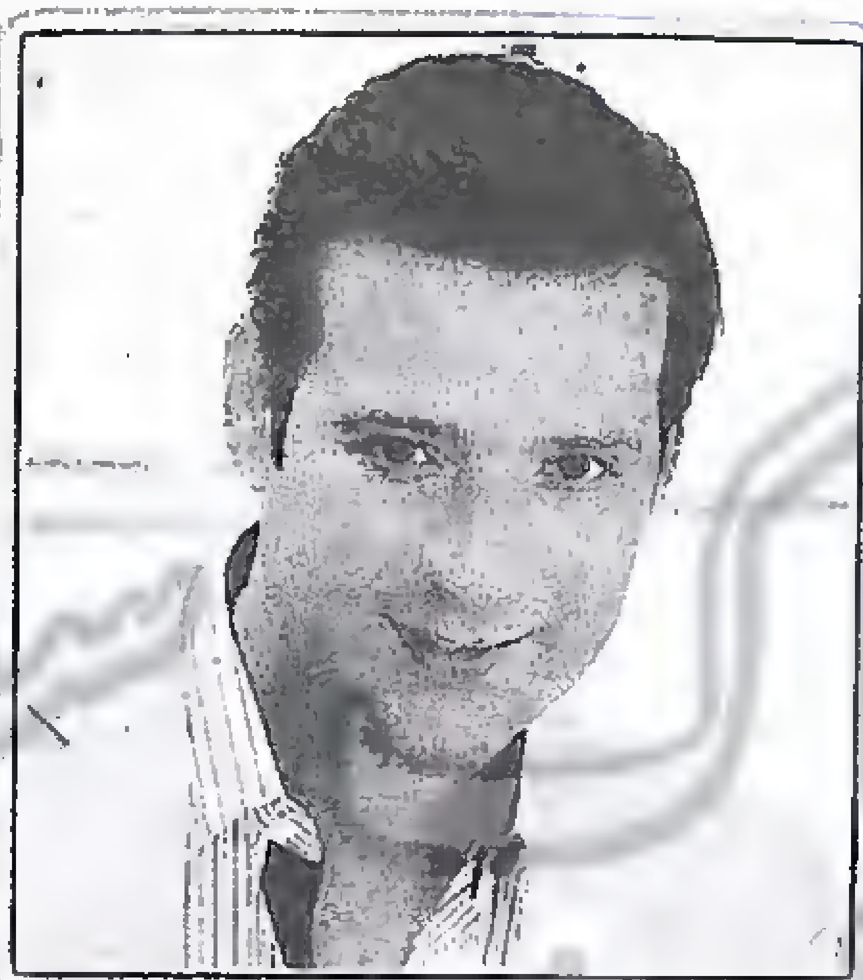
96 "کب اپنے آپ کو بہت فریش محسوس کرتے ہیں؟"

"فجر کی نماز کے وقت' دن کا آغاز اچھا ہو تو سب کچھ اچھا ہوتا ہے۔"

✡

خبریں وبریں

وصفہ سہیل



دعوے

پاکستان فلم انڈسٹری کے اداکار معمر رانا کہتے ہیں کہ پروڈیوسر اپنی فلموں میں کام کرانے کے لیے ان کی ترلے منتیں کررہے ہیں۔(اور یہ بے چارے فلم کے بجائے ٹی وی ڈراموں میں کام کررہے ہیں اور وہ بھی۔؟) فلم پروڈیوسر کو اب ترلے منتیں کرنے کے بجائے معیاری فلمیں بنانا ہوں گی (یہ بات آپ کو ٹی وی میں کام کرنے کے بعد پتا چلی....!) معمر رانا نے مزید کہا کہ ٹی وی کا ایکٹر کبھی بھی فلم اسٹار نہیں بن سکتا (اور فلم اسٹار اگر ٹی وی پر کام کرے تو وہ؟) میں بھی اب ٹی وی میں کام کررہا ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ لوگ فلم کے ہیرو کے لیے ٹکٹ خریدتے ہیں۔ جب وہ انہیں ٹی وی پر نظر آجائے گا تو انہیں کیا ضرورت ہے کہ وہ ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے جائیں۔(اللہ رے خوش فہمی۔!) معمر رانا نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ فلم انڈسٹری کی تباہی کے ذمہ داروں میں ان کا بھی کردار ہے۔(اسے کیا کہتے ہیں.... ڈھٹائی یا۔؟) ایک ہی قسم کے موضوعات اور ایک ہی طرح کی فلموں کی وجہ سے بھی انڈسٹری تباہ ہوئی (اور اب۔؟)۔

قدم

لیجیے جناب! یہاں تو ہوا ہی یہ چل پڑی ہے کہ ٹی وی اداکارائیں فلم انڈسٹری پر بھی چھا جائیں' اب سجل علی کیوں اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتیں سو انہوں نے بھی سلور اسکرین کی طرف قدم بڑھا دیے ہیں' سننے میں آیا ہے کہ سجل علی نے "عشق 2020" نامی فلم سائن کرلی ہے۔ جس میں ان کی مقابل منیب بٹ کو مرکزی کردار کے لیے کاسٹ کیا گیا ہے۔(ہم تو سجل کے لیے دعا ہی کرسکتے ہیں کیوں کہ منیب بٹ ایک فلاپ فلم کے ہیرو ہیں تو کہیں اس کا اثر سجل پر۔) اس فلم کی عکس بندی کراچی ناران کاغان کے علاوہ آسٹریلیا میں بھی کی جائے گی۔

سنا ہے کہ کسی کے جانے سے کسی کے آنے کی نوید



ہو گئی ہے۔ ہم بات کر رہے ہیں نادیہ خان کی۔ جی نادیہ خان اب دوبارہ مارننگ شو کریں گی اس چینل کا جس چینل نے "کسی اور کے" آنے کی وجہ سے نادیہ خان سے آنکھیں پھیرلی تھیں (بھئی شائستہ لودھی نا) اب جب وہ "کسی" کسی اور چینل پر چلی گئی ہیں تو انہیں اپنی ساکھ بچانے کے لیے پھر نادیہ خان کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے نادیہ خان دبئی سے کراچی شفٹ ہو گئی ہیں' سنا ہے کہ انہیں کمرشل اور ماڈلنگ کی آفر کے ساتھ ساتھ ٹی وی ڈراموں کی آفرز بھی ہو رہی ہیں (آہم۔ ہم ہم ہم۔ بھئی یہ "کس" نے اڑائی ہے کہ۔ تھوڑی کم کرلیں بھئی۔ کمرشلز' ماڈلنگ' ڈراما اور فلم۔؟ کمال ہے بھئی' ہم کو تو نہیں آپ کو ہے۔ بھئی یقین.... اور کیا۔؟)

کچھ ادھر ادھر سے

وزیراعظم امریکہ کے دورے پر تھے' کوئی ملک اپنے وزیراعظم کو اتنے وسوسوں کے ساتھ باہر روانہ نہیں کرتا' کیا ہذیان تھا جو نہیں اگلا گیا۔ جو ٹی وی اسٹیشن لگایا' لگا کہ "آکاش وانی" ہے.... شومئی قسمت اب تو ایسے ایسے ریٹائرڈ قسم کے ماہرین اسکرینوں پر جلوہ گر ہیں کہ دم گھٹنے لگتا ہے شاید یہ طے باندھ لیا گیا ہے کہ جتنا حکومت پر لعن طعن کروگے اتنے ہی کامیاب۔

(امتیاز عالم.... انگیخت)

☆ کسی وزیراعظم نے کبھی قومی مفاد کا سودا کیا؟ یاد ش بخیر' بم کی بنیاد رکھی بھٹو نے' دھماکا کیا نواز شریف نے' میزائل ٹیکنالوجی لائی بے نظیر اور پھر بھی مطعون ہوئے وزیراعظم۔

(امتیاز عالم.... انگیخت)

☆ میں خان صاحب کو ایک مشورہ اور دینا چاہتا تھا' وہ مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے مخالف سیاست دانوں کو صرف کرپٹ کہا کریں۔ کرپٹ ترین نہیں کیونکہ جہانگیر ترین ان کی پارٹی کے معزز رہنما ہیں۔ خان صاحب کو لفظوں کے استعمال میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

(عطاء الحق قاسمی.... روزن دیوار سے)

☆ پاکستانی میڈیا دنیا بھر میں سب سے زیادہ "باخبر" ہے' جس بات کی خبر ساری دنیا کے میڈیا میں کسی کو نہیں ہوتی' یہاں ہوتی ہے۔ اسی لیے باقی دنیا میں کہیں پر یہ "غل" نہیں ہے کہ عرب ممالک بے رحم اور بے حس ہیں کہ شامی پناہ گزینوں کی مدد نہیں کر رہے۔ پاکستانی میڈیا کو کون بتائے کہ پچاس لاکھ سے زیادہ شامی مہاجروں کو عرب ملکوں نے پناہ دے رکھی ہے۔

سودی عرب میں یہ گنتی سب سے زیادہ ہے۔ اس نے 25 لاکھ شامیوں کو نہ صرف پناہ دی ہے بلکہ ان کی ساری ضروریات بھی پوری کر رہا ہے۔ دس لاکھ سے زیادہ شامی لبنان اور کئی لاکھ اردن میں ہیں۔ اتنے ہی شامیوں نے ترکی میں پناہ لے رکھی ہے۔ یہاں ان کی حالت کچھ بہتر ہے لیکن سعودی عرب جیسی نہیں۔

(عبداللہ طارق سہیل.... وغیرہ وغیرہ)

ایسے لوگ فوجی آمروں کے پسندیدہ ہوتے ہیں جو قوم کی توجہ بے کار' لایعنی' بے معنی' بے مغز' فضول' کمتر' معمولی' جزوی' سطحی اور چھوٹی باتوں کی طرف مرکوز رکھتے ہیں اور آمر سکون سے حکومت کرتے رہتے ہیں۔

(ڈاکٹر ضیاء الدین خان)

☆ کاش منور رانا صاحب پاکستان آئیں اور دیکھیں یہاں مہاجر آرمی چیف بنتا ہے۔ مسلح افواج کا سپریم کمانڈر بنتا ہے' سپریم کورٹ کا جج بنتا ہے۔ وزیر مشیر بنتا ہے۔ وہ لاہور کے دھرم پورہ میں آباد ہے۔ وہ پشاور کی لال کرتی میں بستا ہے' وہ کوئٹہ کے لیاقت بازار میں ملے گا' وہ سکھر' نواب شاہ' میرپور خاص میں ملے گا۔ اسے وہ جمنا کا کنارہ غلطی نہیں لگتی جہاں آپ کے اخلاق حسین کو صرف اس لیے مار دیا جاتا ہے کہ اس نے گائے کا گوشت کیوں کھایا تھا' جہاں ایک مسلمان ڈرائیور کی جان اس لیے لے لی جاتی ہے کہ اس پر گائے بیچنے کا الزام ہے۔

(سیلانی.... دیکھتا چلا گیا)

آپ کا باورچی خانہ

نبیلہ گلزار احمد

س:۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں 'پسند ناپسند غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟

ج:۔ ہم کھانا پکاتے ہوئے صرف تیل کا خیال رکھتے ہیں کیونکہ امی اس معاملے میں ذرا بھی کوتاہی برداشت نہیں کرتیں اس لیے ہم آئلی کھانا زیادہ نہیں کھاتے۔ صحت بھی ٹھیک اور غذائیت بھی ساتھ ساتھ۔ ویسے کھانا پکاتے ہوئے ڈیڈی کی پسند کا خیال رکھتے ہیں 'کیونکہ ڈیڈی اور مجھے دونوں کو چٹ پٹے کھانے پسند ہیں۔

س:۔ کھانے کا وقت ہے؟ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں

ج:۔ اچانک مہمان گھر آجائیں تو ہم گھبراتے نہیں سبزیاں گھر میں اتنی وافر مقدار میں آتی ہیں کہ ہم فوراً "ان کو ابال کر کباب' چائنیز' چاول یا سالن میں ملا لیتے ہیں اور میٹھا تو ہوتا ہی ہے اور امی بھی سالن بنا لیتی ہیں۔ اور سوجی کے ٹکڑے تو ہم لوگ بنا کے رکھتے ہیں اور مہمان بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ محنت لگتی ہے پر ذائقہ دار بھی بنتے ہیں۔

سوجی کے ٹکڑے

ضروری اجزا :

گھی	آدھا کلو
چینی	دو کلو
ناریل	آدھا چھٹانک
بادام	آدھا پاؤ
چھوارے	آدھا چھٹانک
کشمش	آدھا چھٹانک
سوجی	دو کلو

سب سے پہلے گھی ڈال کر سوجی کو بھون لیں پھر الگ پتیلی میں چینی میں شیرہ تیار کر لیں۔ سارے میوے دھو کر باریک باریک کاٹ کر سوجی میں ڈال کر شیرہ میں جب تار آنے لگے تو سوجی میں ملا دیں اور ایک منٹ بعد اتار کر ٹرے میں پھیلا دیں۔ ٹکڑے تیار ہیں۔ اب ان کو چوکور ٹکڑوں کی شکل میں کاٹ لیں۔

س:۔ صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

ج:۔ صبح کے ناشتے میں چائے لازمی چیز ہے اور ہم پراٹھے بھی بناتے ہیں اور آملیٹ بھی۔ سردیوں میں سب حلوہ بھی پسند کرتے ہیں تو وہ بھی تازہ بنایا جاتا ہے۔ ہم سب کو میٹھا بہت پسند ہے۔ پر ہر چیز گھر کی۔

س:۔ آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں۔ (1) جب کوئی لے جائے۔ (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر

ج:۔ باہر کھانے کا رواج ہے پر اب ہم گھر ہی منگوا لیتے ہیں اور سب فیملی ممبرز بھی آجاتے ہیں تو اچھا بنتا ہے۔ اور تہواروں پہ تو سب کے ہاں آنا جانا لگا رہتا ہے تو گھومنا پھرنا بھی ہو جاتا ہے۔ اور ملانا ملنا بھی 'جو پورا سال ہی رہتا ہے پر ان خاص موقعوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔

س:۔ اچھا کھانا کھانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج:۔ میں کھانا ہمیشہ اچھے موڈ میں بناتی ہوں اور بناتی بھی جب ہوں جب موڈ ہوتا ہے اور مجھے کھانا بنانے کا بہت شوق ہے۔ اس لیے مختلف ڈشیں بھی بناتی ہوں جو خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوتی ہے۔ اور سب کی داد وصول کرتی ہوں۔

چاول بوائل کرتے ہوئے اس میں دھنیے کی ڈنڈیاں ڈال دیں تو اچھی مہک آجاتی ہے۔

اور آخر میں اپنا تعارف میرا نام نبیلہ گلزار احمد ہے اور میں نے بی کام کے پیپرز دیے ہیں اور اب مجھے اپنے نتیجے کا انتظار ہے۔

بہنوں کا شعاع اپنا ماہنامہ

نومبر 2015

کے شمارے کی ایک جھلک



نومبر 2015

کا شمارہ شائع

ہو گیا ہے

- ''وہی راستے وہی منزل'' مریم عزیز کا مکمل ناول،
- ''جام آرزو'' مہوش افتخار کا مکمل ناول،
- نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول ''رقصِ بسمل''،
- صائمہ اکرم کا ناولٹ ''سیاہ حاشیہ''،
- عنبرین ولی کا ناولٹ ''میں اور تم''،
- ہما چودھری کا ناولٹ ''دل کے بھید''،
- سمیرا حمید، مہناز یوسف، شازیہ جمال نیر، اور سویرا فلک کے افسانے،
- ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' نیا سلسلہ،
- ''انور مقصود اور عمرانہ مقصود'' کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ''دستک''،
- خط آپ کے، مسکراہٹیں، آئینہ خانے میں، کھاتا کسی پہ، موسم کے پکوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
- ''پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں'' احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،

شعاع کا شمارہ پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیئے گا، ہم منتظر ہیں۔

شعاع کا نومبر 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چائنیز چکن یلو ساس ودھ فرائیڈ فرائس

ضروری اشیاء :

مرغی کا گوشت	آدھا کلو
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
دودھ	ایک کپ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
میدہ	دو کھانے کے چمچے
پانی	حسب ضرورت
چائنیز نمک	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن کے جوے	تین سے دو عدد
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
کریم	آدھا کپ
فرائیڈ رائس	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کا بون لیس گوشت لیں اور کیوب کی شکل میں کاٹ لیں۔ پھر گوشت دھو کر خشک کرلیں۔ ایک پیالے میں گوشت' نمک' ایک چمچہ مکھن' کارن فلور' چائنیز نمک' سفید مرچ پاؤڈر اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر فریج میں ایک گھنٹے تک میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

فرائی پین میں تیل گرم کرکے اس میں لہسن کے جوے ساتے کرکے گوشت تل لیں اور پلیٹ میں نکال کر رکھ دیں۔

فرائی پین میں ایک چمچہ تیل اور مکھن گرم کرکے میدہ ڈال کر بھون لیں' خوشبو آنے لگے تو دودھ اور مسٹرڈ پیسٹ شامل کرلیں اور گاڑھا ساس بنالیں۔ اس میں فرائی کیا ہوا گوشت ڈال کر دو' تین منٹ پکائیں۔ آخر میں کریم اور لیموں کا رس شامل کرکے فرائیڈ رائس کے ساتھ سرو کریں۔

مسٹرڈ پیسٹ بنانے کی ترکیب

ضروری اشیاء :

مسٹرڈ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گیہوں کا آٹا	دو سے تین کھانے کے چمچے
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
ٹاٹری	ایک چٹکی
پسی چینی	ایک چوتھائی چمچہ
پسی ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
لہسن	آدھا چمچہ (پسا ہوا)
پانی	آدھا کپ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

پہلے دو کھانے کے چمچے تیل گرم کرکے پسا ہوا لہسن ڈال کر بھون لیں۔ پھر اس میں ہلدی اور پسا ہوا میتھی دانہ (مسٹرڈ پاؤڈر) شامل کرکے اس میں گیہوں کا آٹا شامل کردیں اور دو منٹ کے لیے پکائیں۔ پھر پانی' چینی' نمک اور ٹاٹری ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہوجائے تو اس میں سرکہ ملا کر چولہا بند کردیں۔ جب پیسٹ ٹھنڈا ہوجائے تو اسے صاف بوتل میں بھر کر فریج میں رکھ دیں۔

چکن چلیز سبزیوں کے ساتھ

ضروری اشیاء :

چکن	آدھا کلو
کشمیری مرچ	چار عدد
لہسن کے جوے	چھ عدد (کیوبز بنالیں)
شملہ مرچ	دو عدد (کیوبز بنالیں)
ہری مرچ	چار عدد (لمبی باریک کٹی ہوئی)
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تل کا تیل	چند قطرے
پیاز	دو ڈلی (پرت الگ کرلیں)
گاجر	دو عدد (گول قتلے کاٹ لیں)
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچے
سفید مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

بون لیس چکن لے کر چھوٹی بوٹی بنوالیں۔ چکن بوٹی ایک جگہ پھیلا کر رکھیں اور کسی بھاری چھری سے ساتھ ہلکا ہلکا کچل لیں' پھر لہسن کے جوے' سویا ساس' سرکہ' سفید مرچ' چینی' نمک' میدہ اور کارن فلور ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ جب کھانے کے لیے پیش کرنا ہو تو ایک کڑاہی میں دو چمچے تیل ڈال کر گرم کریں' پھر میرینیٹ کی ہوئی چکن ڈال دیں' آنچ تیز کردیں اور چکن کو ہلکا سا بھون لیں' پھر ایک پیالی پانی کارن فلور گھول کر چکن میں ڈال دیں اور چمچہ چلاتے رہیں' گاڑھی ساس بن جائے تو چولہا بند کردیں۔ اب ساری سبزیاں ایک پیالے میں ڈال کر سویا ساس' سرکہ' میدہ اور سفید مرچ ملائیں۔ ایک بڑے فرائنگ پین میں باقی تیل ڈال کر گرم کریں۔ میرینیٹ کی ہوئی سبزیاں ڈال کر تیز آنچ پر اسٹر فرائی کرلیں' پھر چکن میں ڈال کر ملالیں اور گرم گرم پیش کریں۔

چکن چاؤمن

ضروری اشیاء :

چکن	آدھا کلو
سویا ساس	تین کھانے کے چمچے
کارن فلور	ایک چائے کا چمچہ
ہری پیاز کے پتے	ایک پیالی (باریک کٹے ہوئے)
پیاز	ایک ڈلی
(باریک لمبائی میں کٹی ہوئی)	
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ (پسی ہوئی)
بند گوبھی	ایک پھول
(باریک لمبائی میں کٹی ہوئی)	
شملہ مرچ	تین عدد
(باریک لمبائی میں کٹی ہوئی)	
بینز سپراؤٹ	ایک پیالی
تیل	چار کھانے کا چمچے
چک کیوبز	دو عدد
سفید سرکہ	تین کھانے کے چمچے
میدہ	آدھا کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ (پسی ہوئی)
گاجر	تین عدد (باریک کٹی ہوئی)
ادرک، لہسن	ایک چائے کا چمچہ (پسا ہوا)
نوڈلز	ایک پیکٹ
تیل	چند قطرے

ترکیب :

بغیر ہڈی کی چکن لے کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ پھر اس میں سرکہ' سویا ساس' نمک اور کارن فلور ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک بڑی دیگچی میں خوب ڈھیر سارا پانی گرم کریں جب پانی کھولنے لگے تو نوڈلز ڈال دیں' ساتھ میں ایک چمچہ تیل ڈال دیں' جب نوڈلز گل جائیں تو چھلنی سے چھان لیں' فوراً" ہی ٹھنڈے پانی سے نوڈلز کو اوپر نیچے کرکے دھو

نیں اور ایک چائے کا چمچہ تیل ملا دیں تاکہ نوڈلز چپک نہ جائیں' ایک بڑی کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ پیاز ڈال کر ہلکی گلابی کرلیں۔ سرکہ' نمک' کالی' سفید مرچ' میدہ اور چینی ڈال کر پانچ منٹ تک بھون لیں' پھر نوڈلز ڈال کر مکس کریں اور بینز سپراؤٹ اور پتے ڈال دیں اور گرم گرم کھانے کے لیے پیش کریں۔

اسٹر فرائی سبزیاں

ضروری اشیاء :

بند گوبھی	ایک پھول (کیوبز بنالیں)
ہری پیاز	چار عدد (پتے سمیت کٹی ہوئی)
کھیرا	دو عدد (گول قتلے کاٹ لیں)
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
چینی	ایک چائے کا چمچہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ (پسی ہوئی)
لہسن کے جوے	چار عدد (باریک کٹے ہوئے)
شملہ مرچ	تین عدد (کیوبز بنالیں)
مشرومز	ایک ٹن
گاجر	دو عدد (گول قتلے کاٹ لیں)
بینز سپراؤٹ	ایک پیالی
وورسٹر شائر ساس	ایک کھانے کا چمچہ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ساری سبزیاں دھو کر چھلنی میں رکھ لیں' تاکہ ان کا پانی اچھی طرح سے نکل جائے' پھر ان کو ایک بڑے پیالے میں ڈال دیں' بینز سپراؤٹ بالکل الگ رکھ لیں۔ سبزیوں میں اوپر دیے گئے سارے مسالا جات اچھی طرح ملالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں' پھر سبزیوں کو ڈال کر تیز آنچ پر دونوں ہاتھوں میں چمچے لے کر جلدی جلدی چلا کر اسٹر فرائی کرلیں۔ پانچ منٹ بعد تیل اور بینز سپراؤٹ ڈال کر گرم پیش کریں۔ بینز

چائنیز ڈرم اسٹکس

ضروری اجزا :

مرغی کی رانیں	بارہ عدد (گہرے کٹ لگوالیں)
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
انڈے	چار عدد (سفیدی زردی الگ پھینٹ لیں)
سویا ساس	دو کھانے کے چمچہ
شہد	ایک کھانے کا چمچہ
چکن کیوب ملا ہوا میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
سفید مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
تلنے کے لیے تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

سب سے پہلے مرغی کی رانوں کو گرم پانی سے دھو کر ایک پیالے میں ڈال کر میدہ' چینی' سرکہ' سویا ساس' شہد' کالی' سفید مرچ' نمک اور زردی ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ جب تلنا ہو تو انڈوں کی سفیدی پھینٹ کر ایک ایک ڈرم اسٹک سفیدی میں ڈبو کر ہلکی آنچ پر ڈیپ فرائی کرلیں' جب گولڈن براؤن ہو جائے تو نکال کر ٹشو پیپر پر رکھ لیں تاکہ چکنائی جذب ہو جائے۔ فوراً" چٹکی بھر بیسن چھڑک دیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- عشنا زئی
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ---------- موسیٰ رضا

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

زینب وحید' کراچی

س : میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں۔ چودہ سال کی تھی جب والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا' میں اس وقت آٹھویں کلاس میں تھی' والد کی چھوٹی سی کریانہ کی دکان تھی۔ ان کی وفات کے بعد دکان بند ہو گئی' آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ ہم چار بہنیں' دو بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی۔ دو ماہ اسی طرح گزرے' پھر ماموں نے دکان کرائے پر دے دی' دکان مین بازار میں نہیں تھی۔ اس لیے کرایہ بہت کم تھا' وہ بھی کبھی ملتا کبھی نہ ملتا۔ میں نے جیسے تیسے میٹرک کر لیا۔ اس کے بعد آگے پڑھنے کے لیے حالات اجازت نہیں دے رہے تھے۔ امی گھر پر تھوڑا بہت سلائی کا کام کرتی تھیں' اس سے گھر کے اخراجات تو پورے ہو جاتے' چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم' سب پڑھ رہے تھے۔ میں نے کالج میں داخلہ لینے کا خیال چھوڑ کر ملازمت تلاش کرنا شروع کر دی' لیکن صرف میٹرک پاس کو کیا ملازمت ملتی' جس اسکول میں پڑھا تھا اس کی مالک میرے حالات سے واقف تھیں انہوں نے مجھے اسی اسکول میں کلرک کی ملازمت دے دی۔ تنخواہ بہت کم تھی' لیکن اس ملازمت سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ دو چھوٹی بہنوں کی فیس معاف کر دی گئی' وہ میرے ساتھ پڑھتی تھیں' دونوں بھائی اور ایک بہن کو تو سرکاری اسکول میں داخلہ دلایا تھا۔ لیکن ان کا بھی کتابوں کاپیوں کا خرچا تھا۔ میں اسکول کے بعد گھر گھر جا کر خواتین کی ضرورت کی اشیاء فروخت کرتی۔ میں نے پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا' لیکن پڑھائی کے لیے بہت کم وقت ملتا' رات کو بستر پر جاتی تو تھک کر چور ہوتی' پھر بھی ہمت کر کے اٹھتی اور کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی' میری محنت رائیگاں نہ گئی' انٹر کے امتحان میں کامیاب ہوئی تو میری ہمت بڑھ گئی' اس کے بعد پرائیویٹ بی اے بھی کر لیا۔ اسکول میں میری تنخواہ بڑھ گئی۔ میرا سلائی کا کام بھی اچھا جا رہا تھا۔ گھر کے حالات بہتر ہو گئے تھے دونوں چھوٹی بہنوں نے بمشکل انٹر کیا پھر پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا' انہیں پڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ میری عمر اٹھائیس سال ہو چکی تھی۔ امی چاہتی تھیں کہ میری شادی ہو جائے۔ کئی جگہ میرے رشتہ کی بات چلائی' لیکن جو بھی رشتہ آتا چھوٹی بہنیں بن سنور کر سامنے آجاتیں اور وہ میری جگہ ان کو پسند کر کے رشتہ دے جاتے۔ امی نے جب ایک دو بار انکار کیا تو چھوٹی بہنوں کا منہ بن گیا۔ انہوں نے مجھ پر طنز کرنے شروع کر دیے۔ آخر میں نے امی سے کہا کہ آپ پہلے ان کی شادی کر دیں۔ امی راضی نہ تھیں' لیکن بہنوں کے تیور دیکھ کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ جو کچھ امی نے میرے لیے بنایا تھا۔ انہیں دے کر رخصت کیا۔ شادی کے لیے قرض لینا پڑا۔ جو میں نے کمیٹیاں ڈال کر اتارا۔ چھوٹے بھائی نے انٹر کے بعد ٹیکنیشن کا ڈپلوما لیا' وہ باہر جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے پیسے مانگے۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بھائی نے کہا کسی سے قرض لے لیں میں ملازمت ملتے ہی اتار دوں گا۔ خیر کسی نہ کسی طرح پیسوں کا انتظام کر کے بھجوایا۔ بھائی کسی ایجنٹ کے ذریعے غیر قانونی طریقے پر گیا تھا۔ پکڑا گیا۔ پانچ سال وہاں جیل میں رہا' پھر پاکستان واپس آیا تو شدید ڈپریشن کا شکار ہو چکا تھا۔ اب بھی کوئی کام نہیں کرتا' دوسرے بھائی نے بی اے کے بعد ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی سے شادی کر کے الگ گھر بسا لیا۔ اس کے سسرال والوں نے اسے ملازمت بھی دلا دی۔ اس دوران امی کا انتقال ہو گیا۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی اب شادی کے قابل تھیں۔ بڑے بھائی تو ہمیں بھول ہی چکے تھے۔ چھوٹا بھائی کسی قابل نہیں تھا۔ ان کی شادی میری ذمہ داری تھی' اب ان کی شادی ہو چکی ہے۔ میں تنہا ہوں ذہن کی کیفیت عجیب ہے اگر ہجوم میں بھی ہوں تو اپنے اردگرد سناٹا اور تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی کام

کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اسکول سے واپس آکر سو جاتی ہوں تو رات جاگتے گزرتی ہے۔ ذہن ماؤف ہوتا جارہا ہے۔ نماز پڑھنے کھڑی ہوتی ہوں تو دعائیں بھول جاتی ہوں' بار بار وضو کرتی ہوں۔ اسکول میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ پرانی نوکری ہے اس لیے کھل کر نہیں کہا لیکن دبے لفظوں میں مشورہ دیا ہے کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔

مجھے لگتا ہے میری زندگی بے کار اور رائیگاں گزری ہے' میری عمر 45 سال ہے لیکن میں اپنی عمر سے دس سال بڑی نظر آتی ہوں۔

ج: آپ نے بہت مصروف زندگی گزاری ہے محنت اور جدوجہد کی ہے۔ اسی وجہ سے کسی سے دوستی بھی نہ کر سکیں۔ بہن بھائی چھوٹے تھے کبھی ان سے بھی دل کی بات نہ کر سکیں۔ مصروف زندگی نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ کبھی اپنے لیے بھی کچھ سوچتیں' کوئی تفریح نہیں' کوئی خوشی نہیں' ایک مشین کی طرح اپنے فرائض کی انجام دہی میں لگی رہیں۔ اب سب بہن بھائی اپنے گھروں کے ہو چکے ہیں۔ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں تو آپ کو اپنی زندگی بے مصرف معلوم ہوتی ہے۔ بلاشبہ آپ نے ایک مشکل زندگی گزاری ہے' لیکن کیا یہ احساس باعث طمانیت نہیں کہ آپ کی وجہ سے بہت سی زندگیاں سنور گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قابل کیا کہ آپ دوسروں کے لیے کچھ کر سکیں۔ یہ سوچ ہی غلط ہے کہ آپ کی زندگی رائیگاں گئی۔ آپ نے تو بہت کار آمد زندگی گزاری ہے اور ابھی بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں' آپ کی عمر زیادہ نہیں ہے اگر عمر سے زیادہ نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے کبھی خود پر توجہ نہیں دی۔ اپنے آپ پر توجہ دیں' اپنے لباس پر' بالوں پر' اپنی شخصیت پر' جب آپ میں ظاہری تبدیلی آئے گی تو آپ اپنے اندر بھی تبدیلی محسوس کریں گی۔ جو خول آپ نے اپنے گرد بنا رکھا ہے' اس سے باہر نکلیں' کسی مخلص اور اچھی لڑکی سے دوستی کریں اور آپ اپنی شادی کے متعلق بھی سوچیں آپ کو اب بھی کوئی اچھا رشتہ مل سکتا ہے' اپنی بہنوں سے بھی بات کر سکتی ہیں کہ وہ آپ کے لیے کوشش کریں۔ اب تک آپ نے ان کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب ان کی باری ہے۔

عائشہ احمد...... راولپنڈی

یونیورسٹی میں میرے ساتھ ایک لڑکا ف پڑھتا تھا۔ میری اس سے دوستی تھی۔ دوستی کب پسندیدگی اور محبت میں ڈھل گئی۔ پتا ہی نہیں چلا۔ دو سال ہم ساتھ رہے۔ ایم اے کے بعد گھر میں میری شادی کی بات چلی تو میں نے اسے بتایا۔ وہ اس وقت جاب تلاش کر رہا تھا۔ اس نے کہا فی الحال میں اس پوزیشن میں نہیں کہ گھر میں اپنی شادی کی بات کر سکوں میں نے کہا تم صرف رشتہ بھجوا دو' اپنے گھر والوں سے میں خود بات کرلوں گی۔ میں اس کے لیے انتظار کر سکتی تھی' لیکن اس نے مجھے ٹال دیا اور ایک دن مجھے بتائے بغیر ملک چھوڑ کر کینیڈا چلا گیا' مجھے پتا چلا تو بہت دکھ ہوا' میں نے اس سے سچی محبت کی تھی۔ گھر والوں سے کیا کہتی' کس بنا پر شادی سے انکار کرتی۔ میرے پاس انکار کا کوئی جواز ہی نہیں تھا' گھر والوں نے ایک اچھا رشتہ دیکھ کر شادی کر دی۔ بظاہر میرے شوہر بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ ان میں کوئی خرابی نہ تھی لیکن ان کا مزاج عجیب و غریب تھا۔ یا میں ہی سمجھ نہ پائی۔ انہیں خاموشی کے دورے پڑتے تو ہفتوں چپ رہتے اگر اس دوران میں بات کرنے کی کوشش کرتی تو کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ ان کے گھر والے بھی اس موڈ میں ان سے بات نہ کرتے۔ کوئی بچہ بھی نہ ہوا کہ مزاج میں تبدیلی آجاتی۔ مجھے بہت الجھن ہوتی۔ اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ ایک دن اچانک ف کا فون آگیا۔ مجھے اس پر بہت غصہ تھا۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میری شادی ہو چکی ہے' اب وہ مجھے فون نہ کرے۔ اس نے کہا کہ صرف ایک بار مل لو لیکن میں نے غصہ میں فون بند کر دیا۔

ایک دن میرے شوہر اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے ان سے ان کی خاموشی کے دوروں کی وجہ پوچھ لی۔ تب انہوں

نے بتایا کہ وہ کسی لڑکی کو چاہتے تھے لیکن وہ دوسرے مسلک سے تعلق رکھتی تھی اس لیے شادی نہ ہو سکی لیکن وہ آج بھی اسے بھول نہیں پائے ہیں۔ نہ ذہنی طور پر اپنی شادی کو تسلیم کر پائے ہیں۔ مجھے یہ سن کر دھکا سا لگا۔
ف نے مجھے فون کیا تو میں اس بار اس سے ملنے پر راضی ہو گئی.... ہماری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میں اپنے شوہر کو چھوڑ دوں تو وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔

ج: اچھی بہن! پانچ سال گزر گئے ڈیڑھ سال آپ کی منگنی رہی اس دوران اس کو ایک بار بھی آپ کی یاد نہیں آئی۔ باہر جانے سے پہلے اس نے آپ کو جانے کے متعلق بھی نہیں بتایا۔ خاموشی سے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب واپس آیا تو اسے آپ کی یاد آئی.... اس میں شک نہیں کہ آپ کے شوہر سے آپ کو وہ توجہ اور محبت نہیں ملی جو آپ کا حق تھا لیکن آپ اس شخص پر بھی اعتماد نہیں کر سکتیں۔ زندگی ڈراما یا ناول نہیں ہے۔ شادی، طلاق، دوسری شادی آسان نہیں ہے۔ آپ ایک شخص کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھی ہیں۔ آج اس شخص کی خاطر اپنا گھر توڑ دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آپ سے شادی کر لے گا یا شادی کر کے اسے نبھا بھی سکے گا۔ اس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے بظاہر تو ایسا نہیں لگتا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اس سے رابطے منقطع کر لیں۔ وہ آپ کے ساتھ سنجیدہ نہیں ہے، جہاں تک شوہر کے رویے کا تعلق ہے تو اب تک آپ ان کی ذہنی کیفیت اور خاموشی کی وجہ سے لاعلم تھیں۔ اب جبکہ آپ سب کچھ جان چکی ہیں۔ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے آپ کو تھوڑی سی کوشش کرنا ہو گی پھر وہ سب کچھ بھول کر آپ کے ہو جائیں گے۔ خوابوں خیالوں کے سہارے کوئی کب تک جی سکتا ہے۔ ایک دن حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔

ح۔ حسین، حضرو

س: میری دوست کے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ وہ اعتماد کے ساتھ بات نہیں کر سکتی اور اگر کسی کی طرف دیکھ کر بات کرے تو اس سے بات ہی نہیں ہوتی اور اس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے جیسے اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو، وہ اس طرح شرمندہ سی ہو جاتی ہے۔ وہ بہت پیار کرنے والی لڑکی ہے ہر کسی سے محبت سے پیش آنے والی لیکن اب پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے بندوں سے چھپتی رہتی ہے جیسے کوئی جرم ہو گیا ہو۔ اس کا باتیں کرنے کو، سب سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ وہ بہت پریشان ہے، وظیفے بھی کرتی رہتی ہے کچھ دن اثر ہوتا ہے تو بہت خوش ہوتی ہے لیکن تھوڑے دن بعد پھر اسی طرح ہو جاتی ہے۔ بی اے پاس ہے، ماحول بھی اچھا ہے لیکن تھوڑا سخت ماحول ہے کیا وہ سختی کی وجہ سے ایسی ہے۔

ج: بہت زیادہ حساس لوگوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ ذہین بھی ہوتے ہیں۔ کوئی واقعہ پیش آجائے تو کوشش کے باوجود اسے بھول نہیں پاتے۔ وہ ان کے ذہن پر اس طرح نقش ہو جاتا ہے کہ ان کی پوری شخصیت بدل جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں گھنٹوں پریشان رکھتی ہیں، کسی نے سختی سے بات کی یا کوئی جملہ کہہ دیا۔ کسی نے انہیں نظر انداز کیا، وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہیں گے۔
آپ کی سہیلی کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے لیکن پریشانی کی بات نہیں۔ آپ اس کی دوست ہیں اس کو سمجھاتی رہیں۔ آہستہ آہستہ اسے بولنے کی طرف راغب کریں۔ کسی جگہ جائیں تو اس کے ساتھ رہیں۔ اس کو لوگوں سے ملوائیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سے پوچھیں کہ کیا وجہ ہے جو وہ کسی کے سامنے بات نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو جس نے اس کے ذہن پر اثرات مرتب کیے ہوں۔
وظیفے، وظائف چھوڑ دیں۔ بہت زیادہ وظیفے پڑھنے سے بھی ذہن متاثر ہوتا ہے۔

بیوٹی بکس

امت الصبور

ثانیہ ناز... کراچی

س: ہمارے خاندان میں بہت سے افراد کو شوگر ہے۔ امی اور ابو بھی اس کا شکار ہیں۔ جب سے شوگر کا پتا چلا ہے امی نے شکر کا استعمال ترک کر دیا لیکن انہیں پھل بہت پسند ہیں۔ ابو بھی شکر کی حد تک تو پرہیز کر لیتے ہیں لیکن باقی چیزوں کے لیے نہیں مانتے۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ فریج سے نکال کر کھا لیتے ہیں۔ تنگ آکر ہم نے گھر میں پھل اور مٹھائی لانے کی ممانعت کر دی ہے، تب سے امی سخت ناراض ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انہیں کیسے سمجھایا جائے۔

ج: ثانیہ! آپ کا سوال بیوٹی بکس سے تعلق نہیں رکھتا لیکن یہ بہت سارے لوگوں کا مسئلہ ہے۔ اس لیے ہم نے اسے بیوٹی بکس میں شامل کر لیا ہے۔ شوگر کا مرض پوری دنیا میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور ہمارے ملک میں بھی اس کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔ اس مرض کا جڑ سے ختم ہونا تو ممکن نہیں لیکن مناسب احتیاط اور تدابیر سے اس کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک آپ کے امی، ابو کا تعلق ہے تو آپ نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ شوگر کے مرض میں کچھ پھل، سبزیاں ایسی ہیں جو کم مقدار میں کھائی جائیں تو نقصان نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ چیزوں کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ ہم ایک چارٹ دے رہے ہیں، جس سے آپ جان جائیں گی کہ کون سی چیزیں بالکل نہیں دینا چاہییں، کون سی کم مقدار میں دے سکتی ہیں اور کون سی وہ چیزیں ہیں جو حسب خواہش لے سکتے ہیں۔

غذا جو نہیں لے سکتے

شکر، گڑ، شہد، مٹھائی، بند ڈبوں والے پھل، کھجور، پیسٹری، کیک، نان خطائی، بیکری بسکٹ، چاکلیٹ، چیونگم، سوفٹ ڈرنک، تازہ پھلوں کے رس، گنا، شکر قندی، انجیر، کشمش، جام، میٹھا دودھ، آئس کریم، اسکواش، پڈنگ۔

غذا جو کم مقدار میں لے سکتے ہیں

روٹی، چاول، اسپیگھٹی، نوڈلز، دلیہ، دالیں، مکئی، آم، کیلا، تربوز، سنگترہ، شریفہ، سیب، خوبانی، آلو بخارا، آڑو، پپیتا، امرود، چیکو، خربوزہ، چقندر، گاجر، شلجم، اروی، آلو، مونگ کی دال کی جڑ، مٹر، کھانے کا تیل، مارجرین، بڑے کا گوشت، تلی ہوئی اشیا۔

غذا جو حسب منشا لے سکتے ہیں

بیسن، بھنڈی، پھول گوبھی، بند گوبھی، کدو، اروی کے پتے، ہری مرچ، توری، سلاد، ککڑی، کھیرا، کریلا، بیگن، لیموں، سفید اور لال مولی، ہری سوکھی پیاز، چھوٹا گوشت۔

عصمت... علی پور چٹھہ

س: سردیوں کا آغاز ہوتے ہی میرے پیروں کی ایڑیاں پھٹنے لگتی ہیں جو نہ صرف تکلیف دیتی ہیں بلکہ پیر کالے بھی لگتے ہیں اور کام کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ کوئی گھریلو نسخہ بتائیں کیونکہ مہنگے لوشن اور کریمیں میں نہیں خرید سکتی۔ گاؤں میں رہتی ہوں۔

ج: ایک بہت آسان نسخہ لکھ رہے ہیں۔ شلجم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ انہیں ابال لیں۔ جب پانی نیم گرم ہو جائے تو اسے بالٹی یا تسلے میں ڈال لیں۔ آدھا چمچہ نمک، ایک چمچہ سرسوں کا تیل ڈالیں۔ دس منٹ تک پاؤں اس پانی میں رکھیں۔ پھر نکال لیں۔ پاؤں پھٹنا بند ہو جائیں گے۔

☼